حکیم محمد موسیٰ امرتسری
ڈاکٹر محمد مسعود احمد
پروفیسر شاہ فرید الحق
سید ریاست علی شاہ
علامہ شمس الحسن شمس
محمد فاروق القادری
مولانا محمد صادق
سید وجاہت رسول
علامہ سید شجاعت علی
عبدالحکیم شاہجہانپوری
سید نور محمد قادری
پروفیسر مجید اللہ قادری
پروفیسر محمد ابرار احمد
علامہ محمد احمد مصباحی
عبدالمجتبیٰ رضوی (انڈیا)
سید جلال الدین (دہلی)

تعارفِ کتاب

نام کتاب ------ مجالسِ علماء

تحریر ------ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی

موضوعِ کتاب ------ علمائے کرام کی یادیں

ماخذ ------ اوراقِ جہانِ رضا

تعارفِ کتاب ------ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی

مقدمۂ کتاب ------ جرسِ کارواں - سردار محمد اکرم بٹر، ایڈووکیٹ

تمہیدی باتیں ------ محمد عالم مختارِ حق

تحریک ------ سردار محمد اکرم بٹر، ایڈووکیٹ

مرتب و نگرانِ طباعت ------ محمد عالم مختارِ حق

سالِ تالیف و ترتیب ------ ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء

ناشر ------ مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ، لاہور

طابع ------ کاروان پریس، لاہور

قیمت ------ ۳۰۰ روپے

ملنے کے پتے

مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ، لاہور ○ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور ○ شبیر برادرز، اردو بازار، لاہور ○ مکتبہ قادری رضوی، گنج بخش روڈ، لاہور ○ تمام دینی مکتبے جو ملک کے کسی حصے میں کام کر رہے ہیں۔

ترتیبِ مضامینِ کتاب

علمائے کرام —— یادوں کے جھروکوں سے

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی

علمائے کرام گلستانِ اسلام کے وہ مہکتے پھول ہیں۔ جن کی خوشبوؤں سے سارا عالم اسلام مہک رہا ہے۔ صدیوں سے یہ پھول اپنے اپنے انداز میں کھلتے رہے۔ اور گلستانِ اسلام کو خوشبوئے رسول سے مہکاتے رہے ہیں۔ پاکستان کی تحریک، تشکیل، قیام اور اس کی بقا کے لئے جن علمائے ذی شان نے حصہ لیا تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف میں لکھا گیا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب ''مجالس علماء'' میرے مشاہدات'' میری یادوں اور میرے اوراق، میری عقیدتوں کا وہ گلدستہ ہے جو اہل محبت کے دل و دماغ کو مہکا دے گا۔ پاکستان بن رہا تھا۔ آزادی کی بادِ بہاری چل رہی تھی میں ایک طالب علم تھا۔ تحریک پاکستان میں علمائے کرام تقریریں کرتے تو میں ان کی مجالس میں حاضر رہتا۔ پاکستان بنا تو مجھے وقت کے بلند پایہ علماء خصوصاً خوش بیان خطیبوں، شعلہ نوا شاعروں اور نکتہ سنج ادیبوں کی مجالس میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ میں ان مجالس کی یادوں کو اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں محفوظ کرتا رہا۔

تدریسی اور تعلیمی اداروں سے ہٹ کر مجھے ایسے خطیبوں اور مقرروں کی تقاریر سننے کا موقع ملا۔ جو اپنی زور بیانی سے چلتے قافلوں کو روک دیا کرتے تھے۔ جو ساری ساری رات تقریر کرتے تو اپنے سامعین کو اُکتانے نہ دیتے۔ بعض ایسے خوش کلام

خطیبوں کو سننے کا موقع ملا۔ جنہیں سن کر یوں محسوس ہوتا کہ

؎ آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

بعض شیریں بیان خطیب جب خطاب کرتے تو یوں محسوس ہوتا —— نسیم خلد می وزد مگر ز جوئے بارہا —— مجھے ایسے جلسوں میں جانے کا موقع ملا جن میں مقرر اپنی تقریر سے سامعین کو مسحور کر دیتا اور صبح کی اذان تک مجال ہے کہ کوئی شخص مجمع چھوڑ کر جاتا۔ بادلوں کو آسمانو کے سائے میں اکثر گرجتے دیکھا تھا مگر میں نے کئی خطیبانِ وقت کو سٹیج پر بادلوں کی طرح گرجتے اور چمکتے بھی دیکھا۔ میں کئی بار بارش کی پھوار میں بھیگا۔ مگر کئی جلسوں میں ایسے خطیب سنے جن کی تقریریں شبنم کی پھوار بن کر دل و دماغ کو تر و تازہ کرتی گئیں۔ میں نے آگ کے شعلے تو لپکتے ہوئے دیکھے تھے مگر کئی شعلہ بیاں مقرروں کو جلسوں میں شعلہ فشانی کرتے دیکھا۔ تو دنگ رہ گیا۔ میں نے میدانِ جنگ میں شاہ سواروں کی للکار تو سنی تھی مگر جب میں مناظروں کے جلسوں میں آتا تو مناظر اپنے حریف کو اس طرح للکارتا جس طرح واقعی وہ میدانِ علم و فضل کا شاہ سوار ہے میں نے طنز و مزاح کے کئی انداز کتابوں میں تو پڑھے تھے مگر خوش بیان علماء کو کئی جلسوں میں طنز و مزاح سے اپنے سامعین کو کشت زعفران بناتے دیکھا۔ میں نے اکثر مقررین کو سنا تو یوں گماں ہوتا کہ —— بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں! ——
میں ان مقرروں، ان خطیبوں، ان واعظوں، ان شعلہ بیانوں کی مجالس میں زندگی کا ایک طویل عرصہ گزارا۔

ایک وقت آیا کہ میرے قلم نے ان یادوں کو صفحات قرطاس پر لانا شروع کیا۔ اخبارات، رسائل اور کتابوں میں ان یادوں کو کبھی کبھی اپنے قارئین کے سامنے لاتا جاتا۔ ''جہان رضا'' اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار و تعلیمات کا ترجمان بنا۔ تو اس کے صفحات پر ''علماء کی یادیں'' تسلسل سے سامنے آنے لگیں۔ جنہیں قارئینِ ''جہانِ رضا'' نے بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ پسند کیا، داد دی اور اس سلسلہ کو جاری رکھنے

پر زور دیا۔ چودہ سال کے طویل عرصہ میں ''جہان رضا'' کے صفحات میں علماء کی یادوں کی خوشبو پھیلی تو میرے بعض قدر دان دوستوں کو خیال آیا۔ کیوں نہ ان بکھری ہوئی یادوں کو جمع کر کے ایک کتاب مرتب کی جائے۔ اگر چہ یہ خواہش جہان رضا کے قارئین کے علاوہ کئی اہل علم و قلم کے دلوں میں مچلتی تھی۔ مگر ہمارے ایک دوست سردار محمد اکرم بٹر ایڈووکیٹ آگے بڑھے اور ''جہان رضا'' کی فائیلوں سے علماء کی یادوں کو جمع کرنا شروع کیا۔ انہوں نے ابتدائی کام کیا مگر ان کی علالت نے ان کے قلم کو روک دیا اور وہ ایک راستہ ہموار کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔

محمد عالم مختار حق حکیم محمد موسیٰ امرتسری، بانی مجلس رضا کے پرانے جلیس و رفیق رہے ہیں اور ''جہان رضا'' کے آغاز سے اس کے مستقل قاری رہے ہیں وہ آگے بڑھے۔ ''علماء کی یادوں'' کے کام کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اور شبانہ روز محنت سے ان بکھری ہوئی یادوں کو ''مجالس علماء'' کا گلدستہ بنا کر سامنے لے آئے انہوں نے بے شمار منتشر اوراق کو جمع کیا، خزاں دیدہ تحریروں کو مرتب کیا اور ازیاد رفتہ باتوں کو اکٹھا کر کے ایک خوبصورت کتاب مرتب کر دی اس طرح انہوں نے ذروں کو اٹھا کر آفتاب بنا دیا، پتوں کو جمع کر کے گلستان بنا دیا۔ قطروں کو یکجا کر کے دریا بنا دیا۔ بکھری ہوئی سطروں کو ترتیب دے کر دفتر بنا دیا۔

؎ ستارہ می شکند آفتاب می سازند

میں ذاتی طور پر سردار محمد اکرم بٹر اور محمد عالم مختار حق کی کاوشوں کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے میری یادوں کو سمیٹنے میں بڑا کام کیا۔ پھر ان یادوں کو قارئین تک پہنچانے میں دن رات ایک کر دیا۔

حضرات محترم! مجھے زندگی بھر علمائے کرام کی مجالس میں بیٹھنے کا موقع ملا ہے ان کی قربت نے مجھے بہت کچھ دیا۔ ان کی گفتگو کے موتی میری یادداشتوں کے دامن میں جمع ہوتے رہے۔ میں اکثر علماء کرام کی مجالس میں ایک طالب علم کی حیثیت سے

جاتا تو وہ مجھے سرفراز فرماتے۔ میں ان کی تقریریں سننے جاتا۔ تو وہ مجھے اپنے پاس بٹھاتے۔ میں ان سے باتیں کرنے جاتا تو میری باتوں کو توجہ سے سنتے۔ علماء کرام سے ہٹ کر مجھے اولیاء اللہ اور مشائخ کی مجالس میں حاضری کا موقع ملا۔ اہل دل کی صحبت میں بیٹھا۔ کاملین وقت کے حضور گیا تو مجھے قربت ملی۔ میں جہاں گیا۔ مجھے عزت ملی۔ محبت ملی۔ پیار ملا۔

من بہر جمعیتے شاداں شدم   جُفت خوش بختاں و خوش حالاں شدم

جب میں طالب علم تھا تو سیپارۂ دل لے کر چٹائیوں پر بیٹھتا تھا۔ جب میں درویش بنا تو ان درویشوں سے محبت کرنے لگا۔ جنہیں ''حُب درویشاں کلید جنت است'' کا درجہ حاصل تھا۔ کتابوں کا مطالعہ کرنے لگا۔ تو رومی، جامی، سعدی، بلبلِ شیراز کے باغوں میں جا پہنچا۔ وہ میری زباں سے اپنا کلام سنتے، تو مسکرا دیتے۔ درویشوں کی صفوں سے باہر نکلا تو کالجوں، یونیورسٹیوں لاء کالجوں، امیروں، وزیروں، ایوانو درباروں میں جگہ ملی۔ جہاں گیا۔ اہل محبت نے نوازا۔ افسر بنا تو لوگ سَر سَر کرنے لگے۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھا تو وکلا جھک کر سلام کرتے۔ کارخانہ دار ٹریڈرز۔ بزنس مین اور دولت مند دعوتوں میں بلاتے اور عزت دیتے۔ مگر میں نے ساری زندگی درویشوں استادوں، بزرگوں، علماء اور مشائخ کی ثناخوانی میں گزاری۔

کروں مدح اہلِ دول رضا پڑے اس بلا میں میری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا، میرا دین پارۂ ناں نہیں

مجھے اپنے کریم کی گدائی نے بہت کچھ دیا اور پارۂ نان کے لئے دولت مندوں کا محتاج نہیں کیا۔

زیرِ نظر کتاب علماء کرام کی یادوں کا ایک مرقع ہے جسے ''مجالس علماء'' کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے یہ علماء کرام کا تذکرہ نہیں، سوانحی حالات نہیں، یہ ان خوشگوار یادوں کے پھول ہیں جو میری یادوں کے دامن میں محفوظ رہے یہ میری یادوں کے

کشکول کے وہ ٹکڑے ہیں جو ساری عمر کی گدائی میں اکٹھے کیے۔

کاسۂ چشم لے کے چوں مجنوں
ہم نے بس ''حسن'' کی گدائی کی

کتاب کے قارئین یقیناً میری یادوں کی فردگزاشتوں کو نظر انداز کریں گے وہ کئی علماء کے ذکر میں تشنگی محسوس کریں گے اور اس کتاب میں اپنا ذکر نہ ہونے کی کمی محسوس کریں گے۔ مگر با این ہمہ وہ جب اپنے محبوب علماء کی لطیف یادیں شیریں حکایتیں اور میٹھی میٹھی باتیں پڑھیں گے تو خوش ہو کر داد دیں گے۔

چہ خوش گفتی، چہ دُر سُفتی زبانی
حکایت ہائے با شیریں زبانی

مجھے شکریہ ادا کرنا ہے سردار محمد اکرم بٹر ایڈووکیٹ کا جنہوں نے اس باغ کی کیاریاں تیار کیں مجھے ہدیہ تبریک پیش کرنا ہے اپنے یارِ مہربان، قدرداں محمد عالم مختار حق کو جنہوں نے ان کیاریوں کو گلستان بنا دیا۔ مجھے ممنون ہونا ہے ان ایک سو ایک ''رجال الغیب'' کا جنہوں نے علماء کی یادوں کو کتابی شکل میں لانے پر آمادہ کیا۔ مجھے ہدیہ نیاز پیش کرنا ہے ایک ہزار ''قارئینِ جہان رضا'' کا جو ''مجالس علماء'' کی طباعت کی راہوں میں ایک عرصہ سے دیدۂ شوق فرشِ راہ کیے ہوئے ہیں۔

--------❁--------

تمہیدی باتیں

محمد عالم مختارحق

یادگار زمانہ ہیں ''یہ'' لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں ''یہ'' لوگ

محترم پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب سے راقم کے مراسم کا دائرہ کم و بیش گزشتہ نصف صدی پر محیط ہے۔

''یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں''

اور بتائید ایزدی اس طویل عرصۂ رفاقت میں کسی قسم کی شکر رنجی پیدا نہیں ہوئی جس سے ہمارا رشتۂ مودت تعطل کا شکار ہو جاتا۔ فللہِ الحمد۔

اس طویل عرصے میں مجھے ان کی متنوع موضوعات پر تحریریں مطالعہ کرنے کا موقع ملتا رہا اور میں ان کے منفرد اور یگانہ اندازِ تحریر سے اتنا متاثر ہوا کہ ان تحریرات کو محفوظ کرنے کا ارادہ کر لیا جس سے مصنفِ علام کو بھی آگاہ کر دیا گیا جس کا مثبت نتیجہ برآمد ہوا اور آپ میری حوصلہ افزائی کے پیشِ نظر اپنی تحریروں کی نقول بھی وقتاً فوقتاً مہیا کرتے رہے۔ نتیجۂ ان کی نگارشات کا ایک وافر ذخیرہ میرے پاس جمع ہو گیا۔ تب موصوف کی اشیرباد و خواہش کے پیشِ نظر مذکورہ مقالات مختلف موضوعات کے تحت مرتب کر کے انہیں منصۂ شہود پر لانے کا پروگرام وضع کیا گیا چنانچہ ان مرتبات میں سے ''فکرِ فاروقی'' (ماہنامہ ''جہانِ رضا'' لاہور کے اداریوں کا مجموعہ) اشاعت پذیر ہو چکی ہے جب کہ کتابِ حاضر ''مجالسِ علماء'' پیشِ خدمت ہے۔ اس کے متعاقب

آپ کی ''معبرِ محبت کی یادیں'' بازار میں آنے والی ہے جب کہ موصوف کی متفرق تحریریں ''نگارشاتِ فاروقی'' کے عنوان سے زیرِ تسوید ہیں۔

حضراتِ گرامی! موجودہ تذکرہ باقاعدہ علمائے کرام کا تذکرہ نہیں ہے اور نہ ہی اسے تاریخی نقطۂ نظر سے مرتب کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس میں تاریخیت تلاش کرنا کارِ بے سود ہو گا۔ فہرستِ مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے آپ پر عیاں ہو جائے گا کہ ان میں سے بیشتر مضامین میں ان علمائے کرام کی منتشر یادوں کو تازہ کیا گیا ہے جو موصوف کے ہم عصر رہے اور آپ کو ان کی مجالس و محافل میں باریابی کے مواقع نصیب ہوتے رہے۔ آپ نے ان کی مجالس سے بھرپور استفادہ و استفاضہ کیا۔ ان کے ارشادات و ملفوظات اور تقریروں کی جزئیات تک ان کے نہاں خانۂ دماغ میں محفوظ ہیں۔ ع

غالب ایسے گنج کوشایاں یہی ویرانہ تھا

جہاں تک راقم الحروف کی کتابی معلومات کا تعلق ہے اس کی بنا پر یہ جسارت کرنے میں حق بجانب ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ اردو زبان میں اس قسم کا مشاہداتی تذکرہ اس کی نظر سے نہیں گزرا جس میں بے تکلف انداز میں علمائے کرام سے ملاقاتوں اور ان کی مجالس میں ہونے والی گفتگو کو من و عن انہی کے انداز اور لب و لہجہ میں بیان کیا گیا ہو۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آیئے بطور مشتے نمونہ از خروارے کتابِ حاضر کے تین مضامین (i) لاہور کے خطیبوں کی رونقیں (ii) اہلِ علم و فضل کی لطیف یادیں اور (iii) علماء کرام کی یادیں —— مجلسی لطائف کی روشنی میں مطالعہ فرمائیں جو میرے اس دعویٰ کی دلیل کے لیے بس ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ بلا ریب ایک بدیع النظیر تذکرہ کی حیثیت رکھتا ہے اور موصوف کا یہ شرف اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کوئی صاحبِ کمال اس سے بڑھ کر کوئی تذکراتی کاوش اہلِ علم کے سامنے نہیں لاتا۔

تذکرۂ ہذا صرف علمائے کرام کے تذکار پر ہی مشتمل نہیں بلکہ اس میں آپ کو

تخلیقِ پاکستان کے وقت کی سیاسی قوتوں کی کارستانیوں سے بھی آگہی حاصل ہوگی۔ بالخصوص اس مجموعہ کا مضمون ''لاہور کے جلسوں پر ایک نظر'' تو مصنف کی مشاہداتی رپورٹ ہے۔ جسے سیاسی وملی تحریکوں کی دستاویز کہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔

قارئینِ گرامی قدر! آپ کو دورانِ مطالعہ بعض علمائے کرام کے حالات ایک سے زائد مرتبہ نظر نواز ہوں گے مگر جیسا کہ پیشتر ازیں گزرا، یہ کوئی مربوط تذکرہ نہیں بلکہ مختلف عنوانات کے تحت علمائے کرام کی یادوں کو ترتیب دیا گیا ہے، اس لیے ان کے اسماء بھی بار بار زیبِ قرطاس ہوئے ہیں جس کی تصریح کے لیے مندرجہ ذیل علمائے کرام کا انتخاب کیا گیا ہے۔

مولانا نعیم الدین مرادآبادی:

ان کا ذکر پہلے فروری ۱۹۹۲ء کے جہانِ رضا کے شمارہ میں ''جہانِ رضا کے گلہائے خوش رنگ'' کے عنوان کے تحت فاضل بریلوی اعلیٰ حضرت کے اپنے اشعار کی روشنی میں سوانحی انداز میں کیا گیا ہے جب کہ باردگر ''علمائے کرام کی یادیں'' (جہانِ رضا شمارہ اکتوبر ۱۹۹۴ء) میں ان کا ذکر مسجد وزیر خاں میں منعقد ۱۹۳۹ء کے ایک جلسے میں تقریر کرنے کے سلسلے میں آیا ہے اور بتایا ہے کہ صدر الافاضل کی آواز میں سوز بھی تھا اور عالمانہ گرج بھی۔

امانت علی چشتی:

''لاہور کی علمی شخصیات'' (جہانِ رضا مئی ۱۹۹۴ء) کے زیرِ عنوان جیسا کہ ظاہر ہے، صرف لاہور کے علمائے کرام کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ موصوف مثنوی مولانا روم کو خاص انداز میں بیان کرتے اور فلسفۂ وحدت الوجود کو آسان انداز میں سامنے لاتے۔ ان کی آواز میں رومی بولتا اور ابن عربی باتیں کرتا تھا۔ یہ مصنف کے مشاہدہ کی بات ہے۔ پھر اپریل ۱۹۹۵ء کے شمارہ میں ''لاہور کے خطیبوں کی رونقیں'' میں ان کا

ذکر اشارۃً ملتا ہے۔

میاں جمیل احمد شرقپوری مدظلہ:

''لاہور کی علمی شخصیات'' (جہانِ رضا مئی ۱۹۹۴ء) کے عنوان کے تحت آپ کا ذکرِ خیر ہے۔ آپ کا تعلق اگر چہ شرقپور شریف کے روحانی خانوادہ سے ہے مگر اس جگہ ان کا ذکر اس دور کا ہے جب میاں صاحب شاد باغ لاہور میں اپنا مکان تعمیر کر رہے تھے اور یوں ان کا لاہور میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی کے سلسلۂ طریقت اور ان کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے آپ کی مساعی جمیلہ کا ذکر کیا ہے جبکہ (اگست ستمبر ۲۰۰۴ء) کے شمارہ میں ''تحریک نفاذِ نظام مصطفیٰ'' میں میاں صاحب کی کوششوں اور قلمی کاوشوں سے روشناس کرایا ہے اور تان اپنے اس شعر پر توڑی ہے:

چلے تو راہِ طریقت کا شہسوار لگے
رکے تو شیرِ ربانی کا شاہکار لگے

مولانا غلام محمد ترنم:

آپ کا ذکرِ خیر چار مرتبہ ملتا ہے۔ مئی ۱۹۹۴ء کے جہانِ رضا میں ''لاہور کی علمی شخصیات'' میں، پھر اپریل ۱۹۹۵ء کے شمارہ میں وہ ''لاہور کے خطیبوں کی رونقیں'' میں دکھائی دیتے ہیں۔ پھر جون جولائی ۲۰۰۳ء کے شمارہ میں ان کے شاہدرہ ٹاؤن کے خطاب کی یاد تازہ کی ہے جب انہیں خطاب کے بعد منتظمین بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے گئے اور چوتھی مرتبہ ''علمائے کرام کی یادیں'' (شمارہ ستمبر اکتوبر ۱۹۹۵ء) میں شاہدرہ ٹاؤن والے واقعہ کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے مگر بہ اندازِ دگر۔

صوفی غلام حسین گوجروی:

''یادوں کے چراغ'' (جہانِ رضا ۱۹۹۴ء) میں ان کے تعلیمی دور کی یادیں تازہ

کی ہیں جب کہ دوسری مرتبہ اگست ۱۹۹۵ء کے شمارہ میں ''بابا نور کی محفلِ نعت خوانی میں راقب قصوری کی نعتیں پڑھتا دکھایا گیا ہے جب کہ آخری مرتبہ اپریل ۱۹۹۷ء کے شمارہ میں مولوی نبی بخش حلوائی نقشبندی کے تلامذہ میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا محمد بخش مسلم:

اپریل ۱۹۹۵ء کے جہانِ رضا کے شمارہ میں ''لاہور میں خطیبوں کی رونقیں'' میں تحریک پاکستان کے سلسلے میں آپ کی پنجابی تقاریر کا ذکر ملتا ہے۔ پھر جنوری فروری ۱۹۹۶ء کے شمارہ میں ''دارالعلوم نعمانیہ کے علمائے کرام'' کے سلسلے میں آپ کے انجمن نعمانیہ میں زیرِ تعلیم رہنے کا ذکر کیا ہے۔ پھر ''علمائے کرام کی یادیں'' میں ان کے ہارون آباد (بہاولپور) کے سفر کا دلچسپ انداز میں تذکرہ ملتا ہے جہاں آپ ۱۴ میل کا سفر پیدل طے کر کے پہنچتے ہیں۔ اس سفر میں مصنف کے علاوہ استاد عشق لہر بھی آپ کے ہم رکاب تھے۔ منتظمین نے اس قافلہ کو بعداز اختتام جلسہ اللہ حافظ جزاک اللہ کہہ کر ٹال دیا تھا۔ آخر میں ان کا مستقل ذکر ''تحریکِ پاکستان کا ایک جان نثار سپاہی —— مولانا محمد بخش مسلم'' کے عنوان سے موصوف کے قلم سے روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۲۹ مئی ۲۰۰۲ء کی زینت بنا۔

مفتی محمد حسین نعیمی:

پہلے آپ ''لاہور کے خطیبوں کی رونقیں'' (جہانِ رضا اپریل ۱۹۹۵ء) میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ پھر اپریل مئی ۱۹۹۸ء کے شمارہ میں ''کاروانِ علم وفضل کی عالمِ بقا کو روانگی'' میں ان کا نام شامل ہے۔ پھر ان کا ذکر ''علمائے کرام کی یادیں —— مجلسی لطائف کی روشنی میں'' (شمارہ جون جولائی ۲۰۰۳ء) میں جامعہ نعیمیہ میں جلسوں کے اہتمام کے حوالے سے دلچسپ پیرائے میں ملتا ہے جب کہ ''لاہور کے علمائے کرام کی یادیں'' میں موصوف کے سیاسی کردار اور اس سلسلے میں پیش آمدہ کٹھنائیوں کا ذکر

ملاحظہ ہو۔ (شمارہ اپریل ۱۹۹۴ء)

مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں مدظلہ:

ان کے حالات دلچسپ پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ ہارون آباد (بہاولپور) کے نواحی علاقے میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے مولانا بشیر صاحب کی مطالبہ کے حصول کے لیے ان کے حُسنِ طلب کی مخترعہ حکایت چٹخارے لے لے کر بیان کی ہے۔ آیئے۔ جہانِ رضا کے دسمبر ۲۰۰۳ء کے شمارہ میں ''علمائے کرام کی لطیف باتیں'' مطالعہ فرما کر اس واقعہ سے کماحقہ لطف اندوز ہوں۔ مارچ ۱۹۹۶ء کے شمارہ میں بعنوان ''علمائے کرام کی یادیں اور اہلِ علم وفضل کی لطیف باتیں'' میں ان کے سیاسی رنگ کو اجاگر کیا ہے اور بے پردگی کے سلسلے میں بیگم رعنا لیاقت علی خاں کے جس انداز میں لتے لیے، انہی کو زیب دیتا تھا۔

مولانا شاہ احمد نورانی:

ماہنامہ ''احوال'' کراچی (دسمبر ۱۹۹۱ء) کے شمارہ میں آپ کے سیاسی کردار پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے اور انہیں پاکستانی سیاستدانوں میں ایک پارس کی حیثیت سے پیش کیا ہے جب کہ ''جہانِ رضا'' جنوری ۲۰۰۴ء میں آپ کے غیر سیاسی شب وروز کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مولانا نبی بخش حلوائی:

مصنف اپنے استادِ محترم کا ذکر کسی نہ کسی عنوان زیبِ قلم وقرطاس کرتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی مجملاً کبھی تفصیلاً۔ اپریل ۱۹۹۷ء کے جہانِ رضا کے شمارہ میں آپ کے مفصل حالات مع حالات تلامذہ، جس میں مصنف علام نے ان کے تلمیذ ہونے کے حوالے سے اپنے حالات بھی قلمبند کیے ہیں۔ پھر ان کا ذکر ''لاہور کی چھوٹی گلیوں کے بڑے علماء'' (شمارہ فروری مارچ ۲۰۰۴ء) میں کیا ہے جب کہ جنوری

۲۰۰۵ء کے شمارہ میں بعنوان ''حضرت مولانا نبی بخش حلوائی'' آپ کے حالات اختصاراً قلمبند کیے ہیں جسے ہم اپریل ۱۹۹۷ء والے مضمون کا اختصار کہہ سکتے ہیں۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری:

ان کے سوانح حیات اگست ۱۹۹۷ء کے جہانِ رضا میں پیش کیے ہیں جب کہ نومبر دسمبر ۲۰۰۱ء کے شمارہ میں ان کی اعتقادی وفکری خدمات، افکارِ رضا کی روشنی میں پیش کی گئی ہیں۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ علمائے کرام کی یادیں جہانِ رضا میں طباعت کے حوالے سے تاریخ وار پیش کی جائیں مگر آخری تین مضامین بر وقت دستیاب نہ ہونے کے سبب یکسانیت قائم نہیں رہ سکی۔ تاہم چونکہ ہر مضمون اپنی جگہ مکمل اور دوسرے کا محتاج نہیں، اس لیے اسے جہاں بھی جگہ مل گئی، محفوظ کر دیا گیا۔ فہوالمراد۔

قارئینِ کرام! بعض عنوانات آپ کو کتاب کے نفسِ مضمون سے متعارض نظر آئیں گے جیسے:

1- ایک نورانی محفل کا تذکرہ (بابا نوری کی مجلسِ نعت۔ ''جہانِ رضا'' اگست ۱۹۹۵ء)
2- بھاٹی دروازہ —— لاہور کا علمی خیابان (''جہانِ رضا'' اپریل مئی ۲۰۰۲ء)
3- مرکزی مجلسِ رضا کے ننھے منے مجلسی (پانچ اقساط جہانِ رضا فروری تا اگست ۲۰۰۲ء)

مگر بادی النظر میں ان سب کی نسبت کسی نہ کسی طرز سے علمائے کرام سے جا ملتی ہے۔ نورانی محفل گو نعت خوان حضرات نے سجائی ہے مگر اس طبقہ کا تعلق علمائے کرام سے یوں بنتا ہے کہ اُن کی کوئی مجلس ان حضرات کی شرکت کے بغیر شرمندۂ تکمیل نہیں ہو پاتی۔ اور پھر یہ کہ بعض متشرع نعت خوان علمائے کرام کی بعض مواقع پر ان کی عدم موجودگی میں ان کی نمایندگی کا فریضہ بھی ادا کر دیتے ہیں۔ جہاں تک بھاٹی دروازہ کے علمی خیابان کا تعلق ہے، اس مضمون میں قارئین کرام کو ہر طبقۂ زیست کے افراد سے واسطہ پڑے گا جن میں علما، ادبا، شعرا، حکما، امرا، وزرا بھی شامل ہیں۔ ان میں وہ لوگ

بھی شامل ہیں جو عرفِ عام میں عالم تو نہیں مگر عالم گر ضرور ہیں۔ لہٰذا جب ذکر ایک مخصوص علاقے کا ہوگا، اس میں تمام طبقات کو نمایندگی دینا پڑے گی جس کے بغیر اس علاقے کا تذکرہ نامکمل رہے گا۔ اسی طرح ایک عنوان ''مرکزی مجلس رضا کے ننھے منے مجلسی'' پانچ اقساط میں شائع ہوا ہے۔ اس کے ڈانڈے بھی لاہور کے علمی خیابان سے جا ملتے ہیں کیونکہ ان مجلسوں میں جہاں علمائے کرام یا مشائخ عظام شرکت کرتے نظر آتے ہیں، وہاں طلبہ، مدیرانِ جرائد اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے وابستہ حضرات بھی شریکِ محفل ہوتے ہیں جنھیں نظر انداز کرنا دیانتداری کے خلاف تھا۔ لہٰذا آپ بھی انہیں اسی جذبہ سے برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔

ان توضیحات کے بعد خوانندگان گرامی قدر کو دعوتِ مطالعہ دی جاتی ہے کہ وہ آئیں اور علمائے کرام کی یادوں کے مطالعہ سے لطف اندوز ہوں۔ تو آیئے۔

دل افگندیم بسم اللہ مجرہا و مرسٰہا

--------❁--------

جرسِ کارواں

سردار محمد اکرم بُٹر، ایم-اے (سیاسیات، اسلامیات، اردو)

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمیِ محفل نہیں ہے

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

(اقبال)

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ موصوف وطنِ عزیز اور دیارِ غیر میں بسنے والے علمی، ادبی حلقوں میں ایک معتبر نام سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کی زندگی ایک ہشت پہلو ہیرے کی مانند ہے جسے جس سمت سے بھی دیکھیں نور کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ آپ ایک انفرادی شخصیت کے مالک ہیں جس محفل میں بھی بیٹھے ہوں پھولوں کی کیاریاں مہک اٹھتی ہیں۔

علامہ فاروقی صاحب بلند پایہ مصنف، مایۂ ناز مترجم، قابلِ فخر مقالہ نگار، باصلاحیت مدبر اور سب سے بڑھ کر ایک بیدار مغز سیاستدان ہیں۔ آپ نے ہمیشہ قومی، ملی، دینی اور فکری محاذ پر قوم کی رہنمائی کا فریضہ احسن طریقہ سے ادا کیا۔

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب ایک صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت سے بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ آپ کی تحریر کے چھوٹے چھوٹے جملے اور اچھوتا انداز قاری کو کبھی بوریت محسوس نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ قاری آپ کی شگفتہ تحریر اور ہلکی

[illegible] طنز و مزاح سے بھرپور لطف اٹھاتا ہے۔

محترم فاروقی صاحب سے شناسائی کا دور تو ۱۹۸۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ مگر باقاعدہ ملاقاتیں اور قربِ محبت کا شرف ۱۹۹۸ء کے بعد ملا۔

میں نے سُنی طلبہ کی نمائندہ تنظیم ATI سے فارغ ہو کر ۱۹۸۶ء میں ''جمعیت علماء پاکستان'' کی رکنیت حاصل کی تو اکابر علماء و مشائخ سے روابط کا دور شروع ہوا۔ ان دنوں پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب بھی قائدِ اہل سنت علامہ شاہ احمد نورانی کی زیرِ قیادت سیاسی میدان میں قدم رکھ چکے تھے۔ اُن دنوں داتا گنج بخش روڈ پر علامہ انوارالاسلام رضوی (م ۱۹۹۸-۲-۱۸) رحمۃ اللہ علیہ کا ''مکتبہ حامدیہ'' جمعیت علماء پاکستان، جماعت اہل سنت اور سنی علماء و مشائخ کا مرکز ہوتا تھا۔

''مکتبہ حامدیہ'' کو بعض احباب نے ''آستانہ عالیہ کھڈا شریف'' کہنا شروع کیا تو یہ نام مقبولِ عام حیثیت اختیار کر گیا۔ میں بھی کتابوں اور رسائل کی جستجو اور اکابر علماء سے ملاقات کا شوق لے کر اکثر اوقات ''مکتبہ حامدیہ'' پر جاتا اور پھر فاروقی صاحب کے ''مکتبہ نبویہ'' پر بھی چند منٹ رک کر رسائل کی ورق گردانی کرتا تھا۔

حضرت فاروقی صاحب اکثر اپنے مکتبہ نبویہ میں علماء کرام اور دینی سکالرز کی محفل سجائے رکھنے کے عادی تھے جبکہ کاؤنٹر پر آپ کے رفیقِ کار مشہور صوفی بزرگ حضرت علامہ باغ علی نسیم رحمۃ اللہ علیہ نظر آتے اور میں نے کبھی بھی فاروقی صاحب سے ملنے کی کوشش نہ کی تھی۔ مگر مولانا انوارالاسلام رضوی کے انتقال کے بعد مجھے بھی حضرت فاروقی صاحب کا قرب حاصل ہوا۔ آپ نے اتنی محبت اور شفقت سے علمی حوصلہ افزائی اور سیاسی رہنمائی فرمائی کہ آج تک انہی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔

تیری زلفوں کے ہم اسیر ہوئے
تیری گلیوں کے ہم فقیر ہوئے

قائد اہلسنت علامہ الشاہ احمد نورانی کی ہدایت پر ورلڈ اسلامک مشن کا ایک وفد

پیرزادہ اقبال فاروقی صاحب کی قیادت میں برادر اسلامی ملک لیبیا کے سربراہ کرنل معمر قذافی کی دعوت پر طرابلس پہنچا۔ اس وفد میں پچاس افراد تھے۔ اس دورہ کے دوران مجھے اپنے امیر قافلہ کی شخصیت کا قریبی مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

علامہ فاروقی صاحب نے قائد اہل سنت امام الشاہ احمد نورانی کے حکم پر کرنل قذافی کے دیس میں پاکستانی قوم کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔ آپ نے اپنے وطن کی دینی قیادت کا بھرپور تعارف کرایا اور دورہ سے واپسی پر الشاہ احمد نورانی صدیقی نے آپ کو شاباش دی اور آپ کی خیر سگالی کو سراہا۔

فاروقی صاحب کی شخصیت کو نکھارنے میں جن ہستیوں نے حصہ لیا ان میں مفسر قرآن علامہ محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم اہلسنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔ اول الذکر آپ کے استاد تھے جبکہ دوسرے فکری رہنما اور فکر رضا کے ترجمان تھے۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۶۸ء میں فکر رضا کا نور بکھیرنے کے لیے ''مرکزی مجلس رضا'' کی بنیاد رکھی تو فاروقی صاحب بھی اس قافلۂ عشق و مستی میں شامل ہو گئے اور حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رضوی عزم رکھنے والی شخصیت کے زیر سایہ تحقیق و تدقیق کا کام کرتے کرتے خود بھی آسمانِ علم و حکمت کے نیر تاباں بن گئے۔

فاروقی صاحب کی تحریریں علماء و مشائخ کی مسانید اور لائبریریوں کی زینت بننے لگیں تو حلقہ احباب بڑھتا گیا۔ ہم نے دیکھا کہ حکومت پاکستان کا ایک ریٹائرڈ آفیسر علمائے کرام، طبیبوں اور اہلِ دل حضرات کی مجالس میں مشامِ جاں بن کر عطر بیزی کرنے لگا ہے۔ خوابیدہ سُنی بیدار ہونے لگے۔

''مرکزی مجلسِ رضا'' کی جدوجہد سے دنیا بھر میں فکر رضا کی بہاریں آ گئیں۔ جو لوگ کل تک امام احمد رضا کو ایک فتویٰ باز مولوی سے زیادہ درجہ نہیں دیتے تھے وہ اُن کے شیدا ہونے لگے۔ امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کو نشانِ منزل کا مقام مل گیا۔

نفرتوں کے بادل چھٹ گئے، غبار دھلنے لگے اور آپ کی شخصیت نفرت کی تاریکیوں سے نکل کر رونق جاں بن گئی۔

جب پوری دنیا میں ''مجالسِ رضا''، ''رضا اکیڈمیاں''، ''سنی ادارے'' اور ''انجمن ذکرِ رضا'' فکرِ رضا کا مرکز بن گئیں تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے

گونج گونج اٹھے ہیں نغماتِ رضا سے بوستاں

چنانچہ امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر کام کرنے والوں کے لیے ایک ایسے مرکز کی ضرورت محسوس ہونے لگی جو مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے ریسرچ سکالروں کو ایک دوسرے سے شناسا کرائے۔ ایسے حالات میں حضرت فاروقی صاحب آگے بڑھے اور ایک ''جہانِ رضا'' بسا دیا۔ فاصلے سمٹ گئے، رابطے بڑھنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ''ماہنامہ جہانِ رضا'' کی تحریریں ''گلوبل ویلج'' بن کر اطراف و اکناف عالم میں فکرِ رضا کی خوشبوئیں بکھیرنے لگیں۔

فاروقی صاحب کا قلم لکھنے لگا تو رہبر و رہنما بن کر راستوں کا تعین کیا۔ آپ ہمیشہ مصلحت کوشی کے خلاف ڈٹے رہے۔ آپ نے کبھی بھی عیش پسند اور شکم پرست مولویوں اور پیروں کے سامنے ہاتھ نہیں باندھے۔

آج بھی آپ اہل سنت کے باہمی انتشار اور خانقاہی نظام کی بربادی پر نوحہ کناں رہتے ہیں۔ قوم کو ''روشن خیالی'' کے ''اندھیروں'' سے بچانے کے لیے آپ آج بھی میدانِ عمل میں مصروف کار ہیں۔ آپ کی تحریروں نے وقت کے فرعونوں نمرودوں اور ابوجہلوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ باطل پرستوں کے لیے آپ کی تحریریں ''درۂ فاروقی'' کا کام دیتی ہیں۔ بات دور نکل گئی کہاں میں اور کہاں میری اوقات کہ علامہ فاروقی صاحب جیسی شخصیت کے بارے میں لکھوں۔ میں تو بس ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔ جس ہستی کے کمالاتِ علمیہ پر لکھنے والوں میں حضرت ڈاکٹر مختار الدین احمد علی گڑھ، مفکر اسلام علامہ یٰسین

اختر مصباحی دہلی، ادیب ملت علامہ خوشتر نورانی دہلی، مسعودِ ملت ڈاکٹر محمد مسعود احمد کراچی، ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی بریلی شریف، خطیب اعظم علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی کراچی، صاحبزادہ سلیم حماد سجادہ نشین حضرت داتا گنج بخش، ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی، محمد عالم مختار حق پروفیسر محمد اکرم رضا فاضل نوجوان مولانا صلاح الدین سعیدی جیسے حاملان لوح و قلم شامل ہوں وہاں میرا یہاں آفتابوں کے سامنے چراغ جلانے کے مترادف ہے۔

کسی شخصیت کے کردار و عمل کو جانچنے کے لیے اس کے حلقۂ احباب کو دیکھنا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس حوالہ سے بھی علامہ فاروقی کی شخصیت مبلغ اسلام قائد اہلسنّت امام الشاہ احمد نورانی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ القرآن علامہ غلام علی اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ، سید محمد امیر شاہ صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ یکہ توت پشاور، شیخ طریقت میاں جمیل احمد شرقپوری سجادہ نشین دربارِ عالیہ شرق پور شریف، سفیر اسلام ڈاکٹر مظاہر اشرف اشرفی زیب سجادہ شہنشاہ سمنان رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم اور نابغۂ روزگار ہستیوں کے زیرِ داماں دکھائی دیتی ہے۔

علمائے کرام کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ جس میں جناب فاروقی صاحب ہر مجلس کا چراغ نظر آتے ہیں۔ بے شمار علمائے کرام، اساتذہ وقت، خطبائے عصر اور اہلِ علم و فضل کے باغ میں آپ گلِ سرسبد دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت فاروقی صاحب سے محبت کرنے والوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ یہ صفحات اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے میں نے تبرکاً چند اکابر کا ذکر کیا ہے۔

چند برس پہلے میں نے فاروقی صاحب سے عرض کی کہ جہانِ رضا کے اداریوں کو ایک جگہ جمع کرایا جائے تو ایک بہت بڑا علمی ذخیرہ اکٹھا ہو سکتا ہے۔ آپ نے میری تجویز کو پسند کیا اور یہ عظیم کام کرنے کا حکم مجھے ہی فرمایا۔ مگر میں روایتی تساہل کا شکار رہا اور ''انجمن غافلاں'' کی رکنیت سے دستبردار ہونا گوارا نہ کیا۔

برادرم محمد صلاح الدین سعیدی کی کتاب ''باتوں سے خوشبو آئے'' شائع ہوئی تو

میرے جذبات نے انگڑائی لی۔ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم'' کے مصداق ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ بزرگوارم محمد عالم مختارِ حق ''فکرِ فاروقی'' لیے میدان میں کود پڑے۔ میں نے اب ''جہانِ رضا'' کے اداریوں کو ''فکرِ فاروقی'' کی صورت میں مجتمع دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وقت کا گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا میری دسترس سے دور نکل چکا ہے۔ ''رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر'' کا منظر تھا۔ جہانِ رضا کے اداریے جمع کرنے کی سعادت فاروقی صاحب کے دیرینہ رفیقِ کار، ممتاز ادیب اور محقق علامہ محمد عالم مختار حق کے حصہ میں آئی۔ محمد عالم مختار حق صاحب کی کتاب ''فکرِ فاروقی'' نے اہلِ علم و ادب میں تہلکہ مچا دیا۔

چنانچہ میں نے فاروقی صاحب سے گزارش کی کہ میں ''جہانِ رضا'' کے صفحات پر پھیلی ہوئی ''علماء کی یادیں'' مرتب کروں گا تو آپ نے فرمایا کہ دیکھ لو ورنہ پھر کوئی دوسرا امیدان مار لے گا۔ میں نے جہانِ رضا کی فائل کھنگال کر علماء کے تذکارا کٹھے کیے، کمپوزنگ ہوئی، پروف ریڈنگ اور اپنے تئیں کام مکمل کر کے گھر بیٹھ گیا۔ مگر

؎ سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے!

بزرگوار محمد عالم مختارِ حق صاحب نے میری کاوش کو ناکافی پا کر اپنا ہاتھ بڑھایا، اضافے کیے، ترتیب نو دی اور مجھے تسلی دیتے ہوئے فرمانے لگے۔

؎ ہم محبت کو نیا رنگ دیے جاتے ہیں

محترم محمد عالم مختارِ حق صاحب نے ''جہانِ رضا'' کی فائل سے درجنوں علماء کرام کے تذکرے ڈھونڈ نکالے اور میں ''زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد'' کا پیکر بن کر دیکھتا رہ گیا۔ مگر وہ میری انگلی پکڑ کر آگے بڑھتے گئے۔ اور علماء کی یادوں کو یکجا کرتے گئے۔

پھر میں نے سوچا کہ فاروقی صاحب نے اس بڑھاپے کے عالم میں ماضی کو کھنگالا ہے حال پر نظر ڈالی ہے قوم کو روشن مستقبل کا راستہ دکھایا ہے تو ہم کیوں ہمت نہیں کرسکتے۔ آپ جوانوں سے بڑھ کر کام کر رہے ہیں۔ ''مکتبہ نبویہ'' کی نگرانی

''جہانِ رضا'' کی اشاعت و ترسیل، دنیا بھر سے آنے والے خطوط کے جوابات، مختلف اخبارات و جرائد کے لیے مقالہ نگاری، دینی اور سیاسی محافل و مجالس میں شرکت آپ کے معمولات ہیں۔ بقول حبیب جالب

دشت وفا میں آبلہ پا ایک ہم بھی ہیں
سب جا رہے ہیں سایۂ دیوار کی طرف

یہ سب کام وہی کر سکتے ہیں جن کا یقین محکم ہو۔ جو عمل پہ دار و مدار رکھتے ہوں۔ ورنہ اس میدان میں تو بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے اور اسپ قلم دم توڑ دیتا ہے۔

''علماء کرام کی یادوں'' کے حوالے سے جہانِ رضا کی تحریروں سے چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں تا کہ قارئین کرام کو فاروقی صاحب کے دردِ دل کا اندازہ ہو سکے اور وہ جرس کارواں بن کر خواب غفلت میں سوئے ہوئے قافلوں کی بیداری کا سامان کر سکیں۔

ان اقتباسات میں علماء کرام کی ماضی میں خدمات جلیلہ کا تذکرہ بھی ہے اور قافلہ سالاران حال و مستقبل کے لیے راستوں کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

قارئین کے سامنے توصیفی اور تنقیدی تحریروں کا امتزاج پیش کرنے کی کوشش کی ہے، کسی بزرگ کی کسر شان مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ ''پھر کے گلی گلی تباہ ٹھوکریں سب کی کھائیں کیوں''۔ آپ لکھتے ہیں:

''پاکستان میں خطیبوں کی مجالس''

''پاکستان بنا تو اس نظریاتی مملکت میں علمائے کرام نے ایسی خدمات سر انجام دیں جو سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ ان میں دانشور، سکالرز، سخنور اور علماء و خطباء کی ایک نمایاں تعداد تھی جو پاکستان کے مختلف شہروں اور قصبوں میں آ بسی۔ ان سنی علماء میں بڑے بڑے جلیل القدر اور بلند پایہ اہلِ علم و فضل تھے، ان میں مدرس بھی تھے معلم بھی تھے، مفتی بھی تھے اور فقیہ بھی مگر خطباء اور مقررین کا جو طبقہ آیا اس نے

پاکستان کے گوشے گوشے کو روشنیاں بخشیں۔ کراچی، حیدر آباد اور سکھر میں بڑے بڑے شعلہ بیان سُنی آ بسے۔

پنجاب پر ہی نظر ڈالیں تو علامہ احمد سعید شاہ کاظمی ملتان شریف، مولانا عارف اللہ شاہ قادری راولپنڈی، قاری احمد حسن فیروز پوری، گجرات، شیخ الحدیث مولانا سردار احمد فیصل آباد، مفتی ظفر علی نعمانی، سانگلہ ہل، مفتی محمد حسین نعیمی لاہور، مولانا غلام علی اشرفی اوکاڑہ، مفتی اعجاز ولی خاں لاہور اور حافظ مظہر الدین رمداسی، راولپنڈی کے علاوہ بہت سے ایسے خطیب آئے جن سے خیابانِ اہلِ سُنت میں بہار آ گئی۔

(جہانِ رضا جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۴۳)

حضرت سید محمد محدّث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ:

''حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے ۱۹۳۹ء میں ''مرکزی دار العلوم حزب الاحناف'' کے سالانہ جلسہ میں مسجد وزیر خاں لاہور کی شاندار سٹیج پر پہلی بار دیکھا۔ آپ سر پر ''شاہی تاج'' سجائے، گیروا لباس پہنے، تقریر کے آغاز میں خوبصورت منبر پر جلوہ فرما تھے اور خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار ایک عالمِ دین کے سر پر شاہانہ تاج (شہنشاہِ سمنان کا تاج) سجائے دیکھا تو حیرت زدہ ہو گیا۔ حضرت محدّث کچھوچھوی کی آنکھوں کی سرخی اور اُن کے چہرے کا جلال یوں دکھائی دیتا تھا جیسے واقعی ایک زبردست شہنشاہ اپنے وزراء، اور امراء کے حلقہ میں اپنی رعایا کو خطاب کر رہا ہو۔ (جہانِ رضا جلد نمبر ۴ شمارہ نمبر ۳۸-۳۷)

مجاہد ملت مولانا عبد الستار خاں نیازی:

''حضرت مولانا نیازی سے ہماری نیاز مندی کا آغاز پاکستان میں پہلی تحریک ختم نبوت (۵۳-۱۹۵۲ء) کے ہنگاموں سے ہوتا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب لاہور کے گلی کوچوں میں فوجی دندنا رہے تھے اور سارا لاہور فوجیوں کے بوٹوں سے کچلا

جارہا تھا بایں ہمہ کسی فوجی یا سپاہی کو اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ اندرونِ شہر کسی دروازے کے اندر وردی پہن کر داخل ہوسکے۔ سارا قدیم لاہور مولانا عبدالستار خاں نیازی کی کمانڈ میں تھا وہ مسجد ''وزیر خاں'' میں مورچہ سنبھالے بیٹھے تھے جبکہ ملک کے تقریباً تمام نامور علمائے کرام گرفتار ہو چکے تھے۔ تحریکِ ختمِ نبوت کی مجلس عمل کے سارے اراکین جیل میں پابندِ سلاسل تھے۔ مولانا نیازی ان دنوں پنجاب اسمبلی کے رکن تھے۔ انہوں نے پنجاب اسمبلی میں قادیانیوں کے خلاف بھرپور تقریر کی اور حکومت وقت کو مرزائیوں کی اندھی حمایت کرنے پر للکارا۔ اور پھر دوسرے دن مسجد وزیر خاں کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر تحریکِ ختمِ نبوت کی کمانڈ سنبھال لی''۔

(ماہنامہ جہانِ رضا جلد نمبر ١٠ شمارہ نمبر ٩٥)

ایک لطیف مجلسِ وعظ:

''پیپلز پارٹی کے عروج کا زمانہ تھا۔ ملیں قومیائی جا رہی تھیں۔ کارخانوں میں مزدور قابض ہو رہے تھے۔ کارخانوں کے مالکوں کے منہ کالے کر کے ذلیل وخوار کیا جا رہا تھا۔ پیپلز پارٹی کے جیالے جگہ جگہ قبضہ کر رہے تھے۔ لوگ بڑے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ہر طرف ''ہے جمالو'' کے نعرے تھے ''دمادم مست قلندر'' کے بھنگڑے تھے۔ ان کے سامنے کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ جیالوں کے طوفان کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

ایمن آباد کے ایک مولوی نور محمد تھے۔ سنار تھے۔ ان کی آواز میں بڑا درد اور سوز تھا۔ وہ لاہور کے بھاٹی دروازہ کے باہر باغ میں مسندِ وعظ بچھاتے تھے۔ نہایت سریلی آواز میں وعظ کرتے اور شعر سناتے۔ آپ کے مجمع میں عام مردوں کے علاوہ گنجان محلوں میں بسنے والی خواتین آتیں اور آپ کا وعظ سنتیں۔ ان مستورات کو اجازت تھی کہ وہ مجلس وعظ میں بیٹھی بیٹھی گھر کے لیے سبزی تیار کرتی جائیں، سویٹر بنتی جائیں، جرابیں بناتی جائیں، کپڑے سیتی جائیں حتیٰ کہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتی جائیں۔ مگر ''فاضل مقرر'' بلا تردد حضرت جابر کے فرزندوں کا واقعہ، ہرنی کا قصہ اور حضرت بلال

کی کہانی سناتے جاتے اور ہر دل میں اترتے جاتے۔

وہ پیپلز پارٹی کے جیالوں کی لوٹ کھسوٹ سے بڑے تنگ تھے۔ ایک دن راہ چلتے تین جیالے آئے اور کہنے لگے ''لیاؤ مولوی! جو کما کر لایا ہے ہمارے حوالے کر!'' اس طرح مولوی صاحب لٹ گئے۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی بڑے دکھی تھے۔ مگر زبان پر کچھ نہ لا سکتے تھے۔ جیالوں سے ڈرتے تھے۔ اور کہتے تھے ''مجھے شکروں نے لوٹ لیا''۔

وہ ایک دن مجمع میں پنجابی کا یہ شعر بڑی میٹھی آواز میں لاؤڈ سپیکر پر سنا رہے تھے۔

گھگی بیٹھی وچ وظیفے، لٹ کھادا گھر کا نواں
باز عقاب اڈن جس ویلے پُت نہ سانبھن ماواں''

(جہانِ رضا جون، جولائی ٢٠٠٣ء)

لاہور کے علماء کرام:

''قیامِ پاکستان سے کئی سال قبل ١٩٤٣ء میں ایک عالم دین کے صوفیانہ طرزِ بیان نے اہلِ لاہور کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ سید امانت علی شاہ چشتی نظامی تھے۔ وہ مثنوی مولانا روم کو خاص انداز میں بیان کرتے اور فلسفہ ''وحدت الوجود'' کو آسان انداز میں سامنے لاتے۔ ان کی آواز میں ''رومی'' بولتا تھا اور ''ابن عربی'' باتیں کرتا تھا۔ مجھے ان کی تقاریر سننے کا موقع ملا تو دامن دل پھیلا دیا۔ وہ پیر سید نادر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں بیعت تھے اور اپنی خوش بیانی کو انہی کا فیضان بتاتے تھے۔ وہ مسجد ''شاہ کمال گنج''، مغل پورہ لاہور میں خطابت کرتے تھے''۔

دارالارشاد لاہور ویسے تو کئی علماء کرام اور مشائخ عظام کا مرکز تھا مگر تشکیل پاکستان کے بعد ایک نوجوان پیرزادے صاحبزادہ میاں جمیل نقشبندی شرقپوری نے اپنی مسند روحانیت کے بجائے دامن محبت میں جگہ دی، یہ صاحبزادے میاں غلام اللہ ثانی شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ (برادر عزیز میاں شیر محمد شرقپوری علیہ الرحمۃ) کے چھوٹے

بیٹھے ہیں۔(ماہنامہ جہانِ رضا جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۳۲)

مجلس رضا اور علماء کرام کا کردار:

علامہ اقبال احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ:

''آج پاکستان کے عوام کی اعتقادی اور نظریاتی تربیت کی بڑی ضرورت ہے
آج علماء اہل سنت کو روایتی تساہل چھوڑ کر نوجوان نسل کی اعتقادی پرورش کیلئے آگے
بڑھنا چاہیے۔آج کی نوجوان نسل کو بے دینی اور فحاشی کے طوفانوں کا ہی سامنا نہیں وہ
اعتقادی فتنوں کی زد میں بھی ہے...... علماء اہل سنت کا اولین فرض ہے کہ وعظ فروشی،
زکوۃ اندوزی اور امرائے وقت کی مدح سرائی کے مکروہ کاروبار کو چھوڑ کر عوام کی
اعتقادی رہنمائی کریں۔(جہانِ رضا جلد نمبر ا شمارہ نمبر ۳)

قانون دان طبقہ میں سنی علماء کرام پر ایک تاثر:

''پچھلے دنوں ہمیں قانون دانوں کے ایک ایسے پینل کے سامنے ''مرکزی مجلس
رضا'' کی اشاعتی خدمات پر گفتگو کرنے کا موقع ملا جو ملک میں اعتقادی اور نظریاتی
قدروں کو مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں۔ان حضرات نے عوام کی بگڑتی ہوئی اعتقادی
حالت پر بڑے دکھ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا، وہ محسوس کرتے ہیں کہ سنی علماء خود
اپنے عقیدہ پر سختی سے عمل نہیں کرتے اور معمولی سی ترغیب و تحریص پر بدعقیدہ علماء کی
مجالس میں پہنچ جاتے ہیں۔اس طرح ''رواداری'' کے زعم میں ان کی تقریریں سنتے ہیں۔
بعض اوقات ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور اگر نماز کا وقت آجائے تو ان بدعقیدہ
مولویوں کے پیچھے نمازیں خراب کرنے سے بھی نہیں شرماتے۔سنی علماء کرام کا یہ
کردار، یہ رویہ پاکستانی عوام کے اعتماد کو کمزور کر رہا ہے''۔(ماہنامہ جہانِ رضا جلد نمبر ا شمارہ نمبر ۱۱)

دینی وسیاسی جماعتوں کی کشمکش:

''پاکستان کے عام انتخابات کے نتائج کے بعد اسلام دشمن حلقوں نے بڑا شور

مچایا کہ عوام نے دینی جماعتوں کو مسترد کر دیا ہے۔اور اسلام سے بیزاری کا اظہار کیا
ہے۔بے دین طبقوں کی یہ منطق صرف اسلام دشمنی کی بنا پر تھی، ورنہ ان دنوں بہت سی
غیر دینی سیاسی جماعتوں کا بھی برا حشر ہوا ہے۔

پاکستان کے عوام کی اکثریت نظریاتی لحاظ سے اہل سنت و جماعت سے وابستہ
ہے مگر اعتقادی بدنظمی اور نظریاتی ناپختگی کی وجہ سے ملک کی یہ عظیم اکثریت غیروں کے
سیاسی محلات میں ''شمع انجمن'' بن کر اپنی صلاحیتوں کو ''نثار رہ غیرے کردم'' کی تعبیر
بن گئی ہے۔اس عظیم جماعت کے رہنما اپنا مقام کھو چکے ہیں۔اس پاکیزہ جماعت
کے اکثر علماء و مشائخ غیروں کی چوکھٹ کے دریوزہ گر بن کر رہ گئے ہیں۔اکثر
باصلاحیت افراد غیروں کے محلات کا پہرہ دے رہے ہیں۔

آج ہمارے ''سیاسی قائد'' کئی گروہوں میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں، آج
ہمارے ''اعتقادی'' رہنما کئی حصوں میں الجھے ہوئے ہیں۔آہ!

؎ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے''

(جہانِ رضا جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۲۹)

اہل دل کے کارواں کن وادیوں میں کھو گئے:

''جہاں خانقاہیں تھیں وہاں بارگاہیں بن گئیں۔اہل خانقاہ گئے تو ''سجادہ نشین''
آگئے۔رشد و ہدایت کے دروازے بند ہوئے تو ''فتوحات اور نذرانے'' اکٹھے ہونے
لگے۔اہلِ دل کی محفلیں اجڑیں تو ''دنیاداروں کے ڈیرے'' آباد ہوگئے۔جو پیر سینکڑوں
میل پیدل چل کر خاک نشین مریدوں کی تربیت کیا کرتے تھے آج ان کے صاحبزادے
پجارو گاڑیوں پر بیٹھ کر مریدوں کے سروں پر خاک پھینکتے گزر جاتے ہیں۔ان حالات
میں ''رائے ونڈ'' کے میدان میں لاکھوں لوگ جمع نہ ہوں تو کدھر جائیں۔

شب ہجراں کے جاگنے والو
کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی

رہ گئی بات کٹ گئی شب ہجر
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی؟

(جہان رضا جلد نمبر ۴ شمارہ نمبر ۴۰)

کیا پاکستان کے سنی متحد نہیں ہو سکتے؟:

''پچھلے ماہ سنیوں نے اپنی افرادی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لیے لاہور کو اپنے نمائشی اجتماعات سے سرفراز کیا، جماعت اہل سنت نے مینارِ پاکستان کے سایہ میں ''سنی کانفرنس'' کا اہتمام کر کے عظیم الشان اجتماع کا انتظام کیا۔ سنی کانفرنس کے چند روز آگے پیچھے ملتان کی سرزمین نے ''دعوت اسلامی'' کا حد نگاہ تک پھیلا ہوا ''سنتوں بھرا سر سبز باغ'' کے اجتماع کا نظارہ کیا۔ چند روز بعد ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی آواز (کال) پر پنجاب بھر کے سنیوں نے ایک عظیم الشان ''ریلی'' کا اہتمام کیا۔ چند دن بعد ''جمعیت علماء پاکستان'' نے اپنے قائد، شاہ احمد نورانی صاحب کی قیادت میں موچی دروازہ کے باغ میں ''نظام مصطفیٰ کانفرنس'' کا بھرپور اہتمام کیا۔ مگر سنیوں کے ان اجتماعات، جلوسوں اور ریلیوں کو دیکھ کر اس وقت بڑا دکھ ہوا جب ہم نے محسوس کیا کہ ہر سنی اجتماع کا رُخ جدا جدا تھا، ہر سنی جلوس کی واپسی علیحدہ علیحدہ تھی، ہر سنی ریلی کا قبلہ جُدا جُدا تھا.....'' (جہان رضا جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۵۹)

دینی القابات وخطابات کا بے جا استعمال:

''تاریخ عالم پر نگاہ ڈالی جائے تو انسانی شرف وفضیلت کو اجاگر کرنے کے لیے القابات وخطابات کا استعمال مختلف ادوار میں ہوتا رہا ہے۔ اور اصل نام کے ساتھ اوصافی اور صفاتی القابات کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے...... مگر جب پاکستان میں علم وفضل کا جنازہ نکل گیا، روحانیت کے چراغ بجھ گئے، خانقاہیں اہل اللہ سے خالی ہوگئیں تو یہاں کے علماء وفضلا، سجادہ نشینوں اور دربار نشینوں نے بڑھ کر ان

[illegible] خطابات پر قبضہ کرلیا جو ان کے آباؤ اجداد کو سجتے تھے۔

[illegible] کی سرزمین میں جب مولانا احمد رضا خاں بریلوی اپنے علم وتقویٰ کی [illegible] ''اعلیٰ حضرت'' کہلائے تو یہ خطاب اتنا پسند کیا گیا اور عام ہوا کہ ہر شخص اپنے پیرو [illegible] ''اعلیٰ حضرت'' کہنے لگا اور اسی طرح کئی صوبائی اور ضلعی سطح کے ''اعلیٰ حضرت'' [illegible] گئے۔

[illegible] مجددی خانقاہوں سے وابستہ حضرات نے اپنے آپ کو ''قیوم پنجم''، [illegible]''، ''قیوم عصر''، ''قیومِ وقت'' اور ''قیوم ملت'' کہلانا شروع کردیا۔ پھر [illegible] کہ مجدد کے لقب کو ''مجددِ زماں''، ''مجدد اہل سنت''، ''مجدد وقت''، [illegible]''، ''مجدد روحانیت'' اور ''مجدد علمیت'' اپنایا جانے لگا۔ مفتی اعظم ہند [illegible] رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد گرامی کے افکار وفتویٰ کو پھیلانے [illegible] کردار ادا کیا۔ اس طرح اعلیٰ حضرت کے شاگردوں نے ''ملک العلماء''، [illegible]'' اور ''صدر الشریعہ'' جیسے خطابات اپنائے۔

[illegible] ہر سنی عالم دین ''مفتی اعظم''، ''مفتی پنجاب''، ''مفتی کراچی''، ''مفتی [illegible] سامنے آتا ہے جیسے مفتی کا خطاب ''مفت'' مل گیا ہو۔ ہر گلی کوچہ میں [illegible]'' نظر آتے ہیں۔ ہر گدی نشین ''زبدۃ العارفین'' ہے۔ آج ہر واعظ [illegible] الواعظین'' ہے اور آج ہر نعت فروش ''حسانِ وقت'' بن گیا ہے''۔

(جہان رضا جلد نمبر ۸ شمارہ نمبر ۷۸)

[illegible] احمد نورانی کے جانشینوں سے:

''[illegible] احمد نورانی دنیا سے رخصت ہوگئے، آج علمائے اہل سنت کا بکھرا ہوا [illegible] کے صحراؤں میں بھٹک رہا ہے۔ اپنا گھر اجڑ گیا تو بیگانوں نے بھی [illegible]۔ جب پتے درخت سے گر جاتے ہیں تو خس وخاشاک کے ڈھیروں [illegible] ہیں، جب اچھے گھروں کے لاڈلے اپنے گھر سے روٹھ کر نکل جاتے ہیں

تو وہ مزاروں کے لنگروں کی روٹیوں پر گزارا کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے قافلہ سے جدا
ہو جاتے ہیں وہ غول بیابانوں کا شکار ہو جاتے ہیں، آج ان علماء کو سیاسی بھیڑیوں نے
چیر پھاڑ دیا۔ جو کبھی جمعیت علماء پاکستان کا لشکر تھا"۔

قائد کی رحلت کے بعد سنیوں کی جواں سال قیادت کے سامنے ایک خالی میدان
تھا جس میں انہوں نے "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا" کا نعرہ لگا کر اپنا کردار ادا
کرنا تھا مگر ہمیں نہایت دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری جواں سال قیادت بھی سست روی
اور انتشار کا شکار رہی۔ آسمان جمعیت کے ٹوٹے ہوئے تارے خدا معلوم کن خلاؤں
میں گم ہو گئے ہیں"۔ (ماہنامہ جہان رضا جلد نمبر ۱۴ شمارہ نمبر ۱۲۲)

قارئین محترم حضرت علامہ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب کی تحریروں سے تلخ
و شیریں اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ کرم فرما یہ کہہ دیں کہ علماء کی یادوں
کی کتاب میں تنقیدی تحریروں کا کیا کام لیکن میں نے یہ سب کچھ اس لیے اکٹھا کیا ہے
کہ فاروقی صاحب کی تحریروں کو ماضی کا رونا ہی نہ سمجھ لیا جائے بلکہ فاروقی صاحب
مستقبل کی راہوں کو روشن کرنے کے لیے جو مشعل ہاتھ میں لے کر چل رہے ہیں اس
کا بھی احساس ہو سکے۔

حضرت فاروقی صاحب کی تحریریں ہر دور کے قاری کے لیے ہیں۔ کیونکہ بقول
شاعر

پھر جمع کر رہا ہوں جگر لخت لخت کو
مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

خیابانِ رضا کے گل ہائے خوش رنگ

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت فاضل بریلوی قدس سرہ کے افکار و نظریات کی ترجمانی
میں برصغیر پاک و ہند کے علمائے کرام نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ بیسویں صدی
عیسوی میں اعلیٰ حضرت کی تالیفات میں سے خاصی تعداد چھپی پھر آپ کے احوال اور
مقامات پر مختلف انداز میں بے پناہ کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم کے سامنے
آئیں۔ ملک کے نامور اہل علم و قلم نے آپ کے تتبع میں شاندار کتابیں لکھ کر
مسلمانوں کے عقائد کی نشوونما و عشق رسول کو اہل ایمان کے دلوں میں زندہ رکھنے میں
مثالی کام کیا۔ اس میدان میں "مرکزی مجلس رضا لاہور" نے عالی جناب حکیم محمد موسیٰ
صاحب امرتسری دامت برکاتہم العالیہ کی نظامت، صدارت اور سرپرستی میں اشاعت
کا جو خصوصی اہتمام ہوا اسے اہل علم و دانش نے ہمیشہ ہدیۂ تحسین پیش کیا ہے۔ مرکزی
مجلس رضا کی کئی سالہ کوششوں سے آج تک سات لاکھ پچاس ہزار سے زائد کتابیں
چھپ کر عوام تک پہنچی ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت و تقسیم نے جہاں اعلیٰ حضرت کے
دینی اور ملی افکار کو عام کیا وہاں ملک کے مایہ ناز اہل علم و قلم کو تازہ ولولہ دیا ہے تاکہ وہ
اپنے علم و فضل کی دولت کو عوام الناس تک پہنچانے کے لیے اپنا کردار ادا کر سکیں۔

الحمد للہ آج خیابان رضا کی بہاریں ہر دل کو معطر اور تر و تازہ کر رہی ہیں برصغیر
پاک و ہند اور اس سے باہر ایسے سیکڑوں اہل قلم پیدا ہو گئے ہیں جو اپنے اپنے انداز
میں کام کر رہے ہیں۔ آج سے ہم "جہان رضا" میں ایسے حضرات کا مختصر تعارف پیش
کرنے کا ایک سلسلہ شروع کر رہے ہیں جو اعلیٰ حضرت کے علوم و افکار کی خوشبوئیں اور
ضیائیں لوگوں تک پہنچانے میں مصروف ہیں۔ یہ سلسلہ "خیابان رضا کے گلہائے خوش

رنگ'' کے عنوان سے ''جہان رضا'' کی تنگ دامانی کی وجہ سے تفصیلی تعارف تو پیش نہیں کر سکے گا باوجودیکہ ہمارے دلوں میں ان کی علمی وسعتوں کا احترام ہے اور ان کی قابل قدر خدمات کا احساس ہے۔ تاہم ہماری یہ کوشش ہوگی کہ خیابان رضا کے ان قلمکاروں سے قارئین ''جہانِ رضا'' کو براہ راست رابطہ حاصل ہو سکے۔

1- حکیم اہلسنّت حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری مدظلہ العالی:

آپ مرکزی مجلس رضا لاہور'' کے بانی ہیں۔ سابقہ بیس سال سے آپ نے مجلس کی مطبوعات کو نہایت ہی منظم طریقے سے ملک میں پھیلایا اور اس کام کے لیے انہوں نے اپنی زندگی کے شب و روز وقف کر دیئے ان کی ان شبانہ روز کوششوں سے ہی ''خیابان رضا'' میں بہار آئی اور آج رنگا رنگ پھول مہکتے نظر آتے ہیں۔ آپ ایک کامل طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز عالم دین، دانشور، قلمکار، ادیب اور اعلیٰ حضرت بریلوی کے عاشق ہیں آپ کی مجالس میں علمی کام کرنے والے، تحقیقی مقالات لکھنے والے، دانشور، عالم فاضل، اور شیوخ طریقت کی آمد و رفت رہتی ہے اور ہر ایک حکیم صاحب کے حسن سلوک سے اپنا اپنا مقام حاصل کرتا ہے۔

2- پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی مدظلہ العالی:

آپ کا قلم فاضل بریلوی کی تعلیمات کو عام کرنے میں دریائے فیضان بن کر رواں دواں ہے۔ آپ نے اعلیٰ حضرت پر بے پناہ کتابیں اور لاتعداد مقالات لکھے ہیں آپ ایک عرصہ سے ''مرکزی مجلس رضا'' کے رفیق قلم و اشاعت رہے ہیں اور مجلس نے آپ کی کئی کتابیں زیور طبع سے آراستہ کر کے تقسیم کی ہیں۔ دنیائے اہلسنّت میں آپ کو ''ماہر رضویات'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آپ کثرت سے اعلیٰ حضرت بریلوی کے مقامات علمیہ کو احاطۂ تحریر میں لانے کے ساتھ ساتھ ان تمام حضرات کی علمی رہنمائی بھی کرتے ہیں جو ''خیابان رضا'' کی مہک کو اپنے قلموں سے پھیلانے میں

معروف ہیں آپ کی تحریریں پاک و ہند کے علاوہ مختلف ممالک کے اہل علم و فضل کی رہنمائی کرتی ہیں۔

3- پروفیسر شاہ فرید الحق صاحب مدظلہ العالی:

آپ اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ قرآن پاک ''کنز الایمان'' کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے ''خیابان رضویت'' میں سرو قد کھڑے ہیں۔ یہ انگریزی ترجمہ ورلڈ اسلامک مشن برطانیہ اور ''دار العلوم امجدیہ کراچی'' کی طرف سے کئی بار چھپا اور ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوا ہے۔ انگریزی شناس طبقہ میں بے حد مقبول ہوا ہے۔ (رابطہ: پروفیسر شاہ فرید الحق صاحب سینئر نائب صدر جمعیت علمائے پاکستان، یونی سنٹر، مال ریجنسی، عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی)

4- سید ریاست علی شاہ صاحب قادری دامت برکاتہم العالیہ:

آپ ''ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی'' کے بانی اور صدر ہیں آپ کی نگرانی میں اس ادارہ نے اعلیٰ حضرت کے مختلف علوم پر بڑی بلند پایہ کتابیں شائع کی ہیں ''رضا کانفرنسوں'' کے انعقاد و انتظام میں آپ کو خصوصی دسترس حاصل ہے اور آپ نے پاکستان کی سوسائٹی کے اونچے طبقے کو اعلیٰ حضرت کے پیغام سے آشنا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے آپ کے اپنے قلم سے بھی فاضل بریلوی کے احوال و مقامات پر بڑے جاندار مقالات سامنے آئے ہیں۔

5- علامہ شمس الحسن شمس صاحب بریلوی مدظلہ العالی:

آپ ''خیابان رضا'' کے سدا بہار پھول ہیں آپ کے قلم نے فاضل بریلوی پر بڑی بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں اور اہل علم و فضل نے انہیں بے حد پسند کیا ہے آپ نے بریلی شریف کی خالص علمی، اعتقادی اور تہذیبی فضا میں پرورش پائی تھی۔ آپ کی تحریروں میں وہی گہرائی اور شگفتگی ملتی ہے جو ابنائے بریلی کا خاصہ ہے اعلیٰ حضرت کے دیوان ''حدائق

بخشش کا ادبی اور تحقیقی جائزہ'' لکھ کر اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری کی وضاحت کی ہے درجنوں کتابوں کے مؤلف، مصنف، مرتب اور مترجم ہیں۔

6-پیر سید محمد فاروق القادری ایم اے مدظلہ العالی:

آپ خانوادۂ بھر چونڈی شریف (سندھ) کے علمی اور روحانی ورثہ کے امین ہیں۔ بلند پایہ ادیب، عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ ''فاضل بریلوی اور امور بدعت'' لکھ کر خیابان رضا کے گل نوبہار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ آپ کے قلم سے تصوف پر بڑی بلند پایہ کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں اور اہل علم و دانش سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہیں (رابطہ: سید فاروق القادری ایم اے۔ خانقاہ شاہ آباد گڑھی اختیار خان۔ تحصیل لیاقت پور۔ ضلع رحیم یار خان)

7-ابوداؤد حضرت مولانا محمد صادق صاحب رضوی مدظلہ العالی:

آپ اہلسنّت کے ممتاز عالم دین، بلند پایہ صحافی، مسلک اعلیٰ حضرت کے عامل، عالم اور ترجمان ہیں۔ ''ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ'' کئی سالوں سے آپ کے قلمی اہتمام میں شائع ہو کر خیابان رضا کی خوشبوئیں بکھیر رہا ہے۔ اعلیٰ حضرت پر اگر آپ کے مقالات جمع کر دیئے جائیں تو ایک دفتر بنے گا اعلیٰ حضرت کی جماعت ''رضائے مصطفیٰ بریلی'' کی نسبت سے ''رضائے مصطفیٰ'' اپنا علم رضویت بلند کیے ہوئے ہے۔ (رابطہ: ماہنامہ رضائے مصطفیٰ، زینت المساجد، گوجرانوالہ)

8-سید وجاہت رسول صاحب قادری مدظلہ العالی:

آپ حبیب بنک لمیٹڈ پاکستان کراچی میں ایک اعلیٰ افسر ہیں۔ ''ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی'' کے مہتمم اور سیکرٹری جنرل ہیں۔ ادارہ کی مطبوعات کو ایک خاص شان سے چھاپتے ہیں۔ ''رضا کانفرنسوں'' کی آب و تاب آپ کے حسن انتظام کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی پر بلند پایہ مقالات لکھ کر خیابان رضا

گوناگوں رنگ پھولوں کے گلدستے میں نمایاں نظر آتے ہیں (رابطہ: ادارہ تحقیقات امام احمد رضا۔ جاپان مینشن۔ تیسری منزل۔ ریگل چوک کراچی)

9- علامہ سید شجاعت علی صاحب قادری مدظلہ العالی:

علمائے اہلسنت میں ممتاز مقام رکھتے ہیں وفاقی شرعی عدالت کے جج رہ چکے ہیں۔ مصنف، معلم، مدرس اور فقیہ کی حیثیت سے اپنا بلند مقام رکھتے ہیں فاضل بریلوی کے فقہی اور علمی مقامات پر بلند پایہ کتابیں لکھیں۔ ان دنوں ''دارالعلوم نعیمیہ'' کراچی کے ناظم اعلیٰ اور صدر مدرس ہیں۔ ''خیابان رضا'' کی مہک سے ان کے دل و دماغ کے غنچے کھلے ہیں۔ جن کی خوشبو دنیائے رضویت کو معطر کرتی رہتی ہے۔

10- حضرت مولانا علامہ عبدالحکیم شاہجہانپوری مدظلہ العالی:

آپ سنی اہل قلم میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں صحاح ستہ کے اردو تراجم کی وجہ سے علمی حلقوں میں معروف ہیں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی پر بڑی بلند پایہ کتابیں لکھیں۔ جو اہل علم و فضل نے پسند کیں۔ وہ اپنی قلمی کاوشوں خصوصاً اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے احوال و مقامات پر تحریروں کی وجہ سے خیابان رضا کے لہلہاتے ہوئے پھول ہیں۔ ان دنوں مجلس امام اعظم لاہور کے صدر ہیں۔

11- مولانا سید نور محمد صاحب قادری مدظلہ العالی:

آپ ایک صاحب بصیرت ادیب ہیں سیاسیات حاضرہ اور تاریخی واقعات پر گہری نظر رکھتے ہیں مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں تو علمی دنیا نے پسند کیں۔ ''اعلیٰ حضرت کی سیاسی بصیرت'' کے قلمی معاون ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے مقامات علمیہ کے مختلف پہلوؤں پر لکھتے رہتے ہیں۔ (''جہان رضا'' نومبر 1991ء)

12- ڈاکٹر پروفیسر مجید اللہ قادری - ایم اے:

آپ ''ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی'' کے انتظامی امور کے سربراہ ہیں۔

''جامعہ کراچی'' کے پروفیسر ہیں۔آپ نے اسی سال ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے ا
حضرت فاضل بریلوی پر مقالہ لکھ کر بورڈ کو پیش کیا ہے اس مقالہ کے علاوہ آپ
فاضل بریلوی پر بہت سے بلند پایہ مقالات لکھ کر دنیائے رضویت میں اپنا نام پیدا کیا
اسی سال آپ کا ایک مقالہ ''فقیہ اسلام بحیثیت عظیم شاعر وادیب'' کے عنوان سے سا
آیا ہے جسے اہلِ علم وفضل نے بیحد پسند کیا ہے اور آپ کی علمی کاوش کی بے پناہ تعریف
کی ہے۔آپ ''ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی'' کی مطبوعاتی ٹیم کے اہم رکن
اور ادارہ کی اکثر مطبوعات آپ کی نگرانی میں چھپتی ہیں۔(رابطہ: پروفیسر مجید اللہ صاحب
قادری ایم اے ادارہ تحقیقات امام احمد رضا۔نشیمن بلڈنگ ریگل چوک، کراچی)

13-پروفیسر محمد ابرار احمد صاحب-ایم اے:

آپ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (اسلام آباد) میں پروفیسر ہیں اور امام احمد رضا
پر ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں آپ نے اعلیٰ حضرت کی کتاب
''فوز مبین دررد حرکت زمین''۔''زمین ساکن ہے'' اور اعلیٰ حضرت کے علم ہیئت، جغرافیہ
اور اراضیات وافلاک پر لکھے گئے رسالوں کا بدقت نظر مطالعہ کر کے اُن بر خود غلط سائنس
دانوں کے تجرباتی دعووں کا رد کیا ہے۔جو زمین کو متحرک قرار دیتے آرہے ہیں پروفیسر
موصوف امام اہلسنّت کے نظریہ کو جو زمین کو ساکن مانتے ہیں، ارضی اور جغرافیائی دلائل
کے ساتھ اپنے بلند پایہ مقالوں میں پیش کر رہے ہیں آپ کی ان کاوشوں سے جہان رضا
کے دانشوروں میں آپ کا نام ماہر علوم ریاضی کی حیثیت سے اجاگر ہوا ہے۔(رابطہ
پروفیسر محمد ابرار احمد ایم اے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی شعبۂ اراضیات اسلام آباد)

14-علامہ محمد احمد صاحب مصباحی جامعہ اشرفیہ مبارک پور (انڈیا):

آپ اپنے علمی اور تحقیقاتی کارناموں کی وجہ سے دنیائے رضویت میں مانے
ہوئے سکالر ہیں آپ اس مجلس علم وتحقیق کے رکن ہیں جو اعلیٰ حضرت کے فتاویٰ رضویہ

اور دوسری غیر مطبوعہ کتابوں کو سامنے لا رہی ہے۔''مبارکپور'' سے فتاویٰ رضویہ کے وہ
حصے زیور طبع سے آراستہ ہو کر دنیائے علم میں پہنچ رہے ہیں جو ستر سال سے گرد وغبار
میں دبے ہوئے تھے دنیائے فقہ آپ کی ان کوششوں سے فاضل بریلوی کی بلند پایہ
کتابوں سے پہلی بار شناسا ہوئی ہے۔پچھلے سال آپ نے ''جد الممتار علیٰ رد المحتار'' پر
ایک بھرپور علمی اور تحقیقی جائزہ شائع کیا تھا جو''حاشیہ شامی'' کے عنوان سے اہل علم وفضل کی
نظروں میں آیا۔آپ کے اکثر بلند پایہ مضامین ''ماہنامہ اشرفیہ'' مبارک پور (انڈیا) میں
چھپتے رہتے ہیں۔(رابطہ: محمد احمد صاحب مصباحی، جامعہ اشرفیہ، مبارکپور، یوپی (انڈیا)

15-مولانا عبد المجتبیٰ رضوی صاحب بنارس (انڈیا):

آپ نے ''تذکرہ مشائخ قادریہ'' لکھ کر دنیائے اہل سنت میں اپنا مقام پیدا کیا
ہے یہ تذکرہ ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی شائع ہوا ہے اور اہل علم نے اسے بیحد
پسند کیا ہے آپ نے خانوادۂ اعلیٰ حضرت بریلوی اور آپ کے مرشد ومشائخ مارہرہ شریف
(انڈیا) کے حالات کو بڑی تحقیق اور تفصیل سے قلمبند کیا ہے پھر فاضل بریلوی کی نسبت
قادریہ کے روحانی احوال ومقامات پر ایک مخصوص پیرائے میں روشنی ڈالی ہے آپ ایک
اور تحقیقی مقالہ ''اعلیٰ حضرت کی شخصیت'' پر لکھ کر ہندو یونیورسٹی بنارس سے ڈاکٹریٹ کر
رہے ہیں۔(رابطہ: مولانا عبد المجتبیٰ ایم اے ہندو یونیورسٹی بنارس انڈیا)

16-پروفیسر سید جمال الدین صاحب-ایم اے نئی دہلی:

آپ اعلیٰ حضرت بریلوی کے روحانی خانوادہ خانقاہ مارہرہ شریف کے چشم وچراغ
ہیں آپ نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی پر مختلف مضامین لکھ کر دنیائے علم وفضل میں
اپنا نام بلند کیا ہے آپ اردو اور انگریزی میں یکساں لکھتے ہیں اور آپ کے مقالات پاکستان
اور ہندوستان کے علاوہ انگلینڈ، ہالینڈ اور جنوبی افریقہ میں بھی چھپ رہے ہیں آپ
نے ہندوستان کے ان اہل علم وسیاست کے نظریات کو اعلیٰ حضرت کے علمی افکار کے

پیمانے میں تولا تو ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ کیونکہ آپ کے دلائل علمی اور سیاسی اعتبار سے اتنے مستحکم تھے کہ ان پر انگلی اٹھانا مشکل تھا جناب سید جمال الدین نے ہندوستان کے سیاسی حضرات کی علمی و سیاسی لغزشوں کو سامنے لا کر اعلیٰ حضرت کے افکار و نظریات کی بلندیوں کو اجاگر کر دیا ہے۔ آپ ایک جواں سال اسکالر ہیں محقق ہیں اور سیاسی بصیرت رکھنے والے صاحب قلم ہیں ہم آپ کو خیابان رضا کے مہکتے ہوئے پھول کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں۔ (رابطہ: سید جمال الدین ایم اے پروفیسر جامعہ ملیہ نئی دہلی انڈیا)

17- مولانا محمد مرید احمد صاحب چشتی مدظلہ العالی:

آپ ایک استاد کی حیثیت سے پاکستان کے ایک غیر معروف علاقے میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ پر تحقیق و تحریر کا کام کر رہے ہیں آپ کے ان علمی کارناموں نے نہ صرف آپ کی شخصیت کو وادی رضویت کے علمی گلزاروں میں نمایاں کیا ہے بلکہ آپ کی تحریروں کی خوشبو نے باغ رضویت کو مہکا دیا ہے۔ آپ کی معروف کتابیں ''خیابان رضا'' اور ''جہان رضا'' بڑی مقبول ہوئیں جسے مرکزی مجلس رضا نے آج سے چند سال پہلے شائع کیا تھا آپ کا رہوارِ قلم آج بھی اس میدان میں رواں دواں ہے اور اعلیٰ حضرت کی ذات سے عقیدت رکھنے والے ہر شخص کی نگاہیں آپ پر اٹھتی ہیں۔ آپ بیس سال سے ''مرکزی مجلس رضا'' کے رفیق قلم و تحریر ہیں آپ بانی مجلس رضا حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری مدظلہ العالی کے علمی ساتھیوں میں صف اول میں بیٹھتے ہیں۔ (رابطہ: محمد مرید احمد چشتی، گورنمنٹ ہائی سکول، چک جانی، تحصیل پنڈ دادن خان، ضلع جہلم)

18- مولانا جلال الدین احمد صاحب رضوی:

آپ علمائے اہل سنت میں ممتاز مقام رکھتے ہیں صاحب علم و قلم ہیں آپ نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ پر بڑا کام کیا اور آپ کی شخصیت پر پُر مغز مقالات

لکھے ''مرکزی مجلس رضا'' کے مستقل رفیق قلم ہیں اعلیٰ حضرت کے نظریات کے ترجمان حضرت شیخ الحدیث مولانا سردار احمد صاحب قادری رضوی رحمۃ اللہ علیہ فیصل آبادی کے حالات پر دو ضخیم جلدیں لکھ چکے ہیں اپنی تدریسی مصروفیات کے باوجود خیابان رضا کی آبیاری میں مصروف رہتے ہیں۔ (رابطہ: مولانا جلال الدین احمد رضوی۔ گورنمنٹ ہائی سکول کھاریاں ضلع گجرات)

(''جہانِ رضا'' دسمبر 1991ء)

قائدِ اہلِ سُنّت الشاہ احمد نورانی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا پاکستانی سیاست دانوں میں پارس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پارس ایک ایسا پتھر ہے۔ جو کسی بھی دھات کو چھو جائے تو اسے سونا بنا دیتا ہے۔ اگر چہ پارس عنقا اور ہما نادر الوجود ہیں۔ مگر آج تک ان کی اہمیت اور افادیت پر کسی نے شبہ نہیں کیا۔ صدیوں سے پارس کی افادیت اور کمال مسلمہ حقیقت رہا ہے۔ ہر زمانہ میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور ہر قوم نے اس کے موثر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

پاکستان کی موجودہ سیاست کے انداز نے ہر رکن اسمبلی کو دولت اندوزی کی ہوس میں مبتلا کر دیا ہے۔ اراکین ذوالاحترام خواہ اسمبلی میں بیٹھے ہوں یا اپنے گھر میں ان کا دماغ دولت کے حصول اور سونا بنانے میں مصروف رہتا ہے۔ اقتدار کی سرگرمیوں کے قریب بیٹھنے والے اور حکمرانوں کے حاشیہ نشین بھی دولت سے ہاتھ رنگنے میں لگے ہوئے ہیں۔ پھر ان کے رشتہ دار، یار باش اور مدح سرا خزانوں کے ڈھیروں، بینکوں کی برانچوں اور زمینوں کے ترقیاتی اداروں کے اردگرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنا اپنا حصہ سمیٹتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف اقتدار سے محروم، حکومت سے دور سیاست داں، اگر چہ عوام کے مسترد راہنما ہیں، انہیں حکومت کی ''سونا سازی'' کی صنعت پر غصہ آتا ہے۔ لوٹ مار پر شور مچاتے ہیں تو ایوان حکومت میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ ''دس فیصد والے'' پچاس فیصد والوں'' کو طعنے دیتے ہیں حالانکہ یہ دونوں کھوٹے سکے ہیں۔ ''پارس ٹریڈنگ'' کے رواج نے ہر ایک کو بکاؤ مال بنا دیا ہے۔ خواہ وہ اس منڈی کے راستہ سے ''خدمتِ خلق'' کے جذبہ سے ہی واپس آ رہا ہو۔ تاہم ''گھوڑوں کی منڈی'' کے دلال ان لوگوں کا بھی پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ جو اس ''تجارت'' میں ملوث نہیں ہیں۔

اس زر اندوزی اور دولت پرستی کے دور میں ''جمعیت علماء پاکستان'' کے صدر شاہ احمد نورانی اور ان کے رفقائے کار اللہ کی حفاظت میں ہیں۔ وہ اپنی غربت و بے سروسامانی پر ناز کرتے ہیں۔ ان کے بدترین دشمن بھی ان پر یہ الزام نہیں لگا سکتے کہ انہوں نے کبھی اصولوں پر سودا کیا ہو۔ پیسہ بنایا ہو۔ یا ''پارس ٹریڈنگ'' میں شرکت کی ہو۔ مولانا شاہ احمد نورانی ایک فقیر بے نوا کی حیثیت سے سیاسی سفر کر رہے ہیں۔ وہ کلمہ حق کہنے سے نہیں رکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جرائم پیشہ لوگ خواہ کتنے ہی دولت مند ہوں کتنے ہی بڑے بڑے محلات میں مقیم ہوں۔ کلمۂ حق سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی کا ایک بیان اقتدار کے متوالوں کی کئی دن کی نیند حرام کر دیتا ہے۔

پچھلے دنوں مولانا شاہ احمد نورانی نے حکومت کے مخالف سیاستدانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ اس وقت کے حکمرانوں کے ہاتھوں عوام کی جو گت بن رہی ہے اسے روکا جا سکے۔ سارے مخالف رہنما تو قریب نہ آ سکے مگر آپ نے دینی رہنماؤں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ لاہور آئے تو جے یو آئی کے مولانا فضل الرحمٰن سے مختصر سی ملاقات کی۔ اس ملاقات میں آپ نے نہایت محتاط الفاظ میں مل کر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ بس اتنی سی بات تھی کہ اقتدار کی کرسیاں ہلنے لگیں اور وزیر اعظم نواز شریف ''بذات شریف'' ''بنفسِ نفیس'' مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے گھر ڈیرہ اسماعیل خان جا پہنچے۔ کان میں کہنے لگے مولانا اتنی بھی بے رخی کیا ہم تو آپ کے نیاز مندوں میں سے ہیں۔ بھلا مولانا نورانی کیا دیں گے؟ ان سے ملاقات کی کیا ضرورت تھی؟ آپ ہمیں ہی حکم کریں جو خدمت ہو پوری ہوگی۔ اللہ کی شان جس وزیر اعظم کے پاس مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے ملنے کا مدتوں سے وقت نہ تھا وہ خود ان کے گھر ایک دور دراز گاؤں میں جا پہنچے۔

جس کی الفت میں، مَیں ساری زندگی روتا رہا
میری قسمت دیکھیے وہ خود میرے گھر آ گئے

یہ عنایت خسروانہ مولانا نورانی کی ایک ملاقات کا نتیجہ تھی۔ مولانا فضل الرحمن کا
اپنا انتخاب ہے کہ وہ سونا لیتے ہیں یا ''پارس'' کے پروگرام کا ساتھ دیتے ہیں۔

شاہ احمد نورانی اور مولانا عبدالستار خاں صاحب نیازی ایک عرصے تک ایک دوسرے سے کبیدہ خاطر رہے۔ علمائے اہلِ سُنّت کی بڑی کوشش رہی کہ یہ دونوں رہنما دوبارہ مل کر کام کریں اور نفاذِ نظامِ مصطفیٰ کی منزل کی طرف آگے بڑھیں۔ عراق پر امریکہ اور اس کے پیادوں نے حملہ کیا تو مولانا نیازی نے نواز حکومت کے وزیر ہوتے ہوئے امریکہ کی جارحیت کے خلاف بیان دیئے۔ اور عراق کے عوام کے حق میں حمایت کا اعلان کیا۔ اس پر آپ وزارت سے نکال دیئے گئے۔ ایک عرصے تک وزیرِ اعظم انہیں دوبارہ وزارت دینے میں ٹال مٹول کرتے رہے۔ مولانا نیازی اور ان کے رفقاء ایک عجیب قسم کے سیاسی خلجان کا شکار تھے۔ وہ سوچتے تھے آخر مولانا نیازی نے کون سا اتنا بڑا جرم کر دیا ہے کہ لیلیٰ وزارت کو ایشیائی معشوق کا وعدہ بنا دیا گیا ہے۔ انہیں دنوں مانچسٹر (انگلینڈ) میں اہلِ سُنّت نے اپنی بڑی جامع مسجد کی تکمیل کے بعد افتتاح کا اعلان کیا۔ اس مسجد کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا عبدالستار خان نیازی مانچسٹر پہنچے تھے۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ آج مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی ہے تو یہ دونوں بزرگ اس افتتاحی تقریب میں بیک وقت شرکت کریں۔ دونوں بزرگوں کو دعوت دی گئی۔ دونوں ایک سفر پر روانہ ہوئے۔ دنیائے سنیت کی آنکھیں اس اجلاس پر لگی ہوئی تھیں کہ اب دونوں سنی رہنما مل کر ایک ہو جائیں گے۔ مختصر سی ملاقات ہوئی ابھی بات نہ ہونے پائی تھی کہ رات برطانیہ میں مقیم پاکستانی ہائی کمشنر کا فون آیا۔ نیازی صاحب آپ کو وزیرِ اعظم پاکستان سے یاد فرما رہے ہیں۔ ان ملاقاتوں کو چھوڑیں اور آ کر قلم دانِ وزارت سنبھالیں۔ مولانا نیازی پاکستان پہنچے تو نواز شریف صاحب نے بلا کر کہا ''مولانا آپ ہمارے بزرگ ہیں!'' ہم آپ کے نیاز مند ہیں۔ اتنی ''بے نیازی'' بھی کیا۔ یہ لیں وزارت اور وزارت بھی امورِ مذہبیہ

کی'' نورانی کی ایک ملاقات کا (پارس) اپنا کام کر چکا تھا۔

بس اِک نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ ''دل'' کا

دولت اندوزی کا زمانہ اور زر پرستی کا دور بڑا اندھیروں میں ڈھنپا ہوا ہوتا ہے۔ لوٹ مار کرنے والے ان اندھیروں میں بڑے خوش خوش فراٹے بھرتے رہتے ہیں۔ مگر اللہ کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ ایسے دور میں اپنی حجت قائم رکھنے کے لیے بعض افراد کو صبر اور ہمت کی دولت عطا کرتا ہے۔ دولت کو جوتے کی نوک پر رکھیں اور عوام کو بتا سکیں کہ دولت کا کھیل وقتی اور ہنگامی ہے۔ عنقریب اندھیرے چھٹیں گے۔ لوٹ مار کرنے والے لوگ آفتابِ سیاست کی کرنوں کی تاب نہیں لا سکیں گے۔ اور ان روشنیوں میں ننگے ہو کر ایوانِ حکومت چھوڑ کر ایسے گمنام کونوں میں جا گھسیں گے جہاں ان کے چہرے پہچاننے والا بھی کوئی نہ ہوگا اور تاریخ ان کے نام حرفِ غلط کی طرح مٹا دے گی۔

مولانا شاہ احمد نورانی بیس سال سے سیاسی میدان میں ایک قد آور راہنما کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ لوٹنے والوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی پاکستان کے عوام کو کہہ دیتے ہیں۔ ''اللہ والو!'' جاگتے رہنا چوروں کی رکھوالی ہے!'' جس حجرے سے نکل کر سیاست میں آئے تھے اسی حجرے میں آج تک مقیم ہیں۔ جس مسجد میں نماز تراویح میں قرآن سنایا کرتے تھے آج بھی اس مسجد میں قرآن سناتے ہیں۔ وہی مکان، وہی مسجد، وہی لباس، وہی عمامہ، وہی پنکا، وہی شب بیداری اور وہی آداب! جس راہنما (خواہ مخالف ہی ہو) سے ملاقات کرتے ہیں اسے سونا بنا دیتے ہیں۔ حکومت اس راہنما کو مناتی ہے۔ اس کی اہمیت کا اعتراف کرتی ہے۔ جس سیاسی جماعت سے سیاسی اتحاد کے لیے قدم بڑھاتے ہیں۔ حکومت اس سیاسی جماعت کو ''پیار کی نگاہ'' سے دیکھنے لگتی ہے۔ یہ مولانا نورانی کی کرامت ہے یا پارس کا کرشمہ ہے؟

مولانا شاہ احمد نورانی نے ملک کی دینی قیادت کو ایک نیا رخ عطا کیا ہے وہ

یہ عنایت خسروانہ مولانا نورانی کی ایک ملاقات کا نتیجہ تھی۔ مولانا فضل الرحمن کا اپنا انتخاب ہے کہ وہ سونا لیتے ہیں یا ''پارس'' کے پروگرام کا ساتھ دیتے ہیں۔

شاہ احمد نورانی اور مولانا عبدالستار خاں صاحب نیازی ایک عرصے تک ایک دوسرے سے کبیدہ خاطر رہے۔ علمائے اہلِ سُنّت کی بڑی کوشش رہی کہ یہ دونوں رہنما دوبارہ مل کر کام کریں اور نفاذِ نظامِ مصطفٰیؐ کی منزل کی طرف آگے بڑھیں۔ عراق پر امریکہ اور اس کے پیادوں نے حملہ کیا تو مولانا نیازی نے نواز حکومت کے وزیر ہوتے ہوئے امریکہ کی جارحیت کے خلاف بیان دیئے۔ اور عراق کے عوام کے حق میں حمایت کا اعلان کیا۔ اس پر آپ وزارت سے نکال دیئے گئے۔ ایک عرصے تک وزیرِ اعظم انہیں دوبارہ وزارت دینے میں ٹال مٹول کرتے رہے۔ مولانا نیازی اور ان کے رفقاء ایک عجیب قسم کے سیاسی خلجان کا شکار تھے۔ وہ سوچتے تھے آخر مولانا نیازی نے کون سا اتنا بڑا جرم کر دیا ہے کہ لیلیٰ وزارت کو ایشیائی معشوق کا وعدہ بنا دیا گیا ہے۔ انہیں دنوں مانچسٹر (انگلینڈ) میں اہلِ سُنّت نے اپنی بڑی جامع مسجد کی تکمیل کے بعد افتتاح کا اعلان کیا۔ اس مسجد کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا عبدالستار خان نیازی مانچسٹر پہنچے تھے۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ آج مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی ہے تو یہ دونوں بزرگ اس افتتاحی تقریب میں بیک وقت شرکت کریں۔ دونوں بزرگوں کو دعوت دی گئی۔ دونوں ایک سفر پر روانہ ہوئے۔ دنیائے سنیت کی آنکھیں اس اجلاس پر لگی ہوئی تھیں کہ اب دونوں سنی رہنما مل کر ایک ہو جائیں گے۔ مختصر سی ملاقات ہوئی ابھی بات نہ ہونے پائی تھی کہ رات برطانیہ میں مقیم پاکستانی ہائی کمشنر کا فون آیا۔ نیازی صاحب آپ کو وزیرِ اعظم پاکستان سے یاد فرما رہے ہیں۔ ان ملاقاتوں کو چھوڑیں اور آ کر قلم دانِ وزارت سنبھالیں۔ مولانا نیازی پاکستان پہنچے تو نواز شریف صاحب نے بلا کر کہا ''مولانا آپ ہمارے بزرگ ہیں!'' ہم آپ کے نیاز مند ہیں۔ اتنی ''بے نیازی'' بھی کیا۔ یہ لیں وزارت اور وزارت بھی امورِ مذہبیہ

کی ''نورانی کی ایک ملاقات کا (پارس) اپنا کام کر چکا تھا۔

بس اک نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ ''دل'' کا

دولت اندوزی کا زمانہ اور زر پرستی کا دور بڑا اندھیروں میں ڈھنپا ہوا ہوتا ہے۔ لوٹ مار کرنے والے ان اندھیروں میں بڑے خوش خوش فراٹے بھرتے رہتے ہیں۔ مگر اللہ کا ایک قانون یہ بھی ۔ ہے کہ ایسے دور میں اپنی حجت قائم رکھنے کے لیے بعض افراد کو صبر اور ہمت کی دولت عطا کرتا ہے۔ دولت کو جوتے کی نوک پر رکھیں اور عوام کو بتا سکیں کہ دولت کا کھیل وقتی اور ہنگامی ہے۔ عنقریب اندھیرے چھٹیں گے۔ لوٹ مار کرنے والے لوگ آفتابِ سیاست کی کرنوں کی تاب نہیں لا سکیں گے۔ اور ان روشنیوں میں ننگے ہو کر ایوانِ حکومت چھوڑ کر ایسے گمنام کونوں میں جا گھسیں گے جہاں ان کے چہرے پہچاننے والا بھی کوئی نہ ہوگا اور تاریخ ان کے نام حرف غلط کی طرح مٹا دے گی۔

مولانا شاہ احمد نورانی بیس سال سے سیاسی میدان میں ایک قد آور راہنما کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ لوٹنے والوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی پاکستان کے عوام کو کہہ دیتے ہیں۔ ''اللہ والو!'' جاگتے رہنا چوروں کی رکھوالی ہے!'' جس حجرے سے نکل کر سیاست میں آئے تھے اسی حجرے میں آج تک مقیم ہیں۔ جس مسجد میں نماز تراویح میں قرآن سنایا کرتے تھے آج بھی اس مسجد میں قرآن سناتے ہیں۔ وہی مکان، وہی مسجد، وہی لباس، وہی عمامہ، وہی پٹکا، وہی شب بیداری اور وہی آداب! جس راہنما (خواہ مخالف ہی ہو) سے ملاقات کرتے ہیں اسے سونا بنا دیتے ہیں۔ حکومت اس راہنما کو مناتی ہے۔ اس کی اہمیت کا اعتراف کرتی ہے۔ جس سیاسی جماعت سے سیاسی اتحاد کے لیے قدم بڑھاتے ہیں۔ حکومت اس سیاسی جماعت کو ''پیار کی نگاہ'' سے دیکھنے لگتی ہے۔ یہ مولانا نورانی کی کرامت ہے یا پارس کا کرشمہ ہے؟

مولانا شاہ احمد نورانی نے ملک کی دینی قیادت کو ایک نیا رخ عطا کیا ہے وہ

علمائے کرام جو جمعرات کی روٹیوں، لوگوں کے چندوں، درود و سلام کی محفلوں پر زندگی بسر کرتے تھے۔شاہ احمد نورانی کی قیادت میں جمع ہوئے۔سیاسی تربیت حاصل کی۔ سیاسی شعور پایا۔ملتان اور رائے ونڈ میں اپنی اجتماعی قوت کا مظاہرہ کیا۔اس نورانی پارس کی قربت کا ثمرہ ہے کہ ان علماء میں سے بعض کو سونے میں تولا گیا۔کوئی جج بن گیا،کوئی مفتی بن گیا،کوئی چیئرمین بن گیا،کوئی شیخ الوقت بنا،کوئی مرشد کامل بن گیا۔ جو اس کے اہل نہ تھے اور زبان بیاں سے محروم تھے زکوٰۃ، انعامات اور صدقات کے ڈھیروں پر جا کھڑے ہوئے۔الحمدللہ آج مولانا نورانی کے تربیت یافتہ اور جان نثار ساتھی لاکھوں روپوں کے مالک، انعامات، اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں۔ وہ شاندار مکانوں میں رہتے ہیں اعلیٰ کاروں میں سفر کرتے ہیں ان مراعات یافتہ حضرات میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو مولانا نورانی کے احسانات کا اعتراف نہیں کرتا مگر حقیقت اپنی جگہ ہے کہ مولانا نورانی کی ایک للکار سے حکومت ان علماء کرام کو اپنے دربار کے قریب رکھنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔آج یہ علماء حضرات اپنے نورانی پارس کی قربت کی وجہ سے ''سونا'' بن گئے ہیں۔یہ قسم قسم کی دھاتیں کندن بن کر جھلک رہی ہیں۔آج یہ علمائے کرام زکوٰۃ، صدقات اور انعامات کی نعمتوں سے مالا مال ہیں۔مگر مولانا نورانی کو اپنی مسجدوں، خانقاہوں اور جلسوں میں بھی آنے کی اجازت نہیں دیتے۔

جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں
جب بولنے لگے تو ہمیں پر برس پڑے!

مولانا نورانی کی ایک عادت ہے کہ جو شخص ازراہِ عقیدت اپنے بیٹے یا بیٹی کا نکاح آپ سے پڑھوائے تو آپ کو مجلس میں جو کچھ ملے۔اس علاقہ کے عالم دین (نکاح خواں) کو دے دیتے ہیں کہ یہ اس کا حق ہے۔کئی مجالس میں لوگوں نے یہ منظر دیکھا کہ آپ کو جو کچھ ملا مقامی عالمِ دین کو وہاں ہی دے دیا۔چند سال پہلے امریکہ سے ایک پاکستانی تاجر اپنے بیٹے کی شادی کے سلسلہ میں پاکستان آیا۔وہ مولانا نورانی کا

[illegible] مند تھا۔اس نے نہایت لجاجت سے اصرار کیا کہ نکاح آپ پڑھائیں گے۔ [illegible] مان گئے۔آئے۔مجلسِ نکاح میں سیکڑوں لوگ موجود تھے۔آپ نے نکاح پڑھایا۔تو لڑکے کے والد نے حضرت مولانا نورانی کو ایک لاکھ روپیہ نذرانہ پیش کیا۔ علاقہ کے عالم دین جو کسی وقت مولانا نورانی کے مرید تھے،مگر آج وہ حضرت مولانا نورانی کے خلاف برا بھلا کہنے کا وظیفہ کرتے ہیں (ہم ان مولانا کا نام ادباً نہیں لکھتے) مجلس نکاح میں موجود تھے۔ایک لاکھ روپیہ دیکھ کر لوگوں کو مولانا نورانی کی عادت کا خیال آیا۔آپ نے روپیہ اٹھایا اور ہاتھ بڑھا کر مولانا کو دے کر کہا: مولانا! یہ آپ کا حق ہے! یہ مولانا ایک عرصہ تک شاہ احمد نورانی کی فیاضی کے پیشِ نظر آپ کو ''ولی اللہ'' کہا کرتے تھے۔مولانا شاہ احمد نورانی مجالس نکاح میں بھی علماء کے لیے پارس ہیں۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ دنیا پرستی، دولت اندوزی اور زرگری کا دور ہے۔ نہ ان چیزوں کو عار سمجھا جاتا ہے۔ نہ ان معاملات پر ندامت محسوس ہوتی ہے۔بس جو ہاتھ بڑھا لے مینا اسی کی ہے۔وزیر مشیر، امیر کبیر ''فقیر'' بن گئے ہیں۔ اور ملکی دولت کے پیچھے دوڑ لگا رہے ہیں۔خواہ ملک کے کپڑے تار تار ہو جائیں۔ وزیروں، مشیروں اور اسمبلی کے اراکین تو خیر اس ملک کی دولت کو شیر مادر جانتے ہیں۔ لیکن اب تو ان کے حاشیہ نشین بھی لاکھوں میں کھیل رہے ہیں۔ملک کی دولت سمیٹنے کے لیے ایسے ایسے انداز اپنا لیتے ہیں کہ شیطان بھی انہیں اپنا استاد ماننے لگتا ہے۔ پٹواریوں اور کلرکوں کی ٹولیاں باہر نکل پڑی ہیں اور لوٹ کھسوٹ کے اس بازار میں کروڑوں روپوں کی کوٹھیاں اور پلازے بنائے جا رہے ہیں حکمران بیچارے اپنی لوٹ مار میں لگے ہیں وہ کسی کی کیا خبر لیں۔اور کسے پوچھیں کہ تیرے منہ میں کتنے دانت ہیں؟ ایسے دور میں جس سیاستدان کا دامن ان آلائشوں سے پاک ہے وہ ''مردِ مومن'' ہے اور وہی مستقبل کا تابندہ ستارہ ہے۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے ہر دور دیکھا۔مارشل لا کا دور، عوامی دور، ضیائی دور،

بے نظیر کا دور اور آج کل کا ''اسلامی دور'' اب تو ماشاء اللہ نواز شریف کی ''نوازشو
اور شرافتوں نے ذروں کو ''آفتاب'' بنا دیا ہے۔ الحمد للہ! قائدِ اہلِ سُنّت ان تمام اد
سے گزرے نہ کبھی آنکھ میلی ہوئی نہ کبھی قدموں میں لغزش آئی۔

یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کے لیے!

مولانا کی غربت اور بے سر و سامانی کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں
جاسکتا کہ مولانا جس سیاسی لیڈر یا سیاسی جماعت کی طرف قدم اٹھاتے ہیں یا مختصر
ملاقات کر لیتے ہیں حکومت کے انعامات کا رخ ادھر پلٹ جاتا ہے۔

مولانا شاہ احمد نورانی پیر آف پگارا شریف کے احباب میں سے ہیں۔ مسلک
روحانیت اور ہم خیال ہونے کی وجہ سے پیر صاحب پگارا شریف آپ کو اپنا چھوٹا بھا
کہتے ہیں۔ پیر پگارا نے کبھی کسی حکومتی سربراہ یا وزیر کو شمار قطار میں نہیں رکھا۔ کچ
عرصے سے حکومتی حلقوں نے پیر صاحب کو راضی کر رکھا ہے کہ ہمارے منحوس ستارو
کے مستقبل کے بارے میں کسی کو نہ بتائیں۔ وہ لندن گئے تو ایک سندھی دوست نے
پیر صاحب سے عرض کی ''حضور! مولانا نورانی یہاں آئے ہوئے ہیں کیا ملاقات
اہتمام کروں؟'' پیر آف پگارا نے فرمایا: ''بابا! نورانی ہمارا بھائی ہے لیکن مَیں نے اب
حکومت والوں کو ڈرانا چھوڑ دیا ہے''۔

اس وقت حکمرانوں کے پاؤں تلے زمین نہیں وہ ریت کے صحرا میں سفر کر رہے
ہیں وہ فقیر صفت اور حق گو علماء سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں ہم ملک کی مختلف سیاسی
پارٹیوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ شاہ احمد نورانی سے تعلقات قائم کرنے کا پروگرام
بنائیں۔ ان شاء اللہ حکومت کے پیادے ان کے پیچھے وہ خود بھاگتے ڈیرہ اسماعیل
خان کے ایک گاؤں اور مانچسٹر کی ایک مسجد تک چلے آئیں گے۔ ہم اپنے سنی علماء
کرام اور مفتیان عظام سے بھی گزارش کریں گے کہ وہ اپنی زکوٰۃ اور انعامات
بڑھانے کے لیے مولانا نورانی کی دعوت کا اعلان کر دیا کریں (دعوت دینے کی

...نہیں مولانا ''کالے بکروں'' کا گوشت نہیں کھاتے) ان شاء اللہ ان کے مال
ایمان میں برکت آجائے گی اور دولت میں اضافہ ہوگا۔ نورانی پارس ایسا رنگ دکھائے
گا کہ علماء کرام ماڈل ٹاؤن کا طواف اور اسلام آباد کے پھیرے بھول جائیں گے۔

بعض علماء کرام شاہ احمد نورانی کو برا بھلا کہہ کر اپنے ''آقایان ولی نعمت'' کا حق
نمک ادا کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ اتنا فائدہ بخش کام نہیں۔ اس سے تو صرف وفاداری
اور استواری کا یقین ہوتا ہے پھر مولانا اپنے خلاف گالیاں دینے والوں کو برا بھی
نہیں کہتے۔ اور نہ ان کی اہمیت کم ہونے دیتے ہیں۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

(ماہنامہ ''احوال'' کراچی دسمبر ۱۹۹۱ء)

خیابانِ رضا کے گل ہائے خوش رنگ

اگرچہ اس عنوان کے زیر نظر ہم ان ارباب علم وقلم کا تذکرہ کرتے ہیں جو اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلوی پر کام کر رہے ہیں۔ لیکن آج ''جہان رضا'' کے قارئین اُن ''گل ہائے رضویت'' کی خوشبو سے دل ودماغ کو معطر کریں گے جنہیں ''اعلیٰ حضرت'' نے اپنی زندگی میں ایک گلدستہ بنا کر اپنی آنکھوں کے سامنے سجایا تھا اور جو آپ کی علمی اور روحانی مجالس کی زینت بنے رہے۔ ان حضرات کا ذکر ''فاضل بریلوی'' کے اپنے اشعار میں پیش کیا جا رہا ہے۔ جس پر پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی ایم اے نے تعارفی حواشی لکھے ہیں۔

شہزادہ مولانا محمد حامد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۴۳ء):

تیرے ''رضا'' پر تیری رضا ہو
اس سے غضب تھراتے یہ ہیں

بلکہ ''رضا'' کے شاگردوں کا
نام لیے گھبراتے یہ ہیں

''حامد'' مِنّی اَنا مِنْ ''حامد''
حمد سے ہمد کماتے یہ ہیں

شہزادۂ اعلیٰ حضرت حضرت مولانا مولوی محمد حامد رضا خان قادری برکاتی نوری رحمۃ اللہ علیہ خلف اکبر وخلیفہ اعلیٰ حضرت مجدّد مائۃ حاضرہ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ کو بریلی میں پیدا ہوئے اسم گرامی ''محمد'' عرف ''حامد رضا'' اور خطاب ''حجۃ الاسلام'' تھا۔ درسیات کی

تحصیل والد ماجد سے کی۔ علوم مروجہ اور حدیث وتفسیر میں سند فضیلت حاصل کی۔ بلند ابو الطیب، شعلہ بیاں مقرر اور معروف مدرس علوم دینیہ کی حیثیت سے شہرت پائی تفسیر وحدیث کی تدریس میں خصوصیت سے مشہور تھے ''تفسیر بیضاوی'' کے درس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ عربی ادب اور فارسی، اردو، عربی نظم ونثر میں کمال حاصل کیا۔ مجلسی گفتگو میں فصاحت وبلاغت سے اہل مجلس کے ذوق کا سامان تھے۔ ۱۳۴۲ھ میں حج کے لیے گئے۔ تو وہاں کے معروف عربی دان حضرت سید حسین دباغ اور سید محمد مالکی ازہری نے آپ کی قابلیت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا ''کہ ہم نے ہندوستان کے اکناف واطراف میں ''حجۃ الاسلام'' جیسا فصیح وبلیغ دوسرا نہیں دیکھا۔ جسے عربی زبان پر اتنا عبور ہو''۔

حضرت ''مخدوم شاہ ابوالحسن احمد نوری مارہروی'' قدس سرہ سے بھی دستار فضیلت اور اجازت وخلافت حاصل کی۔ تصوف کے ''سلسلہ قادریہ'' کے تمام مراحل کو طے کیا اور عارف باللہ مشہور ہوئے۔ نظریاتی اور اعتقادی میدان میں ایک مناظر کی حیثیت سے برصغیر کے تمام بدعقیدہ معاندین کا تعاقب کیا۔ مولوی اشرف علی تھانوی کو بار بار مناظرہ کے لیے للکارا لیکن وہ کبھی سامنا کرنے نہ پائے۔ وفات سے ایک سال پہلے اور اپنی رحلت کے حالات وکوائف بیان فرماتے گئے۔ کیفیت وصال بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔ زبان ذکر صلوٰۃ وسلام رسول اللہ میں مشغول ہوگی۔ روح قرب وصال کے چھلکتے ہوئے کیف وسرور کے جام سے محظوظ ہوگی۔

حضور روضہ ہوا جو حاضر تو اپنی سج دھج پہ ہوگی ''حامد''
خمیدہ سر، بند آنکھیں، لب پہ، میرے درود وسلام ہوگا

۱۷ جمادی الاول ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۳ مئی ۱۹۴۳ء نماز کے دوران عالم تشہد میں ''السلام علیك ایها النبی'' کہتے ہوئے وصال ہوا۔ تصانیف میں نعتیہ دیوان، الصارم الربانی علی اسراف القادیانی، ''مجموعہ فتاوٰی''، ملا جلال پر حاشیہ، ترجمہ ''الدولۃ المکیہ''، ترجمہ ''حسام الحرمین''، یادگار زمانہ ہیں۔ (استدراک، تذکرہ علماء اہلسنت،

مئولفہ مولانا محمود احمد قادری کانپور، و ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ جولائی ۱۹۷۲ء

مولانا عبدالسلام جبل پوری (م ۱۹۵۳ء):

عبد السلام سلامت جس سے
سخت آفات میں آتے یہ ہیں

حامی السنن جناب مولانا مولوی محمد عبدالسلام جبل پوری، قادری، برکاتی، رضوی
علیہ الرحمۃ ''اعلیٰ حضرت'' کے نامور خلفاء میں شمار ہوتے ہیں۔ ''اعلیٰ حضرت'' نے آپ کو
''عبدالسلام'' کا خطاب دیا۔ آپ کے والد شاہ عبدالکریم حیدر آباد دکن میں قیام پذیر
تھے۔ آپ وہاں ہی پیدا ہوئے ''گشتہ عبدالسلام مردنکو'' ۱۲۸۳ھ سنہ ولادت ہے۔ تی
برس کے تھے کہ آپ کے والد حیدر آباد دکن سے جبلپور آگئے۔ آپ نے یہاں ہی حفظ
قرآن اور تحصیل علوم مروجہ کی تکمیل کی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ابتدائی دور کے رکن
۱۳۱۲ھ میں ندوۃ العلماء کی خصوصی مجلس کے رکن اعلیٰ بنے۔ جب ندوہ میں اعتزال
آگیا۔ تو آپ نے اپنے والد گرامی کے حکم سے ۱۳۱۳ھ میں بریلی کے اجلاس کے دوران
اعلیٰ حضرت کی مجلس میں حاضری دی۔ اعلیٰ حضرت کی علمی کشش نے آپ کو ندوہ کی مجالس
سے کھینچ لیا اور پھر آپ بریلی کے ہو کر رہ گئے۔ اسباق حدیث کو اعلیٰ حضرت سے از سر
نو پڑھا۔ مولانا حامد رضا خان قدس سرہ کے ہم سبق تھے۔ دستارِ فضیلت اور خلافت امام
اہلسنّت سے حاصل کیں۔

اعلیٰ حضرت بریلوی آپ پر خصوصیت سے نظرِ شفقت فرماتے۔ اور آپ کی
خدمات دینیہ کو فخریہ طور پر بیان فرماتے تھے۔ اعلیٰ حضرت آپ کی دعوت پر دو ماہ کے لیے
جبل پور رہے اور وہاں کے لوگوں کو علمی دولت سے مالا مال کیا۔ اعلیٰ حضرت فرمایا
کرتے تھے۔ ''عبدالسلام سی پی کا قطب ہے'' ۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۳
فروری ۱۹۵۳ء کو آپ کا وصال ہوا۔ (استدراک، تذکرہ علماء اہلسنت، مؤلفہ مولانا
محمود احمد قادری کانپور)

ملک العلماء مولانا ظفر الدین رضوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۶۲ء):

میرے ظفر کو اپنی ظفر دے
اس سے شکستیں کھاتے یہ ہیں

حضرت مولانا ظفر الدین بہاری قادری برکاتی اعلیٰ حضرت کے خلیفہ، رفیق کار
اور سچے جانشین تھے۔ تاریخی نام ''غلام حیدر'' ہے والد محترم کا اسم گرامی عبدالرزاق
تھا۔ ۱۰ محرم الحرام ۱۳۰۳ھ کو موضع میجرہ ضلع عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی
درسیات والد محترم سے پڑھیں۔

دس سال کی عمر میں مدرسہ ''غوثیہ حنفیہ'' میں مولانا معین الدین اشرف، مولانا
بدر الدین اشرف اور مولانا معین الدین اظہر سے علوم مروجہ حاصل کیے۔ ۱۳۲۰ھ میں
''مدرسہ حنفیہ پٹنہ'' میں شاہ وصی احمد محدث سورتی کے درس میں شریک ہوئے۔
۱۳۲۱ھ میں مولانا احمد حسن کانپوری سے منطق پڑھی۔ قاضی عبدالرزاق کانپوری سے
اعلیٰ علوم حاصل کیے۔ پہلی نشست میں حضرت محدث سورتی سے استفادہ کیا پھر
بریلی میں آکر تکمیل تفسیر و حدیث کی۔

آپ بریلی کے مدرسہ ''منظر اسلام'' کے بانیوں میں سے تھے۔ اعلیٰ حضرت نے
دو شاگردوں ظفر الدین بہاری اور مولانا عبدالرشید عظیم آبادی کی تدریس سے مدرسہ کا
آغاز فرمایا تھا۔ بخاری شریف، اقلیدس تشریح تصریح افلاک، شرح چغمینی، علم توقیت و
القامات جفر اعلیٰ حضرت سے خصوصیت سے حاصل کیے۔ ۱۳۲۵ھ میں دستار فضیلت
حاصل کی۔ ۱۳۲۹ھ میں ''مدرسہ منظر اسلام بریلی'' میں مدرس ہوئے۔ پھر شملہ میں خطیب
اعلیٰ بنے۔ ''مدرسہ حنفیہ آرہ'' میں صدر مدرس ہوئے۔ ۱۹۱۳ء میں دار العلوم ''جامعہ شمس
الہدیٰ'' کے مدرسِ اول بنے تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۸ء میں جامعہ گورنمنٹ نے لے لیا
تو آپ جامعہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ اور ''ظفر منزل''
شاہ گنج پٹنہ میں مقیم ہوئے۔ حضرت شاہ شاہد حسین سجادہ نشین تکیہ حضرت شاہ رکن

الدین عشق پٹنہ کی استدعا پر ۲۱ شوال المکرم ۱۳۷۱ھ کو کٹیار میں ''جامعہ لطفیہ بحر العلوم''
کی بنیاد رکھی۔ ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۸ نومبر ۱۹۶۲ء بوقت سحر راہی ملک
بقا ہوئے۔

آپ علماء اہلسنت کے مایہ ناز مدرس، منظم، مصنف، مورخ، تذکرہ نگار اور
اعتقادی اور نظریاتی مسائل کے حل کرنے میں یگانہ روزگار تھے۔ ''ملک العلماء''
لقب آپ کو زیب دیتا تھا۔ آپ ''امام اہلسنت'' کے خلیفہ خاص تھے اور آپ کے علمی
اور روحانی فیضان کے ترجمان تھے۔ مندرجہ ذیل تصانیف آپ سے یادگار ہیں۔

1- ''جامع الرضوی شرح صحیح بخاری'' چھ مجلدات۔
2- جواز عرس۔
3- ''حیات اعلیٰ حضرت'' چار مجلدات۔
4- ''تنویر السراج فی ذکر المعراج'' چار جلدیں۔
5- ترجمہ حسان الخیرات۔
6- احناف کی موید احادیث کا مجموعہ۔
7- اعلیٰ حضرت کی تصانیف کا مجموعہ (تالیف المجدد)

ان مطبوعات کے علاوہ بھی آپ کی تالیفات کا قلمی ذخیرہ آپ کے صاحبزادے
پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پاس محفوظ ہے۔

محمد امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۴۸ء):

میرا امجد مجد کا پکا
اس سے بہت کچھ پاتے یہ ہیں

حکیم ابوالعلا مولانا محمد امجد علی اعظمی قادری برکاتی رضوی مصنف ''بہار شریعت''
اعلیٰ حضرت عظیم المرتب کے خلیفہ خاص اور ''مدرسہ اہلسنت و جماعت'' کے صدر مدرس
اور ''مطبع اہلسنت و جماعت بریلی'' کے ناظم اعلیٰ تھے۔ گھوسی ضلع اعظم گڑھ میں پیدا

والد مکرم مولانا حکیم جمال الدین بن مولانا خدا بخش اپنے دادا اور بھائی محمد صدیق
رحمہم اللہ کی کتابیں پڑھیں مدرسہ حنفیہ جونپور میں مولانا ہدایت اللہ خاں سے استفادہ
کیا۔ شاہ وصی احمد سورتی کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ اور ۱۳۲۰ھ میں سندِ فراغت
حاصل کی۔ ۱۳۲۲ھ میں حکیم عبدالولی لکھنوی سے طب پڑھی۔ اور پھر ۱۳۲۷ھ تک
حضرت محدث سورتی کے مدرسہ میں رہے۔

اعلیٰ حضرت بریلوی کو اپنے مدرسہ کے لیے ایک قابل مدرس کی ضرورت پڑی۔
تو حضرت محدث سورتی نے آپ کا نام پیش کیا۔ آپ بریلی پہنچے۔ ''دار العلوم منظر
اسلام'' میں مدرس مقرر ہوئے۔ آپ کی قابلیت اور حسن انتظام کو اعلیٰ حضرت نے بڑی
قدر کی نگاہ سے دیکھا اور دار العلوم کا سارا انتظام آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ اعلیٰ
حضرت کے مرید بنے پھر خلیفہ بنے۔

برصغیر پاک و ہند کے مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کی، حج کیا اور مفتی اعظم ہند
مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بمبئی پہنچے مگر ذیقعدہ ۱۳۶۷ھ بمطابق ۱۲
ستمبر ۱۹۴۸ء واصل بحق ہوئے۔ گھوسی اعظم گڑھ میں استراحت فرما ہیں۔

"ان المتقين فی جنات و عیون" سے سال رحلت ۱۳۶۷ھ برآمد ہوتا ہے۔

علمی یادگار ہیں ''بہار شریعت'' جو حنفی فقہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے، شامل ہے۔ سیکڑوں
ایڈیشن چھپ کر پاک و ہند کے سنی مسلمانوں کی رہنمائی کر چکے ہیں۔ حاشیہ شرح معانی
الآثار، مجموعہ فتاویٰ امجدیہ اور دیگر کئی کتابیں اہل علم کے لیے مشعل راہ بنیں۔ معروف
شاگردوں میں سے مولانا رفاقت حسین، مولانا سردار احمد، حافظ عبد العزیز مبارک
پوری، شاہ محمد حبیب الرحمان، مولانا قاضی شمس الدین جونپوری، مولانا حشمت علی، مفتی
اعجاز ولی خان، مولانا غلام جیلانی میرٹھی، مولانا غلام یزدانی مولانا تقدس علی خان اور
آپ کے فرزند ارجمند علامہ عبد المصطفیٰ ازہری کے اسمائے گرامی دنیائے سنیت میں
آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ (رحمہم اللہ) بریلی کا مکتب فکر آپ کی مساعی جمیلہ سے پھلا

پھولا۔ اورآپ نے علمی رنگ دے کر اسے اوجِ ثریا تک پہنچادیا۔

صدرالافاضل مولانا نعیم الدین چشتی مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۴۸ء):

میرے نعیم الدین کو نعمت

اس سے بلا میں سماتے یہ ہیں

حضرت مولانا حافظ محمد نعیم الدین مرادآبادی چشتی اشرفی قادری برکاتی امام اہلسنّت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اعظم تھے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید محمد معین الدین المتخلص بہ ''نزہت'' (م ۱۳۳۹ھ) تھا۔ جد امجد مولانا سید محمد امین الدین راسخ بن مولانا سید محمد کریم الدین آرزو تھے۔ آپ ۲۱ صفر ۱۳۰۰ھ یکم جنوری ۱۸۸۳ء بروز پیر پیدا ہوئے۔ تاریخی نام ''غلام مصطفیٰ'' تھا۔ حفظ قرآن اور ابتدائی کتابوں کی تعلیم کے بعد مولانا شاہ فضل احمد سے استفادہ کیا۔ اور ''دارالعلوم امدادیہ'' میں مولانا سید گل محمد رحمۃ اللہ علیہ سے دورہ حدیث کی تکمیل کی۔ اور ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء کو دستار فضیلت حاصل کی۔

''سلسلہ قادریہ'' میں اپنے استاد مکرم سید گل محمد سے بیعت ہوئے۔ اعلیٰ حضرت بریلوی سے خلافت حاصل کی۔ آپ اعلیٰ حضرت کی علمیت اور نظریاتی برتری کو بن دیکھے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور آپ کے مخالفین کا مسکت جواب دیتے۔ اعلیٰ حضرت نے اپنے اس عقیدت مند کو بریلی میں طلب کیا۔ اور زندگی بھر اپنا رفیق کار بنائے رکھا۔ آپ نے ۱۳۲۸ھ میں مرادآباد میں ''مدرسہ اہلسنّت و جماعت'' کی بنیاد رکھی۔ ۱۳۵۲ھ میں اس مدرسہ کو وسعت دی اور ''جامعہ نعیمیہ'' نام رکھا گیا۔ یہ دارالعلوم ہندوستان بھر میں تکمیل علوم دینیہ کی ایک اعلیٰ درسگاہ تھا۔ اسی دارالعلوم کے فارغ طلبہ آگے چل کر برصغیر میں دینی مدارس کے بانی اور مہتمم بنے۔ مولانا ابوالحسنات قادری، مولانا ابوالبرکات سید احمد شیخ الحدیث مرکزی حزب الاحناف لاہور، مفتی محمد عمر نعیمی دارالعلوم امجدیہ کراچی، حکیم الامت مفتی احمد یار خان گجرات، پیر محمد کرم شاہ صاحب دارالعلوم محمدیہ بھیرہ شریف، فقیہ اعظم مولانا محمد نور اللہ بصیر پوری، مفتی غلام معین الدین نعیمی

(ماہنامہ سوادِ اعظم) مفتی محمد حسین نعیمی بانی جامعہ نعیمیہ لاہور، مولانا غلام محمد فخر الدین گولڑوی (مدظلہ)، آپ ہی کے گلستان نعیمیہ کی بہاریں ہیں۔

آپ شاعر، مصنف، مدرس، مہتمم اور مناظر کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ عیسائی، آریہ، روافض، خوارج، قادیانی اور غیر مقلدین کو مناظروں میں کئی بار شکست دی۔ آپ ملک کے سیاسی اور دینی مسائل میں عملی حصہ لیتے۔ ہر تحریک میں پیش پیش ہوتے۔ ماہنامہ سوادِ اعظم مرادآباد' ایک عرصہ تک جاری رکھا۔ نظریہ پاکستان اور قیام پاکستان کے لیے دن رات کوشاں رہے۔ ''آل انڈیا سنی کانفرنس بنارس'' میں آپ نے ہی پاکستان کے حق میں ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ آپ کی تصانیف میں سے تفسیر خزائن العرفان، اطیب البیان رد تقویت الایمان، الکلمۃ العلیا، ہدایت کاملہ، التحقیقات، کتاب العقائد، سوانح کربلا، زاد الحرمین، آداب الاخیار، اسواط العذاب، الفرائد النور، گلبن غریب نواز مشہور کتابیں ہیں۔

۱۸ ذوالحجہ ۱۳۶۸ھ مطابق ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء بروز جمعۃ المبارک واصل بحق ہوئے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں حیات صدرالافاضل، تذکرہ علماء اہلسنّت لاہور، تذکرہ علماء اہلسنت مطبوعہ کانپور، خلفائے اعلیٰ حضرت (زیر طبع) تحریک پاکستان کے نامور علماء، علمائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، ترجمان اہلسنّت کراچی، ضیائے حرم بھیرہ)

مولانا احمد اشرف جیلانی کچھوچھوی (م ۱۳۴۳ھ):

احمد و اشرف حمد و شرف لے

اس سے ذلت پاتے یہ ہیں

ابوالمحمود احمد اشرف جیلانی زیب سجادہ کچھوچھہ شریف حضرت جناب غوث الاعظم جیلانی کی اولاد سے تھے اور اعلیٰ حضرت بریلوی کے ابتدائی تلامذہ میں سے تھے۔ آپ عارف باللہ سید علی حسین اشرفی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کے نامور فرزند تھے۔ تاریخی نام مولانا ابوالمحمود سید شاہ احمد اشرف تھا۔ ۱۴ شوال ۱۲۸۶ھ بروز جمعہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی

کتابیں کچھوچھہ شریف میں پڑھیں۔ مفتی لطف اللہ علی گڑھی سے درسیات کی تکمیل
کی۔ خواب میں سرکار دو عالم ﷺ نے دستار بندی کرائی۔ چنانچہ اس خواب کے بعد
آپ نے کسی مدرسہ سے دستار فضیلت حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔

گو آپ اپنے والد مکرم سے بھی بیعت تھے۔ مگر آپ کو اعلیٰ حضرت بریلوی قدس
سرہ نے بھی اجازت وخلافت عطا فرمائی۔ آپ کی تقریر ہر دل عزیز ہوتی اور وعظ میں
تاثیر ہوتی۔ آپ اپنے والد ماجد کی زندگی میں ہی ۱۳۴۳ھ میں واصل بحق ہوئے۔ حضرت
شیخ المشائخ مولانا سید شاہ مختار اشرف مد ظلہ تعالیٰ آپ کے ہی فرزند ارجمند ہیں (تفصیل
کے لیے دیکھیے تذکرہ علماء اہلسنت مطبوعہ کانپور، مقالات یوم رضا حصہ سوم مطبوعہ
لاہور، خلفائے اعلیٰ حضرت مولفہ محمد صادق قصوری)

حضرت سید دیدار علی الوری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۳۵ء):

مولانا دیدار علی کو
کب دیدار دکھاتے یہ ہیں

اسم گرامی دیدار علی، کنیت ابو محمد، والد ماجد کا نام سید نجف علی پیدائش نواب پور
الور ۱۲۷۰ھ میں ہوئی آپ کے آباء واجداد مشہد سے اودھ (بلگرام) سے ہوتے ہوئے
فرخ آباد، پھر الور میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ نے قرآن پاک اپنے چچا سیّد نثار علی الوری
سے پڑھا۔ شاہ کرامت اللہ دہلوی سے ابتدائی درسیات پڑھیں۔ مولانا ارشاد حسین
رامپوری کے "مدرسہ مجددیہ نقشبندیہ" سے اصول فقہ اور معقولات پڑھیں۔ مولانا شاہ
عنایت اللہ خان رامپوری سے فقہ حنفی کی تکمیل کی۔ ۱۲۹۲ھ میں مولانا احمد علی
سہارنپوری سے دورہ حدیث ختم کیا۔ ۱۲۹۳ھ میں سندِ حدیث حاصل کی۔ قبلہ پیر مہر علی
شاہ گولڑوی اور شاہ وصی احمد محدث سورتی آپ کے ہم سبق تھے۔

حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت ہوئے۔ امام العارفین شاہ آل
رسول مارہروی اور اعلیٰ حضرت بریلوی سے خلافت حاصل کی۔ "مدرسہ ارشاد العلوم

لاہور" میں مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں تدریسی فرائض کے لیے بمبئی گئے۔ مگر
آپ نے ایک سال بعد الور آ کر "مدرسہ قوۃ الاسلام" کی بنیاد رکھی۔ لاہور کے مدرسہ
نعمانیہ میں ایک عرصہ تک مدرس رہے۔ ۱۹۱۴ء میں مفتی اعظم آگرہ مقرر ہوئے۔ مگر
۱۹۲۰ء میں "انجمن نعمانیہ لاہور" کی دعوت پر دوبارہ لاہور آئے۔ ۱۹۲۲ء میں وزیر
خاں کی مسجد کے خطیب بنے اور "مرکزی انجمن حزب الاحناف" کی بنیاد رکھی۔ ایک
دار العلوم قائم کیا۔ آپ نے مذہب اہلسنت کی ترویج اور عقائد باطلہ کی تردید میں بڑی
پامردی سے کام کیا۔ لاہور کو وہابیت، دیوبندیت اور دوسرے عقائد کے زہر سے کافی
حد تک بچالیا۔ ۲۲ رجب المرجب ۱۳۵۴ھ مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو رحلت فرمائی۔
"مزار دار العلوم حزب الاحناف اندرون دہلی دروازہ لاہور" میں ہے۔ آپ کے دونوں
صاحبزادے مولانا ابو الحسنات سیّد محمد احمد قادری خطیب جامع مسجد وزیر خاں لاہور اور
استاذ العلماء مولانا ابو البرکات سید احمد قادری شیخ الحدیث حزب الاحناف لاہور اپنے
زمانہ میں یگانۂ عصر قرار پائے۔ اور علمی دنیا میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ آپ کی
تصانیف میں سے "تفسیر میزان الادیان"، رسول الکلام، ہدایۃ الطریق، "دیوان دیدار
علی" جیسی کتابیں یادگار ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں۔ تذکرہ علماء اہلسنت لاہور
مطبوعہ لاہور، اولیائے نقشبند لاہور۔ تذکرہ علماء اہلسنت مطبوعہ کانپور۔ ماہنامہ نقوش
لاہور نمبر، روزنامہ سعادت لائلپور، امام اہلسنت نمبر ۱۹۶۸ء)

مولانا احمد مختار صدیقی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۳۸ء):

مجبور احمد مختار ان کو
کرتا ہے مر جاتے یہ ہیں

حامی سنت مولانا مولوی احمد مختار صدیقی میرٹھی قادری برکاتی رضوی علیہ الرحمۃ اعلیٰ
حضرت کے خلیفہ تھے۔ والد محترم کا اسم گرامی شاہ عبد الحکیم تھا۔ ۷ محرم الحرام ۱۲۹۴ء کو
محلہ مشائخاں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبد العلیم میرٹھی اور شاہ نذیر احمد میرٹھی آپ

کے چھوٹے بھائی تھے۔ پانچ برس کی عمر میں قرآن پڑھا۔ ۱۳۱۰ھ میں مدرسہ اندر
میرٹھ سے درس حدیث لیا۔ ۱۳۲۲ھ میں مدینہ منورہ میں قیام کے دوران حضرت
رضوان سے تکمیلِ علمِ حدیث کی۔

حج سے واپسی پر میرٹھ کے قومی مدرسہ میں فارسی اور اسلامیہ کالج اٹاوہ
پروفیسر عربی مقرر ہوئے۔ بیگم شاہ جہاں بیگم کے ''اسلامی مدرسہ بھوپال'' میں
مدرس مقرر ہوئے۔ ''شدھی تحریک'' کے دوران برما گئے۔ وہاں ایک اسلامی دار العلو
کی بنیاد رکھی۔ مانڈلے میں اعلیٰ تعلیم کا کالج قائم کیا۔ ڈربن میں عورتوں کی تعلیم کے
ایک درسگاہ بنائی۔ ۱۹۰۸ء میں افریقہ پہنچے اور الاسلام رسالہ جاری کیا۔ ۱۹۲۰ء
تحریک خلافت میں پرجوش حصہ لیا۔ خلافت کمیٹی کے فنڈ میں تین لاکھ روپیہ جمع کرا
۱۹۲۲ء میں گرفتار کر لیے گئے۔

آپ نے اعلیٰ حضرت امام اہلسنت سے بیعت کی۔ خلافت حاصل کی۔ اور آپ
کے مقربین میں شمار ہوئے۔ قطب العالم حاجی وارث شاہ دیوا شریف کے عقیدتمندو
میں سے تھے۔ قطب المشائخ شاہ علی حسین رحمۃ اللہ علیہ کچھوچھوی سے سلسلہ عالیہ اشرفی
میں فیض ملا۔ شاہ سعود نے سرزمین حجاز میں مشاہیر اسلام کے مزارات کو مسمار کیا
آپ ہندوستان کے اس وفد کے رکن کی حیثیت سے سعودی عرب گئے۔ جو شاہ ابن
سعود کو عالم اسلام کے جذبات سے خبردار کرنے گیا تھا۔

آپ کے وعظ پر ہزاروں ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ ۶۳ برس کی عمر میں
جمادی الاول ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۰ جولائی ۱۹۳۸ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ (استدراک
تذکرہ علماء اہلسنت مطبوعہ کانپور)

مبلغ اسلام شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی (م ۱۹۵۴ء):

عبد العلیم کے علم کو سن کر
جہل کی بہل بھگاتے یہ ہیں

حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ مبلغ اسلام خلیفہ اعلیٰ حضرت
حاضرہ ۱۵ رمضان ۱۳۱۰ھ بمطابق ۱۳ اپریل ۱۸۹۲ء میرٹھ میں پیدا ہوئے۔
ابتدائی تعلیم والد بزرگوار شاہ محمد عبدالحکیم سے حاصل کی۔ ''دارالعلوم عربیہ قومیہ'' میں
داخلہ لیا۔ سولہ برس کی عمر میں درس نظامی کی تکمیل کی۔ علوم جدید اٹاوہ ہائی سکول اور
کالج میرٹھ سے حاصل کیے۔ حکیم احتشام الدین سے علمِ طب حاصل کیا۔ کالج
تعلیم کے دوران ''اعلیٰ حضرت'' کی مجالس علمیہ سے استفادہ کرنے کے لیے بریلی
۔ پھر عمر بھر آپ کے ہی دامن علم وادب کی خوشہ چینی کرتے رہے۔

۱۹۱۹ء میں حجاز مقدس پہنچے۔ واپس آکر ''اعلیٰ حضرت'' کے حلقہ ارادت میں
داخل ہوئے۔ منازل سلوک طے کیں اور خلافت حاصل کی۔ فاضلِ بریلوی کے علاوہ
آپ نے شیخ احمد الشمس (مراکش) لیبیا کے شیخ السنوسی سے بھی روحانی فیض حاصل
کیا۔ آپ نے زندگی کا طویل حصہ تبلیغ دین میں گزارا۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۵۴ء تک
یورپ، افریقہ اور امریکہ جیسے متعدد ممالک اور علاقوں میں جا کر اسلام کی روشنی
پھیلاتے رہے۔ جہاں گئے مساجد، مکاتب، کتب خانے، ہسپتال یتیم خانے اور تبلیغی
مراکز قائم کرتے گئے۔ آپ کی شبانہ روز اور مخلصانہ کوششوں سے دنیائے فرنگیت کے
امراء وکلاء، پروفیسر ڈاکٹر اور سائنس دان مشرف باسلام ہوتے گئے۔

آپ نے ۷ اپریل ۱۹۳۵ء کو مشہور عالمی فلاسفر ''برنارڈ شا'' سے ''اسلام اور
عیسائیت'' پر مناظرہ کیا۔ برنارڈ شا کو آپ کی شخصیت نے بے حد متاثر کیا۔ اور اس نے
اعتراف کیا کہ قرآن کائنات ارضی کی قوموں کی رہنمائی کرتا ہے۔ آپ برصغیر، مصر،
افریقی ممالک میں جہاں جہاں کانگریس کے وظیفہ خوار گماشتے پاکستان کے خلاف
زہر پھیلا رہے تھے۔ آپ وہاں پہنچ کر ''نظریۂ پاکستان'' کی تشریح کرتے۔ جب
''جمعیت العلماء ہند'' نے نہرو رپورٹ کی حمایت کی تو آپ مولانا حسرت موہانی، میر
غلام بھیک نیرنگ، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ جمعیت علماء

ہند سے علیحدہ ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء میں بنارس کی ''آل انڈیا سنی کانفرنس'' میں مسلمانوں کو تحریک پاکستان کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ ان خدمات کے پیش نظر ''قائد اعظم'' نے آپ کو عالم اسلام میں پاکستان کا ترجمان بنا کر بھیجا۔

آپ دنیا کی کئی زبانوں پر پوری دسترس رکھتے تھے اور ان زبانوں میں خطاب کرتے۔ جس ملک میں جاتے وہاں کے باشندوں کو اسلام کے محاسن بتاتے اور پھر وہاں اسلامی مراکز قائم کرتے۔ جو آج تک تبلیغ اسلام کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ برما، ملائیشیا، افریقہ، کینیا، تنزانیہ، یوگنڈا، بلجیم، کانگو، حجاز، مصر، شام، فلسطین، عراق، فرانس، برطانیہ، جزائر غرب الہند، گیانہ، امریکہ اور کینیڈا وغیرہ میں تبلیغی دورے کیے۔

آپ نے ۲۲ ذوالحجہ ۱۳۷۴ھ مطابق ۲۲ اگست ۱۹۵۴ء کو ''مدینہ منورہ'' میں وصال فرمایا۔ ''جنت البقیع'' میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں دفن ہوئے۔ حضرت مولانا ''ضیاء الدین قادری مدنی'' نے نماز جنازہ پڑھائی۔ قائدِ اہلسنّت حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدر جمعیت علماء پاکستان آپ کے فرزند ارجمند ہیں۔ مندرجہ ذیل تصانیف آپ کی علمی یادگار ہیں۔ ذکر حبیب، کتاب التصوف، احکام رمضان، بہار شباب اسلام کی ابتدائی تعلیمات، انسانی مسائل کا اسلامی حل اسلام کا اصولی رشتہ کیا ہے البیان (عربی) مسائل نماز (انگریزی) غرضیکہ بہت سی کتابوں کے آپ نے مختلف زبانوں میں ترجمے کیے اور کتابیں شائع کیں۔

سلطان الواعظین مولانا عبدالاحد قادری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۳۳ء):

اک اک وعظ عبد الاحد پر
کتنے نتھنے پھیلاتے یہ ہیں

سلطان الواعظین مولانا الحاج عبدالاحد قادری برکاتی رضوی خلف الرشید حضرت مولانا محمد وصی احمد محدث سورتی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۸۳ء میں پیلی بھیت میں پیدا ہوئے۔ ''مدرسہ

الحدیث'' میں داخل ہو کر اپنے والد گرامی کے زیر تربیت درسیات کی تکمیل کی۔ ۱۹۱۳ء میں ''تکمیل الطب کالج لکھنؤ'' میں طب پڑھی۔ ایک عرصہ تک لکھیم پور میں مطب کیا۔ ''مدرسہ حنفیہ پٹنہ'' میں تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ پھر اپنے والد کے جانشین بن کر ''مدرسہ الحدیث'' میں پڑھاتے رہے۔ آپ کے وعظ میں جادو کی تاثیر تھی۔ زور خطابت سے متاثر ہو کر اعلیٰ حضرت امام اہلسنت نے آپ کو ''سلطان الواعظین'' کا خطاب دیا۔ آپ نے ''اعلیٰ حضرت'' سے خلافت حاصل کی ۱۳۳۳ھ میں ''اعلیٰ حضرت'' کی معیت میں حج کیا۔ آپ نے آزادی کی تحریک میں مسلمانوں کو ہندوؤں کی فریب کاریوں سے آگاہ کیا۔ ۱۳ شعبان المعظم ۱۳۵۲ھ بمطابق ۱۹۳۳ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ آپ کے صاحبزادے مولانا شاہ فضل الصمد مانا میاں پیلی بھیت، صاحبزادہ مولانا امام قاری احمد ایڈیٹر پیام حق کراچی اور صاحبزادہ مولانا فضل احمد صوفی کراچی آپ کے علمی جانشین ہیں۔

حضرت مولانا محمد رحیم بخش قادری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۴۴ھ):

بخش رحیم پہ رحمت جس سے
آرے کے نیچے آتے یہ ہیں

حضرت مولانا محمد رحیم بخش آروی قادری برکاتی رضوی خلیفہ اعلیٰ حضرت آرہ صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ علماء رامپور اور سہارنپور سے درسیات پڑھیں۔ حدیث پھلواری شریف سے پڑھی۔ ''حضرت فاضل بریلوی'' کی شہرت نے آپ کو بریلی کھینچا اور آپ کے مرید ہو کر خلافت کے رتبہ تک پہنچے۔ اپنے وطن میں ''مدرسہ حنفیہ'' میں ایک عرصہ مدرس رہے۔ ایک دارالعلوم ''فیض الغربا'' کے نام سے بھی جاری کیا۔ ''آرہ'' کے شیخ طریقت حضرت شاہ محمد فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ آپ کے زبردست حامی تھے۔ اعلیٰ حضرت کو آپ کی علمی مساعی پر بے حد فخر تھا۔ آپ کئی بار آرہ تشریف لے گئے۔ اور طلبہ کی دستار بندی کرائی۔

مولانا شاہ عبدالغفور، علامہ محمد ابراہیم آروی، مولانا ولی الرحمٰن پوکھیروی اور سید سلیمان ندوی آپ کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں۔ وصال ۸ شعبان ۱۳۴۴ھ میں ہوا۔

مولانا حاجی لعل خاں قادری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۲۱ء):

جوہر منشی لعل پہ ہیرا
کھا مرنے کو منگاتے یہ ہیں

مولانا حاجی محمد لعل خان رحمۃ اللہ علیہ مدراسی نزیل کلکتہ قادری برکاتی رضوی ''اعلیٰ حضرت'' کے خلیفہ تھے۔ آپ کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ آپ اعلیٰ حضرت کی تصانیف کی اشاعت میں بے پناہ حصہ لیتے۔ آپ کی اپنی تصانیف ''تاریخ وہابیہ''، ''فتاوی برعقائد وہابیہ و دیوبندیہ'' اہل علم کے ہاں خاصی مشہور ہوئی ہیں۔ ۲۱ جولائی ۱۹۲۱ء کو وفات پائی۔

مفتی اعظم ہند محمد مصطفیٰ رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۸۱ء):

آل الرحمٰن برہان الحق
شرق پہ برق گراتے یہ ہیں

مفتی اعظم ہند محمد مصطفیٰ رضا قادری برکاتی نوری رحمۃ اللہ علیہ ''اعلیٰ حضرت'' کے فرزند ارجمند خلیفہ اعظم اور زیب سجادہ دربار عالیہ بریلی شریف ۲۲ ذوالحجہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء بریلی میں پیدا ہوئے اسم گرامی ''آل رحمٰن'' عرف ''مصطفیٰ رضا'' ہے۔ اعلیٰ حضرت کے فرزند اصغر ہیں۔ آپ نے مولانا شاہ رحم الٰہی منگلوری سے خصوصی تعلیم حاصل کی۔ اپنی ذہانت اور قابلیت سے اساتذہ کے دل میں گھر کر لیتے۔ حضرت مولانا ظفر الدین بہاری کے دارالافتاء میں ان کے رفیق کار رہے۔ اور ملک سے آنے والے استفسارات اور ان کے جوابات میں معاون رہے۔ ۱۳۲۸ھ میں باقاعدہ فتاوی نویسی کی اجازت ملی۔ ''اعلیٰ حضرت امام اہلسنّت'' نے آپ کی قابلیت کے پیش نظر ''ابوالبرکات محی الدین جیلانی آل رحمٰن محمد عرف مصطفیٰ رضا'' کی مہر اپنے اہتمام میں بنوا کر دی۔ سفر

حج میں سید علوی مالکی شیخ الحرم المکی اور علامہ سید محمد ابن امین علماء مکہ سے سند قابلیت حاصل کی ابوالحسن احمد نوری سے اجازت وخلافت حاصل کی۔ شعر وسخن میں خاصا لگاؤ تھا۔ آپ کی کئی تصانیف اہل علم کے لیے مشعل راہ بنیں۔ ''الاستمداد'' کے حواشی و تکمیلات ملقب بلقب تاریخی ''کشف ضلال دیوبند'' آپ کے ہی رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ آپ نے اعلیٰ حضرت کے علمی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے بے پناہ محنت کی اور آپ کی تالیفات کو شائع کرانے کا اہتمام کیا۔ آپ کے مدرسہ کو جاری رکھا۔ پھر آپ کے روحانی اور علمی حلقہ کو برقرار رکھا۔ آپ کے لاکھوں مرید ہیں۔ اور آپ ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ طریقت وحقیقت کے حقائق کے پیش کرنے میں ہندوستان میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملفوظات اعلیٰ حضرت کی چار جلدیں آپ نے ترتیب دیں۔

۱۳ محرم ۱۴۰۲ھ ۱۱ نومبر ۱۹۸۱ء ۱۱ بجکر ۴۰ منٹ شب پنجشنبہ واصل بحق ہوئے۔ مزار خانقاہ عالیہ رضویہ میں مرجع خلائق ہے۔

مفتی برہان الحق جبل پوری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۸۴ء):

حضرت مولانا عبدالباقی برہان الحق جبلپوری قادری برکاتی رضوی خلف الرشید مولانا عبدالسلام خلیفہ اعلیٰ حضرت ۱۳۰۱ھ میں جبل پور میں پیدا ہوئے۔ درسیات والد مکرم سے مکمل کیے۔ ۱۳۲۳ھ میں بریلی کے عظیم الشان سالانہ جلسہ میں دستار فضیلت حاصل کی۔ اور خلافت ملی۔ اعلیٰ حضرت نے آپ کو ''برہان الحق'' کا خطاب عطا فرمایا۔ مدھیہ پردیش میں آپ کا مدرسہ روحانی فیضان کا مرکز تھا۔ بڑے متقی، عالم، اور مستعد سنی راہنما تھے۔ اجلال الیقین بہ تقدیس المرسلین آپ کی تصنیف ہے۔ آپ نے ۲۵ دسمبر ۱۹۸۴ء کو وصال فرمایا۔

امین الفتویٰ مفتی محمد شفیع قادری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۲۰ء):

تازہ ضرب شفیع احمد سے
کہنہ بخاری اٹھاتے یہ ہیں

دے حسنین وہ تیغ ان کو
جس سے برے کھسیاتے یہ ہیں

نجدیہ میں ہلچل رہے ان کی
جیسے بل ان پہ چلاتے یہ ہیں

کم کو فزوں افزوں کو فزوں تر
کر دے ترا ہی کھاتے یہ ہیں

اپنوں میں ان کے مثل فزوں کے
تیرا ذکر بڑھاتے یہ ہیں

مولانا مولوی محمد شفیع احمد بیسلپوری قادری برکاتی اعلیٰ حضرت کے خلیفہ اور امین الفتوی دارالافتاء تھے۔ والد گرامی کا اسم فضل احمد تھا۔ آپ فاتح روہیلکھنڈ حافظ رحمت خان کی فوج کے سپہ سالار عبدالرشید خاں کی اولاد سے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پیلی بھیت کے ''دار العلوم مدرسۃ الحدیث'' میں حدیث پڑھی۔ اعلیٰ حضرت امام اہلسنّت پیلی بھیت تشریف لائے تو نگاہ انتخاب آپ کو بریلی میں ساتھ ہی لے گئی۔ اور فتاویٰ نویسی اور کتب خانہ کی نگرانی پر مقرر ہوئے۔ آپ کے استاد حضرت محدث سورتی نے اپنی صاحبزادی حلیم النساء آپ کے نکاح میں دیدی۔ اعلیٰ حضرت نے جن شاگردوں اور مریدوں کو اپنے اعتماد میں لیا ان میں سے مولانا شفیع احمد بھی تھے۔ آپ کو ''امین الفتوی'' کا خطاب دیا۔ ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ بمطابق ۱۹۲۰ء کو رحلت فرمائی۔ مزار قصبہ بیسلپور میں زیارت گاہ عام و خواص ہے۔ آپ کی وفات پر اعلیٰ حضرت نے پر زور قطعہ تاریخ لکھ کر آپ کی قابلیت کو سراہا۔ ''نعتیہ دیوان'' اور ''مجموعہ فتاویٰ'' آپ کی علمی یادگار ہیں۔

حضرت مولانا حسنین رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مولانا مولوی حسنین رضا خاں بریلوی قادری برکاتی نوری تلمیذ و خلیفہ اعلیٰ حضرت بریلوی اور خلف الرشید مولانا حسن رضا خاں قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ ہیں ''مدرسہ ارشاد العلوم رامپور'' میں کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ آپ بہت سی کتابوں کے مؤلف تھے۔ ''حلیہ اعلیٰ حضرت''، ''وصایا شریف''، ''اسباب زوال امت'' کے علاوہ آپ نے اعلیٰ حضرت بریلوی کی بہت سی کتابوں کو اپنے اہتمام میں شائع کرایا۔ بریلی الیکٹرک پریس آپ نے ہی قائم کیا تھا اور اہل سنت کا لٹریچر شائع کر کے بڑی اہم خدمات سرانجام دیں۔ آپ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔

(''جہانِ رضا'' فروری ۱۹۹۲ء)

''خیابانِ رضا'' کے گلہائے خوش رنگ

مولانا غلام رسول صاحب سعیدی مدظلہٗ:

حضرت علامہ سعیدی صاحب علمائے اہلسنّت میں ایک معلّم، مفتی اور صاحب قلم کی حیثیت سے معروف ہیں۔ آپ نے مسلم شریف کی شرح لکھ کر دنیائے علم و فضل میں بڑا نام پیدا کیا۔ اپنی مختلف تصانیف کے علاوہ آپ ''مرکزی مجلسِ رضا'' کے لیے ''ضیائے کنز الایمان'' اور ''فاضل بریلوی کا فقہی مقام'' لکھ کر خیابانِ رضویت کے گلہائے رنگا رنگ میں شامل ہوئے۔ آپ دہلی میں ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ پاکستان بنا تو کراچی آئے۔ ''جامعہ محمدیہ رضویہ'' رحیم یار خان میں ابتدائی دینی کتابیں پڑھیں ''جامعہ نعیمیہ لاہور'' سے فنی علوم حاصل کیے جامعہ مظہریہ امدادیہ بندیال سے تکمیل کی سندیں لیں۔ آپ مختلف رسائل و جرائد میں مضامین لکھتے رہے ہیں۔ جن میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی نظریاتی تحریروں کا رنگ جھلکتا ہے۔ آپ غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور مرید ہیں ان دنوں ''دارالعلوم نعیمیہ کراچی'' میں مدرس ہیں اور مرکزی مجلسِ رضا کے قلمی معاونین کی صف اول میں ہیں۔ (رابطہ: علامہ غلام رسول سعیدی ''دارالعلوم نعیمیہ فیڈرل بی ایریا'' کراچی)

مفتی غلام سرور قادری مدظلہ العالی:

آپ نے اپنی علمی خدمات کے پیشِ نظر پاکستان کے سیاسی اور دینی حلقوں میں اپنا مقام بنایا ہے۔ اپنی دوسری تالیفات کے ساتھ ساتھ ''الشاہ احمد رضا خان بریلوی'' کی وجہ سے دنیائے سنیت میں نام آور ہوئے۔ آپ ۱۹۳۹ء میں ضلع مظفر گڑھ کے

ایک گاؤں ''کچی لعل'' میں پیدا ہوئے۔ آپ نے سنی مدارس دینیہ سے مختلف علماء کرام سے علمی استفادہ کیا۔ اور کئی مدارس سے سند فضیلت حاصل کی۔ مولانا غلام رسول داجلی، مفتی امید علی خان رامپوری، سید مسعود علی صاحب، مولانا غلام جہانیاں، علامہ سید احمد سعید کاظمی، مولانا عبید اللہ، شیخ الحدیث مولانا سردار احمد فیصل آبادی، مفتی محمد حسین نعیمی ..، قاری ریحان الحق سہارنپوری جیسے عمائدین عصر سے شرف تلمذ رہا۔ مدرسہ عربیہ انوار العلوم ملتان، جامعہ رضویہ ہارون آباد جامعہ نظامیہ لاہور کے تدریسی سٹاف میں رہے۔ ''تحریکِ نظام مصطفیٰ'' میں گرفتار ہوئے۔ خواجہ عبدالرحمٰن بھرچونڈی شریف مفتی اعظم ہند الشاہ مصطفیٰ رضا خاں بریلی سے اجازت و خلافت حاصل کی۔ ان دنوں لاہور میں آپ نے اپنا ادارہ ''مصباح القرآن'' قائم کیا ہے۔

(رابطہ: مفتی غلام سرور صاحب قادری ڈائریکٹر ادارہ مصباح القرآن۔ سوک سنٹر، ماڈل ٹاؤن، لاہور)

قاری محمد امانت رسول صاحب رضوی مدظلہ العالی:

بلبل باغ رضا الحاج قاری محمد امانت رسول پیلی بھیتی ۱۳۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی محمد ہدایت رسول ہے۔ آپ نے مفتی اعظم ہند مفتی وجیہ الدین رضوی، مولانا مشاہد رضا چشتی، قاری عمران رضوی پیلی بھیتی سے تعلیم حاصل کی۔ مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا نوری سے قادریہ، برکاتیہ، رضویہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ سلسلہ میں خلافت پائی۔ قطبِ مدینہ حضرت مولانا ضیاء الدین احمد قادری مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت ملی آپ مفتی اعظم کے محبوب نظر اور مقرب رہے۔ آپ ''خیابانِ رضویت کے گلہائے رنگا رنگ'' کی خوشبوؤں کی مہک ہیں۔ ''تجلیاتِ امامِ احمد رضا''، ''پندرہویں صدی کے مجدد'' ''اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں انصاریوں کا مقام'' جیسی بلند کتابیں علمی دنیا میں بڑی مقبول ہوئیں۔ اور دعوتِ اسلامی پاکستان کے امیر، مولانا محمد الیاس قادری دامت برکاتہم العالیہ آپ کے ہی خلیفہ مجاز ہیں۔ (رابطہ: قاری محمد

''خیابانِ رضا'' کے گلہائے خوش رنگ

مولانا غلام رسول صاحب سعیدی مدظلہٗ:

حضرت علامہ سعیدی صاحب علمائے اہلسنّت میں ایک معلّم، مفتی اور صاحب قلم کی حیثیت سے معروف ہیں۔ آپ نے مسلم شریف کی شرح لکھ کر دنیائے علم وفضل میں بڑا نام پیدا کیا۔ اپنی مختلف تصانیف کے علاوہ آپ ''مرکزی مجلسِ رضا'' کے لیے ''ضیائے کنزالایمان'' اور ''فاضل بریلوی کا فقہی مقام'' لکھ کر خیابانِ رضویت کے گلہائے رنگا رنگ میں شامل ہوئے۔ آپ دہلی میں ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ پاکستان بنا تو کراچی آئے ''جامعہ محمدیہ رضویہ'' رحیم یار خان میں ابتدائی دینی کتابیں پڑھیں ''جامعہ نعیمیہ لاہور'' سے فنی علوم حاصل کیے جامعہ مظہریہ امدادیہ بندیال سے تکمیل کی سندیں لیں۔ آپ مختلف رسائل وجرائد میں مضامین لکھتے رہے ہیں۔ جن میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی نظریاتی تحریروں کا رنگ جھلکتا ہے۔ آپ غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور مرید ہیں ان دنوں ''دارالعلوم نعیمیہ کراچی'' میں مدرس ہیں اور مرکزی مجلسِ رضا کے قلمی معاونین کی صف اول میں ہیں۔ (رابطہ: علامہ غلام رسول سعیدی ''دارالعلوم نعیمیہ فیڈرل بی ایریا'' کراچی)

مفتی غلام سرور قادری مدظلہ العالی:

آپ نے اپنی علمی خدمات کے پیشِ نظر پاکستان کے سیاسی اور دینی حلقوں میں اپنا مقام بنایا ہے۔ اپنی دوسری تالیفات کے ساتھ ساتھ ''الشاہ احمد رضا خان بریلوی'' کی وجہ سے دنیائے سنیت میں نام آور ہوئے۔ آپ ۱۹۳۹ء میں ضلع مظفر گڑھ کے

ایک گاؤں ''کچی لعل'' میں پیدا ہوئے۔ آپ نے سنی مدارس دینیہ سے مختلف علماء کرام سے علمی استفادہ کیا۔ اور کئی مدارس سے سند فضیلت حاصل کی۔ مولانا غلام رسول داجلی، مفتی امید علی خان رامپوری، سید مسعود علی صاحب، مولانا غلام جہانیاں، علامہ سید احمد سعید کاظمی، مولانا عبیداللہ، شیخ الحدیث مولانا سردار احمد فیصل آبادی، مفتی محمد حسین نعیمی وغیرہ، قاری ریحان الحق سہارنپوری جیسے عمائدین عصر سے شرف تلمذ رہا۔ مدرسہ عربیہ انوار العلوم ملتان، جامعہ رضویہ ہارون آباد جامعہ نظامیہ لاہور کے تدریسی سٹاف میں رہے۔ ''تحریکِ نظام مصطفیٰ'' میں گرفتار ہوئے۔ خواجہ عبدالرحمٰن بھرچونڈی شریف مفتی اعظم ہند الشاہ مصطفیٰ رضا خاں بریلی سے اجازت وخلافت حاصل کی۔ ان دنوں لاہور میں آپ نے اپنا ادارہ ''مصباح القرآن'' قائم کیا ہے۔

(رابطہ: مفتی غلام سرور صاحب قادری ڈائریکٹر ادارہ مصباح القرآن۔ سوک سنٹر، ماڈل ٹاؤن، لاہور)

قاری محمد امانت رسول صاحب رضوی مدظلہ العالی:

بلبل باغِ رضا الحاج قاری محمد امانت رسول پیلی بھیتی ۱۳۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسمِ گرامی محمد ہدایت رسول ہے۔ آپ نے مفتی اعظم ہند مفتی وجیہ الدین رضوی، مولانا مشاہد رضا چشتی، قاری عمران رضوی پیلی بھیتی سے تعلیم حاصل کی۔ مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا نوری سے قادریہ، برکاتیہ، رضویہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ سلسلہ میں خلاف پائی۔ قطب مدینہ حضرت مولانا ضیاء الدین احمد قادری مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت ملی آپ مفتی اعظم کے محبوب نظر اور مقرب رہے۔ آپ ''خیابانِ رضویت کے گلہائے رنگا رنگ'' کی خوشبوؤں کی مہک ہیں۔ ''تجلیاتِ امام احمد رضا''، ''چودہویں صدی کے مجدد''، ''اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں انصاریوں کا مقام'' جیسی بلند پایہ کتابیں علمی دنیا میں بڑی مقبول ہوئیں۔ اور دعوتِ اسلامی پاکستان کے امیر، مولانا محمد الیاس قادری دامت برکاتہم العالیہ آپ کے ہی خلیفہ مجاز ہیں۔ (رابطہ: قاری محمد

امانت رسول رضوی، محلّہ بھورے کان، پیلی بھیت، یوپی، انڈیا)

مولانا محمد انور علی رضوی ایم اے:

آپ بریلی شریف کے ''دارالعلوم منظر اسلام'' کے شیخ الادب ہیں۔ آپ درگا[illegible] ضلع بہرائچ انڈیا میں ۱۹۵۶ء میں پیدا ہوئے اور دارالعلوم ''حشمت الرضا نگر'' پیلی بھیت سے تعلیم حاصل کی مفتی اعظم ہند الشاہ مصطفیٰ رضا نوری، قدس سرہٗ کے دارالاسلام، مظہرالاسلام، بی بی جی بریلی شریف میں داخلہ لے کر مولانا حسنین رضا قادری مولانا محمد اعظم سے دینی کتابوں کی تکمیل کی۔ آپ نے درسِ نظامی سے دستار فضیلت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف علومِ جدیدہ پر عبور حاصل کیا۔ اور ایم اے کیا۔ آپ نے ۱۹۸۲ء میں ''مکتبہ المصطفیٰ'' قائم کیا جس کا مقصد امام اہل سنت سید امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ کی تصانیف کی اشاعت کرنا تھا۔ آپ نے اس مکتبہ سے اعلیٰ حضرت کی کئی نادر و نایاب کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ کیں۔ آپ ایک عرصہ تک ماہنامہ ''اعلیٰ حضرت'' میں لکھتے رہے ہیں جن میں ''انتخابِ نوری''، ''انتخاب کلامِ رضا''، ''مناقبِ اعلیٰ حضرت''، ''مناقبِ مفتی اعظم'' جیسے بلند پایہ مقالات علمی دنیا میں بڑے مشہور ہوئے آپ آج بھی خیابانِ رضا کے مہکتے ہوئے پھول ہیں۔

(رابطہ: سید محمد انور علی صاحب ایم اے شیخ الادب، دارالعلوم منظرِ اسلام، بریلی، یوپی، انڈیا)

مولانا شہاب الدین رضوی مدظلہٗ العالی:

چند سال ہوئے مولانا شہاب الدین رضوی مدظلہٗ العالی کی ایک ضخیم کتاب ''مفتی اعظم اور اس کے خلفاء'' علمی دنیا میں آئی تو دل کے غنچے خیابان رضا کی خوشبو سے مہک اٹھے۔ اس کتاب میں آپ نے مفتی اعظم کے خلفاء کا ہی تذکرہ نہیں لکھا، بلکہ برِ صغیر پاک و ہند کے علماء اہل سنت کی تاریخ مرتب کر دی ہے۔ آپ شیدا پور ضلع

بہرائچ، یوپی، انڈیا میں ۱۳۷۲ھ کو پیدا ہوئے۔ رام پور کی عظیم درس گاہ ''الجامعۃ الاسلامیہ'' میں داخل ہو کر علوم دینیہ حاصل کیے۔ ۱۴۰۲ھ کو مفتی محمد اختر رضا خان ازہری قادری سے بیعت ہو کر ''سلسلہ رضویہ'' سے ارادت حاصل کی۔ ماہنامہ ''دامنِ مصطفیٰ''، ''بریلی سُنی دنیا'' بریلی میں بلند پایہ علمی مضامین لکھے اور ۱۹۸۹ء میں مفتی سید شاہد علی رضوی رام پور کی نگرانی میں ''مفتی اعظم کے خلفاء'' پر ایک مفصل کتاب لکھی جو ''رضا اکیڈمی بمبئی'' سے چھپی۔ آپ کے اس علمی کارنامہ نے آپ کو ''خیابانِ رضا'' کا گل سرسبد بنا دیا ہے۔ اور آپ کی اس کاوش سے ''گلستانِ رضویت'' میں بہار آ گئی ہے۔

(رابطہ: مولانا محمد شہاب الدین رضوی الجامعۃ الاسلامیہ گنج قدیم، رام پور، یوپی، انڈیا)

(''جہانِ رضا'' مارچ 1992ء)

لاہور کے علمائے کرام کی یادیں

ابھی پاکستان نہیں بنا تھا۔ برصغیر پر انگریز کی حکومت تھی غلامی کے منحوس سائے سارے ملک پر چھائے ہوئے تھے اس کے باوجود لاہور اپنی علمی اور دینی روایات کو برقرار رکھنے میں ایک نمایاں کردار ادا کیا کرتا تھا۔ اس شہر کے مختلف علاقوں میں علمائے کرام، مشائخ عظام، دانشور، قومی راہنما اور شعراء اپنے اپنے انداز میں علمی اور ادبی محفلیں سجائے رکھتے تھے۔ آیئے آج اس دور کے چند علمائے اہلسنت کی محافل اور مجالس کی یادیں تازہ کریں اور قارئین ''جہان رضا'' کو پچاس سال پیچھے لے جا کر لاہور کا علمی نظارہ کرائیں۔

یہ ۱۹۳۹ء (آج سے پچپن سال پہلے) کا زمانہ تھا۔ میں لاہور میں ایک ایسے سنی عالم دین کے دستر خوان علم کی خوشہ چینی کر رہا تھا۔ جو دہلی دروازے کے باہر ٹی کوتوالی کے شمال میں ایک دو منزلہ مسجد میں مسند رشد و ہدایت بچھائے ہوئے تھے۔ یہ عالم دین حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی، نقشبندی، مجددی مؤلف ''تفسیر نبوی'' تھے۔ جو جبہ و دستار سے بے نیاز نہایت سادگی کا علم و عرفان کا سرچشمہ تھے۔ ان کی مجلس میں لوگ دور دراز سے آتے، طلبہ علم دین حاصل کرنے پہنچتے، مختلف علاقوں سے آئے ہوئے علمائے کرام دینی مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ کئی سالکان طریقت ''مجددی سلسلہ روحانیت'' میں آپ کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کرتے تھے۔ میں نے یہاں طلبہ کو کتابوں کے سامنے سر ہلا ہلا کر سبق یاد کرتے دیکھا۔ میں نے یہاں علماء کرام کو دینی و اعتقادی مسائل پر نہایت سنجیدگی سے بحث و تمحیص کرتے سنا۔ میں نے

یہاں بعض صوفیہ کو رات بھر نوافل میں سجدہ ریز دیکھا۔ میں نے یہاں اہل دل کو مراقبے میں گردن خمیدہ پایا۔

مولانا محمد نبی بخش حلوائی، حضرت مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے ''مدرسہ فتحیہ اچھرہ'' کے فارغ التحصیل تھے۔ یہ مدرسہ میاں فتح محمد مجددی ذیلدار اکبر و خلیفہ حضرت صاحبزادہ عبدالرسول قصوری نے قائم کیا تھا۔ (آج جماعت اسلامی کے سابقہ ایم۔ این۔ اے میاں عثمان انہی کے پوتے ہیں) مناظر اسلام مولانا غلام دستگیر قصوری الہاشمی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمد نبی بخش حلوائی کو اپنی مریدی اور تربیت میں لیا۔ اور ''سلسلہ نقشبندیہ'' میں خلیفہ مجاز کی خلعت سے نوازا۔ آپ نے زندگی کے تیس سالوں میں اپنی مشہور تالیف ''تفسیر نبوی'' کی پندرہ جلدیں پنجابی اشعار میں مکمل کی تھیں۔ آپ نہایت خاموشی اور سادگی سے کام کرتے تھے۔ نام و نمائش سے دور رہ کر دین کی خدمت میں مصروف رہتے۔ ''تفسیر نبوی'' کے علاوہ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں جو اہل علم و فضل میں بڑی مقبول ہوئیں۔ ان دنوں آپ کے زیر تربیت جن طلبہ نے فیض پایا ان میں سے مولانا باغ علی صاحب نسیم (جو ان دنوں مکتبہ نبویہ کی اشاعتی سرگرمیوں میں مصروف ہیں) حافظ محمد عالم صاحب سیالکوٹی (جنہوں نے سیالکوٹ میں ایک شاندار دینی دار العلوم قائم کر کے ہزاروں علماء دین کی تربیت کی) صوفی غلام حسین گوجری (جو ملک کے مایہ ناز خطیب کی حیثیت سے شہرت یاب ہوئے) پیر سید علی حسین شاہ صاحب مجددی علی پور سیداں (جو ایک پیر طریقت کی حیثیت سے لاکھوں افراد کی روحانی رہنمائی کا ذریعہ بنے) کے نام ابھی تک یاد ہیں۔ راقم الحروف نے بھی آپ کے علمی دستر خوان سے جو خوشہ چینی کی اس کے اثرات اور ثمرات زندگی بھر قائم رہے ہیں۔

ان ہی دنوں مولانا غلام دین رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں کا چرچا سارے پنجاب میں تھا۔ آپ گجرات کے ایک دور افتادہ گاؤں سے آئے اور ''دار العلوم حزب الاحناف لاہور'' سے فارغ التحصیل ہو کر ریلوے کے ''لوکو شیڈ'' کے سامنے ایک کھلے سپاٹ

میدان میں جمعہ پڑھانے لگے۔ چھوٹی سی مسجد میں کھڑے ہوتے۔ سامعین سامنے
میدان میں بیٹھتے۔ آپ کی آواز میں رس تھا۔ گلے میں مٹھاس تھی۔ اور انداز بیاں
دلوں میں اترتا جاتا تھا۔ ریلوے کے مزدور جمعہ کی نماز کے وقفے میں آپ کی تقریر
سنتے تو پورا ہفتہ سرور میں رہتے۔ آپ اکثر پنجابی میں تقریر کیا کرتے تھے۔ دوران
تقریر ایسے درد بھرے اشعار لاتے کہ دلوں کو موہ لیتے تھے۔ میں نے ان کی تقریریں
سنیں۔ ان کی تقریر چھوڑ کر اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ریلوے مزدوروں کے علاوہ
لاہور کے مختلف علاقوں کے لوگ بھی آپ کی تقریر کی چاشنی لینے پہنچ جاتے۔ آپ کے
سامعین کا یہ مجمع دور دور تک نظر آتا۔ مولانا غلام دین کی تقاریر نے ریلوے کے
مزدوروں اور ملازمین کی جو اعتقادی تربیت کی اس کا نتیجہ تھا کہ ریلوے کے کارخانوں
سے جو اہل کار کہیں تبدیل ہو کر جاتا عشق مصطفیٰ ﷺ کی خوشبوئیں ساتھ لے جاتا۔

وہ صبح کی نماز کے بعد قرآن کا درس دیتے۔ اس درس میں لاہور کے مختلف
علاقوں کے لوگ شریک ہوتے۔ آپ قرآن کی تفسیر کے ایسے ایسے نکتے ذہن نشین
کراتے جو دل و دماغ کو درخشاں کر دیتے۔ مجھے آپ کے کئی درسوں میں شرکت کا
موقع ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج نصف صدی گزر گئی مگر مولانا کے انداز بیاں کا نقش
ایک سرور بن کر ذہن پر چھایا ہوا ہے۔ آپ کی چھوٹی سی مسجد آج ایک بہت بڑی مسجد
میں تبدیل ہو چکی ہے۔

مولانا غلام دین مرحوم کے ایک ہمنوا مولانا محمد بخش مسلم، بی۔ اے لوہاری
دروازے کے باغ میں جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ آج یہاں ایک بلند و بالا مینار کے
ساتھ "مسلم مسجد" سر اٹھائے کھڑی ہے ان دنوں وہاں صرف کارپوریشن کا باغ تھا اور
ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کے محراب کے ساتھ پھلیروں (گل فروشوں) کی چھابڑیاں
تھیں۔ مولانا مسلم، علم دین اور انگریزی زبان پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ گورا چٹا رنگ
اور سر پر سرخ ترکی ٹوپی مولانا کا خصوصی نشان تھا۔ آپ عظمت اسلام پر تقریر کرتے تو

انگریزی کے دلچسپ فقرے فرفر بولتے۔ خوش آواز تھے۔ انداز بیاں میٹھا تھا۔ لوگ
[illegible] جوق آتے۔ نوجوان طبقہ خصوصاً کالجوں کے طلبہ ان کی تقریر سننے کا اہتمام
کرتے تھے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ مولانا مسلم تقریر کر رہے ہیں اور ان کے مجمع کے
[illegible] عورتیں اور مردان کی تقریر سن رہے ہیں۔ ایک زمانہ آیا کہ مجھے مولانا محمد بخش
مسلم مرحوم کے ساتھ بڑی طویل مجالس کا موقع ملا۔ مجھے آپ نے بتایا کہ میری تقریر
سے متاثر ہو کر پاکستان بننے سے پہلے ایک سو سے زیادہ ہندو مرد اور عورتیں مسلمان
ہوئے تھے۔ مولانا مسلم، "تحریک پاکستان" کے زبردست ترجمان تھے۔ وہ مسلم لیگ
کے منشور کے زبردست حامی تھے۔ وہ احراری، خاکساری اور کانگریسی مولویوں کے
مقابلے میں "نظریۂ پاکستان" پر بڑی توانائی سے خطاب کیا کرتے تھے۔ آپ کے
سامعین کا حلقہ اہل علم و ذوق کا حلقہ تھا۔ یہ لوگ سیاسی شعور کے مالک تھے۔ پاکستان
بننے کے بعد مولانا مسلم، علمائے اہلسنت کی ایک ٹیم کے ساتھ ملک بھر میں "نظام
مصطفیٰ" اور "قانون اسلامی" کے نفاذ میں سرگرم رہے۔ اس ٹیم میں شیخ القرآن مولانا
عبدالغفور ہزاروی وزیر آبادی، مولانا غلام دین صاحب لوکوشیڈ، مولانا محمد بشیر کوٹلی
لوہاراں، مولانا ابوالحسنات قادری خطیب مسجد وزیر خاں، مولانا محمد شریف نوری، مولانا
محمد عمر اچھروی اور مولانا عارف اللہ شاہ راولپنڈی جیسے بلند پایہ خطیب تھے۔ رحمۃ اللہ علیہم۔ ان
علمائے ملک بھر میں دینی قیادت کے فرائض سرانجام دیئے۔ مولانا مسلم خطیب ہونے
کے ساتھ ساتھ ایک ادیب، ایک مصنف، اور ایک مقالہ نگار دانشور بھی تھے۔ ان کی کئی
تالیفات آج بھی اہل ذوق کے مطالعہ کا حصہ ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد مولانا غلام دین مرحوم کے برادرزادے مولانا محمد شریف
نوری مرحوم نے اپنی تقاریر میں بڑا نام پایا۔ مولانا نوری، مولانا نور اللہ بصیر پوری رحمۃ اللہ علیہ
کے مدرسہ حنفیہ بصیر پور سے سند فضیلت لے کر آئے۔ حضرت بلھے شاہ کے شہر قصور
میں اپنی خوش آوازی سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا۔ آپ نے اپنی خوش بیانی سے قصور

کے مردوزن کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ قصور کے لوگ محبت والفت میں مشہور ہیں۔ وہ خوش نمائی اور خوش بیانی کے دلدادہ ہیں۔ نوری صاحب کی میٹھی تقریر سننے کے لیے سارا قصور امڈ آتا۔ آپ کی مسجد کے بام ودر کے علاوہ دور دور تک کھلی جگہ نمازیوں سے بھر جاتی۔ آپ ترنم سے شعر پڑھتے تو دلوں کی گہرائیوں میں جگہ بنالیتے۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ لاہور آگئے۔ شاہ عالمی دروازے کے باہر ایک باغ کی مسجد میں جمعہ پڑھانے لگے کچھ عرصہ بعد یہ جگہ تنگ ہوگئی تو آپ ''میو ہسپتال'' کے ساتھ نمک منڈی کی مسجد میں خطبہ دینے لگے۔ ان دنوں اس مسجد کے سامنے ایک کھلا میدان تھا جہاں آپ کی تقریر سننے والے دور دور تک بیٹھے نظر آتے۔ یہ جگہ تنگ پڑگئی تو نوری صاحب راوی روڈ پر (جہاں آپ کی تعمیر کردہ ''مسجد محمدی'' کا بلند وبالا مینار آپ کے مزار پر سایہ فگن نظر آتا ہے) ایک کھلے میدان میں تقریر کرنے لگے۔ جہاں سیکڑوں نہیں ہزاروں سامعین جمعہ پڑھنے آتے۔ نوری مرحوم کی شہرت لاہور سے نکل کر سارے پاکستان میں پھیل گئی۔ ہر شہر کے اہل محبت نے آپ کو بلایا اور آپ کی تقریریں سنیں۔ آپ نے عالم اسلام کا دورہ کیا حرمین شریفین سے نکل کر وہ مصر، فلسطین، بیت المقدس، عراق، ایران، افغانستان میں گئے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھیں آپ کی ''بارہ تقریریں'' بڑی مشہور ہوئیں۔ آج ہمارے نوجوان خطیب اسی کتاب کے صفحات سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ آپ کا ماہنامہ رسالہ ''الحبیب' ایک عرصہ تک اپنے قارئین سے داد وتحسین وصول کرتا رہا ہے۔ آپ ایک بھرپور خطیبانہ، ادیبانہ اور عالمانہ زندگی گزار کر جوانی میں ہی چل بسے۔

شاہی قلعہ لاہور کی دیواروں کے قریب مغلیہ دور کی ایک خوبصورت مسجد ہے جو ''بیگم شاہی مسجد'' کے نام سے مشہور ہے۔ سکھوں کے دور اقتدار میں یہ مسجد بارود خانہ بنادی گئی تھی۔ جب مسجد آزاد ہوئی تو اس میں بڑے بڑے جید علماء کرام آئے۔ مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ اسی مسجد کے خطیب تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ایک عالم دین

مولانا محمد عمر مرحوم یہاں آئے۔ جنہوں نے اس کو ''حلقۂ صوفیہ'' میں تبدیل کردیا۔ وہ اپنی تقریروں میں بزرگان دین کے ایسے ایسے ایمان افروز واقعات بیان کرتے کہ جو شخص ایک بار ان کا بیان سن لیتا وہ ساری مسجدیں چھوڑ کر آپ کی محفل میں دوڑا آتا۔ آپ صوفی منش عالم دین تھے۔ سیاسی اور دینی مسائل کی بحث میں نہ پڑتے۔ بس بزرگان دین اور صوفیۂ کرام کی تعلیمات کو بڑے دلنشین پیرائے میں بیان کرتے اور دلوں کو عشق ومحبت سے مالامال کرتے جاتے۔

شاہی مسجد کے ایک نامور خطیب مولانا غلام مرشد مرحوم ہوئے ہیں۔ وہ سرگودھا کے ایک گاؤں ''انگہ'' سے اٹھے اور اپنے علم وفضل کی وجہ سے لاہور پر چھا گئے۔ وہ بے حد ذہین، طباع اور حافظ احادیث نبوی (بقول مولانا مسلم مرحوم آپ کو ''بخاری شریف'' ازبر تھی) عالم دین تھے۔ ایک عرصے تک ''دارالعلوم نعمانیہ'' میں مدرس رہے۔ ان کی مجالس میں اہل علم وفضل کا جمگھٹا ہوتا اور وہ دین کے دقیق مسائل کو حل کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ شاہی مسجد کے علاوہ وہ ''سنہری مسجد لاہور'' میں ایک عرصہ تک درس قرآن دیتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد ان کا میلان طبع دولت مندوں اور دنیا داروں کی طرف زیادہ ہوگیا تھا۔ اگرچہ وہ شہنشاہ عالم گیر کی شاندار شاہی مسجد کے خطیب تھے مگر میں نے انہیں اکثر اہل اقتدار اور اہل دول کے دروازوں پر کھڑے دیکھا۔ میں اتنے بڑے عالم دین کو جب دنیا داروں کے دروازوں پر کھڑا پاتا تو مجھے ندامت ہوتی۔ وہ بایں علم وفضل دنیا داروں کے ہوکر رہ گئے۔ وہ حکومت وقت کی غیر اسلامی مصلحتوں پر فتوی دینے سے بھی نہ شرماتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ عام مسلمانوں کی نظروں سے گرتے گئے تیس سال کی خطابت کے بعد ایک وقت آیا کہ ان کے اپنے شاگرد خاص ''مسعود کھدر پوش'' نے انہیں شاہی مسجد کی خطابت سے ہٹادیا اور وہ عمر کے آخری حصے میں نہ ''اہل دل'' کے رہے نہ ''اہل دول'' کے!

مولانا ابوالبرکات علامہ سید احمد قادری اشرفی رحمۃ اللہ علیہ لاہور کے ''دارالعلوم

حزب الاحناف'' کے صدر نشین تھے۔ آپ حضرت مولانا سید دیدار علی الوری ؒ کے قابل فرزند ارجمند تھے۔ آپ نے زندگی بھر اپنے دارالعلوم میں تدریسی فرائض کو بڑی خوبی سے سرانجام دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنی ساری زندگی تعلیم و تدریس میں وقف کر دی تھی۔ آپ کے مدرسہ سے ہزاروں علماء اہل سنت دستار فضیلت لے کر دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچے۔ آپ نے جس پامردی سے تدریسی کام کو نباہا اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ پھر اس مسند تدریس پر مستقل مزاجی سے جو کام کیا اس کے ثمرات صدیوں تک رہیں گے۔ آج کے بڑے بڑے قد آور علمائے اہلسنت کی اکثریت ''مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف'' کے ہی چشمۂ فیض سے سیراب ہو کر نکلی ہے۔

اسی دریا سے یہ نہریں ہوئیں جاری ساری!

آپ زبردست عالم دین، محدث، مفتی، معلم اور دینی راہنما تھے۔ آپ کا فتویٰ اہلسنّت و جماعت کیلیے مستند ہوتا۔ آپ کی رائے قول فیصل ہوتی تھی۔ آپ نے زندگی بھر اگرچہ تدریسی فرائض کو ترجیحی بنیادوں پر قائم رکھا مگر میدان خطابت میں بدعقیدہ مولویوں کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے بڑی پامردی سے کام کیا۔ آپ کے صاحبزادہ سید علامہ محمود احمد رضوی نے آپ کے علمی مشن کو آگے بڑھایا۔ اور اپنے والد کی علمی تربیت کے ثمرات اپنی نوک قلم سے عوام تک پہنچائے۔ علامہ رضوی نے اپنی تالیفات، تصنیفات اور تحریروں سے اہل علم و فضل کو بڑا حصہ دیا ''فیوض الباری شرح بخاری، دین مصطفیٰ، روشنی'' اور دوسری کئی کتابیں عوام تک پہنچیں اور پسند کی گئیں۔ آپ نے اپنے والد کی مسند پر بیٹھ کر سنی اعتقادیات کی نشوونما میں نمایاں حصہ لیا۔

قیام پاکستان کے چند سال بعد مجھے مولانا مفتی محمد حسین صاحب نعیمی بانی دارالعلوم نعیمیہ کی مجالس میں حاضری کا موقع ملا۔ آپ ان دنوں ''دارالعلوم نعمانیہ لاہور'' میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ''تحریک ختم نبوت'' میں گرفتار

... قید کاٹ کر باہر آئے تو اپنے مدرسہ ''جامعہ نعیمیہ'' کی بنیاد رکھی۔ یہ دارالعلوم ... گراں کی جامع مسجد میں نہایت بے سروسامانی کے عالم میں قائم ہوا۔ مگر مفتی محمد ... صاحب نعیمی کی شبانہ روز محنت نے اس دارالعلوم کو ایک شاندار جامعہ میں بدل ... یہاں سے ہزاروں عالمان دین فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ آج مفتی صاحب کا ... دارالعلوم ... کے بہترین مدارس میں شمار ہوتا ہے۔

مفتی محمد حسین صاحب نعیمی خطیب کم مگر معلم اور منتظم زیادہ ہیں۔ انہوں نے اپنی ... زندگی تدریس میں وقف کر دی۔ تدریس سے فارغ ہوتے تو جامعہ نعیمیہ کی تعمیر ... میں اپنا وقت عزیز صرف کرتے رہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب علم و ... تدریس کے ساتھ ساتھ ایک انجینئر (مہندس) کی حیثیت سے بھی شہرۂ آفاق ... ایک زمانہ تھا کہ آپ مختصر سی تقریر کرتے جو قلب و جگر کو گرما دیتی۔ چالیس سال ... مفتی صاحب کی نیازمندی حاصل رہی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ

زمانے نے ہزاروں رنگ بدلے
نہ فرق آیا ہے اپنی مخلصی میں

... اس انتشار اور افراتفری کی وجہ سے بعض حلقے مفتی صاحب کو ''اقتدار پسند ... '' میں شامل ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب کی ... زندگی جرات اور بیباکی کی ایک کھلی کتاب ہے۔ مفتی صاحب نے ''تحریک ختم ... '' میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ صدر ایوب کے دور میں کلمۂ حق کہنے ... بلوچستان میں قید رہے۔ ''جمعیت علمائے پاکستان'' کے انتشار، مایوسی اور ... کے دور میں آپ نے بڑا اہم کردار ادا کر کے جمعیت کی از سر نو شیرازہ بندی ... ''اقتدار پرست طبقے'' سے نجات دلا کر اسے فعال بنا دیا۔ بھٹو کی آمریت نے ... گراں اور جامعہ سے محروم کر دیا۔ پی۔ این۔ اے کی تحریک چلی تو وہ صف ... کھڑے تھے۔ جنرل ضیاء کا دور آیا تو مفتی صاحب نے اپنی حق گوئی سے

آمریت کو ہر جگہ للکارا۔ آج جو لوگ مفتی صاحب کے کردار کا موجودہ سیاسی تلخی
تناظر میں تجزیہ کرتے ہیں وہ ان کی سابقہ قربانیوں کو یکسر بھول جاتے ہیں۔

حضرت مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ وزیر خاں کی جامع مسجد
کے خطیب تھے۔ وہ کشمیر کی جنگ آزادی کے ہراول دستے میں کھڑے تھے۔ آپ
''تحریک آزادی کشمیر'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مجاہدین کشمیر کی بھرپور حمایت کی
آپ کشمیر کے اگلے مورچوں میں پہنچتے اور غازیان کشمیر کو اسلحہ اور دوسری ضروریات
مہیا کرتے تھے۔ آپ کو ان خدمات کی وجہ سے ''غازی کشمیر'' کا خطاب ملا تھا۔ آپ
بہت سے علوم پر دسترس تھی۔ علوم اسلامیہ کے علاوہ آپ علم طب میں بھی یکتا
روزگار تھے۔ ملک کے بڑے بڑے نامور رؤسا آپ کے زیر علاج رہتے تھے۔ مسجد
وزیر خاں آپ کے دم قدم سے پر رونق تھی۔ وہ قاری تھے، حافظ تھے، خطیب تھے
ادیب تھے اور سیاسی راہنما تھے۔ ''تحریک ختم نبوت'' میں مارشل لاء کے حکام نے
آپ کو عمر قید کی سزا دی۔ آپ کے اکلوتے بیٹے مولانا خلیل احمد قادری کو سزائے موت
سنائی گئی مگر دونوں باپ بیٹا طویل عرصہ قید و بند میں رہنے کے بعد رہا ہوئے۔ مولانا
ابوالحسنات مرحوم نے جیلوں میں جو سختیاں برداشت کیں اس سے وہ مستقل بیمار ہو گئے
اور انہی بیماریوں نے آپ کو زندگی کی آخری رات تک پہنچا دیا۔ آپ ان سیاسی اور ملی
مصروفیات کے باوجود صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ آپ نے جیل کی تنہائیوں میں
''تفسیر الحسنات'' کے آٹھ پارے مکمل کیے۔ ابتدائی دور میں ''شرح قصیدہ بردہ'' لکھی
اور ''اوراق غم'' کے علاوہ بہت سی گراں قدر علمی یادگاریں چھوڑیں۔

مناظر اسلام مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ نے پاکستان بننے کے بعد بڑی
شہرت حاصل کی۔ اہلسنت و جماعت کے خلاف جتنے اعتقادی فتنے اٹھتے مولانا اچھروی
مرحوم چٹان بن کر ان کی سامنے کھڑے ہو جاتے۔ وہ مخالفین کے سامنے ہمیشہ سینہ سپر
رہتے۔ وہ ٹھیٹھ پنجابی میں تقریر کرتے تھے۔ قرآن پاک خاص انداز میں پڑھتے

...ں کو سکون ملتا۔ دلائل دیتے تو سننے والے عش عش کر اٹھتے۔ مخالفین کی گرفت کرتے
تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ تقریر کرتے تو سامعین پر سناٹا طاری ہو جاتا۔ وہ
ایک عرصہ تک ''داتا گنج بخش لاہوری'' کی جامع مسجد کے اعزازی خطیب رہے۔ ان
کی تقریر سننے کے لیے پنجاب بھر کے لوگ جوق در جوق آتے۔ مولانا محمد عمر اچھروی
مرحوم ایک مناظر کی حیثیت سے ایک باکمال عالم دین تھے۔ وہ پاکستان کے گوشے
گوشے میں پہنچے۔ معاندین کو للکارا اور اپنی خطابت کا لوہا منوایا۔ مولانا محمد عمر مرحوم
... سادہ لباس، متحمل مزاج اور سادہ زندگی کے مالک تھے۔ ان کے سامنے کوئی بھی
... اپنے علمی رعب کے نیچے دبنے نہ دیتے تھے۔ چھوٹا بڑا ان سے یکساں
... کرتا۔ اور ان کی گفتگو سے خوش ہو کر جاتا۔ گفتگو پر لطف ہوتی۔ اور کسی پر گراں
... گزرتی۔ باتوں میں وزن ہوتا مگر عالمانہ رعب نہ جماتے تھے۔ انہوں نے تقاریر کی
... کے ساتھ ساتھ بڑی زوردار کتابیں لکھیں جو آج کے علماء کے لیے مشعل راہ
ہیں۔ ان کی ''مقیاسیں'' آج بھی اہل علم و فضل کی راہنمائی کرتی ہیں۔ مولانا محمد عمر اچھروی
مرحوم اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب ہیں کہ ان کی اولاد کا ہر فرد زیور علم دین سے آراستہ
... مولانا فقیر اللہ، مولانا سلطان باہو خطیب ہیں۔ مولانا عبدالتواب صدیقی مناظر
اسلام ہیں۔ مولانا عبدالوہاب صدیقی (جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے) برطانیہ
کے معروف عالم دین اور پیر طریقت تھے۔

(''جہانِ رضا'' اپریل ۱۹۹۴ء)

لاہور کی علمی شخصیات

سیّد امانت علی چشتی نظامی (م-۵ مارچ ۱۹۷۱ء):

۱۹۴۳ء میں ایک عالم دین کے صوفیانہ طرز بیاں نے لاہور کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ سید امانت علی شاہ چشتی نظامی تھے۔ وہ مثنوی مولانا روم کو خاص انداز میں بیان کرتے اور فلسفہ ''وحدت الوجود'' کو آسان انداز میں سامنے لاتے۔ ان کی آواز میں ''رومی'' بولتا تھا اور ''ابن عربی'' باتیں کرتا تھا۔ مجھے ان کی تقاریر سننے کا موقع ملا تو دامن دل پھیلا دیا وہ پیر سید نادر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں بیعت تھے اور اپنی خوش بیانی کو انہی کا فیضان بتاتے تھے۔ وہ مسجد ''شاہ کمال گنج''، مغل پورہ لاہور، میں خطابت کیا کرتے تھے۔ ''آستانہ بیت الاماں'' میں اہل محبت سے گفتگو کرتے۔ سید امانت علی شاہ کی تقاریر میں صوفیانہ رنگ ہوتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے بیان کو جب ''مثنوی مولانا روم'' کے پرسوز اشعار سے مزین کرتے تو دل چاہتا کہ بولتے جائیں۔ مجھے کبھی کبھی اپنی آمد سے نوازتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ خاصا وسیع ہو گیا تھا۔ کسی جلسہ میں اگر میں انہیں مثنوی مولانا روم کے کسی موضوع پر اظہار خیال کرنے کی فرمائش کرتا تو بڑی قدر سے قبول کرتے اور اظہار خیال فرماتے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھے ہی مخاطب فرما کر تقریر کر رہے ہیں۔ وہ ''وعظ فروش'' علماء کی طرح رٹی رٹائی تقریر نہیں کیا کرتے تھے۔ موقع محل پر ان کا بیان جداگانہ ہوتا تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی بات میں نیا لطف پیدا کر لیا کرتے۔ ایک بار آپ نے مولانا روم کے مشہور شعر ؎

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق تا بگویم شرح دردِ اشتیاق

پر تقریر شروع کی تو دو گھنٹے اس شعر سے باہر نہیں گئے اور نہ اپنے سامعین کو مجلس سے اٹھ کر باہر جانے دیا۔

شیخ المشائخ میاں جمیل احمد شرقپوری:

دارالارشاد لاہور ویسے تو کئی علماء کرام اور مشائخ عظام کا مرکز تھا۔ مگر تشکیل پاکستان کے بعد ایک نوجوان پیرزادہ، صاحبزادہ میاں جمیل احمد نقشبندی شرقپوری نے مجھے اپنی مسند روحانیت کی بجائے دامن محبت میں جگہ دی۔ یہ صاحبزادے میاں غلام اللہ ثانی شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ (برادر عزیز میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ) کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری کے کچھ عزیز فاروق گنج اور باغبانپورہ میں رہتے تھے۔ ان کے ایک عزیز شادباغ میں میرے گھر کے قریب ہی رہائش پذیر تھے جبکہ میاں جمیل احمد صاحب اپنا ایک مکان شادباغ میں تعمیر کرا رہے تھے۔ ان حالات میں آپ لاہور آتے جاتے۔ صاحبزادہ موصوف نے مجھے بھی اپنی نگاہ التفات سے نوازنا شروع کیا۔ وہ کبھی کبھی میرے غریب خانہ پر تشریف لاتے اور اس طرح میری عزت افزائی فرماتے۔ مجھے ان کی سادہ اور سیدھی باتیں عام پیروں سے مختلف محسوس ہوئیں۔ میں ان کے قریب ہوتا گیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ میاں جمیل احمد شرقپوری نے چوک دالگراں کے قریب ''مقبول عام پریس'' میں اپنی نشست گاہ بنائی تو مجھے بھی اہل علماء کرام کا دامن پکڑ کر میاں صاحب کی مجلس میں جانے کا موقع مل جایا کرتا۔

اس مجلس میں مولانا محمد بخش مسلم مرحوم، مفتی محمد حسین صاحب نعیمی، جناب مرتضیٰ احمد خان میکش، مولانا ابوالحسنات اور دوسرے علماء اہلسنت آتے جاتے تھے۔ میاں صاحب کے مریدان باصفا کا حلقہ بڑھنے لگا، تو ان کے ''نگران مریدین'' شیخ فضل الٰہی [illegible] مرحوم نے ''مقبول عام پریس'' کی بجائے ''مدینہ پریس'' بیرون لوہاری دروازہ کے ایک کمرہ میں مسند ارشاد بچھانے کا مشورہ دیا۔ یہاں صاحبزادہ صاحب کے مرید قطار در قطار آتے، بیعت ہوتے اور روحانی تربیت حاصل کرتے مگر ہم لوگ

بھی ان کی مجلس سے دور نہ ہوتے اور کبھی کبھی ''حلقہ یاراں میں ابریشم کی طرح نرم ... کر آبیٹھتے۔

صاحبزادہ جمیل احمد شرقپوری صاحب نے خانوادہ شرقپور کے فرد ہونے ... ساتھ ساتھ میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی فیضان کو عام کرنے میں بڑا ... کردار ادا کیا۔ وہ حضرت مجدد الف ثانی کے سلسلہ طریقت کو لے کر پاکستان کے گوشے ... گوشے میں پہنچے اور لوگوں کو ''سلسلہ نقشبندیہ'' کی تربیت دی۔ آپ نے ایک ماہانہ ... رسالہ ''نور اسلام'' جاری کیا جس سے حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات پھیلانے ... میں بڑا کامیاب تجربہ کیا۔ اس ماہنامہ کے کئی نمبر ''سلسلہ نقشبندیہ'' کے طریقہ ... نظریات کا مرقع بن کر سامنے آئے اور صاحبزادہ جمیل احمد شرقپوری نے اپنی نگرانی میں ... اہل علم و قلم کی جو ٹیم تیار کی تھی، اس سے بڑا کام لیا اور لوگوں کے لیے حضرت مجدد کے ... افکار کی اشاعت کی کامیاب کوشش کی۔ ''نور اسلام'' کی تحریروں کے علاوہ صاحبزادہ ... جمیل احمد شرقپوری نے ''یوم مجدد'' کے ایک روحانی سلسلے کو رواج دیا۔ انہوں ... حضرت مجدد الف ثانی کی یاد میں پاکستان کے تمام شہروں میں ''یوم مجدد'' منانے ... اہتمام کیا۔ میں نہ تو صاحبزادہ کی قلمی ٹیم کا رکن بن سکا، نہ تقریری علماء کا ہم سفر ... سکا۔ ان کی ان ساری روحانی عظمتوں کے باوجود میں ان کے روحانی حلقہ میں ... شامل نہ ہو سکا۔ مگر میاں جمیل احمد شرقپوری نے نہ مجھے کبھی نظر انداز کیا اور نہ ... التفات سے محروم کیا۔

ایک وقت آیا کہ میاں جمیل احمد شرقپوری پاکستان کی سرحدوں سے نکل کر ... اسلامی ممالک اور یورپ کے ان علاقوں میں جا پہنچے، جہاں جہاں ان کے عقیدت ... مند رہتے تھے۔ آپ نے ان ممالک میں عام پیروں کے رویہ کے برعکس چندہ ... کرنے کی بجائے ''سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ'' کے مراکز قائم کیے۔ پھر وہ دنیا بھر کے ... نقشبندی مشاہیر سے ملاقات کے لیے نکلے۔ نقشبندی بزرگوں کے مزارات ...

... وں پر پہنچے۔ اس طرح انہوں نے نقشبندی سلسلہ تصوف کی ان کڑیوں کو منظم ... کی کوشش کی جو یک جان ہوتے ہوئے بھی بکھری پڑی تھیں۔

صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب شرقپوری ایک طرف ایک کامیاب ''پیر ہیں، ... دوسری طرف ان کے حلقہ میں علماء کرام، دانشور، شعراء اور اہل قلم حضرات کی ایک ... بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ حالانکہ آج کل کے مشائخ، اہل علم کو اپنے حلقہ سے دور ہی ... رکھتے ہیں۔ ان کا دستر خوان کھلا ہے۔ اگر میں کھلا کی بجائے ''وسیع'' کہوں تو مبالغہ نہ ... ہوگا۔ وہ اہل علم و فضل کو گھر بلا کر صرف میزبانی ہی نہیں کرتے، بلکہ ان کے پاس پہنچ کر ... انہیں اپنا مہمان بنانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وہ جمعیۃ علماء پاکستان سے وابستہ ... رہے تو قید و بند کو لبیک کہتے رہے۔ انتخابی میدان میں نکلے تو اپنے مخالفین کو پسینہ ... پسینہ کر دیا۔

آج وہ ''افضل المشائخ'' ہیں۔ پیر طریقت ہیں۔ شرقپور شریف کے دربار عالیہ کے سجادہ نشین ہیں۔ ان کے صاحبزادوں میں سے ایک پیر ہیں۔ ایک ضلع ناظم ... ہیں، وہ ہیں۔ ایک دانشور ہیں۔ مگر ان تمام بلندیوں کے باوجود وہ ہم جیسے فقیروں کو ... التفات سے نوازتے رہتے ہیں اور اپنے بلند مقامات کی رعونت کی گرمی دور افتادہ اور ... کم نام لوگوں پر نہیں پڑنے دیتے۔

ایسے درویشوں کی اے اہل جہاں قدر کرو
ایسے درویشوں کا تاریخ میں نام آتا ہے

مولانا علم الدین جہلمی:

پاکستان بننے سے پہلے لاہور بہت چھوٹا سا شہر تھا۔ اس کے مسلمان، ہندو، سکھ، ... عیسائی ملا کر بہت کم آبادی تھی۔ سارے شہر کی ''سبزی منڈی'' گوالمنڈی کے چوک ... میں تھی۔ اور ''میوہ منڈی''، فلیمنگ روڈ پر برف خانہ چوک میں تھی۔ اس میوہ منڈی کی ... جامع مسجد کے ایک خطیب مولانا علم الدین تھے جو جہلم سے آکر اپنی پر جوش تقریروں

بھی ان کی مجلس سے دور نہ ہوتے اور کبھی کبھی ''حلقہ یاراں میں ابریشم کی طرح نرم'' ہو کر آ بیٹھتے۔

صاحبزادہ جمیل احمد شرقپوری صاحب نے خانوادہ شرقپور کے فرد ہونے کے ساتھ ساتھ میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی فیضان کو عام کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ وہ حضرت مجدد الف ثانی کے سلسلہ طریقت کو لے کر پاکستان کے گوشے گوشے میں پہنچے اور لوگوں کو ''سلسلہ نقشبندیہ'' کی تربیت دی۔ آپ نے ایک ماہانہ رسالہ ''نور اسلام'' جاری کیا جس سے حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات پھیلانے میں بڑا کامیاب تجربہ کیا۔ اس ماہنامہ کے کئی نمبر ''سلسلہ نقشبندیہ'' کے طریقہ اور نظریات کا مرقع بن کر سامنے آئے اور صاحبزادہ جمیل احمد شرقپوری نے اپنی نگرانی میں اہل علم وقلم کی جو ٹیم تیار کی تھی، اس سے بڑا کام لیا اور لوگوں کے لیے حضرت مجدد کے افکار کی اشاعت کی کامیاب کوشش کی۔ ''نور اسلام'' کی تحریروں کے علاوہ صاحبزادہ جمیل احمد شرقپوری نے ''یوم مجدد'' کے ایک روحانی سلسلے کو رواج دیا۔ انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی کی یاد میں پاکستان کے تمام شہروں میں ''یوم مجدد'' منانے کا اہتمام کیا۔ میں نہ تو صاحبزادہ کی قلمی ٹیم کا رکن بن سکا، نہ تقریری علماء کا ہم سفر بن سکا۔ ان کی ان ساری روحانی عظمتوں کے باوجود میں ان کے روحانی حلقہ میں بھی شامل نہ ہو سکا۔ مگر میاں جمیل احمد شرقپوری نے نہ مجھے کبھی نظر انداز کیا اور نہ نظر التفات سے محروم کیا۔

ایک وقت آیا کہ میاں جمیل احمد شرقپوری پاکستان کی سرحدوں سے نکل کر مختلف اسلامی ممالک اور یورپ کے ان علاقوں میں جا پہنچے، جہاں جہاں ان کے عقیدت مند رہتے تھے۔ آپ نے ان ممالک میں عام پیروں کے رویہ کے برعکس چندہ اکٹھا کرنے کی بجائے ''سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ'' کے مراکز قائم کیے۔ پھر وہ دنیا بھر کے نقشبندی مشاہیر سے ملاقات کے لیے نکلے۔ نقشبندی بزرگوں کے مزارات اور

خانقاہوں پر پہنچے۔ اس طرح انہوں نے نقشبندی سلسلہ تصوف کی ان کڑیوں کو منظم کرنے کی کوشش کی جو یک جان ہوتے ہوئے بھی بکھری پڑی تھیں۔

صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب شرقپوری ایک طرف ایک کامیاب ''پیر'' ہیں، تو دوسری طرف ان کے حلقہ میں علماء کرام، دانشور، شعراء اور اہل قلم حضرات کی ایک خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ حالانکہ آج کل کے مشائخ، اہل علم کو اپنے حلقہ سے دور ہی رکھتے ہیں۔ ان کا دسترخوان کھلا ہے۔ اگر میں کھلا کی بجائے ''وسیع'' کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ اہل علم وفضل کو گھر بلا کر صرف میزبانی ہی نہیں کرتے، بلکہ ان کے پاس پہنچ کر انہیں اپنا مہمان بنانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وہ جمعیۃ علماء پاکستان سے وابستہ ہوئے تو قید وبند کو لبیک کہتے رہے۔ انتخابی میدان میں نکلے تو اپنے مخالفین کو پسینہ پسینہ کر دیا۔

آج وہ ''افضل المشائخ'' ہیں۔ پیر طریقت ہیں۔ شرقپور شریف کے دربار عالیہ کے سجادہ نشین ہیں۔ ان کے صاحبزادوں میں سے ایک پیر ہیں۔ ایک ضلع ناظم شیخوپورہ ہیں۔ ایک دانشور ہیں۔ مگر ان تمام بلندیوں کے باوجود وہ ہم جیسے فقیروں کو اپنی محبت سے نوازتے رہتے ہیں اور اپنے بلند مقامات کی رعونت کی گرمی دور افتادہ اور گمنام لوگوں پر نہیں پڑنے دیتے۔

ایسے درویشوں کی اے اہل جہاں قدر کرو
ایسے درویشوں کا تاریخ میں نام آتا ہے

مولانا علم الدین جہلمی:

پاکستان بننے سے پہلے لاہور بہت چھوٹا سا شہر تھا۔ اس کے مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی ملا کر بہت کم آبادی تھی۔ سارے شہر کی ''سبزی منڈی'' گوالمنڈی کے چوک میں تھی۔ اور ''میوہ منڈی''، فلیمنگ روڈ پر برف خانہ چوک میں تھی۔ اس میوہ منڈی کی جامع مسجد کے ایک خطیب مولانا علم الدین تھے جو جہلم سے آ کر اپنی پر جوش تقریروں

کی وجہ سے بڑے معروف ہوئے۔ وہ مولانا محمد نبی بخش حلوائی کے مدرسہ ''ستی کوتوال''
میں آتے اور حضرت مولانا سے مسائل اسلامیہ پر گفتگو کرتے تھے۔ اس طرح
سب طالب علموں کے محبوب عالم دین بن گئے۔ ہم بھی ان کی تقریر سننے میوہ منڈی
پہنچتے تھے۔ مولانا علم دین، علامہ عنایت اللہ المشرقی کی عسکری تحریک سے بڑے متا
تھے۔ وہ علامہ صاحب سے نظریاتی اختلاف کے باوجود خاکساروں کی صفوں میں
کھڑے ہوتے اور ''چپ وراست'' بھی کرتے۔ ان کے ایک دوست، پروفیسر مو
عبدالحمید جو جہلم سے آئے تھے، خاکسار تحریک کے ہمنوا تھے۔ لاہور کے ریلو
اسٹیشن کے ساتھ ''آسٹریلیا مسجد'' میں شعلہ بار تقریر کرتے۔ لاہور اور لاہور میں آنے
جانے والے نمازیوں کو گرما دیتے۔ اس زمانہ میں ''آسٹریلیا مسجد'' ایک بڑی مسجد
ہوتی تھی۔ اور پروفیسر عبدالحمید مرحوم کی تقریروں نے اسے پرجوم بنا دیا تھا۔ مولانا علم
الدین مرحوم، پروفیسر عبدالحمید کے پرجوش بیان سے اتنے ہی متاثر تھے، جتنے ہم لوگ
مولانا کی جوشیلی تقریروں کے شیدائی تھے۔ نواب آف ممدوٹ نے مولانا کی تقار
سنیں تو انہیں لاہور سے اپنی ریاست ممدوٹ میں لے گئے۔ چنانچہ جلال آباد ممدوٹ
پہنچ کر مولانا علم الدین نے نہ صرف تقریر و خطاب سے لوگوں کو متاثر کیا بلکہ وہاں ایک
دارالعلوم قائم کیا۔ حافظ محمد عالم سیالکوٹی اور راقم الحروف ان کے مدرسہ میں گئے۔ چند
روز زیر تعلیم بھی رہے مگر محمد عالم سیالکوٹی صاحب چونکہ تیز رفتاری سے تعلیم کی منزلیں طے
کرنا چاہتے تھے، وہاں کے مدرسین کی سست رفتار گاڑی سے تنگ آ کر لاہور آ گئے۔

پاکستان بنا۔ ''ریاست ممدوٹ'' ہندوستان کے حصہ میں آئی تو مولانا علم الدین
بھی مہاجر بن کر پاکستان آ گئے۔ نواب آف ممدوٹ نے کئی بار انہیں فرمایا، مولانا آپ
مہاجر ہیں کچھ زمین مکان الاٹ کرا لیں۔ مگر مولانا علم دین فرمایا کرتے تھے۔ ''اصلی
مہاجر'' نہیں ہوں اور اس طرح اس وقت کی لوٹ کھسوٹ سے تہی دامن رہے۔ ان
دنوں ''دریائے جہلم'' اپنی موجوں پر بڑا نازاں ہو کر بہتا تھا۔ اس کے دائیں کنارے

پر ایک بڑی خوبصورت مسجد ''ملاحان'' تھی۔ مولانا اس میں نماز جمعہ پڑھانے لگے اور
ایک عرصہ وہاں خطابت کرتے رہے۔

پاکستان بننے کے بعد راقم الحروف محکمہ صنعت پنجاب میں انڈسٹریل ڈویلپمنٹ
آفیسر بن کر جہلم شہر کے دورے پر گیا، تو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے
مولانا کو تنگ دست پایا۔ تنخواہ تھوڑی۔ اہل و عیال کے اخراجات زیادہ تھے۔ مولانا
سادہ لوح، سادہ روش اور ہیر پھیر سے محفوظ ذہن کے مالک تھے۔ میں نے دیکھا کہ
مولانا کی مسجد کے ارد گرد شہتوتوں کے درخت قطار در قطار کھڑے ہیں۔ میں نے انہیں
مشورہ دیا کہ اگر آپ کے بچے فارغ وقت میں ریشم کے کیڑے پال کر ریشم تیار کر لیا
کریں تو آپ کو اچھی آمدنی ہو جایا کرے گی۔ ان دنوں ریشم کے کیڑے پالنے اور
ریشم کی تیاری پر ''محکمہ صنعت پنجاب'' کا کنٹرول تھا۔ مولانا کو ریشم کے کیڑوں کے
انڈے لے دیے۔ مولانا کے بچے ان انڈوں کو چارپائیوں پر بکھیر دیتے اور شہتوت
کے پتے کتر کتر کر ان کے آگے ڈال دیتے۔ بس چند ہفتوں میں ریشم کے یہ کیڑے
شہتوت کے پتوں پر پل کر جوان ہو جاتے اور اپنے منہ سے ریشم اگلنے لگتے اور مولانا
ریشم کی ٹوکریاں بھر کر لاہور لے آتے اور بیچ کر اپنا محنتانہ حاصل کرتے۔ انہوں نے
یہ کام کئی سال کیا۔ امیر تو نہ بن سکے مگر گزر اوقات میں سہولت ہو گئی۔

اس عرصہ میں مولانا لاہور ضرور آتے۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات
کے بعد ان کے مدرسہ میں ہی آ کر قیام کرتے۔ طلبہ میں بیٹھ کر علم کی باتیں کرتے۔
ریشم پیدا کرنے کے باوجود ان کا بدن کھدر کے سادہ لباس میں ہی سجتا۔ نواب آف
ممدوٹ سے مراسم ہونے کے باوجود ان سے صرف چائے کی پیالی ہی پیتے اور گھر
چلے آتے۔ امراء اور رؤساء وقت کے سامنے کلمہ حق ہی بیان کرتے۔ جھولی پھیلا کر
''دے دے میرے داتا سخی نام خدا'' کا نعرہ کبھی نہ لگایا۔ غربت کی المناک کہانی
سناتے۔ مگر امراء اور وزراء سے اپنی غربت کا علاج نہ کراتے۔ کاش وہ آج زندہ

ہوتے تو میں ''زکات العلوم'' کا ادارہ قائم کرنے کا انہیں مشورہ دیتا۔

کروں مدح اہل دول ''رضا'' پڑے اس بلا میں میری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا میرا دین پارۂ ناں نہیں

مولانا عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ (م۔۲۰۰۳-۸-۲۸):

مولوی عبدالقیوم ہزاروی مرحوم ''دارالعلوم حزب الاحناف'' سے دستارِ فضیلت لے کر نکلے تو شیرانوالے دروازے کے باہر باغ میں ایک چھوٹی سی مسجد میں جمعہ پڑھانے لگے۔ یہ مسجد مولوی احمد علی لاہوری کی مسجد کے قریب تھی۔ حضرت سید ابوالبرکات کا یہ شاگرد دیوبندیوں کے اتنے بڑے مرکز کے سامنے کھڑے ہوکر خطاب کرتا۔ نوجوان تھا۔ لوگوں کو اس کی پرجوش باتیں پسند آنے لگیں۔ ان کے استاد مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ ان کی حوصلہ افزائی کیلئے ''جمعۃ الوداع'' اور ''عیدین'' کا خطبہ خود پہنچ کر وہاں ہی دیتے۔ مولوی عبدالقیوم ہزاروی مرحوم ثابت قدم رہے۔ مسجد آہستہ آہستہ اپنا دامن پھیلاتی رہی۔ سختیاں آئیں، پریشانیاں آئیں، دیوبندیوں کی یلغاریں آئیں مگر وہ اپنی مسجد میں قائم و دائم رہے۔ لاہور کے کچھ غنڈے اور کارپوریشن کے کچھ کارندے بھی انہیں پریشان کرتے رہے مگر وہ ڈٹے رہے۔ ایک عرصہ تک قائم و دائم رہے۔ بلکہ تاحیات اپنا مصلی و محراب نہیں چھوڑا۔ فوت ہوئے تو آج ان کی پرانی مسجد خراسیاں کو شہید کر کے لاہور کا ایک متمول آدمی شاندار مسجد بنانے میں مصروف ہے۔ سنا ہے وہ ایک کروڑ روپیہ تک لگانے کا تہیہ کر چکا ہے۔

شدیم خاک و لیکن زبوئے تربت ما
تواں شناخت کہ زیں خاک مردی خیزد!

قاری صدرالدین رحمۃ اللہ علیہ:

لاہور کے علماء کرام کی یادوں میں اپنے ایک بے مثال دوست حافظ قاری صدر الدین مرحوم کو بھلا دینا بڑی ہی بے ذوقی ہوگی۔ حافظ صدرالدین نابینا تھے۔ ریاست

[illegible] (انڈیا) میں جنم لیا تو بچپن میں ہی لاہور آگئے۔ قرآن پاک حفظ کیا۔ عبادات میں ریاضت، چلہ کشی، ضبط دم اور حبس دم کے مراحل سے گزرے۔ مولانا تاج الدین مرحوم کی مسجد کے امام مقرر ہوئے۔ یہ مسجد، جامع مسجد وزیرخان کے پہلو میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ جہاں مولوی تاج الدین رحمۃ اللہ علیہ مسند ارشاد بچھائے اہل لاہور کو علم و فضل سے حصہ دیتے رہے تھے۔ یہ مسجد کبھی جنات کا مسکن تھا۔ مگر مولوی تاج الدین سے بعد از مزاحمت بسیار جنات کو اپنا ٹھکانہ بدلنا پڑا۔

قاری صدرالدین نے اس مسجد کی رونق کو نہ صرف دوبالا کیا بلکہ اس میں حفظ و ناظرہ کا درس جاری کیا۔ پھر ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ قاری صدرالدین نابینا تھے مگر بلا کی ذہانت اور محنت لے کر آئے تھے۔ وہ دن کو بچوں کو قرآن حفظ کراتے۔ رات بھر بجلی کا کام کرتے۔ نابینا ہونے کے باوجود مسجد میں بجلی کے پنکھوں کو درست کرنا، مرمت کرنا، حتیٰ کہ وائرنگ کرنا ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

مسجد کی ساری بجلی کا نظام ان کے اپنے حجرے میں ہوتا۔ برقی روان کے قبضہ میں ہوتی۔ ساری رات بجلی کے آلات سے پنکھے، ٹیوبیں، بلب لگاتے اور وائرنگ درست کرتے۔ صبح نمازی آتے تو آپ مصلے پر کھڑے ہوکر امامت کراتے۔ پاکستان بنا تو انہوں نے ریڈیو ٹرانسسٹر بنانے میں مہارت حاصل کرلی۔ ان دنوں ریڈیو کسی کسی کے پاس ہوتا تھا۔ قاری صاحب ٹرانسسٹر تیار کرتے، بیٹری اور بجلی کے بغیر ہی ایسے ٹرانسسٹر کام کرتے۔ لنڈے سے ملٹری کے فارغ شدہ ہیڈ فون لے آتے اور قلمدان کی ڈبیہ میں ٹرانسسٹر تیار کر کے احباب کو دیتے۔ نہ بجلی کی ضرورت نہ بیٹری کی حاجت۔

قاری صاحب کے ایک ساتھی صوفی محمد اسمٰعیل مرحوم تھے۔ جو ایک زاہد و عابد درویش تھے۔ وہ کہاں سے آئے، کہاں کے رہنے والے تھے، دوستی کے باوجود کبھی انہوں نے اپنا اتا پتا بتانے کا تکلف نہیں کیا۔ ہم کبھی انہیں سی آئی ڈی کا آدمی سمجھتے کبھی

جنات کی بقیہ ہستی قرار دیتے۔ مگر صوفی صاحب ہمارے ہر خدشے کو ایک مسکراہٹ سے ٹال جاتے۔ وہ عمر بھر قاری صدرالدین کی نابینائی کی روشنی بنے رہے۔ قاری صاحب کی تدریسی شہرت پھیلی تو قیام پاکستان کے بعد امرتسر سے آئے ہوئے قاری فضل کریم صاحب نے موتی مسجد لاہور میں حفظ قرأت کا مدرسہ قائم کیا۔ تو قاری صاحب کو تدریسی کام کے لیے مقرر کر دیا۔ قاری صاحب نے کئی سال تک اس دارالعلوم کے ابتدائی دور میں قاری فضل کریم صاحب کا ساتھ دیا۔ اگرچہ قاری فضل کریم صاحب دیوبندی تھے مگر قاری صدرالدین مرحوم کی وجہ سے کئی سال تک مجھے تقسیم اسناد کے جلسوں میں تقریر کرنے کا موقع ملتا رہا۔ اور فارغ ہونے والے حفاظ کے سروں پر پگڑیاں (دستار فضیلت) میرے ہاتھ سے باندھی جایا کرتی تھیں۔ قاری صدرالدین کو میری علمی خدمات کی بڑی قدر تھی۔ میں انہیں انگریزی کی نصابی کتابیں ایک بار سناتا تو ان کے حافظہ پر لفظ لفظ نقش ہو جاتا۔ پھر وہ طلبہ کو انگریزی کی تعلیم دیتے۔ میں انگریزی سنا کر بھول جاتا تو وہ میری اغلاط کو بھی درست کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ مجھے انگریزی الفاظ کے ہجا میں غلطی ہوتی تو قاری صاحب درست فرماتے۔ قاری صدرالدین مرحوم نے ساری زندگی درس و تدریس میں گزار دی۔ بینائی سے محروم ہونے کے باوجود کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ آج کے علماء جب کاسہ گدائی لے کر نکلتے ہیں تو مجھے حافظ صدرالدین مرحوم کی خودداری یاد آتی ہے۔ ان کے ایک بھائی پروفیسر ملک نورالدین تھے (غالباً ابھی زندہ ہیں) وہ محکمہ تعلیم میں پروفیسر اور بعد میں بہت بڑے آفیسر بن کر ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنے بھائی کو ملنے آتے۔ مگر قاری صدرالدین نے ان کی معاشی راحتوں سے کبھی حصہ نہیں لیا۔

قاری عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا قاری عبدالغفور ہزاروی مرحوم اپنے زمانے کے بڑے بلند آواز اور پر جوش قاری تھے۔ وہ یکی دروازے کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد کے امام تھے۔ میں جن دنوں

[illegible] کے اجتماع میں تقریر کیا کرتا تھا، تو وہ میری درخواست پر جمعہ کی نماز کی امامت کراتے۔ ان کی قرأت سے لوگوں کی نکاہت دور ہو جاتی اور دل وجد سے جھوم اٹھتے۔ انہوں نے میرے ساتھ جو وقت گزارا نہ کبھی مالی توقع رکھی، نہ میں نے انہیں کبھی کچھ دیا اور نہ ان کے چہرے اور زبان پر کبھی "حرفِ مدعا" آیا۔ آج میں چھوٹے چھوٹے قاریوں کو قرآن سنانے کا صلہ طلب کرتے پھر اس پر اصرار کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے احباب کی بے نیازی کی روشنیاں ڈھانپ لیتی ہیں۔

مولانا سلیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ:

قیامِ پاکستان کے کچھ عرصہ پہلے "دارالعلوم حزب الاحناف" کے فارغ التحصیل ایک نوجوان عالم دین نے "مصری شاہ" کی "سفید مسجد" کو اپنا مرکز بنایا۔ یہ نوجوان عالم دین، مولانا سلیم اللہ صاحب تھے، جنہوں نے اپنی تقریر و خطابت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ ان کی تقریر سننے کے لیے لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے۔ مسجد کا صحن اور چھتیں سامعین سے بھر جاتیں۔ وہ خطاب بھی کرتے اور مختلف اوقات میں دینی تقریبات کا اہتمام بھی کرتے۔ اس طرح ان کی مسجد لاہور کی مشہور مسجد شمار ہونے لگی۔ اس عالم دین کو محراب و منبر سے ہٹ کر عملی زندگی میں کام کرنے کا بڑا جوش تھا۔ یہ مسلم لیگ کے ساتھ اس وقت وابستہ ہو گئے جب مسلم لیگ کو لیڈروں کے علاوہ نوجوانوں کی ضرورت تھی۔ مولانا سلیم اللہ مسجد کے محراب و منبر سے نکل کر سبز وردی زیب تن کرتے اور مسلم لیگ کا جھنڈا اٹھائے "مسلم نیشنل گارڈ" کی قیادت کرتے۔ ان دنوں قائداعظم لاہور تشریف لاتے تو میاں ممتاز دولتانہ، نواب آف ممدوٹ اور سردار شوکت حیات خاں جیسے نامور مسلم لیگی لیڈران کے ساتھ ہوتے، مولانا سلیم اللہ ان دنوں "مسلم نیشنل گارڈ لاہور" کے شمالی ونگ کے سالار تھے۔ ان دنوں مسلم لیگ کو خاکی وردیوں میں خاکسار [illegible] اٹھائے تنگ کرتے "احرار" سرخ وردیوں میں کلہاڑیاں اٹھائے ڈراتے، سکھوں کے اکالی نیلے لباس میں اپنی کرپانوں اور کڑوں کو لہراتے، پھر کانگرس کے ہندو نوجوان

بھی مسلم لیگ دانت پر پیستے دکھائی دیتے۔ ان حالات میں مولانا سلیم اللہ اپنے سبز پو
جیش کو لے کر نکلتے تو لوگ دیکھتے رہ جاتے۔ تحریکِ پاکستان میں تشدد کا تو پکڑ
شروع ہوئی۔ آنسو گیس اور لاٹھی چارج برسنے لگے۔ مولانا سلیم اللہ ان تمام حملوں کی
میں ہوتے۔ خضر حکومت نے جب ایسے سبز پوش نوجوانوں کو گرفتار کر کے جیل میں
تو حکم دیا کہ ان سبز پوشوں کو بید اور کوڑے مارے جائیں۔ مولانا سلیم اللہ نے تو کبھی
نہیں کیا۔ مگر ان کے ساتھ کوڑے کھانے والے ساتھی بتاتے ہیں کہ مولانا سلیم اللہ
جس قدر کوڑے برسائے گئے تھے اگر یہ پیپلز پارٹی کے جیالے ہوتے تو آج نیو گار
ٹاؤن لاہور میں چار کمرشل پلاٹوں کے مالک ہوتے۔ افسوس مسلم لیگی اقتدار نے ا
لوگوں کو کبھی نہیں نوازا اور مولانا سلیم اللہ اپنی زندگی کے کئی سال سفید مسجد میں قال
اور قال الرسول کی دولت کے مالک بنے رہے۔ کچھ عرصہ بعد جب انہیں فکر معاش
آ گھیرا تو وہ امامت و خطابت کے ساتھ ساتھ پرانے لوہے کا کاروبار کرنے لگے۔ ان کی
اس مصروفیت نے انہیں علمی اور دینی مصروفیات سے دور ہٹا دیا اور وہ محراب و منبر جو
کی للکار سے گونجا کرتے تھے خاموش ہو گئے۔

نہ وہ ''غزنوی'' میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے ''زلفِ ایاز'' میں!

قاری محمد طفیل امرتسری رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۹۸۹ء):

قاری محمد طفیل امرتسری قیامِ پاکستان کے بعد امرتسر سے ہجرت کر کے لاہو
گئے اور لاہور کے دل ''مسجد وزیر خان'' میں مسند تدریس قرآن بچھا دی۔ وہ بڑ
خوش آواز، بلند آواز اور شیریں زبان قاری تھے۔ ان کی قرآن خوانی نے لاہور کے
اہل دل کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ قرآن کی تلاوت کرتے تو مسجد کے در و دیوار معمو
ہو جاتے۔ ان دنوں لاؤڈ اسپیکر کا رواج نہیں تھا مگر قاری محمد طفیل کی آواز منت پذ
لاؤڈ اسپیکر نہ تھی۔ وہ قرآن پڑھتے تو ساری مسجد گونج اٹھتی۔ لوگ جوق در جوق آ
لگے۔ وہ اپنی فنی بلندیوں کے باوجود خلیق اور خوش گفتار تھے۔ وہ ایک عرصہ ''مسجد وز

خان'' کی رونق بنے رہے۔ ہم رمضان المبارک کی روحانی راتوں کو اپنی اپنی مساجد
میں تراویح پڑھ کر مسجد وزیر خان جاتے تو قاری طفیل مرحوم کی آواز سے دلوں کو سکون
ملتا۔ وہ رات گئے تک مصلی سناتے اور نمازی اکتانے کا نام نہ لیتے۔ ان کے شاگردوں
کا ایک خاصہ حلقہ آج بھی لاہور ہی نہیں پنجاب کے مختلف شہروں میں موجود ہے۔ کچھ
عرصہ بعد وہ لاہور کو چھوڑ کر حیدر آباد سندھ چلے گئے اور زندگی کے آخری سانس تک
قرآن کی تدریس و تعلیم میں مشغول رہے۔ اگرچہ وہ کام کرتے رہے مگر جو گونج ان کی
لاہور کی مسجد وزیر خان میں تھی وہ پھر کبھی سننے میں نہ آئی۔

ع اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب!

خطیب اعظم مولانا غلام محمد ترنم رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۴-۷-۵۹):

مولانا غلام محمد ترنم مرحوم کا ذکر ''ذکر خیر'' سے کم نہیں۔ وہ امرتسر کے ایک باکمال
خطیب اور مقرر تھے۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور آئے تو لاہور کے کوچہ و بازار ان کی
للکار سے گونج اٹھے۔ وہ ''بزمِ غالب'' کی سٹیج پر گوالمنڈی کے چوک میں تقریر کرتے تو
چاروں بازار حدِ نگاہ تک سامعین سے اٹ جاتے۔ ان کا زور بیان، مترنم آواز اور
پرزور تقریر اہلِ ذوق کو لوٹ لیتی۔ جس سٹیج پر کھڑے ہوتے چھا جاتے۔ اپنے تو اپنے
غیر بھی ان کی خوش بیانی کی تعریف کرتے۔ وہ پنجاب سیکرٹریٹ کی ایک چھوٹی سی مسجد
میں خطبہ جمعہ دینے لگے تو سیکرٹریٹ کے ملازمین سے نمازیوں کی تعداد زیادہ بڑھ گئی۔
مسجد کا دامن تنگ تھا، نمازی زیادہ ہوتے گئے۔ مسجد پھیلنے لگی، محراب و منبر گونجنے لگے
تو پنجاب گورنمنٹ کو ہوش آیا۔ مسجد کی تعمیر نو شروع ہوئی تو ایک بہت بڑی مسجد بن گئی۔
مولانا غلام محمد ترنم مرحوم کے بعد یہ مسجد روایتی مولویوں کے ہاتھوں میں آ گئی تو آج
ان کے در و دیوار مولانا ترنم کی آواز کو ترستے ہیں۔

ے وہ مسجد روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب!

مولانا ترنم صاحب کبھی کبھی مجھ پر کرم فرمائی کرتے۔ تقریر و خطاب کے زیر و بم سے آگاہ کرتے اور ایسے بلا تکلف انداز میں ذہنی اور لسانی تربیت کر جاتے کہ محسوس بھی نہ ہوتا کہ مولانا غلطی درست کر رہے ہیں یا تربیت دے رہے ہیں۔ وہ سادہ لباس، سادہ رہائش اور سادہ زندگی کے خوگر تھے۔ علم و خطاب کی بلندیوں کے باوجود ہر ایک کے ساتھ اس کی ذہنی سطح پر بات کرتے اور ذہنی راہنمائی فرماتے۔

مولانا غلام معین الدین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۴-۸-۷۱):

مولانا غلام معین الدین نعیمی لال کھوہ، موچی دروازہ کے اندر سکونت پذیر تھے۔ پاکستان وجود میں آیا تو وہ مراد آباد، انڈیا سے ہجرت کر کے لاہور آ بسے۔ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ "دارالعلوم نعیمیہ" کے تربیت یافتہ تھے۔ راسخ العقیدہ سنی عالم دین تھے اور ارباب قلم میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے تقریر کی بجائے تحریر کو اپنا طریق زندگی بنا لیا تھا۔ ایک ماہ نامہ "سوادِ اعظم" جاری کیا۔ جس کے صفحات پر بعض نادر و نایاب کتابوں کے ترجمے بالاقساط شائع کرتے۔ پھر ایک وقت آتا تو ان صفحات کو جمع کر کے پوری کتاب تیار کر لیتے۔ وہ مقرر اور خطیب نہیں تھے۔ مگر "باغ جناح" کی جامع مسجد میں خطبۂ جمعہ دیتے۔ (اس مسجد میں ایک عرصہ سے ڈاکٹر اسرار احمد اپنے نظریات پیش کر رہے ہیں) مولانا غلام معین الدین بڑے جفاکش، محنتی اور قابل عالم دین تھے۔ انہوں نے وادی غربت میں زندگی کا سفر جاری رکھا۔ مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ عقیدے کی بات بڑی جامعیت کے ساتھ کرتے اور اس سلسلہ میں کسی مصلحت بیں عالم دین کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انہوں نے بڑی بڑی نادر کتابوں کو اردو لباس پہنایا جو آج اہلِ علم و فضل کے مطالعہ میں آ رہی ہیں۔ حضرت مولانا ابوالحسنات رحمۃ اللہ علیہ کے ہم مجلس تھے۔ ادیب بھی تھے۔ حکیم بھی تھے۔ وہ پان کو بڑے سلیقہ سے چباتے۔ میں نے کئی بار ان سے پان کے لیے استدعا کی

کہ وہ فرماتے جسے پان کھانے کے آداب نہیں آتے میں اسے پان نہیں دیا کرتا۔

ع پارسا آداب مے خوردن نمی داند کہ چیست؟

میں خود پان نہیں کھاتا ہوں مگر ان سے جب ملتا پان کا مطالبہ ضرور کرتا۔ مگر کمال ہے ان کی وضع داری کا، کبھی پان کے پتے کی توہین نہیں ہونے دی۔ میرے پاس آتے تو میں دکاندار سے پان منگوا کر پیش کرتا تو "مالِ غنیمت" سمجھ کر کھا لیتے اور اپنے ادا کردہ روپیہ پر ذرا بھی شرمندگی کا اظہار نہ کرتے۔

مولانا محمد مہر الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (م:۵-۱۱-۸۷):

مولانا محمد مہر الدین نقشبندی جماعتی رحمۃ اللہ علیہ ایک بلند پایہ عالمِ دین، ماہر تعلیم، علوم وادب میں فاضل بزرگ تھے۔ وہ صرف و نحو، منطق، علم کلام، بیان پر نہ صرف کامل دسترس رکھتے تھے بلکہ ان کی تدریس میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے ساری زندگی ان علوم کی تدریس میں گزار دی تھی۔ آج کے بڑے بڑے علماء کرام انہیں کے دسترخوان کے لقمہ چیں ہیں۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو جز وقتی استاد کی نیابت سے اپنے شاگردوں کے لیے مقرر کیا تھا۔ آپ ان کے مدرسہ میں طلبہ کو فارغ اوقات میں پڑھایا کرتے تھے۔ پاکستان سے حافظ محمد عالم صاحب سیالکوٹی، صوفی غلام حسین گوجرہ والے، صاحبزادہ سید محمد اسلم صاحب علی پوری، مولانا باغ علی نسیم صاحب اور راقم الحروف آپ سے صرف، نحو اور منطق کی ابتدائی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ میری گوشمالی اور میرے رخساروں پر طمانچوں کے غیر مرئی نقوش، ابھی تک موجود ہیں۔ وہ مولانا غلام رسول صاحب موچھل امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ تھے اور فن تدریس میں یکتائے روزگار تھے۔ دارالعلوم حزب الاحناف، دارالعلوم نعمانیہ، مدرسہ لاثانیہ، علی پور شریف جیسے مدارس میں آپ نے ایک عرصہ تک علمائے دین کو تعلیم دی۔ آپ کی بعض فنی کتابیں آج تک طلبائے علم دین کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ وہ زندگی

کے آخری ایام میں چاہ میراں میں اپنی رہائش گاہ میں رہنے لگے تھے اور دربار میر
حسین زنجانی میں جامعہ معینیہ کے بعض طلبہ کو پڑھانے میں مصروف رہے۔

پاکستان بنا، تو مسلمان مہاجرین کا ایک سیلاب پاکستان کی سرحدوں کے ا
گیا۔ لاہور خصوصاً اس سیلاب کا پہلا ٹھہراؤ تھا۔ خستہ حال مسلمان، زخمی مسلمان او
سب کچھ لٹا کر آنے والے مسلمان، قافلہ در قافلہ لاہور میں وارد ہوئے۔ ان لٹے
قافلوں میں کئی علماء کرام، مشائخ، قاری، نعت خواں اور درویش آئے۔ راقم ا
طالب علم تھا مگر چند نوجوانوں کے ساتھ مل کر مہاجروں کے کسی نہ کسی کیمپ میں چلا
اور جو کچھ بن پڑتا کرتا۔ ایک دن میں نے کٹے پھٹے قافلے کو لاہور پہنچتے دیکھا، تو
اختیار رونے لگا۔ رونا کیا، آہ و فغاں لے کر رویا۔ مہاجروں میں سے ایک خوبصو
چہرے والا شخص اٹھا اور مجھے سہارا دینے لگا۔ سینے سے لگا کر تسلی دی۔ اس نے
میرے اہلِ خاندان اس زخمی قافلے میں آئے ہیں۔ وہ مجھے اس خونچکاں منظر سے
کر ایک طرف لے گیا اور مجھے سہارا دے کر شہر میں میرے حجرہ تک لے آیا۔ دوس
دن وہ پھر میرے پاس آیا۔ پھر ہر روز آنے لگا۔ وہ خوبصورت وجیہ انسان خوش لہ
بھی تھا اور شیریں کلام بھی۔ اب وہ میرے حجرے میں ہی رہنے لگا۔ ایسے کئی م
مہاجرین کے سیلاب میں بہ کر آگئے تھے۔ ایک دن سحری کے وقت اسے میں
قرآن پڑھتے سنا تو دل گرفتہ ہوگیا۔ اللہ اللہ! سوز قرات اور انداز تلاوت کے نقو
آج تک میرے دل و دماغ میں مرتسم ہیں۔

؎ تو میدانی کہ سوز قرات تو　　　دگرگوں کرد تقدیر "عمر" را

"تقدیر عمر" تو صدیوں پہلے بدل چکی تھی۔ اور پھر عمر نے دنیا بھر کی تقدیر کو بدل
رکھ دیا تھا۔ لیکن آج ایک قاری کی قرات نے عمر کے بیٹے کی تقدیر بدل دی۔ میں
التجا کی۔ آپ مجھے قرآن پڑھنا سکھا دیں۔ اس نے ہامی بھر لی۔ پندرہ دن مجھے مشق کر

رہا۔ اس نے بتایا کہ وہ "پانی پت" سے اپنے بچوں کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ مگر آگے وہ
میرے سامنے کچھ نہ کہتا۔ اس کی تربیت سے میں قرآن کے الفاظ پڑھتا تو دل سے جھوم
جاتا۔ پندرہ دن کے بعد وہ غائب ہوگیا اور آج تک بس اس قاری کی یاد اور شکل و صورت تو
سامنے آتی ہے مگر خدا معلوم وہ کہاں گیا، کہاں بسا، کن کن لوگوں کو قرآن سناتا گیا۔
آج جب علماء کی مجالس کی باتیں لکھتا ہوں تو اس گمنام قاری کی یاد تڑپا جاتی ہے۔

("جہانِ رضا" مئی ۱۹۹۴ء)

یادوں کے چراغ

علامہ غلام قادر اشرفی رحمۃ اللہ علیہ (م:۹-۷-۸-۲۶):

مولانا غلام قادر اشرفی آف ''لالہ موسیٰ'' سے پہلی ملاقات ''ہارون آباد'' بہاول پور کے ایک جلسہ کے بعد ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں حضرت مولانا اشرفی علماء کرام کی ایک ٹیم کے ساتھ مولانا احمد دین درگاہی مرحوم، خطیب جامع مسجد ہارون آباد کی دعوت پر ایک جلسہ میں تقریر کرنے گئے تھے۔ آپ کا لباس گیروا کھدر کا تھا اور سر پر سکھوں کی طرح رنگدار پگڑی سجائے ہوئے تھے۔ علمائے کرام کے اجتماع میں ایک ''سکھ نما مولوی'' ہمیں عجیب سا لگا۔ جب تقریر کرنے اٹھے تو سکھوں کی زبان گورمکھی میں قرآن و احادیث بیان کرنے لگے۔ یہ بات ہم جیسے نووارد طالب علموں کے لیے حیران کن تھی۔ ملاقات ہوئی تو مولانا کی زبان میں مٹھاس تھی، شیرینی تھی اور اپنائیت تھی۔ وہ ہر ایک سے خوشگوار بات کرتے۔ لباس و گفتار کے متعلق انہوں نے بتایا کہ وہ ریاست ''فرید کوٹ'' میں پیدا ہوئے۔ سکھوں کے سکولوں میں پڑھے، وہی لباس اور انداز گفتگو اپنایا۔ کالج چھوڑ کر دینی تعلیم کیلئے ''جامعہ نعیمیہ'' مراد آباد (یو-پی) پہنچے۔ فارغ التحصیل ہوکر ''مولوی'' کی بجائے ''گیانی'' بن کر ہندی، سنسکرت اور گورمکھی میں قرآن و احادیث کا مطلب بیان کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ نواب شاہ نواز آف ممدوٹ نے انہیں سیاسی میدان میں لا کھڑا کیا۔ جہاں وہ ''شدھی تحریک'' کے خلاف سکھوں کے بھیس میں اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ مسلم لیگ میں شامل ہوکر کانگریس اور احراری مولویوں اور نیشنلسٹ علماء کو للکارتے رہے۔ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ، مغلپورہ ایجی ٹیشن، تحریک کشمیر، قادیانی تحریک، مسجد شہید گنج کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔

پاکستان بنا تو مولانا اشرفی لالہ موسیٰ سے لاہور آتے تو ہم ان کی تقریر سننے جاتے اور ملاقات بھی کرتے۔ اس طرح ان سے رفاقت بڑھتی گئی۔ وہ خوش گفتار مجلسی آدمی تھے اور خوش گفتاری سے لوگوں کو قریب کر لیتے۔ وہ علمائے اہل سنت کے ہر تنظیمی اجلاس میں شرکت کرتے۔ علمائے اہل سنت سے اعتقادی وابستگی کے ساتھ ساتھ انہیں مسلم لیگ کا سیاسی پلیٹ فارم پسند تھا۔ لاہور آتے تو سردار شوکت حیات، ملک فیروز خان نون، ممتاز دولتانہ اور دوسرے مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ وقت گزارتے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ان علماء کرام کی ٹیم کے ساتھ وابستہ ہو گئے جو ملک میں نفاذ اسلام کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ آپ نے ''تحریک ختم نبوت'' میں بھرپور حصہ لیا۔ جمعیت علماء پاکستان کی تشکیل نو میں بھرپور کردار ادا کیا۔ پھر ۱۹۷۴ء کی ''تحریک ختم نبوت'' میں زبردست کام کیا۔ ''تحریک نفاذ نظام مصطفیٰ'' چلی تو جمعیت علماء پاکستان کا علم اٹھا کر آگے بڑھے اور قید و بند میں رہے۔

مولانا علامہ غلام قادر اشرفی، حضرت محدث کچھوچھوی سے بیعت ہوئے تو ''اشرفی'' کہلائے۔ حج بیت اللہ کرنے گئے تو مدینہ منورہ میں حضرت قطب مدینہ، مولانا ضیاء الدین قادری مدنی خلیفہ مجاز اعلیٰ حضرت الشاہ احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجلس نشین بن گئے۔ پھر ان کے صاحبزادے الشیخ فضل الرحمان مدنی کے رفیق کار رہے۔ ان نسبتوں سے آپ کے مزاج میں درویشی آ گئی عالمانہ جاہ و جلال اور مناظرانہ جنگ و جدال چھوڑ کر فقیرانہ لباس میں آ گئے۔ خاک نشینوں اور انکسار پسندوں میں بیٹھ کر خوشی محسوس کرتے۔ ہم جیسے راہ نشین ملتے تو ان کا چہرہ کھل اٹھتا۔ مولانا ضیاء الدین مدنی کی مجلس سے اٹھ کر پاکستان آتے تو ''مرکزی مجلس رضا'' کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی مجالس میں صبح و شام گزارتے اور حکیم صاحب کے کام میں برابر کے شریک رہتے۔

آپ اس درویشانہ زندگی میں کئی بار حج اور دیارِ حبیب کی حاضری کے لیے مدینہ منورہ گئے۔ اب ان کے احباب کا حلقہ علماء کرام کی بجائے فقیروں، درویشوں،

خاکساروں اور بوریا نشینوں کا ہو گیا تھا۔ میں اگرچہ کتابی دنیا کا ''درویش بے گلیم'' تھا مگر مجھ پر ان کی عنایات زندگی کے آخری لمحہ تک برستی رہیں اور وہ ''حدیث دل'' بتانے سے گریز نہ کرتے۔ انہیں آج اہل علم و فضل اور اہل ذکر و فکر دونوں طبقے یاد رکھتے ہیں۔ آج وہ لالہ موسیٰ شہر کے مغرب کی طرف آرام فرما ہیں۔

تواں شناخت کہ زیں خاک مردی خیزد!

مولانا مفتی محمد عبدالعزیز مزنگوی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۳-۱۲-۱۶):

مولانا محمد عبدالعزیز چشتی مزنگوی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت اس وقت ہوتی، جن دنوں وہ میرے استاد حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوتے اور اعتقادی اور نظریاتی مسائل پر گفتگو کرتے۔ وہ صاحب علم و قلم بزرگ تھے۔ عقیدہ درست اور مضبوط۔ صبح و شام تحریر و تقریر میں مصروف رہتے۔ وہ عالمانہ لباس زیب تن کرتے۔ سفید براق لباس، پھر سر پر سفید، شملہ دار عمامہ۔ ان دنوں علمائے کرام اپنے عالمانہ لباس میں بود و باش کیا کرتے تھے۔ ہزاروں کے ہجوم میں لباس سے ہی دکھائی دیتا کہ یہ شخص عالم دین ہے۔ میں نے پاکستان بننے تک کسی عالم دین کو نہیں دیکھا کہ وہ ننگے سر باہر نکل آیا ہو یا عامیانہ لباس میں گھر سے نکلا ہو۔ وہابی علماء کبھی کبھی ننگے سر باہر نکل آتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ آدھی نماز چھوڑ کر مسجد سے بھاگ آئے ہوں۔ پاکستان کے بعد تو ہمارے اکثر علماء بھی ننگے سر چھلانگیں لگاتے نظر آتے ہیں مگر مولانا عبدالعزیز مزنگوی کا زمانہ اہل علم کے آداب لباس کا زمانہ تھا۔ مولانا عالمانہ لباس میں آتے اور وضع قطع میں عالم دین ہی دکھائی دیتے۔ مجھے یاد ہے کہ آپ کے عمامہ کے نیچے کان کی لو میں ہمیشہ قلم ہوتا۔ آپ تقریر و خطاب کی نسبت تحریر و تصنیف میں زیادہ وقت دیتے۔ میں نے اکثر انہیں ''ملک دین محمد اینڈ سنز'' ناشر کتب کشمیری بازار کی دکان میں دیکھا۔ وہ کتابوں کی تصحیح کا کام کرتے۔ مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کا ترجمہ قرآن نیا نیا چھپا تھا جو بڑا مشہور ہوا۔ دیو بندیوں کے ترجموں میں دوسری اغلاط

علاوہ اللہ اور اس کے محبوب کے متعلق عامیانہ الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ ''اللہ تعالیٰ نے یوں کہا''، ''محمد صاحب نے یوں بتایا'' یہ انداز بیاں اس وقت کے دیو بندیوں میں عام تھا۔

مولانا عبدالعزیز مزنگوی نے مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کے ترجمہ قرآن ''عزیز البیان فی تفسیر القرآن'' کے حواشی لکھ کر ان عقائد کی تردید کر دی جو دیو بندیوں کا طرہ امتیاز تھا۔ مولانا کی اس کوشش پر دیو بندی مکتب فکر نے بڑا شور مچایا مگر مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کے ترجمہ پر مولانا عبدالعزیز کی تفسیر بڑی مقبول ہوئی۔ مولانا نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کی ایک کتاب ''احسن الاقوال فی احوال الابدال'' ہے جسے راقم نے اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ ''مکتبہ نبویہ'' سے چھپوا کر رجال الغیب کے حالات کی وضاحت کی تھی۔

مولانا عبدالعزیز مزنگوی مرحوم ''مزنگ'' میں جنازگاہ کی مسجد کے اعزازی خطیب رہے۔ پھر ایک عرصہ تک قلعہ مادھو سنگھ ''مزنگ'' میں مسند درس پر فائز رہے۔ ہم طالب علمی کے زمانہ میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے تو دینی مسائل سے مالا مال ہو کر آتے۔

پاکستان بنا تو آپ کا حلقہ احباب وسیع ہو گیا۔ عقائد اہل سنت پر ان کی کتابیں بازار میں آنے لگیں۔ کتابوں کے مطالعہ میں کوئی مشکل پیش آتی تو ہم لوگ مزنگ جاتے۔ وہ نہایت خندہ پیشانی سے ان اشکال کا حل فرماتے۔

صوفی غلام حسین گوجروی رحمۃ اللہ علیہ:

۱۹۳۹ء میں مولانا نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کا دار العلوم دین اور معارف تصوف کا مرکز تھا۔ دور و نزدیک سے طلبہ آتے، دینی نصاب کی کتابیں پڑھتے۔ ارباب تصوف آتے تو نقشبندی سلوک کی تربیت پاتے۔ انہی دنوں صاحبزادہ سید علی حسین شاہ علی پوری جو اسی دار العلوم سے فارغ التحصیل ہو کر گئے تھے۔ اپنے چند

مریدوں کے ساتھ اپنے استاد گرامی مولانا نبی بخش حلوائی کی خدمت میں آئے۔ ا
کے ساتھ ایک نوخیز نوجوان تھا جو بڑا ہو کر خطیب پاکستان صوفی غلام حسین گوجر
کے نام سے شہرت یاب ہوا۔ صاحبزادہ سید علی حسین صاحب کی خواہش تھی کہ ا
حضرت علامہ حلوائی کی تربیت ملے۔ صاحبزادہ صاحب نے سفارش کی کہ یہ نوجو
نعت خوان رسول ہے، اسے قبول فرمالیں۔ ہم نے زندگی میں پہلی بار تعجب سے د
کہ ایک نعت خوان موذن کی طرح کانوں پر انگلی رکھ کر نعت پڑھ رہا ہے۔ نعت سنا
داخلہ مل گیا۔

صوفی غلام حسین رمداس ضلع گورداسپور (انڈیا) کے رہنے والے تھے۔ والد صا
محمد دین حضرت ثانی صاحب علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور شریک سفر بھی۔ ا
نوجوان طالب علم نے محنت و ریاضت سے کتابوں کو کھانا شروع کر دیا۔ کچھ وقت
میرے ہم سبق رہے۔ صوفی غلام حسین، حافظ محمد عالم، صاحبزادہ سید محمد اسلم علی پو
اور راقم ''علم الصیغہ'' اور صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں مولانا مہر الدین صاحب جما
سے اسی مدرسہ میں پڑھتے رہے۔ صوفی غلام حسین مرحوم اپنی تیز رفتاری سے ہم
پیچھے چھوڑ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کتابوں کے علاوہ صوفی غلام حسین گوجروی
''گلستان سعدی'' کا دیباچہ زبانی یاد کر لیا تھا۔ ''زلیخا جامی'' کے اکثر اشعار ان کی نو
زبان پر تھے۔ مثنوی مولانا روم کے اکثر اشعار از بر تھے۔ نعت خوان تھے، خوش آ
تھے۔ بڑے ہو کر خطابت کی دنیا میں ابھرے تو میں نے دیکھا کہ وہ ''گلستان''
بوستان'' اور ''جامی'' کے اشعار و واقعات سے اپنی تقریر کو اتنا مزین کرتے کہ سامعی
عش عش کر اٹھتے۔ پاکستان بنا تو صوفی غلام حسین مرحوم اپنے والدین کے سا
''گوجرہ'' میں آبسے اور ''صوفی غلام حسین گوجروی'' کے نام سے شہرت یافتہ ہو۔
انہوں نے ساری زندگی وعظ کی مجالس کو رونق بخشی اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے بیان
خطاب سے اہل ذوق کے دل و دماغ کو اسلام کی عظمتوں کے سامان سے مالا مال

یا۔ وہ جہاں جاتے لوگ ان کی تقریر کو سننے کے لیے جوق در جوق آتے۔ وہ بولتے تو
تین تین گھنٹے بولتے جاتے اور لوگ سنتے سنتے نہ تھکتے۔

ع وہ قصہ فراق سناتے چلے گئے!

ایک خطیب اور مقرر کی حیثیت سے صوفی غلام حسین گوجروی مرحوم نے بڑی
بھرپور زندگی گزاری۔ سنی واعظوں اور خطیبوں میں نام پیدا کیا۔ جلسوں کی زینت بنے
رہے اور سامعین کے محبوب خطیب بن کر زندہ رہے۔

مولوی خیر الدین فلسفی ''سائیں بابا'':

تعلیم کے دوران جب مجھے ابتدائی کتابوں سے گزر کر آگے بڑھنا پڑا تو
''صدرا'' کے موضوعات پڑھنے کے باوجود میرے پلے کچھ نہ پڑا۔ مجھے ایک عالم
دین نے بتایا کہ مصری شاہ کی ایک کٹڑی میں ایک فلسفی مولوی خیر الدین رہتا ہے۔ وہ
تارک الدنیا ہے۔ علی الصبح شہر چھوڑ کر لاہور کے شمال کی طرف نکل جاتا ہے۔ باغوں
سے گزرتا ہوا، دریائے ''راوی'' کے کنارے پر پھیلے ہوئے ذخیرہ جنگلات میں سارا
دن گزار دیتا ہے۔ خاموش طبع ہے، کسی سے بات نہیں کرتا۔ کسی طالب علم کو نزدیک
نہیں آنے دیتا۔ مگر علم کا دریا ہے، فلسفے کا بادشاہ ہے، منطق کا امام ہے اور علوم عقلیہ کا
سمندر ہے۔

مجھے مولوی خیر الدین سے ''صدرا'' پڑھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اس کی رہائش
پر جا پہنچا۔ وہ گھوڑوں کے ایک اصطبل کے پیچھے ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رہتا
تھا۔ اصطبل کا مالک بھنگ کا رسیا تھا اور مولوی خیر الدین کو اپنا پیر و مرشد بنا کر ''سائیں
بابا'' کہتا تھا۔ میں نے اپنے علمی شوق کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگا ہم نے ''سائیں بابا''
سے نہ کبھی علم کی بات سنی، نہ پوچھی۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں ساری رات نمازیں پڑھتا رہتا
ہے۔ جب میرا کوئی گھوڑا بیمار ہوتا ہے یا پولیس میرا چالان کرتی ہے تو سائیں بابا ''اللہ
خیر کرے گا'' کہہ کر ''راوی'' کے کنارے چلا جاتا ہے۔ گھوڑا تندرست، چالان

معاف۔ بس اس سے زیادہ اسے کچھ نہیں آتا۔ تم مسجدوں میں کتابیں پڑھا کرو۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔

اس کے باوجود میں نے مولوی خیر الدین کا تعاقب جاری رکھا۔ کئی دنوں کی کاوش کے بعد ایک دن علی الصبح ان کے پیچھے ہولیا۔ ان دنوں ''سفید مسجد'' مصری شاہ سے آگے دور دور تک گھنے باغات پھیلے ہوتے تھے۔ پھر جنگلات کا سلسلہ راوی کے کنارے تک چلا جاتا۔ ان دنوں لاہور کا حفاظتی بند نہیں بنا تھا۔ کئی دنوں کے مسلسل تعاقب کے بعد مولوی خیر الدین نے میری بات سنی اور ''صاحب صدرا'' اور اس کے معاصرین پر اتنے شاندار الفاظ میں خیالات کا اظہار کیا کہ میں دنگ رہ گیا۔

دل ہی دل میں کہتا کہ علم کو گھوڑوں کے طویلے میں ذلیل کرنے والا مولوی خیر الدین اس جنگل میں سارا دن گزار دیتا ہے۔ مسجد اور مدرسہ سے کیوں دور رہتا ہے۔ راوی کے ذخیرہ میں برگد کا ایک قد آور درخت تھا۔ اس کی ٹہنیوں پر ''شپرہ چشم'' (کھنک) الٹے لٹکے رہتے تھے۔ ایک دن مولوی خیر الدین نے دو شپرہ چشم قابو کر لیے اور مجھے پاس بلا کر ایک کا منہ کھولا اور کہا یہ لو سرخ شنگرف کی ڈلی اور اس کے منہ میں ڈالو، میں نے ڈلی ڈال دی۔ دوسرا شپرہ چشم پکڑا اور مجھے فرمایا اس کے منہ میں یہ ''پارہ'' ڈال دو۔ اب دونوں پرندوں کے پر باندھ کر برگد کی ٹہنیوں سے باندھ کر لٹکا دیا۔ چالیس دن گزر گئے۔ کبھی کبھی درخت پر چڑھ کر مولوی خیر الدین انہیں کچھ کھلاتا۔ چالیس دن گزرنے کے بعد انہیں ذبح کر کے شنگرف اور پارہ نکال لیا۔ اس دن وہ اتنا خوش تھا جیسے اس نے لاہور فتح کر لیا ہو۔ مجھے کبھی کبھی چند سطریں زبانی پڑھا دیتے اور فلسفیوں اور منطقیوں کے واقعات سنا دیتے۔ دوسرے دن میں نے دیکھا وہ ایک پاؤ خالص تانبہ لیے جنگل میں لکڑیوں کا ڈھیر لگائے آگ بھڑکا رہا ہے۔ مٹی کا ایک پیالہ جس میں تانبہ، شنگرف اور پارہ رکھ دیا گیا۔ آگ کے شعلے بھڑکتے رہے۔ میں دیکھتا رہا۔ مولوی خیر الدین کی نظریں اس پیالے پر گڑی ہوئی تھیں۔ آگ

اڑا دی۔ میں نے دیکھا پارہ دھواں بن کر اڑ رہا ہے۔ شنگرف پگھل کر تانبے پر پھیل رہی ہے اور تانبے کا ٹکڑا سرخ ہو گیا ہے۔ آگ بجھی تو تانبہ اور شنگرف پیالے میں اور پارہ ہوا میں۔ ادھر مولوی صاحب کا چہرہ فق!

کسی کے ''اڑنے'' سے ساقی کے ایسے ہوش اڑے

شراب سیخ پہ ڈالی کباب پیالے میں

اس وقت مولوی خیر الدین کی حالت دیدنی تھی اور اس کی مایوسی اور پریشانی دیکھ کر دکھ ہوتا تھا۔ ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگا یا تو شپرہ چشم بیمار تھا یا آگ کی تپش کم تھی ورنہ آج یہ تانبہ، تانبہ نہ ہوتا، سونا ہوتا!

میں دوسرے دن گھوڑوں کے طویلے میں گیا تو مجھے بتایا گیا رات ''سائیں بابا'' نہیں آئے۔ دوسرے دن گیا، تیسرے دن گیا، چوتھے دن گیا، ''سائیں بابا'' نہ آئے۔ آخر پانچویں دن میں آگ کے اس الاؤ کے پاس پہنچا جہاں مولوی خیر الدین شنگرف اور پارے کو اپنے آتش کدہ میں اڑا چکے تھے۔ نہ مولوی خیر الدین نظر آئے نہ ''سائیں بابا'' دکھائی دیے۔ میں نے دیکھا ''فلسفے'' اور ''کیمیا گری'' کا بادشاہ ''پارے'' اور ''شنگرف'' کی گرمی میں گم ہو گیا ہے۔

حافظ محمد نواز نقشبندی:

حافظ محمد نواز نقشبندی، میانوالی سے اٹھے اور لاہور کے ایک شمالی محلے ''حبیب گنج'' میں سکونت پذیر ہوئے۔ مسجد چھوٹی تھی، محلے کے لوگ غریب تھے مگر حافظ محمد نواز زانو تہ کر کے اللہ کے گھر میں بیٹھ گئے۔ تنخواہ اور فیس کے بغیر محلے کے بچے حفظ و ناظرہ کی منزلیں طے کرنے لگے اور حافظ صاحب فقر و فاقہ کو اپنائے زندگی کی راہ پر گامزن رہے۔ وہ مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقش بندی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد سٹی کوتوالی میں حاضری دیتے۔ نقشبندی سلوک کی منزلیں طے کرتے حضرت ثانی صاحب علی پوری رحمۃ اللہ سے بیعت تھے اور مولانا حلوائی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ثانی صاحب کے خلیفہ مجاز۔

حافظ محمد نواز قرآن پڑھتے تو لطف آ جاتا۔ تراویح سناتے تو دریا بہتا سنائی دیتا۔ بڑ
خوش گفتار اور خوش رفتار تھے۔ قوت لایموت سے جو کچھ بچتا، غربا اور درویشوں می
تقسیم کر دیتے۔

کتاب دوست تھے، کتاب والوں سے محبت کرتے۔ دل پسند اور نایاب کتا
جہاں سے ملتی، خرید لیتے۔ ایک کتاب فروش کے پاس پرانی کتاب دیکھی، دل کو بھا گ
پشمینے کی چادر دکاندار کے حوالے کی، ٹھٹھرتے ہوئے کتاب لے آئے۔ کئی دن بع
پیسے ملے تو گروی چادر واپس لے آئے۔ آج کا مولوی کتاب کو کب خریدتا ہے۔ وہ
"بارہ تقریریں" پڑھ کر قوم کو خطاب کرتا ہے اور "وعظ فروشی" کا بیوپاری بن گیا ہے۔

حافظ محمد نواز تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے۔ ذکر و فکر کی محافل میں وق
گزارنے لگے۔ خوش خط تھے۔ کتابی ذوق کا چسکا ایسا تھا کہ اگر کسی کے پاس نادر
نایاب کتاب دیکھتے تو اسے اپنے قلم سے نقل کر کے جلد کروا لیتے۔ خواہ نقل کرتے کئی م
لگ جاتے۔ زندگی گزارتے گئے، مسجد بنواتے گئے، شاگرد بڑھاتے گئے، مقامات
سلوک طے کرتے گئے۔ جس دن اس دنیا سے رخصت ہوئے تو جنازے کے سات
ہزاروں عقیدت مند تھے۔ جنازہ گاہ میں جگہ کم تھی تو "انجینئرنگ یونیورسٹی" کی گراؤ
میں جنازہ ہوا۔ دفناتے وقت چالیس حافظان قرآن قبر کے اردگرد تلاوت قرآن کر
رہے تھے۔ قبر میں اتارے گئے تو چہرہ نور کی لپٹیں لیے ہوا تھا۔

؎ نگاہ میں برق نہ تھی، شکل آفتاب نہ تھی
یہ بات کیا ہے انہیں دیکھنے کی تاب نہ تھی

("جہانِ رضا" جون ۱۹۹۴ء)

گنج ہائے گراں مایہ

مفتی اعجاز ولی خاں رضوی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۲۰-۱۱-۷۳):

مفتی اعجاز ولی خاں رضوی (قدس سرہ) سے اس وقت نیاز مندی حاصل ہوئی
سے آپ "دار العلوم نعمانیہ لاہور" کے شیخ الحدیث، "جامع مسجد اسلام پورہ" کے
"جامعہ گنج بخش" کے ناظم اعلیٰ اور ماہنامہ "گنج بخش" کے مدیر شہیر تھے۔ آپ
اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے خانوادہ سے تھے۔ "اعلیٰ حضرت" سے قرآن پاک کی
تعلیم کا آغاز کیا اور بچپن میں آپ سے ہی بیعت کی سعادت حاصل کی۔ آپ نے
اسی خانوادہ کے بلند پایہ علماء کرام سے علوم مروجہ کی تکمیل کی۔ اپنے برادر گرامی
حضرت مولانا تقدس علی خاں شیخ الحدیث "جامعہ راشدیہ" پیر جو گوٹھ (سندھ) مولانا
احمد سلطان پوری، مولانا حسنین رضا بریلوی، مفتی اعظم ہند مصطفیٰ رضا بریلوی،
حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں بریلوی، صدر الشریعۃ مولانا امجد علی اعظمی (رحمۃ اللہ علیہم)
بلند پایہ علماء کے سامنے زانوئے ادب تہ کیے اور علوم اسلامیہ پر عبور حاصل کیا۔

مفتی اعجاز ولی خاں مرحوم ایک مقتدر عالم دین ہونے کے باوجود بڑے ملنسار،
انکسار اور دوست نواز بزرگ تھے۔ وہ نہ کسی پر تنقید فرماتے اور نہ کسی کی حرف گیری
کرتے۔ عقیدہ کے پکے، دل کے سچے اور لوگوں سے پیار و محبت کے خوگر تھے۔ میں نے
حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب "تکمیل الایمان" کا اردو ترجمہ کیا تو کتاب
پہنچتے ہی سب سے پہلے آگے بڑھے اور بیس کتابیں خرید کر لوگوں میں تقسیم کرتے
گئے۔ جب مجھے "مرج البحرین" کے ترجمہ کی سعادت حاصل ہوئی تو ابھی کتاب کی
جلد کی تزئین نہیں ہوئی تھی کہ بیس نسخے خرید کر لے گئے اور اسی رات ماڈل ٹاؤن میں

حضرت محدث دہلوی کے سالانہ عرس کی تقریب میں لے جا کر علماء میں تقسیم کرنے
لگے۔ یہ بات ان کی علم دوستی اور حضرت شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کمالات کا
اعتراف تھا۔

مفتی اعجاز ولی خاں مرحوم اپنی تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ''جمعیت علماء
پاکستان'' کے ساتھ سیاسی وابستگی رکھتے تھے۔ آپ جمعیت کے مختلف عہدوں پر منتخب
ہوئے اور زندگی بھر اس دینی و سیاسی جمعیت میں کام کرتے رہے۔ انہیں اس سیاسی
وابستگی کی وجہ سے کئی بار اپنی ملازمت، امامت اور تدریسی فرائض سے محروم ہونا پڑا۔ اگر
وہ مستقل مزاجی سے اپنی راہ پر گامزن رہے۔ آج اپنے بعض علماء کرام کو مساجد اور
مدارس کی جاہل انتظامیہ کے سامنے سرنگوں ہو کر اپنی سیاسی اور دینی جماعت ''جمعیت
علماء پاکستان'' کی صفوں سے بھاگتے دیکھتا ہوں تو مجھے مفتی اعجاز ولی خاں کا کردار
دوپہر کے سورج کی طرح درخشاں نظر آتا ہے۔ مفتی اعجاز ولی خاں بڑے خلیق انسان
تھے۔ میں ان کی انکساری اور حسن اخلاق سے اتنا متاثر تھا کہ ایک دن میں نے ازراہ
تفنن کہہ دیا: ''مفتی صاحب! مجھے ڈر ہے کہ آپ کو راستہ میں ابلیس کھڑا کر کے سلام
کرے تو آپ اسے بھی ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' کہہ دیں گے''۔ فرمانے لگے ''نہیں
اتنا بھی خلیق نہیں ہوں، لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا کوڑا مار کر اسے بھگا دوں گا''۔

مفتی اعجاز ولی خاں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میرے ساتھ اگلے مورچوں پر
گئے۔ دوسرے لفظوں میں میں ان کے ساتھ اگلے مورچوں پر گیا۔ ہمارے ساتھ
بڑے نامور علماء اہل سنت کا ایک وفد تھا۔ اگرچہ ہر عالم دین نے اپنے اپنے انداز میں
غازیان صف شکن کے سامنے اسلامی جہاد کی فضیلت پر گفتگو کی مگر مفتی اعجاز ولی خاں
مرحوم کا انداز روحانی تھا، جسے موت و حیات کے درمیان کھڑے جوانوں نے بے حد
پسند کیا۔ آپ نے بعض نوجوانوں کو ایسے وظائف بھی بتائے، جسے سپاہی سے لے کر
کمانڈر تک، ہر ایک نے حاصل کرنے میں دلچسپی لی۔ مفتی صاحب قبلہ علمی مصروفیت

کے ساتھ ساتھ خانقاہ بریلی کے ان تعویذات اور وظائف کے مجاز تھے، جو ''شمع
شبستان رضا'' میں درج ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ''دارالعلوم نعمانیہ لاہور'' میں آج
تک ان حضرات کے خطوط آتے ہیں، جو ان سے اپنے مصائب کا روحانی علاج تلاش
کرتے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم علماء اہلسنت کی محبوب و مرغوب شخصیت تھے۔ تمام علماء کرام
ان سے محبت کرتے تھے۔ ان علماء کرام کی علمی مجالس کے علاوہ انہیں حضرت علامہ سید
ابوالبرکات صدر نشین ''انجمن حزب الاحناف لاہور'' سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اپنا
زیادہ وقت حضرت کی خدمت میں گزارتے۔ علامہ ابوالبرکات ایک فاضل اجل، بلند
پایہ ماہر علوم و فنون درسیہ اور راسخ العقیدہ سنی عالم دین تھے۔ وہ اپنی علمی مصروفیتوں کے
ساتھ ساتھ ''سلسلہ قادریہ'' کی روحانی مسند پر بھی فائز تھے۔ ان دونوں نعمتوں سے
حضرت مفتی اعجاز ولی خاں نے وافر حصہ پایا تھا۔

حضرت مولانا فضل عثمان فاروقی مجددی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۵-۴-۷۳):

حضرت مولانا فضل عثمان مجددی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ افغانستان کے روحانی خانوادہ
مجددیہ کے نامور فرزند تھے۔ آپ کے والد مُلّا شور بازار افغانستان کے سیاسی اور روحانی
راہنماؤں میں صف اول کے راہنما تھے۔ انگریزوں کے خلاف جنگ مزاحمت میں
حضرت ''ملا شور بازار'' نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ آپ نے ''بچہ سقہ'' کی شورش کے
دوران افغانستان کی سالمیت کی خاطر اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس جرم پر کابل
کے گورنر خان عطا محمد نے آپ کو موت کی سزا سنائی مگر تختہ دار تک پہنچنے سے پہلے ہی
جنرل غلام نبی خاں نے افغانستان کا بہت بڑا علاقہ واگزار کرالیا۔ اس یلغار کی وجہ
سے آپ موت کے دروازے پر دستک دے کر واپس آ گئے۔ ''تحریک پاکستان'' کے
دوران حضرت پیر فضل عثمان مجددی نے افغانستان کے ہندو نواز حکمرانوں کے رویے
کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔

پاکستان کی دعوت پر کشمیر کی پہلی یلغار میں آپ نے اپنے ایک لاکھ مرید مختلف قبائل سے جمع کر کے حکومت پاکستان کے حوالے کیے۔ پھر آپ پاکستان آئے اور برصغیر میں پھیلے ہوئے اپنے لاکھوں مریدوں کو پاکستان کی حمایت اور کشمیر کے جہاد کے لیے تیار کیا۔ آپ اس مقصد کے لیے ہندوستان میں دہلی، کاٹھیاواڑ، بمبئی، کلکتہ اور مشرقی پاکستان کے دور دراز علاقوں تک پہنچے۔ آپ کا یہ انداز نہ حکومت ہندوستان کو پسند تھا، نہ افغانستان کے حکمرانوں کو، چنانچہ آپ کے لیے ہندوستان اور افغانستان میں داخل ہونے پر پابندی لگا دی گئی۔

پاکستان میں صدر ایوب نے آپ کی سیاسی خدمات کی بڑی قدر کی۔ آپ کو شاہی مراعات کا پراٹوکول دیا گیا۔ آپ کچھ عرصہ کراچی میں رہے، پھر لاہور آ گئے۔ لاہور کے قیام کے دوران آپ کی رہائش گاہ ''گلبرگ'' میں تھی۔ یہاں علماء و مشائخ کا جمگھٹا لگا رہتا۔ مجھے بھی صدر المشائخ مولانا فضل عثمان فاروقی سے انہی مجالس میں نیازمندی کا موقع ملا۔ لاہور میں میرے اہتمام میں ''یوم فاروق اعظم'' منایا گیا تو آپ مولانا ابوالحسنات رحمۃ اللہ علیہ کی وساطت سے صدر جلسہ تھے۔ مولانا محمد بخش مسلم، صاحبزادہ فیض الحسن آلومہاروی، مولانا غلام محمد ترنم اور مولانا محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا عمر فاروق کی زندگی پر بڑی پرزور تقاریر کیں۔ میری گزارش پر ''صدر المشائخ'' نے فارسی میں تقریر کی۔ مجھے یاد ہے کہ آپ کے پر جوش بیان اور ایمان افروز تقریر نے سامعین کو مسحور کر دیا اور کئی سال تک ان کی تقریر کا تذکرہ رہا۔ وہ مجاہدانہ کردار کے مالک تھے۔ وہ ''سلسلہ مجددیہ'' کا علمی و روحانی مرکز تھے اور پاکستان کو ''نظام مصطفیٰ'' کی رونقوں سے شاداب دیکھنے کے خواہاں تھے۔ وہ فلسطین کی جنگ کے راہنما مفتی اعظم سید امین الحسینی کے دوست تھے۔ غازی کشمیر مولانا ابوالحسنات کے دست راست تھے۔ عالم اسلام میں جنگ آزادی لڑنے والے مجاہدین راہنماؤں سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ۱۹۷۳ء میں فوت ہوئے تو ان کے جسد خاکی کو ایک خصوصی طیارے سے کابل

لے جایا گیا، جہاں ''خانقاہ عالیہ مجددیہ قلعہ جواد کابل'' میں اپنے والد فضل عمر ملا شور بازار کے پہلو میں آسودہ خاک ہیں۔

سید محمد معصوم شاہ گیلانی: (م: ۱۹۶۹-۱-۱۸)

ہم قیام پاکستان سے پہلے حضرت سید ابوالحسن ہجویری داتا گنج بخش لاہور رحمۃ اللہ علیہ کی آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوتے تو داتا صاحب کے بازار میں کتابوں کی ایک دکان پر ضرور رکتے۔ اس دکان کی پیشانی پر ''نوری کتب خانہ'' کا بورڈ لگا ہوتا اور دکان کی مسند پر ایک درویش صفت بزرگ بیٹھے نظر آتے۔ دکان پر چھوٹے چھوٹے رسالے رکھے ہوتے جن کے عربی نام ہماری سمجھ میں نہ آتے۔ علماء کرام سے سنا کہ یہ بزرگ حضرت مولانا سید محمد معصوم شاہ گیلانی نوری ہیں۔ بڑے عالم ہیں، صوفی ہیں اور صاحب طریقت ہیں۔ ہم نے سید معصوم شاہ کو نہ عالمانہ شان میں کبھی دیکھا نہ وعظ و تقریر کے سٹیج پر دیکھا، نہ جبہ و دستار سجائے پیر طریقت بنے دیکھا مگر ان کی دکان کے سامنے سے جو سنی عالم گزرتا، انہیں ادبا سلام کرتا۔ چند لمحے بیٹھتا اور اگر دل میں آتا تو چند رسالے ابھی لے لیتا۔

سید محمد معصوم شاہ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ سادہ چک گجرات سے آئے اور حضرت داتا گنج بخش لاہور کے مزار کے زیر سایہ دینی کتابوں خصوصاً اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کی اشاعت کرنے لگے۔ ان دنوں عام لوگ اعلیٰ حضرت کی علمی اور اعتقادی خدمات سے نا آشنا تھے۔ سید معصوم شاہ گیلانی نوری وعظ و بیان کی مجالس کے عالم دین نہ تھے، نہ طریقت کا حلقہ بنا کر مریدوں کو گھیرے میں لے کر بیٹھنے کے عادی تھے مگر وہ سنی اعتقادی کتابوں کی اشاعت کے منفرد اور ممتاز ناشر تھے۔ ایک عرصہ تک اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی کتابوں کو شائع کرتے گئے۔ صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی کے ایک نامور شاگرد مفتی احمد یار خاں نعیمی گجراتی کی تحریروں کو بھی شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ غالباً سب سے پہلے مفتی صاحب کی ''جاء الحق'' ''تفسیر

نعیمی'' ''مراۃ شرح مشکوۃ'' ''شان حبیب الرحمٰن من آیات القرآن'' آپ کے اہتمام میں ہی زیورطبع سے آراستہ ہو کر اہل علم تک پہنچیں۔ پنجاب کے سنی سادات میں شیعہ نوازی کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ بعض سید گھرانے شیعوں کی دیکھا دیکھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن کرتے۔ سید معصوم شاہ گیلانی نوری نے مفتی احمد یار خاں نعیمی کو سیدنا امیر معاویہ پر ایک جامع کتاب لکھنے پر آمادہ کیا، جو لکھی گئی اور بعد میں ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر تقسیم ہوئی۔ سید معصوم شاہ گیلانی نوری رحمۃ اللہ علیہ کی اس خاموش مگر موثر اعتقادی خدمات کے اثرات بڑے دوررس ہوئے۔

سید معصوم شاہ گیلانی کی زندگی کا ایک اور پہلو بڑا ہی قابل تحسین تھا۔ وہ مساجد کی تعمیر میں عملی حصہ لیتے۔ جب ریلوے اسٹیشن کے سامنے بلند و بالا، عمارتیں بننے لگیں تو سید معصوم شاہ گیلانی نے آگے بڑھ کر ایک شاندار مسجد بنا ڈالی، جس کا نام ''نوری مسجد'' رکھا گیا۔ اس مسجد میں ''مرکزی مجلس رضا'' کے تاریخی اجلاس ہوتے رہے اور یہی مسجد ایک عرصہ تک حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب، بانی ''مجلس رضا'' کی نگرانی میں ''مرکزی مجلس رضا'' کی اشاعتی سرگرمیوں کا مرکز بنی رہی۔ ''نوری مسجد'' کے علاوہ لاہور میں سید معصوم شاہ گیلانی نے بیس اور مساجد بھی تعمیر کرائیں۔ اسی طرح آپ لاہور کے علاوہ جس شہر یا قصبہ میں جاتے، مریدوں سے نذرانے جمع کرنے کی بجائے انہیں اللہ کا گھر بنانے پر لگا دیتے۔

مجھے سید معصوم شاہ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں بیٹھنے کا موقع تو نہیں ملا مگر میں نے اکثر علماء اہل سنت کو اس بات کا معترف پایا کہ انہیں سید صاحب نے ہی تقریر و تحریر پر آمادہ کیا ہے اور ان کی ترغیب سے وہ اس راہ پر کامیابی سے گامزن ہوئے ہیں۔

سید صاحب کی ذاتی زندگی ایک خاموش درویش اور سالک کی زندگی تھی۔ ان کے ہزاروں عقیدت مند تھے، ہزاروں مرید تھے اور ہزاروں مداح تھے۔ ان کے عقیدت مندوں کا حلقہ ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیلا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ حضرت دا

گنج بخش کے کئی ''مجاورین'' جو اپنی خصوصی نسبت کی وجہ سے کسی کو شمار قطار میں نہیں لاتے تھے، حضرت سید معصوم شاہ گیلانی نوری سے متاثر ہو کر بیعت ہوئے اور انہی کے زیر ہدایت اپنی زندگیاں گزار دیں۔

حضرت سید معصوم شاہ گیلانی کا ایک علمی کارنامہ آب زر سے لکھا جائے گا کہ انہوں نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ اس وقت شروع کیا، جب پنجاب کے اکثر لوگ اعلیٰ حضرت سے متعارف نہ تھے۔ ان کی کتابوں کو پڑھنے والا کوئی نہ تھا، ان کی کتابوں کو خریدنے والا کوئی نہ تھا، حتیٰ کہ ان کی کتابوں کے ناموں کو صحیح سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ سید صاحب اس اندھیری وادی میں شمع رضویت کو ہاتھ میں اٹھائے چلتے رہے۔ آج الحمد للہ اعلیٰ حضرت کے نظریات کو عام کرنے کے لیے کئی اشاعتی مراکز، کئی اشاعتی ادارے، کئی اشاعتی انجمنیں اور کئی لائبریریاں قائم ہوگئی ہیں اور دنیا بھر میں

ع ''گونج گونج اٹھے ہیں نغمات رضا سے بوستان''

کا سماں بندھ گیا ہے۔

آپ کی اشاعتی یادگاروں میں سے ''نوری کتب خانہ'' اور ''نوری بک ڈپو'' آج تک قائم ہیں۔ پھر آپ کے دو بیٹے سید محمد حسین شاہ نوری گیلانی اور سید محمد حسن شاہ نوری گیلانی آپ کے علمی اور روحانی مراکز کو آباد رکھے ہوئے ہیں۔

صائم چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۲-۱-۲۰۰۰):

آج سے تیس سال قبل مجھے محکمہ صنعت پنجاب نے ''انڈسٹریل ڈویلپمنٹ آفیسر'' بنا کر فیصل آباد (لائل پور) مقرر کیا۔ ان دنوں محکمہ صنعت کا یہی افسر کئی ضلعوں کا نگران ہوتا تھا۔ پاکستان ان دنوں صنعتی انقلاب کے میدان میں قدم رکھ رہا تھا اور محکمہ صنعت کے ضلعی آفیسر کے بڑے اختیارات ہوتے تھے۔ ''سمندری روڈ'' پر انجینئرنگ کی صنعتی ترقی اپنا دامن پھیلا رہی تھی۔ مجھے کسی نے بتایا کہ ایک کارخانہ دار شاعر بھی

ہے اور نعت خواں بھی۔ دوسرے صنعت کار میرے پاس آیا کرتے تھے مگر میں اس
''نعت خواں کارخانہ دار'' کے پاس خود چل کر گیا۔ پہلی بار صائم چشتی مدظلہ العالی سے
ملاقات ہوئی۔ ان دنوں ان کا نام شیخ محمد ابراہیم تھا۔ بس ایک نوعمر نوجوان۔ زلفیں لٹکی
ہوئی اور داڑھی کا آغاز۔ ملاقات ہوئی۔ بڑے خلوص ومحبت سے تبادلہ خیالات ہوا۔
معلوم ہوا کہ صائم چشتی نعت لکھتے ہیں، شعر کہتے ہیں اور حضرت پیر علی حسین علی پوری
رحمۃ اللہ علیہ سے چشتی ہوتے ہوئے بھی گہری ارادت رکھتے ہیں۔

کئی سال بعد دوبارہ ''فیصل آباد'' گیا تو پتا چلا کہ صائم چشتی صاحب، کارخانہ داری
چھوڑ کر منڈی میں تیل فروشی میں مصروف ہیں مگر تیل فروشی کے باوجود شعر وادب کا
غلبہ رہا۔ تیسری بار فیصل آباد پہنچا تو صائم چشتی کے شعری اور علمی ذوق نے آپ کو تیل
اور تیل کی دھار سے علیحدہ کر دیا۔ اب میں نے انہیں ''چشتی کتب خانہ'' جھنگ بازار
میں مسند نشین دیکھا۔ اب میرا صبح وشام چشتی کتب خانہ میں آنا جانا ہوتا۔ دینی کتابوں
کے حلقے میں صائم چشتی ایک خوبصورت نشست پر جلوہ فرما ہوتا۔ ایک خوبصورت حقہ
گردش میں ہوتا اور علماء، شعراء اور طلبہ کا مجمع ہوتا۔ کتابوں کا لین دین ان کے بھائی
فضل کریم نقشبندی مرحوم کرتے تھے اور چشتی صاحب حقے کے کش لگاتے رہتے۔ ہم
جیسے مہمانوں کو ''شربت دیدار'' کے ساتھ ساتھ ''شربت انجبار'' پلاتے اور اہلِ سخن
حضرات کو اپنے شعروں سے نوازتے۔ جن شعراء کا کلام کوئی نہ سنتا تھا، صائم صاحب
انہیں اپنے حقے کی گڑگڑاہٹ کا شریک حال بنا کر ان کا کلام سنتے اور وہ شعراء
''بشنو از نے چوں حکایت می کند'' سے فائدہ اٹھا کر ساری نظم سنا جاتے۔ میں حقہ نوش
نہیں تھا۔ میرے دفتر کے کمرے میں جو سگریٹ بھی لگاتا میں چپراسی کو اشارہ کرتا تو وہ
اسے ''ادب'' سے باہر لے جاتا مگر ''چشتی کتب خانہ'' میں حقے کے دھوئیں کے
مرغولوں کے دوران صائم چشتی کے اشعار اور ان کے رفقائے سخن کی نظمیں سنتا چلا
جاتا۔ صائم چشتی کے ساتھ ایک عرصہ تک علمی رفاقت رہی۔ وہ اپنی غربت کے باوجود

آپ کی تواضع کرتے اور خوش بختی کے باوجود ان شعراء کے کلام کو سننے کا حوصلہ رکھتے
تھے جنہیں صائم چشتی کے بغیر کوئی نہ سنتا تھا۔ پھر انہیں خوش رکھنے کا سلیقہ بھی جانتے
تھے۔

ع غم دل نگفتہ بہتر ہمہ کس جگر ندارد!

صائم چشتی پنجابی میں قادر الکلام شاعر ہیں۔ انہوں نے کم وبیش ۲۰۰ سے زیادہ
کوہ ہائے شعر لکھے اور چھپوائے۔ اردو اور فارسی میں بھی ان کے اشعار نے اہلِ علم
سے داد و تحسین وصول کی۔ آپ کی بعض نعتیں اور کتابیں تو زبانِ زدِ عام ہوئیں اور
مقبولِ خواص وعام بنیں۔ شعر وسخن کے ساتھ ساتھ صائم چشتی نے نثری انداز میں بڑی
بڑی ضخیم کتابیں لکھیں۔ پھر زندگی کے ایک موڑ پر آپ کا راہوار قلم عربی کی بلند پایہ
کتابوں کے ترجموں کی طرف بڑھا۔

آپ نے ''ابنِ عربی'' کی فتوحات مکیہ، تفسیر خازن، تفسیر ابن عربی اور امام فخر الدین
رازی کی ''تفسیرِ کبیر'' جیسی شہرہ آفاق کتابوں کے اردو ترجمے شروع کیے اور ساتھ
ساتھ چھپوانے کا اہتمام کیا۔ وہ اس میدان میں اب تک رواں دواں ہیں۔ قدیم علمائے
کرام مسائل علمیہ کی تشریح کے ساتھ ساتھ علم کیمیا اور علمِ طب سے دلچسپی لیتے رہتے
ہیں۔ ہمارے صائم چشتی علم کیمیا پر تو عمل نہ کر سکے مگر لوگوں کے علاج معالجہ میں ایک
کامیاب طبیب کی حیثیت سے علی الصباح مریضوں کی نبضوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔
''سخن شناسی'' کے ساتھ ساتھ ''نبض شناسی'' اور ''دواسازی'' میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں
اور سنا ہے کہ دوا اور دعا سے ''ھوالشافی'' کا مظہر ہیں۔

''صائم چشتی'' وقت کے ان اہلِ قلم وسخن کے زمرہ کے فرد ہیں جو اپنی زندگی کو
ہزاروں سالوں تک کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں کی روشنیوں میں صدیوں
زندہ رہتے ہیں۔ غالب نے جن لوگوں کیلئے

ے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

کا فارمولا دیا ہے، وہ یہی اربابِ تصنیف ہیں۔ صائم چشتی ایک گوشہ نشین اہل قلم ہیں۔ وہ اخباری اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے بے نیاز کام کرتے جا رہے ہیں۔

میری مجلس میں بیٹھنے والے کئی اربابِ علم وفضل ان کی تحریروں پر تنقید کرتے ہیں مگر تنقید انہی پر ہوتی ہے، جس کا کام سامنے آئے۔ جو حضرات علم وفضل کے باوجود ''جف القلم'' اور ''کف اللسان'' ہوں، ان پر تنقید کون کرے گا؟

صائم چشتی کی زندگی اس مشینی اور مصروف دور میں ان علماء کرام کے لیے بڑی سبق آموز ہے، جو علم وفضل کی دولت کے باوجود دنیا کی دولت کو ''ضروریات زندگی'' کا حصہ بنا کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ زکوٰۃ وصدقات کی چھتریوں کے سائے میں مدرسے چلاتے ہیں اور ''وعظ فروشوں کی منڈی'' میں اپنے آپ کو ''فخر الدین رازی'' اور ''امام ابوحنیفہ'' کا جانشین کہلاتے ہیں۔

''صائم چشتی'' کو اہلِ بیت سے محبت ہے اور بے پناہ محبت۔ انہوں نے اظہار محبت کے جذبہ کی تسکین کے لیے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ اظہارِ محبت کے لیے الفاظ دلائل کی تلاش میں نکلے تو رافضی اور شیعہ مولفین کی کتابوں تک رسائی حاصل کر کے بعض مقامات پر اہل سنت کے ان متفقہ نظریات سے اختلاف کرتے چلے گئے جو صدیوں سے مستند اور اجماع اہلِ سُنّت کے طور پر تسلیم کیے گئے ہیں۔ انہوں نے ''خدمات ابوطالب'' سے متاثر ہو کر ''ایمانِ ابوطالب'' پر کتابیں لکھیں تو علماء اہل سنت نے انہیں شیعوں کا وکیل تصور کیا۔ وہ ''افضلیت علی'' کے سلسلہ میں وہی دلائل لائے جو ''تفضیلی سنیوں'' کا ایک طبقہ پیش کرتا رہتا ہے۔ ان ''غلطیہائے مضامین'' کے باوجود ''صائم چشتی'' کے قلم نے اس زمانہ کی ''شب تاریک'' میں روشنیاں پھیلائی ہیں۔

انہوں نے پنجابی میں ''خاتونِ جنت'' لکھی، اردو میں ''البتول'' لکھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی افضلیت میں ''مشکل کشاء'' لکھی اور نصرت فتح علی خاں قوال کے طبلہ کی چوٹ پر ''علی علی دم علی علی'' کو دنیا بھر ''دمادم مست قلندر'' بنا دیا۔ ایک خارجی

... محمد دین بٹ'' کی بدنام زمانہ کتاب ''رشید ابن رشید'' سے کبیدہ خاطر ہو کر ''الشہید ابن شہید'' لکھی تو مقام حسین کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔

صائم نعت رسول پر مختلف انداز میں بات کرتے ہیں۔ وہ جب حضور کی مدحت بیان کرتے ہیں تو ان کی زبان وقلم سے کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں۔ وہ نعت لکھتے ہیں تو پھول کھل اٹھتے ہیں۔ وہ نعت کہتے ہیں تو بہاریں مسکرا پڑتی ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب صائم کی کہی ہوئی نعتوں پر ''تحقیقاتی مقالے'' لکھے جائیں گے اور دنیائے نعت میں ان کی کوششیں داد وتحسین حاصل کریں گی۔

(''جہانِ رضا'' جولائی ۱۹۹۴ء)

لاہور کے پرانے جلسوں پر ایک نظر

لاہور دینی اور سیاسی معرکوں کا مرکز رہا ہے۔ لاہور سے اٹھی ہوئی تحریکیں، لا...
کی محفلوں کی رونقیں اور لاہور کے دینی اور روحانی مراکز سارے پاکستان پر اث...
ہوتے ہیں۔ قیام پاکستان سے کچھ سال پہلے دوقومی نظریہ پر بڑے بڑے جلسے ہو...
تے۔ ان جلسوں میں ملک کے بلند پایہ رہنما اظہار خیال کرتے اور لوگوں کو سیاسی ا...
قومی مسائل سے آگاہ کرتے تھے۔ میں ان دنوں ایک دینی مدرسے کا طالب علم...
جس طرح دینی مدارس کے طلبہ سوشل زندگی میں قدم رکھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں،...
بھی اسی طرح سیاسی جلسوں اور ہنگاموں میں جاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ مصری شا...
گورنمنٹ کالج کے ایک طالب علم صدیقی صاحب (نام دانستہ نہیں لکھ رہا) تھے، جو...
ے نکلتے اور مجھے ساتھ لیتے اور ہم دونوں ہر روز کسی نہ کسی جلسہ میں جا پہنچتے۔ صد...
صاحب کی میرے ساتھ دوستی تھی اور میری ایک ادا کو بہت پسند کرتے تھے کہ جب
کوئی جلسہ سن کر واپس آتے تو میں انہیں تقریر کرنے والے مقرروں اور لیڈروں
تقاریر اس انداز میں سنایا کرتا تھا جس انداز اور آواز میں وہ لوگوں کے سامنے...
کرتے تھے۔ صدیقی صاحب کے لیے گویا میں گراموفون کا ایک ایسا ریکارڈ تھا ج...
میں سیاسی تقریریں ہر انداز میں موجود ہوتی تھیں۔ وہ کبھی کبھی مجھے کالج میں ا...
پروفیسروں کی محفل میں بھی لے جاتے جو سٹاف روم میں بیٹھے سیاسی لیڈروں
تقریریں سن لیتے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری احرار کے جلسہ میں:

میں نے صدیقی صاحب کے ساتھ دہلی دروازے کے باہر باغ میں مولانا...

...اء اللہ شاہ بخاری کی وہ تقریر سنی تھی جو رات شروع ہوئی اور شاہ محمد غوث کی مسجد میں
...ح کی اذان کی آواز پر ختم ہوئی تھی اور شاہ صاحب نے ''موذن بانگ بے ہنگام
...اشت'' کہہ کر تقریر ختم کی۔ اس تقریر میں فاضل مقرر نے ''حکومت الٰہیہ'' کا فلسفہ
...ن کیا اور مسلم لیگ کے پاکستان کے مطالبہ پر بڑے پر زور حملے کیے۔ شاہ صاحب
کی قوت بیانیہ کا یہ کمال تھا کہ وہ ساری رات تقریر کرتے مگر کسی کو نہ تھکنے دیتے، نہ
جانے دیتے۔ میں اس تقریر سے بڑا متاثر ہوا۔ مگر صدیقی نے مجھے بتایا کہ ''حکومت
الٰہیہ'' دراصل اکبر کے ''دین الٰہی'' کا چربہ ہے۔ تم حضرت مجدد الف ثانی کے ماننے
والے ہو، تم ''ابوالفضل اور فیضی'' کے لفظوں کے چکر میں کیوں آتے ہو۔ اپنا قبلہ
درست رکھو۔

ان دنوں مجلس احرار نے عوام کا ایک لاکھ ستر ہزار روپے کا چندہ کھا لیا تو احرار
کے ورکروں اور چندہ دینے والوں میں بڑی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ مجلس احرار کا
ایک جلسہ دہلی دروازہ کے باغ میں تھا۔ مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی سٹیج پر بڑی زور
دار تقریر کر رہے تھے۔ کسی نے آواز لگائی ''چندے کا حساب دو!'' مولانا رک گئے۔
مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ پھر بولے ''ہم چندہ لیں گے! حساب نہیں دیں گے! ہم ''احرار
اسلام'' ہیں، بنیے نہیں کہ پائی پائی کا حساب رکھتے پھریں!'' مولانا کے اس رندانہ
جواب پر احراری رضا کاروں کی طرف سے نعرے بلند ہوئے۔ ''چندہ لیں گے،
حساب نہیں دیں گے!! چندہ لیں گے، حساب نہیں دیں گے!!'' نعرے رکے تو مولانا
لدھیانوی پھر گرجے۔ ''چندے کا حساب پوچھنے والو! پہلے برٹش گورنمنٹ سے دوسری
جنگ عظیم کے مظالم کا حساب لو! پھر احرار سے چندے کا حساب لینا''۔ رضا کاروں
نے پھر نعرے بلند کیے اور سوال کرنے والا اپنا سا منہ لے کر جلسہ سے غائب ہو گیا!

لاہور میں جس طرح دہلی دروازہ کا باغ احراریوں کی جلسہ گاہ تھا، اسی طرح
موچی دروازے کے باغ میں مسلم لیگ کے جلسے ہوتے تھے۔ ہم ''مسلم ہے تو مسلم

لیگ میں آ'' کے ترانے سنتے۔ ''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح'' جیسی نظمیں سنتے۔
مجھے ان دنوں مسلم لیگی لیڈروں کی تقریریں پسند نہ آتی تھیں۔ کیونکہ یہ سب ''داڑھی
منڈے'' تھے اور میں ''داڑھی منڈے'' کی تقریر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر میرے دوست
صدیقی صاحب ان کی بڑی تعریف کرتے۔ ان ہی دنوں لوہاری دروازے کے باہر باغ
میں مولانا محمد بخش صاحب مسلم بی۔ اے تقریر کرتے تھے۔ ان کا خطاب اکثر جمعہ کی
نماز سے پہلے ہوتا۔ بڑا مجمع ہوتا۔ مولانا مسلم ''نظریہ پاکستان'' پر بات کرتے، احرار
کے خلاف بولتے، قائداعظم کی تعریف کرتے اور پاکستان کے قیام کے فوائد بتاتے۔
وہ انگریزی، اردو اور پنجابی زبان میں تقریر کرتے۔ خوش آواز تھے، خوش بیان تھے۔
تقریر میں انگریزی کے جملے روانی سے بول جاتے اور بڑی پرسوز آواز میں شعر کہتے۔

کانگریسی لیڈروں کے جلسے:

ان دنوں موری دروازے کے باہر والے باغ میں کانگریسی، مہاسبھائیوں اور
ہندوؤں کے جلسے ہوتے تھے۔ سارے ہندوستان سے ہندو لیڈر لاہور آتے۔ بڑے
بڑے عجیب لباس میں نمودار ہوتے۔ ڈھیلی ڈھیلی دھوتیاں باندھے ہوئے چلے آتے۔
اور پاکستان کے خلاف زہر اگلتے۔ ہندو، سکھ، پارسی اور کانگریسی مسلمان ان کے ارد
گرد جمع ہوتے۔ وہ انگریز کے خلاف بولتے مگر پاکستان اور بانی پاکستان کو برا بھلا بھی
کہتے۔ میں نے ان ہی دنوں ''براڈلے ہال'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سنی،
جہاں کانگریسی لوگ جوق در جوق آئے تھے۔ میں نے انہی دنوں لاہور میں قائداعظم
کی تقریر سنی۔ وہ اردو کم بولتے مگر انگریزی کے الفاظ پر جوش ہوتے اور ٹھہر ٹھہر کر علیحدہ
ادا کرتے۔

Our God is separate. Our Rasool is separate. Our Religion is separate. Our Culture is separate. Therefore, we want a separate state in which we could live an Islamic life.

آپ کے ان الفاظ پر مجمعے میں شور برپا ہو جاتا۔ نعرۂ تکبیر بلند ہوتے۔ پاکستان
زندہ باد کے نعرے لگتے۔ قائداعظم زندہ باد کے نعرے گونجتے۔ عام لوگ قائداعظم کی
زبان نہیں جانتے تھے مگر ان کے ایک ایک لفظ پر نعرے بلند کرتے تھے۔

سخن میں سوز الٰہی کہاں سے آتا ہے
وہ چیز کیا ہے! جو پتھر کو بھی گداز کرے!

مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقریر:

میں نے اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی کی وہ تقریر
سنی، جو انہوں نے پاکستان بننے سے پہلے تشکیل پاکستان کے حق میں کی تھی اور بتایا تھا
کہ یہ خطہ ایک دن سارے عالم اسلام کی خوشحالی کا گہوارہ ہوگا۔ ان کی تقریر بڑی مدلل،
موثر اور دلنشین تھی۔ لوگوں نے بڑی پسند کی۔ دیوبندی خانوادہ میں صرف مولانا شبیر
احمد عثمانی ایسے عالم دین تھے۔ جو سٹیج پر کھل کر پاکستان کے حق میں تقریریں کرتے
تھے۔ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی دوسرے چند دیوبندی عالم تھے، جنہوں نے
پاکستان کے خلاف کبھی لب کشائی نہیں کی تھی۔ ورنہ دیوبندیوں کا یہ سارا خانوادہ مولانا
ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، سید عطاء اللہ شاہ
بخاری کی قیادت میں پاکستان کی ''پ'' تک کے خلاف تھے۔ ان دنوں لاہور میں
کانگریسی راہنماؤں کے ساتھ ساتھ ''نیشنلسٹ علما'' کے جلسے بڑے پرہجوم ہوتے
تھے۔ ان کے شاگرد، ان کے مقتدی اور ان کے حلقۂ اثر کے لوگ آتے اور جلسے میں
حاضرین کی تعداد بڑھاتے۔ وہ دھواں دھار تقریریں کرتے۔ لوگوں کے دماغ ان
کے ساتھ تھے مگر دل پاکستان کے ساتھ تھے۔ میں نے صدیقی صاحب کے ساتھ مل کر
ایسے لوگوں کی لچھے دار تقریریں سنیں، پھر رات کو گھر آ کر ان پر غور بھی کیا مگر مجھے
قائداعظم کی انگریزی کے چھوٹے چھوٹے جملے دل نشین ہوتے گئے۔ میں اس وقت
انگریزی زبان سے ناآشنا تھا مگر قائداعظم کی انگریزی میرے دل میں اترتی جاتی۔

میں نے اسلامیہ کالج لاہور کی گراؤنڈ میں وہ جلسہ بھی دیکھا جہاں قائداعظم نے خطاب کرنا تھا اور جس جلسے کو خاکسار تحریک کے سالار اعظم علامہ عنایت اللہ المشرقی نے درہم برہم کر دیا تھا۔ میں نے علامہ عنایت اللہ المشرقی کو اسی مجمعے میں لوگوں کے ہاتھوں پٹتے ہوئے دیکھا۔ علامہ مشرقی کا اس دن عوام کے ہاتھوں بچ جانا ایک ا... واقعہ تھا جسے میں آج تک نہیں سمجھ پایا۔

میں نے حافظ پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری کو پاکستان کے حق میں اور قائداعظم کی تعریف میں تقریر کرتے ہوئے سنا۔ وہ لچھے دار تقریر نہیں کرتے تھے۔ سیدھا سادا بیان اور سیدھے سادے الفاظ مگر ان کی بات جو سن لیتا، عہد کر کے اٹھتا کہ وہ پاکستان بنائے گا اور قائداعظم کے جھنڈے کے سایہ میں ہندوؤں اور انگریزوں کے خلاف لڑے گا۔ ان کے جلسہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں عقیدت مندوں کا مجمع ہوتا تھا۔

مجلس احرار کے جلسے:

مجلس احرار اسلام کے جلسے بڑے پررونق ہوتے تھے۔ ان کے مقرر شعلہ بیان تھے۔ ان کے لیڈر آتش بہ لب تھے۔ ان کا ہر ایک مقرر زبردست خطیب تھا۔ ہر مقرر منفرد طرز بیان کا مالک تھا۔ میں نے سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کی قیادت میں احراری مقررین کی تقریریں سنیں۔ ہر ایک مقرر دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بولتا۔ مولوی محمد علی جالندھری، چوہدری افضل حق، شیخ حسام الدین امرتسری، ماسٹر تاج دین انصاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، صاحبزادہ سید فیض الحسن، مولوی مظہر علی اظہر، مظفر علی شمسی اور آغا شورش کاشمیری شعلہ بیاں مقرر تھے۔ مگر یہ لوگ پاکستان کے خلاف تقریریں کرتے تھے۔ قائداعظم کو برا بھلا کہتے اور ہندوؤں کی ہمنوائی میں دھواں دھار تقریریں کرتے۔ وہ مسلمانوں کے جذبہ ایمانی اور تحریک آزادی وطن سے بے خبر تھے۔ وہ محراب و منبر میں کھڑے ہو کر بھی گاندھی اور نہرو کی تعریف کرتے اور مسلمانوں کو علیحدہ مملکت حاصل کرنے سے ڈراتے تھے۔ میں ان شعلہ بیانوں کی

تقریریں سننے پہنچ جاتا مگر ان کے خیالات سن کر دل کڑھتا۔ میں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی دہلی پہنچ کر اس جلسے میں تقریر سنی، جس کے دوران انہیں مشہور دیوبندی عالم دین مولوی اشرف علی تھانوی کی موت کی خبر پہنچی تھی اور انہوں نے موضوع سے ہٹ کر مولوی اشرف علی تھانوی کو ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ میں نے لکھنؤ میں ان کی وہ تقریر سنی جس میں انہوں نے جمعیۃ علماء ہند کے جھنڈے کے نیچے لوگوں سے پاکستان کی مخالفت کا عہد لیا۔ میں نے رام تلائی سیالکوٹ میں ان کی وہ تقریر بھی سنی، جس میں وہ پاکستان کے لفظ پر لطیفے سناتے رہے۔ احراری مقررین کی تقریریں سننے کے لیے میں شاہ محمد غوث کے سامنے مجلس احرار کے دفتر میں جانے لگا۔ وہاں میرے کچھ دوست احرار کے دفتر میں مختلف فرائض سرانجام دیتے تھے۔ میں نے ان شعلہ بیانوں کو بھنے ہوئے مرغے اڑاتے دیکھا۔ مجھے صدیقی صاحب نے کئی بار ٹوکا کہ احرار کے صرف جلسے دیکھا کرو، دفتر میں نہ جایا کرو۔ مگر میں آنے بہانے دفتر میں چلا ہی جاتا۔ دسترخوان پر مرغ اڑتے دیکھتا اور تلی ہوئی مچھلی کے ترنوالے دیکھے بغیر نہ رہتا۔

مسلم لیگ کے جلسے:

میں نے مسلم لیگ کے جلسے دیکھے۔ یہ جلسے زیادہ تر لاہور موچی دروازے کے باغ میں ہوا کرتے تھے۔ اگرچہ مسلم لیگی رہنما اشتعال انگیز تقریریں نہیں کرتے تھے مگر خضر حیات ٹوانہ کی حکومت تحریک پاکستان پر لوگوں کو یکجا کرنے سے روکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ لاٹھی چارج بھی کرا دیتی اور دفعہ ۱۴۴ کی آڑ میں رضا کاروں کو جیل میں بھی لے جاتی۔ ان جلسوں میں میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ، نواب ذوالفقار علی خان آف ممدوٹ، سردار عبدالرب نشتر، خان عبدالقیوم خان، خان لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، مولانا محمد بخش مسلم، نواب زادہ رشید علی خان اور بنگال اور یوپی کے مقتدر مسلم لیگی لیڈر تقریریں کرتے اور لوگوں کو پاکستان حاصل کرنے کی اہمیت پر زور دیتے۔

لاہور کے دینی جلسے:

ان سیاسی جلسوں سے ہٹ کر لاہور میں دینی اور مذہبی جلسوں کی رونقیں بھی نہ تھیں۔ علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف لاہور کا سالانہ جلسہ مسجد وزیر خان میں کراتے تھے۔ یہ جلسہ دراصل دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء کو دستار فضیلت (تقسیم اسناد) دینے کی تقریب کے طور پر منایا جاتا تھا مگر علامہ ابوالبرکات اسے تین دن مناتے۔ ہندوستان بھر سے سنی علماء کرام کو دعوت خطاب دیتے۔ ملک بھر کے اہل ذوق کو شرکت کے لیے بلاتے۔ اس طرح لاہور کے کوچہ و بازار سنی علماء اور سامعین سے پر رونق ہو جاتے۔ میں نے ان جلسوں میں حضرت محدث کچھوچھوی، صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی، حافظ پیر جماعت علی شاہ علی پوری، شیخ الحدیث مولانا سردار احمد فیصل آبادی (ان دنوں آپ بریلی سے تشریف لایا کرتے تھے)، مولانا قطب الدین جھنگوی، پیر ولایت شاہ صاحب گجراتی، صدر الشریعت مولانا محمد امجد علی صاحب اعظمی (مولف بہار شریعت)، مولانا ابوالحسنات قادری، مولانا محمد یار چشتی نظامی فریدی، مولانا عبدالغفور ہزاروی، علامہ احمد سعید کاظمی، مفتی احمد یار گجراتی، مولانا حشمت علی خان صاحب جیسے ناموران اہل سنت کو ان جلسوں میں سنا۔ ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، مولانا غلام دین انجمن شیڈ، حافظ مظہر الدین اور دوسرے نوجوان علماء ان دنوں ابھرتے ہوئے مقرر تھے، جو اس سٹیج پر تعارفی تقاریر کیا کرتے تھے۔ آگے چل کر ان حضرات نے علمی اور روحانی مراکز میں بڑا نام پیدا کیا اور اپنے اپنے مقام پر قد آور علماء دین نظر آئے۔

مسجد وزیر خان کے جلسے:

علامہ سید ابوالبرکات اپنے جلسے کے انتظامات کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ہر ایک عالم دین کے لیے ریلوے سٹیشن پر استقبال کرنا، خود جا کر بڑے اہتمام سے جلسہ گاہ

لاتا۔ اس جلسہ گاہ کا سٹیج ایک سو سے زیادہ نشستوں کا سٹیج ہوتا تھا۔ منقش قالینوں پر [illegible] سے زیادہ رنگین توشک اور گاؤ تکیے سجے ہوئے ہوتے۔ علماء کرام ان نشستوں پر جلوہ افروز ہوتے اور ان کے سامنے خوبصورت پاندان، اگالدان، سبز الائچی اور سفید [illegible] کی خوبصورت ڈلیاں چمکدار طشتریوں میں رکھی ہوتیں۔ کبھی کبھی عطر گلاب کا خوبصورت چھڑکاؤ ہوتا تو جلسہ مہک اٹھتا۔ سید ابوالبرکات ہر عالم دین کے پاس بہ نفس نفیس حاضر ہو کر آداب خدمت بجا لاتے۔ مجھے کئی بار ان جلیل القدر علماء کرام کی قربت کا موقع اس طرح ملتا کہ میں بھی ان خدام کے زمرے میں شامل ہو جاتا جو سٹیج پر جلوہ افروز علماء کرام کی خدمت پر مامور ہوتے۔ اس طرح سٹیج پر کھڑے کھڑے حد نگاہ تک پھیلے ہوئے ان سامعین کے نورانی چہروں کی ایک جھلک دیکھ لیتا جو ملک کے گوشے گوشے سے آتے تھے۔ میں نے ایسے سیکڑوں سنی علماء کرام کو دستار فضیلت سر پر سجاتے دیکھا ہے، جو آگے چل کر علم و فضل کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے رہے ہیں۔

دیوبندی جلسے:

اہل سنت کے اس مثالی اجتماع کے علاوہ دیوبندی علماء کرام کا سالانہ اجتماع شیرانوالہ دروازہ کی اس مسجد میں ہوتا جو مولوی احمد علی صاحب لاہوری کے دم قدم سے آباد تھی۔ مولوی احمد علی لاہوری نے اپنی تقریر و تحریر کی بدولت اس مسجد کو دیوبندیوں کا مرکز بنا دیا تھا۔ مولانا لاہوری کی وجہ سے اس مسجد میں سارے برصغیر کے جید علمائے دیوبند آتے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی احمد علی لاہوری نے اپنی زبان و قلم سے عقائد دیوبند کی اشاعت میں جتنا حصہ لیا ہے، اس کی مثال دیوبندیت کی پوری تاریخ میں شاید ہی ملے۔

وہابی جلسے:

وہابیوں کے جلسے لاہور شہر کے درمیان چینیانوالی مسجد میں ہوا کرتے تھے۔

مولوی عبد الواحد صاحب ان جلسوں کا اہتمام کرتے تھے۔ ان جلسوں میں بڑے بڑے سخت جان اور کرخت بیان وہابی آتے تھے مگر ان دنوں پنجاب میں وہابیت کا زور نہ تھا اور نہ سعودیہ کے پاس اتنا روپیہ پیسہ تھا کہ ان لوگوں کو ''دانہ دنکا'' ڈال سکے۔ یہ جلسہ ہوتا۔ وہابی علماء بدعت اور شرک پر تقریریں کرتے اور چلے جاتے۔

شیعہ مجالس:

شیعہ طبقے کے لوگ لاہور میں جلسے تو نہیں کرتے تھے، مگر ان کے ماتمی اجلاس منعقد ہوا کرتے تھے۔ شیعوں میں اتفاق اور تنظیم کا یہ عالم تھا کہ ان کے ماتمی جلسوں میں رونے دھونے کے لیے سارے شہر کے شیعے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ ان جلسوں کی رونقیں بس رونے دھونے اور آہ و فغاں سے معمور ہوتی تھیں۔ شیعوں کے مقرر اور ذاکر فصاحب و بلاغت میں طاق تھے۔ وہ ایک ایک لفظ سے کئی کئی معنے تراشتے اور انہیں کئی کئی انداز میں بیان کر جاتے۔ اگر ان کی مجلسوں سے رونے دھونے کی آواز نکال دی جائے تو فصاحت و بلاغت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر ہوتا جو لکھنوی ادب کی چاشنی بکھیرتا جاتا۔

اک رنگ کا مضموں ہو، سو رنگ سے باندھوں!

قادیانی جلسے:

مرزائی ان دنوں انگریز کی چھتری کے سایہ میں قادیان سے نکل کر لاہور آ جمع ہوتے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی موت بھی لاہور کے اس علاقہ میں ہوئی تھی جو اکبری دروازے کے باہر رام گلیوں کا علاقہ کہلاتا ہے۔ بس یہاں ہی ان کے اجلاس ہوتے، یہاں ہی ''وحی'' نازل ہوتی اور یہاں سے ہی مرزائی عقائد کی اشاعت ہوتی تھی۔ مرزائیوں کے جلسے، عوامی جلسے نہیں ہوتے تھے، بس کمروں میں اجتماع کی صورت تھے۔ ان کا ہر مقرر ''صحابی'' ہوتا اور ہر سامع بھی ''صحابی'' کہلاتا۔ میں نے مرزا محمود

[illegible]ول کو یہاں ہی آتے جاتے دیکھا۔ پھر دیکھتے دیکھتے ہی ''قادیانی مرزائی'' اور [illegible]ہوری مرزائی'' علیحدہ علیحدہ ہو گئے اور ان کی اجتماعیت میں انتشار پیدا ہو گیا اور [illegible] قادیان نے یہاں آنا جانا بھی چھوڑ دیا۔

[illegible]حانی مجالس:

[illegible]ہور میں سیاسی اور دینی جلسوں کے علاوہ ''روحانی مجالس'' بھی منعقد ہوا کرتی [illegible]۔ ان کا ایک اپنا انداز تھا۔ ان روحانی مجالس کی رونقیں بزرگان طریقت کی [illegible] سے دوبالا ہو جایا کرتی تھیں۔ ذکر و فکر کے یہ اجتماع بڑے ایمان افروز [illegible] اور دلوں کی دنیا کو آباد رکھتے۔ ان روحانی مجالس کی تفصیلات ایک مستقل [illegible] کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر موقع ملا تو ہم اپنے قارئین کو ان محافل میں لے جائیں [illegible] ان شاء اللہ۔

نہ دیکھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے پھرتے ہیں اپنی آستینوں میں

(''جہانِ رضا'' جولائی ۱۹۹۴ء)

اہلِ سنت کے جلسوں پر ایک نظر

حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے ۱۹۳۹ء میں ''مرکزی ا
حزب الاحناف'' کے سالانہ جلسہ میں مسجد وزیر خان لاہور کی شاندار اسٹیج پر پہلی
دیکھا تھا۔ آپ سر پر ''شاہی تاج'' سجائے، گیروا لباس پہنے، تقریر کے آغاز میں ا
خوبصورت منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار ایک عالم دین کے سر پر ''شاہانہ تاج'' (شاہ ہمدانی
تاج) سجے دیکھا تو حیرت زدہ ہو گیا۔ حضرت محدث کی آنکھوں کی سرخی اور ان
چہرے کا جلال یوں دکھائی دیتا تھا، جیسے واقعی ایک زبردست شہنشاہ اپنے وزراء، امر
کے حلقہ میں اپنی رعایا کو خطاب کر رہا ہو۔ حضرت کی آواز سے مسجد وزیر خان کے
در گونج رہے تھے جس سے در و دیوار روشن تھے۔ خطبہ کے الفاظ کی ادائیگی اتنی پر
تھی کہ سامعین دم بخود تھے۔ مسجد وزیر خان کا وسیع صحن سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا
یہ سامعین عامی نہیں تھے، اہل علم و فضل تھے۔ اہل ذوق و محبت تھے۔ محدث صاحب
تقریر فصاحت و بلاغت کا ایک نمونہ تھی۔ آپ کا انداز بیان اہل علم کے لیے غذا
روح تھا۔ آپ کا خطاب آدھ گھنٹہ یا ایک گھنٹہ نہیں، رات ڈھلنے تک جاری رہا
سامعین ہمہ تن گوش بیٹھے رہتے اور ہنستے رہتے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب م
وزیر خان کا صحن اہل ذوق، اور سامعین سے لبالب بھرا ہوتا تھا۔ یہ ان دنوں کی با
ہے جب تشنگانِ علم و فضل ''نوشا نوش'' کی آواز پر اُمڈے آتے تھے۔ یہ اس زمانے کی
یاد ہے جب سامعین شب ہجراں کے ماروں کی طرح جاگتے رہتے تھے اور تقریریں

...تے تھے۔

شب ہجراں کے جاگنے والو ۔۔۔ کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی

حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علامہ سید ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ کے
خاندان کے نامور فرد تھے۔ علامہ ابوالبرکات اسی خانوادہ کی نسبت سے ''اشرفی''
کہلاتے تھے۔ حضرت علامہ سید ابوالبرکات با ایں علم و فضل محدث کچھوچھوی صاحب
کے لیے آنکھیں فرش راہ بنائے رکھتے اور دست بستہ خدمت کے لیے کھڑے رہتے۔
پاکستان بننے کے بعد حضرت محدث کچھوچھوی جب لاہور آتے تو ملک دین محمد
اینڈ سنز تاجران کتب، بل روڈ، لاہور کے مالک ملک عارف مرحوم کے ہاں قیام فرماتے
اور ہم زیارت کے لیے وہاں ہی حاضر ہوتے۔ انہی مجالس نے ہمیں ذوق زیارت
اور ذوق تقریر عطا کیا۔ انہی مجالس نے ہمیں اہل اللہ کی دید کا مشتاق بنایا۔

حضرت محدث رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں کا سلسلہ ہندوستان کے علاوہ پاکستان کے
مختلف علاقوں میں پھیلا ہوا تھا۔ بہاولپور اور اس کے مضافات میں آپ کے عقیدت
مندوں کی بڑی تعداد تھی۔ آپ پاکستان آتے تو بہاولپور اور اس کے قرب و جوار میں
علمی اور روحانی روشنیاں بکھیرتے۔ مجھے کئی بار اس علاقہ میں جا کر بھی آپ کی تقاریر
سننے کا موقع ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ سفر کرتے تو فصاحت و بلاغت آپ کے ہم
رکاب ہوتے۔ جہاں جاتے، عزت و شہرت قدموں میں بچھی جاتی۔ تقریر کرتے تو
مجمع پر سکوت چھا جاتا، قرآن پڑھتے تو دل دہلتے جاتے۔ نگاہ اٹھاتے تو لوگ بے تاب
ہو جاتے۔

مولانا محمد حسین صاحب نعیمی نے اپنے ''دار العلوم نعیمیہ'' (چوک دالگران) کے
ایک جلسے پر حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت خطاب دی، مجھے سپاسنامہ پڑھنے
کا حکم دیا۔ میں نے بڑا زور دار سپاسنامہ لکھا اور بڑے عمدہ الفاظ میں ترتیب دیا اور
والہانہ انداز میں پڑھا۔ مگر حضرت محدث نے جلسۂ عام میں مجھے سخت سست کہا۔ جلسے

کے اختتام پر حضرت نے مجھے اپنے پاس بلایا اور فرمایا: ''کسی کو سامنے بٹھا کر اتنا
نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے تکبر کی خو پرورش پاتی ہے۔ پھر تم تو ابھی بچے ہو، اتنی
باتیں نہیں کرنا چاہیے''۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے شفقت سے دعائیں دیں
میرے سر پر رکھا۔

حضرت محدث رحمۃ اللہ علیہ عوام میں تقریر کرتے، علمائے کرام کی محفل میں جلوہ
کرتے، خصوصی مجالس میں مشکل مسائل کی عقدہ کشائی فرماتے، رات آتی تو معمولا
کے وظائف ادا کرتے اور رات کا خاصا حصہ اللہ کی بارگاہ میں سربسجود ہو کر گزار د
میں نے دولت مندوں اور وقت کے رؤسا کو ان کے دروازے کے سامنے
باندھے کھڑے پایا مگر آپ کو کسی وزیر، امیر کی ''زیارت'' کے لیے کہیں جاتے
دیکھا۔ نواب آف بہاولپور آپ کے عقیدت مند تھے مگر ساری زندگی آپ کو کبھی نو
صاحب کے محل میں قدم رکھتے نہیں دیکھا۔ آج میں اپنے وقت کے علماء کو چھو
چھوٹے دنیاداروں اور بدقماش وزیروں کی کوٹھیوں میں خوش خوش آتا جاتا دیکھتا ہو
تو حضرت محدث یاد آتے ہیں۔

حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے علم و عرفان سے برصغیر کے ہر خطے
مسلمانوں کو حصہ دیا۔ دلوں کو عشق مصطفیٰ کی شمع کی روشنیاں دیں۔ تحریک پاکستان
صف اول میں کھڑے ہو کر پاکستان کی حمایت کا اعلان کیا۔ صرف سیاسی نہیں،
اہمیت کے پیش نظر آپ نے نظریہ پاکستان کے وجود کو ضروری قرار دیا اور اس کی
سارے ملک میں کی۔ علمائے اہل سنت اور مشائخ کو حصول پاکستان کے لیے ۱۹۴۶
میں ''سنی بنارس کانفرنس'' میں اکٹھا کیا اور ایک تاریخی قرارداد پاس کر کے قائداعظم
یقین دلایا کہ ان کی پاکستان کے لیے خدمات قابل قدر ہیں اور اعلان کیا کہ اگر
خدانخواستہ قائداعظم کسی مقام پر سیاسی دباؤ میں آ کر قیام پاکستان کے مطالبہ
دستبردار بھی ہو جائیں تو برصغیر کے اہل سنت پاکستان کے قیام سے کبھی کنارہ کشی نہیں

گے۔ حضرت محدث کچھوچھوی کی سیاسی بصیرت اور خدمات کو قائداعظم بے حد
نگاہ سے دیکھتے تھے اور یہی وہ خدمات ہیں، جو سنہری حروف میں لکھی جائیں گی۔

مولانا احمد دین درگاہی رحمۃ اللہ علیہ:

پاکستان بننے سے آٹھ سال پہلے مجھے ریاست بہاولپور کے ایک شہر ہارون آباد
میں قیام کا موقع ملا۔ وہاں مجھے مرکزی جامع مسجد کے خطیب مولانا احمد دین درگاہی
کا اتفاق ہوا۔ مولانا درگاہی، ضلع گجرات کے ایک گاؤں بیگہ مروج پور کے
والے تھے۔ بڑے باوقار اور بہادر عالم دین تھے۔ وہ اتنی بڑی مسجد میں اپنی
کی وجہ سے ساری ریاست بہاولپور میں مشہور ہوئے۔ آپ شیخ الجامعہ، علامہ غلام
گھوٹوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور دارالعلوم حزب الاحناف لاہور سے سید ابوالبرکات
حدیث پڑھی تھی۔ وہ مجھے بتایا کرتے تھے کہ انہوں نے سید دیدار علی شاہ الوری
سے بھی درسی کتابیں پڑھی تھیں۔ ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، مولانا نور اللہ
نعیمی اور مولانا غلام دین آف انجمن شیڈ لاہور آپ کے ہم درس تھے۔ وہ جب
ہارون آباد سے حج بیت اللہ شریف کو گئے تو آدھا شہر آپ کو الوداع کہنے کے لیے امڈ آیا۔

آپ نے ۱۹۴۴ء میں ایک زبردست جلسے کا اہتمام کیا اور اتنی محنت کی کہ ہارون
آباد کے علاوہ، بہاولنگر، چشتیاں، فقیروالی، فورٹ عباس کے سارے دیہات کے لوگ
میں قطار در قطار پہنچے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سیکڑوں سانڈنی سوار ریگستانوں کو
ہوئے جلسہ گاہ میں شریک ہوئے تھے۔ اس جلسہ میں، میں مولانا غلام علی اوکاڑوی
(ان دنوں وہ غالباً جالندھر سے آئے تھے) مولانا غلام قادر اشرفی لالہ موسیٰ، مولانا غلام
دین لاہور، مولانا محمد بخش مسلم بی۔ اے نے بھی خطاب کیا جب کہ صدارتی خطبہ
حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا۔ ریاست بہاولپور کے اس ریگستانی علاقہ
میں اتنے بڑے بڑے علماء کرام کا جمع ہونا ایسا ہی تھا، جیسے لق و دق صحرا میں ابر بہاری
لوٹ کر برسے۔ مولانا درگاہی اس جلسہ کے منتظم اعلیٰ بھی تھے اور سٹیج کے سیکرٹری بھی۔

مولانا درگاہی، ہارون آباد کی جامع مسجد کے ان دنوں خطیب تھے۔ جب م
کے محراب و منبر کے حسن و جمال کو نکھارا جا رہا تھا۔ کچا فرش، بلند و بالا مینار اور سادہ
دیوار بنائے جا رہے تھے اور پانی کی قلت تھی۔ جب مسجد مکمل ہوئی تو اس میں وق
کے بلند پایہ خطیب اور علماء اہلسنت نے وہاں دینی تربیت کا کام کیا مگر مولانا احمد د
درگاہی کا زمانہ بڑا سنہری زمانہ تھا۔

پاکستان بننے سے پہلے مجھے ہارون آباد کے مضافات میں ایک دارالعلوم ''تعلیم
الاسلام'' میں دینی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ میں گاہے بگاہے مولانا درگاہی کی
خدمت میں حاضر ہوتا تو وہ بڑی شفقت فرماتے۔ میں لاہور آ گیا، تو جب بھی لا
آتے، ملاقات کا موقع دیتے اور میری علمی خدمات کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ جب
جسمانی عوارض کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنے گاؤں بیگہ میں صاحب فراش ہوئے تو ان
کی یادیں ان کے ایک عزیز کی وساطت سے باد بہاری بن کر لاہور چلی آتیں۔

مجھے یاد ہے کہ مولانا کی شادی پر علماء اہلسنت کی ایک کثیر تعداد براتی بن کر
شریک ہوئی تھی۔ یہ ان کی ملنساری کا ثمرہ تھا کہ بڑے بڑے معروف علماء کرام براتی بنے
مولانا غلام قادر اشرفی آف لالہ موسیٰ کو خدا معلوم کیا سوجھی کہ مولانا درگاہی کے لیے
برات کے جلوس ایک بیل گاڑی پر لاؤڈ سپیکر نصب کر دیا گیا۔ براتی علماء کرام گ
کوچوں میں رک رک تقریر کرتے جاتے۔ جب برات کا جلوس دلہن کے گھر کے
سامنے پہنچا تو مولانا غلام قادر اشرفی نے اعلان کیا کہ اب دولہا میاں مولانا احمد دین
درگاہی تقریر کریں گے۔ درگاہی صاحب کی فرمانبرداری ملاحظہ ہو کہ انہوں نے دو
ہوتے ہوئے بھی دلہن کے دروازے کے سامنے اتنی پرجوش تقریر کی کہ سارا علاقہ گو
اٹھا اور اس طرح ہم دولہا کو لے کر دلہن کے گھر پہنچے۔

پاکستان بنا۔ قادیانیوں نے ملک کے اعلیٰ مناصب پر قبضہ کر لیا۔ وزارت خا
اور ایئر فورس کی ہر شاخ پر مرزائی بیٹھا نظر آتا۔ مرزائیوں نے ملک میں اتنی بالا دس

ل کر لی کہ لوگ تنگ آ گئے۔ ''تحریک ختم نبوت'' چلی تو مولانا درگاہی، ہارون آباد
قادیانیوں کے خلاف میں جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ پولیس نے گرفتار کرنا چاہا
ی ہاتھوں پر پوری نہ آتی تھی۔ آپ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہا: ''راہ
میں گرفتار ہونے والوں کو زنجیروں کی ضرورت نہیں۔ آؤ میں خود جیل جاؤں
''۔ مولانا درگاہی کی جرات رندانہ آج بھی ہارون آباد کے ہزاروں شہریوں کو یاد ہے۔

مولانا کی وضع داری اور ملنساری کی عادت سنی علماء کرام میں منفرد تھی۔ وہ اپنے
سنی علماء کرام کے ساتھ ہوتے تو یوں معلوم ہوتا کہ وہ ایک خادم ہیں۔ احباب کا
تے تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ اپنے پیر و مرشد کا ذکر کر رہے ہیں۔ تقریر کرتے تو
ان کی گرج اور للکار کسی سے کم نہ ہوتی۔ آخری عمر میں صاحب فراش ہو گئے اور کئی
سال تک احباب اور ارباب علم سے کٹے رہے، مگر اپنے ایک عزیز کی وساطت سے
یادوں کو لاہور پہنچا کر دل و دماغ کو زندہ کر دیتے۔

مولوی شمس الدین مرحوم:

مولوی شمس الدین مرحوم نہ مولوی تھے، نہ خطیب، نہ شاعر تھے، نہ ادیب۔ میں
ان کی تقریر کبھی نہیں سنی۔ انہیں تقریر کرنا آتی نہیں تھی۔ میں نے ان سے کوئی شعر
نہیں سنا، وہ شعر نہیں کہتے تھے۔ میں نے ان کی کوئی تصنیف نہیں دیکھی، وہ اہل قلم نہیں
۔ مگر میں نے ان کی مجلس میں ہمیشہ علماء، فضلاء، خطباء و اہل تحقیق اور اہل قلم کو
اپنے گھیرے میں لیے ہوئے دیکھا۔ وہ مسلم مسجد لاہور کے نیچے نادر کتابوں کی ایک
دکان کے مالک تھے۔ ان کے پاس نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ تھا اور کتاب کے
متلاشی اور کتاب سے محبت رکھنے والے ارباب علم ان کی دکان میں بیٹھتے اور پہروں
نادر اور نایاب کتابوں پر گفتگو کرتے۔

مولوی شمس الدین مرحوم عالم دین نہیں تھے مگر وہ کتابوں کے عالم تھے۔ آپ کسی
کتاب کے متعلق گفتگو کریں، مولانا آپ کو بتائیں گے کہ اس کتاب کے کتنے ایڈیشن

چھپے، کہاں کہاں چھپے، کب کب چھپے اور کون سا ایڈیشن اعلیٰ ہے۔ مولانا جب کتابوں کے بارے میں گفتگو کرتے تو یوں معلوم ہوتا کہ صدیوں کے کتابی خزانے ان کے سامنے ہیں اور ان کے ایک ایک ورق سے واقف ہیں۔

مولوی شمس الدین مرحوم عالم نہ تھے مگر علماء کا مجمع ان کی دکان پر ہر وقت لگا رہتا۔ وہ عالم نہ تھے مگر لاہور میں ہر آنے والا عالم دین انہیں سلام کرنے جاتا۔ مولوی شمس الدین مرحوم عالم نہیں تھے مگر پاکستان کا کوئی عالم دین جس نے ایک کتاب بھی پڑھی تھی، آپ سے واقف تھا۔ وہ صرف کتاب شناس ہی نہ تھے بلکہ کتاب سے محبت کرنے والے حضرات کی قدر کرتے، عزت دیتے، وقت دیتے اور تواضع بھی کرتے۔ وہ اگرچہ غریب دکاندار تھے مگر اہل علم کی خاطر تواضع میں، جو کچھ ہاتھ میں آتا خرچ کر دیتے۔ میں نے کئی ایسے مولویوں کو ان کی دکان پر بیٹھے دیکھا، جو بات کتاب کی کرتے مگر فرمائش مرغ بریانی کی کرتے۔ مولوی شمس الدین ''نعمت کدہ ہوٹل'' سے اعلیٰ قسم کے مرغاب اور بریانی منگوا کر پیش کرتے۔ وہ کھا کر جب دانتوں میں پھنسی ہوئی بوٹیاں نکالتے تو ہمیں ان مولویوں پر غصہ آتا کہ یہ غریب مار کرنے والے مولوی کہاں سے آجاتے ہیں۔ ہم فاقہ زدہ مولوی شمس الدین کی مہمان نوازی پر ناراض ہو کر انہیں ایسی حرکت سے روکتے، تو وہ نہ ہمیں جواب دیتے نہ مرغ بریانی کھانے والوں سے ہاتھ کھینچتے!

مولوی شمس الدین مرحوم کی دکان اہل علم و فضل کا مرجع بنی ہوئی تھی۔ مجھے بڑے بڑے اہل علم اور ''اہل کتاب'' سے اسی دکان سے شناسائی حاصل ہوئی۔ میں نے ممتاز حسن مرحوم (گورنر سٹیٹ بنک) کو کتابوں سے گرد جھاڑتے دیکھا۔ میں نے میر علی احمد خاں تالپور مرحوم (وزیر دفاع پاکستان) کو مولوی صاحب سے کتابیں خریدتے دیکھا۔ میں نے بشیر حسین صاحب ناظم (ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل وزارت امور مذہبی پاکستان) کو کتابوں کی ورق گردانی کرتے دیکھا۔ میں نے سید شرافت نوشاہی

(مؤلف شریف التواریخ) کو گھنٹوں یہاں بیٹھے دیکھا۔ میں نے ملک محمد لطیف مرحوم (مؤلف اولیائے لاہور) کو نادر کتابوں پر بحث کرتے یہاں سنا۔ میں نے مولانا غلام رسول مہر (مدیر انقلاب) کو کتابوں کی جستجو میں دیکھا۔ میں نے نواب زاہد حسین (صادق آباد) کو ہزاروں روپوں کی کتابیں خریدتے دیکھا۔ میں نے حکیم محمد موسیٰ امرتسری (بانی مرکزی مجلس رضا) کو یہاں اٹھتے بیٹھتے دیکھا۔ میں نے یہاں مولانا محمد عالم مختار حق، احسان دانش مرحوم، مولانا محمد بخش مسلم مرحوم، محمد اقبال مجددی، علامہ مرزا غلام قادر، مخدوم غلام جیلانی، سید اصغر علی شاہ جعفری، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر مرحوم، مولانا محمد دین رضوانی مرحوم (ریاض شاہد کے والد) اور کالجوں کے پروفیسروں اور سیکڑوں کتاب دوست حضرات کو اسی دکان میں کتابوں کی تلاش میں سرگرم پایا۔

پرانی اور نادر کتابوں کے تاجروں کے برعکس مولوی شمس الدین مرحوم نہ صرف کتاب شناس تھے بلکہ وہ مردم شناس بھی تھے۔ پرانی کتابوں کے تاجر کسی کتاب میں دلچسپی لینے والے گاہک سے زیادہ قیمت وصول کرتے ہیں مگر مولوی شمس الدین جس کتاب شناس کو کسی نادر کتاب پر فریفتہ پاتے تو اس کے ذوق کے پیش نظر بسا اوقات قیمت خرید سے بھی کم قیمت لے لیتے۔ ایسے کئی واقعات کو میں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور اس درویش صفت کتب فروش کے انداز کتب فروشی پر داد و تحسین دیے بغیر نہ رہ سکا۔ میری موجودگی میں اسٹیٹ بنک کے سربراہ ممتاز حسن کسی کتاب کی تلاش میں آئے، مولانا کے پاس وہ نادر کتاب موجود تھی۔ پیش کی۔ چند صفحات کی کتاب تھی۔ ممتاز حسن مرحوم نے از رہ قدر افزائی بتایا کہ مولانا میں اس کتاب کی تلاش میں تیس سال سے سرگرداں تھا۔ انہوں نے ایک سو روپیہ کا نوٹ نکال کر پیش کیا۔ (ان دنوں سو روپے کا نوٹ، سو روپے کا قبالہ ہوتا تھا) مولانا شمس الدین اٹھے اور اپنی جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا جس پر ممتاز حسن کے دستخط چھپے ہوئے تھے اور کہا، آپ اس نوٹ کی سفیدی پر اپنے قلم سے ایک اور دستخط فرما دیجیے۔ دستخط ثبت ہوئے

تو مولانا نے فرمایا: ”یہ نادر (نوٹ) میری نادر کتاب کی قیمت ہے“۔ اور سو روپے کا
نوٹ واپس کر دیا۔

مولوی شمس الدین مرحوم کی دکان پر ہر مکتب فکر کے کتاب شناس اور ”کتاب
تلاش“ آیا کرتے تھے۔ سنی، وہابی، دیوبندی، شیعہ، سکالر، پروفیسر غرضیکہ اساتذہ و
طلبہ کی مجلس رہتی۔ مولوی شمس الدین اپنی وضع داری اور مہمان نوازی کی عادت کی وجہ
سے ساری زندگی غربت کی وادی میں سفر کرتے رہے۔ جنازہ اٹھا تو ایک ”غریب
الدیار“ اور ”غریب الحال“ درویش ہمارے کندھوں پر تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی کے
خلیفہ حضرت طاہر بندگی کے خصوصی احاطہ میانی لاہور میں آسودہ خاک ہوئے۔ ان کی
قبر کے ساتھ محمد صدیق الماس رقم (صاحب القلم) آرام فرما ہیں جبکہ مولانا شمس
الدین (صاحب الکتاب) تھے۔ میں ان کی آرام گاہ کے پاس سے گزرتا ہوں تو فاتحہ
کے لیے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں اور حضور نبی کریم ﷺ کی نعت کا شعر لبوں پر آ جاتا ہے۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب!

(”جہانِ رضا“ اگست، ستمبر ۱۹۹۴ء)

۱۔ اب یہ تاریخی حیثیت کا حامل نوٹ پروفیسر محمد اقبال مجددی کی ملکیت ہے۔ اس کا عکس محمد عالم مختار حق کی کتاب ”نذر شمس“ میں شریک اشاعت ہے۔

علماء کرام کی یادیں

صدر الافاضل سید نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ:

جن علمائے کرام نے فاضل بریلوی کے ساتھ مل کر برصغیر میں مقام مصطفیٰ کی
پاسداری اور عشق مصطفیٰ ﷺ کی شمع کو مسلمانوں کے دلوں میں روشن کرنے کے لیے
جدوجہد کی ان میں صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سرفہرست
ہے۔

میں نے ۱۹۳۹ء میں آپ کو مسجد وزیر خاں لاہور کے اسٹیج پر پہلی بار تقریر کرتے
ہوئے سنا۔ آپ کا چہرہ درخشاں، قد بہت بلند اور لباس عالمانہ وجاہت کا آئینہ دار تھا۔
تقریر کے دوران حضور ﷺ کا نام نامی آتا تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ
جاتیں۔ ان کے بیان میں ایک خاص رنگ تھا۔ سامعین میں سے اکثر لوگ اپنے آقا و
مولا کا نام سن کر بے اختیار روتے۔ یہ کیفیت میرے جیسے نوعمر طالب علم کے لیے حیران
کن تھی کہ تقریر کرنے والا اور تقریر سننے والے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں
کو روک نہیں سکتے۔ ”صدر الافاضل“ کی آواز میں سوز بھی تھا اور عالمانہ گرج بھی تھی۔
ان کی تقریر گھنٹوں جاری رہتی اور اہل درد اٹھنے کا نام نہ لیتے۔

آپ اعلیٰ حضرت کے نامور شاگرد جناب علی حسین اشرفی کچھوچھوی کے معروف
خلفاء اور علماء اہلسنت کے ممتاز علماء کرام میں شمار ہوتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کے
ترجمہ قرآن ”کنز الایمان“ پر آپ کا تفسیری حاشیہ بنام ”خزائن العرفان“ بڑا مشہور
ہوا۔ برصغیر کی آبادی میں ”دو قومی نظریہ“ آل انڈیا سنی کانفرنس بنارس کا انعقاد اور مراد آباد
میں ”جامعہ نعیمیہ“ کی بنیاد آپ کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ اسم گرامی محمد نعیم الدین، تخلص

نعیم، تاریخی نام غلام مصطفیٰ، لقب صدر الافاضل تھا۔ والد مکرم مولانا محمد معین الدین
نزہت اپنے وقت کے مشہور عالم دین اور شاعر تھے۔ ۲۱ صفر المظفر ۱۳۰۰ھ میں پیدا
ہوئے۔ قرآن پاک حفظ کیا، ''ملا حسن'' تک درس نظامی کی کتابیں مولانا شاہ فضل
رسول سے پڑھیں۔ سید شاہ گل محمد قدس سرہ سے ۱۳۱۸ھ میں افتاء نویسی کی سند لی۔
طب مولانا شاہ فضل احمد امروہوی سے پڑھی۔ ۱۳۲۰ھ میں دستار بندی ہوئی۔ والد
مکرم نے قطعہ تاریخ کہا:

ہے مرے پسر کو طلبہ پر وہ فضیلت
سیاروں میں رکھتا ہے مریخ فضیلت
نزہت نعیم الدین کو یہ کہہ کے سنا دے
دستار فضیلت کی ہے تاریخ ''فضیلت''
۱۳۲۰ھ

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت حاصل کی۔ متعدد مواقع پر آپ
کے وکیل رہے۔ تدریس کا خاص انداز تھا۔ ''صدر الافاضل'' کا لقب اعلیٰ حضرت
بریلوی نے ہی عطا کیا تھا۔ ایک وقت تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ''البلاغ اور الہلال''
میں آپ نے زوردار مضامین لکھے۔ آپ نے ۱۳۲۰ھ میں ''الکلمۃ العلیاء'' لکھی جو
علمی اور نظریاتی دنیا میں بڑی مشہور ہوئی۔ سارے ہندوستان میں غیر مقلدین، دیوبندی
علماء اور آریہ سماجیوں سے مناظرے کیے۔ منشی برکت رام پوری، سید حبیب ایڈیٹر
''سیاست'' لاہور کو لے کر مولوی خلیل احمد انبیٹھوی سے مناظرہ کرنے کے لیے ''مظاہر
العلوم سہارنپور'' پہنچے اور علمائے دیوبند کو ساکت کر دیا۔ بڑے صائب الرائے، مدبر
اور ملت کا درد رکھنے والے تھے۔ آپ کے نامور شاگردوں میں سے مولانا سید غلام جیلانی
میرٹھی، حضرت مولانا محمد عمر نعیمی، مفتی محمد حسین نعیمی، بانی جامعہ نعیمیہ لاہور، استاذ العلماء
ابوالبرکات سید احمد قادری مدظلہ العالی، مولانا غلام معین الدین نعیمی مدیر (سواد اعظم)

مولانا مفتی احمد یار خاں گجراتی، مولانا نور اللہ صاحب بصیر پوری، مولانا ابوالحسنات،
[illegible] پیر محمد کرم شاہ صاحب بھیروی آسمان شہرت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔
آپ کی تصانیف میں تفسیر قرآن، اطیب البیان، الکلمۃ العلیاء، سوانح کربلا، کتاب
العقائد، دیوان ریاض نعیم، خاص طور پر مشہور ہیں اور ہر ایک کے کئی کئی ایڈیشن چھپے۔
وفات ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء، مطابق ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ کو ہوئی۔

۱۹۴۴ء کی ایک جگمگاتی رات کا سرور میرے دل و دماغ کو ابھی تک درخشاں کیے
ہوئے ہے، جب میں نواب وزیر خاں لاہور کی مسجد کے صحن کے ایک کونے میں چند
احباب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہم حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی کی سٹیج پر آمد کے منتظر
تھے۔ مسجد کا صحن سامعین سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ انجمن مرکزی حزب الاحناف لاہور کا
سالانہ جلسہ تھا اور آج حضرت محدث کی تقریر سننے کے لیے ہزاروں سامعین ہمہ تن
گوش تھے۔

میرے پاس مسجد کے ایک گوشے میں ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، مولانا
غلام دین مرحوم (انجمن شیڈ) مولانا غلام ربانی مرحوم (حافظ مظہر الدین کے بھائی)
حافظ مظہر الدین مرحوم اور ان کے ایک دوست صوفی غلام حسین گوجروی بیٹھے تھے۔ میں
عمر میں سب سے چھوٹا تھا اور علم میں ان سب کا خوشہ چین تھا۔ یہ ابھرتے ہوئے مقرر
تھے جو تمام لوگوں کی نظر سے بچ کر مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ حضرت محدث
کے لیے انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوئیں تو حافظ محمد مظہر الدین نے مجھے چھوٹا جان کر چار
آنے دیئے اور فرمایا جاؤ وزیر خان کے چوک سے پکوڑے بیچنے والے سے چار آنے
کی پکوڑیاں لے آؤ۔ (یہ پکوڑا فروش بے نظیر بھٹو صاحبہ علیہا ما علیہا کے منظور نظر وزیر
جہانگیر بدر صاحب کے والد محترم تھے) گرم گرم پکوڑیاں آئیں تو انتظار کی شدت کم ہونے
لگی۔ ادھر حضرت محدث کچھوچھوی نعروں کے درمیان علامہ ابوالبرکات اور دوسرے
علماء اہل سنت کی جلو میں سٹیج پر جلوہ افروز ہوئے تو حافظ محمد مظہر الدین مرحوم گنگنائے:

کس کی زلفوں کی مہک لائی ہے طیبہ سے نسیم
دل و جاں وجد کناں جھک گئے بہرِ تعظیم

یہ شعر میرے دل میں اتر گیا اور آج تک قرار دل و جاں ہے۔

حافظ مظہر الدین رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۹۸۱-۵-۲۲):

مولانا حافظ محمد مظہر الدین مرحوم مشہور عالم دین مولانا نواب دین رمداسی کے بیٹے تھے اور چند سال پہلے سر پر دستار فضیلت سجا کر دار العلوم حزب الاحناف سے فارغ التحصیل ہوئے تھے اور وہ ایک ممتاز عالم دین، بلند پایہ خطیب اور گل بار قلم کے مالک بن کر دنیا کے سامنے آئے۔ وہ نوجوان خطیبوں کے ہمنوا تھے۔ تقریر کرتے تو لطف آجاتا، بات کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے۔ مجھے ان کی تقریروں سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ دست بوسی کا بھی حصہ ملا۔ وہ جس سٹیج پر کھڑے ہوتے، سامعین جھوم جھوم جاتے۔ وہ اکثر اپنے والد محترم مولانا نواب الدین کے ساتھ مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے میں آتے، قیام کرتے اور طلبہ کے ساتھ گفتگو کرتے۔ صوفی غلام حسین گوجروی مرحوم بھی اسی مدرسہ میں پڑھتے تھے۔ رمداس کے رہنے والے تھے۔ ہم وطن ہونے کی وجہ سے ان سے خصوصی لگاؤ تھا۔ مجھے بھی ان کی مجالس میں سے حصہ ملتا۔ پاکستان بنا تو حافظ محمد مظہر الدین یک دم گم ہو گئے۔ نہ خطاب نہ تقریر، نہ محراب نہ منبر، نہ آنا، نہ جانا۔ نہ نامہ نہ پیام!

ع جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

پاکستان کو بنے چند سال ہوئے تو راولپنڈی سے ایک روزنامہ ''کوہستان'' نکلا۔ ''کوہستان'' دیکھتے دیکھتے صحافتی دنیا پر چھا گیا۔ راولپنڈی کے علاوہ وہ لاہور سے بھی چھپنے لگا۔ ''کوہستان'' چھپنے کیا لگا، لوگوں کے دل و دماغ پر چھانے لگا۔ 'کوہستان'' کے اداریہ کے صفحہ کے ساتھ ''نشان راہ'' کے عنوان سے روزانہ ایک کالم چھپتا۔ ''نشان راہ'' بڑا دل پسند کالم تھا۔ میں دلچسپی سے پڑھتا۔ لکھنے والے کے قلم کی چاشنی اور مضمون کی

حلاوت دل و جاں کو زندگی بخشتی۔ ''کوہستان'' کے چیف ایڈیٹر نسیم حجازی میرے شناسا تھے۔ ایک محفل میں ملاقات ہوئی تو میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا کہ ''نشان راہ'' کون لکھتا ہے۔ انہوں نے بتایا ''حافظ مظہر الدین''۔ دل جھوم گیا۔ دوسرے دن خط لکھا۔ ''نشان راہ'' کے مختلف موضوعات پر اظہار مسرت کیا اور اس طرح خط کتابت کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ میں نے محراب و منبر کو خیرباد کہنے کا شکوہ کیا تو فرمانے لگے:

ع زیں ''مرہان سست عناصر'' دلم گرفت!

ایک عرصہ تک ''نشان راہ'' لکھتے رہے۔ ''کوہستان'' روبزوال ہوا تو ''نشان راہ'' بھی بند ہو گیا۔ اب ان کی نعتوں کی خوشبوئیں پھیلنے لگیں۔ وہ مجھے نعت لکھ کر بھیجتے اور اپنے کلام کے امتیازات سے بھی آگاہ کرتے۔ ان کی تحریر کی حلاوت اور نعت کی مٹھاس ابھی تک میرے کانوں میں شہد بن کر ٹپکتی ہے۔

میں انہیں ''اسلام آباد'' ملنے ان کے گھر گیا۔ ان دنوں وہ نعت کی دنیا میں آباد تھے۔ میں نے مسجد وزیر خان میں سنا ہوا نعتیہ شعر یاد دلایا تو تڑپ اٹھے اور ساری نعت سنا دی:

کس کی زلفوں کی مہک لائی ہے طیبہ سے نسیم
دل و جاں وجد کناں جھک گئے بہرِ تعظیم

میرے خواجہ کی عنایت کے مظاہر ہیں تمام
لب جاں بخش مسیحا، ید بیضائے کلیم

لب داؤد پہ نغمے تیری زیبائی کے
دل ایوب و براہیم میں تیری تکریم

خلد اک جلوۂ رنگین تیری رعنائی کا
موج دریائے کرم تیری ہے موج تسنیم

تیری رحمت نے گداؤں کو بنایا سلطان
تیری تدبیر نے کی نوع بشر کی تنظیم

ایک وقت تھا کہ بشیر حسین صاحب ناظم ہماری طرح ''فقرے'' تھے۔ آج وہ وزارت امورِ مذہبیہ اسلام آباد میں ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ سترہ بار حج کر چکے ہیں۔ ایم اے کی چار ڈگریاں در بغل لیے پھرتے ہیں۔ سربراہان مملکت پاکستان کے محبوب نظر رہے ہیں۔ جب ''فقرے'' تھے میری فرمائش پر آدھی رات کے وقت حافظ مظہر الدین مرحوم کی مندرجہ بالا نعت اپنی خاص آواز میں پڑھی۔ مجھے یاد ہے لوگ بستروں سے اٹھ کر گلیوں میں آ گئے۔ گلیوں میں گھومنے والے بازار میں جمع ہو گئے اور بازاروں میں جانے والے ناظم صاحب کے اردگرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ حافظ صاحب کی نعت کا کمال تھا یا ناظم صاحب کے انداز نعت خوانی کا اثر تھا یا خواجہ بطحا کی محبت کی کشش تھی!!

ع دل و جاں وجد کناں جھک گئے بہر تعظیم

حافظ محمد مظہر الدین مرحوم کے نعتیہ کلام کے کئی حصے چھپے۔ کچھ زندگی میں، کچھ زندگی کے بعد۔ ان کے کلام میں ''مدینہ پاک'' کا ذکر سطر سطر پر لکھا ہوا ملتا ہے۔ شاہ مدینہ، اصحاب مدینہ، ارباب مدینہ، بہار مدینہ، بازار مدینہ، خاک مدینہ، غبار مدینہ، خار مدینہ، حتیٰ کہ ''سگان مدینہ'' کا ذکر جس والہیت سے کرتے ہیں، وہ ان کا ہی حصہ تھا۔

تیری مٹی وہیں کی ہے ''مظہر''
تجھ سے آتی ہے بو مدینے کی

نعت گوئی کے باغوں سے گزرتے ہوئے انہیں روحانیت کا ایسا گوشہ ملا، جہاں یادِ محبوب کے ساتھ شب بیداری، سحر خیزی اور قرب خداوندی کی کیاریاں آباد تھیں۔ ان کے اردگرد بے پناہ دنیا گھومنے لگی۔ حاجت مند دعاؤں کے لیے امنڈنے لگے۔ مرد، عورتیں خانقاہ کے اردگرد بیٹھے رہتے۔ میں ملاقات کو گیا۔ لوگ زیارت کو ترس

رہے تھے اور میں ملاقات کے لیے لپک رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو شفقت فرمائی۔ بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ پوچھا کیا کھاؤ گے؟ عرض کی ''پکوڑیاں'' بے پناہ ہنسے! گلے لگایا اور بڑی دعائیں دیں۔ ان کی علمی اور روحانی یادگاریں ''تجلیات، نشان راہ، بانگ جبریل''، اہل محبت کو ان کی یادوں سے سرشار کر دیتی ہیں۔

آقا بیدار بخت مرحوم:

آقا بیدار بخت مرحوم عالم دین تو نہ تھے مگر ''السنۃ الشرقیہ'' کے ماہر استاد تھے۔ انہوں نے لاہور میں دہلی دروازے کے باہر حضرت شاہ محمد غوث کے دربار کے عقب میں کارپوریشن کے ایک سکول میں ''دار العلوم السنۃ الشرقیہ'' کے نام سے ایک ایسا شبینہ ادارہ قائم کیا تھا، جس میں ملازمت پیشہ نوجوان منشی فاضل، ادیب فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات پاس کر کے بی اے کا امتحان دے کر علمی منازل طے کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کوئی نوجوان سکول و کالج میں داخل ہوئے بغیر تعلیم حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ زبانوں کے امتحانات پاس کرنے کے بعد پرائیویٹ طور پر اعلیٰ امتحانات کے لیے مجھے ۱۹۴۴ء میں منشی فاضل کی تیاری کے لیے ''آقا بیدار بخت'' کے دار العلوم میں داخلہ لینا پڑا تو میں نے اپنی درخواست پر ''آقائے بیدار بختاں و حامی زیردستاں'' لکھا تو میری فیس معاف کر دی گئی۔ برکت علی محمڈن ہال لاہور کے ایک جلسہ میں میں نے نظیری نیشاپوری کے ایک شعر کو موضوع سخن بنا کر تقریر کی۔

چراغ زندہ می خواہی در شب زندہ داراں زن
کہ ''بیداری بخت'' از بخت بیداراں شود پیدا

آقا بیدار بخت مرحوم نے ارشاد فرمایا کہ آج سے ہفتے میں ایک دن تم میرے ساتھ چائے پیا کرو گے۔ ان دنوں دار العلوم کے پرنسپل کے ساتھ چائے پینا بڑا اعزاز تھا۔
آقا بیدار بخت مرحوم کو فارسی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا۔ وہ ''دیوان نظیری، دیوانِ حافظ، رباعیات ابوسعید ابوالخیر اور مثنوی مولانا روم'' پڑھاتے تو لطف آ جاتا۔ وہ خود

بھی جھوم جھوم کر پڑھاتے۔ یوں معلوم ہوتا کہ وہ ''حافظ اور رومی'' کی خانقاہ کے درواز
پر کھڑے ہیں۔ آقا بیدار بخت تدریس میں انتھک معلم تھے۔ شام سے رات دس
تک پڑھاتے۔ علی الصباح دس بجے تک پڑھاتے۔ دن کو طالبات کو پڑھاتے۔ ا
محتاط اندازے کے مطابق آقا بیدار بخت نے ایسے بیس ہزار نوجوانوں کی علمی راہنما
کی جو گریجویٹ بن کر اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے۔ لاہور میں علم کی اتنی وسیع پیما
تدریس و تعلیم آقا مرحوم کے بغیر شاید ہی کسی دوسرے کے حصہ میں آئی ہو۔

آقا بیدار بخت کے رفقائے علم بھی بڑے محنتی اور قابل لوگ تھے۔ ان میں مخد
غلام جیلانی صاحب، سید اصغر علی شاہ جعفری، ایم۔اے، محمد عاشق مرحوم، علامہ تا
نجیب آبادی، محمد موسیٰ نظامی، احمد غریب نواز مرحوم، محمد ارشد کیانی، ایم۔اے، مفتی مح
عالم مرحوم (مفتی غلام سرور لاہوری، مئولف ''خزینۃ الاصفیاء'' کے نواسے) علامہ کی
اور دوسرے اساتذہ کے نام علمی دنیا میں درخشاں رہیں گے۔ آج روپے کی دوڑ
ملک میں ''علم فروشوں'' کے اڈے قائم کر دیے ہیں مگر جب ہماری قوم غربت میں پھنس
ہوئی تھی تو یہ اساتذہ بے سروسامان شاگردوں کو علم کے موتیوں سے مالا مال کر
کرتے تھے۔

امتحانات قریب آتے تو طلبہ کی تعداد بڑھتی تو دارالعلوم کا دامن تنگ ہو جاتا۔ آ
بیدار بخت اور ان کے رفقاء اپنی کلاس یونیورسٹی ہال میں لگاتے اور پڑھنے والوں کی
تعداد دو ہزار تک جا پہنچتی۔ آج ساٹھ لاکھ کی آبادی والا لاہور شادی ہال، تجارتی
پلازے تو بناتا جا رہا ہے مگر علم کے پیاسوں کو سنبھالنے والے ادارے اجڑتے جا رہے
ہیں۔ دوسری طرف ''علم فروشی'' کی منڈیاں کھلتی جا رہی ہیں۔

آج پاکستان کے اعلیٰ دفاتر میں بیٹھے ہوئے ایسے سیکڑوں افسروں کو میں ذاتی
طور پر جانتا ہوں، جو آقا بیدار بخت کے دسترخوان علم سے ٹکڑے اٹھا کر گریجویٹ بنے
تھے۔ اور اعلیٰ مناصب پر پہنچے تھے۔ مجھے وہ ''یتیم'' آج بھی ملتے ہیں اور ایئر کنڈیشنڈ

کمروں میں رہتے نظر آتے ہیں، جو آقا بیدار بخت کی خیرات پر جوان ہوئے تھے۔
میں اکثر ایسے قانون دانوں کا شناسا ہوں، جو دارالعلوم ''السنۃ الشرقیہ'' سے شام
اعلیٰ علم کی دولت لے کر نکلے۔ مجھے عدلیہ میں ابھی تک وہ واقف کار دکھائی دیتے
ہیں، جو آقا بیدار بخت کے کالج سے نکل کر گریجویٹ بنے۔ میں ایک کروڑ پتی صنعت
کار سے آج بھی ملتا ہوں، جس کی فیس معاف کرانے کے لیے مجھے ''مولا بخش'' کے
ہوٹل پر کئی بار جانا پڑا تھا۔ یہ یادیں ان حضرات کے لیے بھی باعث فخر ہوں گی مگر میں
انہیں آقا بیدار بخت کی علمی فیاضی کی زندہ مثالیں خیال کرتا ہوں۔

''آقا بیدار بخت'' مرحوم نے اس زمانے میں علم کے چشمے رواں دواں رکھے،
جب علم کے دروازے بند تھے۔ طالب علم غربت کے ہاتھوں تنگ تھے، طالب علموں
کے والدین فیس ادا کرنے سے قاصر تھے۔ آج علم فروشی کے بیوپاری، آج علم سے
محروم سیاست دان، آج جہالت کے اندھیروں میں بھٹکنے والے امراء، آج احساس علم
سے ناآشنا، ''قومی راہنما'' قوم کے فرزندوں کو وہ کچھ نہیں دے سکتے، جو آقا بیدار
بخت نے تن تنہا انہیں شبانہ روز محنت سے دیا تھا۔

''کہ بیداریِ بخت از بختِ بیداراں شود پیدا''

(''جہانِ رضا'' اکتوبر ۱۹۹۴ء)

علمائے کرام کی یادیں

علامہ عبدالنبی کوکب رحمۃ اللہ علیہ (م: ۸۷-۱-۱۹):

علامہ عبدالنبی مرحوم ایک ذہین، فطین اور ممتاز سنی عالم دین تھے۔ وہ گجرات میں پیدا
ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو گجرات میں سنیوں کی ایک مشہور دینی درسگاہ طلبہ کی تربیت میں
مصروف تھی۔ یہ دینی درسگاہ پیر ولایت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں کام کر رہی تھی۔ اس درسگاہ
میں نامور سنی مدرس مصروف تدریس تھے۔ ان میں ایک ممتاز عالم دین مولانا مفتی احمد یار
خاں صاحب نعیمی رحمۃ اللہ علیہ بھی مسند تدریس پر فائز تھے۔ یہ وہی مفتی احمد یار خان ہیں
جنہوں نے آگے چل کر تفسیر نعیمی، نور العرفان، جاء الحق، مراۃ شرح مشکوٰۃ اور کئی دوسری
بلند پایہ اعتقادی اور نظریاتی کتابیں لکھ کر بڑا نام پایا۔ علامہ عبدالنبی کوکب مرحوم نے اس
درسگاہ سے اکتساب علم کیا۔ پھر انہیں اعلیٰ تعلیم کی پیاس لاہور لے آئی۔

لاہور آئے تو ان دنوں دارالعلوم ''جامعہ نعیمیہ'' دارالعلوم ''حزب الاحناف'' اور
دوسرے کئی علمی چشمے طلبائے علم کو سیراب کر رہے تھے۔ علامہ کوکب نے ان درسگاہوں
سے اکتساب علم بھی کیا اور ساتھ ساتھ کالج اور یونیورسٹی کے علمی مدارج کو بھی یکے بعد
دیگرے طے کر لیا۔ وہ اپنی ذہانت اور شب و روز محنت سے ایک طرف علوم دینیہ سے
فارغ ہوئے، دوسری طرف کئی مضامین میں ایم اے کر لیا۔ جب انہوں نے عربی میں
''ماسٹر آف آرٹ'' کی ڈگری حاصل کی تو وہ پنجاب بھر میں اول آئے۔

علامہ کوکب میرے ہم وطن ہونے کی وجہ سے میرے محبوب دوست تھے۔ وہ
ہلکے پھلکے جسم میں علم و ذہانت کا ایک سمندر تھے۔ دیکھنے میں وہ ''طفل مکتب'' نظر
آتے، مگر جب اہل علم کی مجلس میں بیٹھ کر گفتگو کرتے تو ان کی ذات سے علم و فضل کا

...کمل'' جاتا۔ وہ چند ہی سالوں کے اندر لاہور کی علمی محفلوں پر چھا گئے۔ علماء
کرام کے محبوب نظر بن گئے اور طلبہ کے مطلوب استاد کی حیثیت سے ہر محفل کی جان
نظر آنے لگے۔ انہوں نے چند سال پہلے جن درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی تھی، ان
میں ایک ماہر استاد کی حیثیت سے مسند تدریس پر دکھائی دینے لگے۔ انہوں نے یونیورسٹی
کا رخ کیا تو اپنی قابلیت کی وجہ سے پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کے ''شعبہ مخطوطات''
کے انچارج بن گئے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد اورینٹل کالج، یونیورسٹی پنجاب میں لیکچرر
لگ گئے۔ مسجد تاجے شاہ، چیمبرلین روڈ، لاہور میں درس قرآن شروع کیا تو لاہور
کے تشنگان علوم قرآن کا مجمع لگنے لگا۔ سید ابوالحسن الہجویری داتا گنج بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ
کی عظیم الشان مسجد میں مسند ارشاد بچھائی تو اہل دل پروانہ وار جمع ہونے لگے۔ دینی
جلسوں میں خطاب کرتے تو ان کی تقریر اہل علم کو متاثر کرتی۔

انہوں نے اپنی شبانہ روز محنت سے پنجاب یونیورسٹی کی عظیم الشان لائبریری کو ایسا
مرتب کیا کہ قلمی کتابوں کا شعبہ چمکنے لگا۔ وہ اہل علم کی قدر کرتے۔ اہل تحقیق کی رہنمائی
کرتے اور تشنگان علوم و فنون کی تشنہ کامی کا سامان مہیا کرتے۔ میں جن دنوں ''تذکرہ
علماء اہل سنت'' کو ترتیب دے رہا تھا تو ان کے قلمی شعبے سے مجھے بہت کچھ ملا۔ سید
شرافت نوشاہی مرحوم (مئولف شریف التواریخ) نے آپ کی نگرانی میں ہی ''گنج
شریف'' کے قلمی نسخے کو صاف کر کے ترتیب دیا تھا۔

وہ داتا دربار کی مسجد میں درس دیا کرتے۔ پڑھے لکھے لوگ خاصی تعداد میں آپ
کا درس سنا کرتے تھے۔ ان کا انداز بڑا علمی اور تحقیقی ہوتا۔ ان دنوں محکمہ اوقاف کی
سیٹ پر ایک بے دین سی۔ ایس پی آفیسر، مسعود بھگوان، کھدر پوش کی تقرری ہو گئی۔ وہ
علماء کرام کے خلاف تھا۔ جب علماء کرام اس کے ملحدانہ نظریات کے خلاف بات
کرتے تو وہ سیخ پا ہو جاتا۔ وہ محکمہ اوقاف کا خدا بنا بیٹھا تھا اور سمجھتا تھا کہ اوقاف کے
تمام علماء اور مشائخ میرے تنخواہ دار ملازم ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے اپنے محلے بھاٹی
دروازہ کے ایک حجام کو، جو دس سال کویت میں حجامتیں بناتا رہا اور بازاری عربی بولنے

میں مشاق تھا، اپنا ''مشیر اللسان عربیہ'' بنالیا۔اوقاف کا سربراہ جب کسی عالم دین کو اپنے دفتر میں بلاتا تو اس حجام کو حکم دیتا کہ اس عالم دین سے ''کویتی'' عربی میں بات کرو اور عالم دین سے کہتا کہ میرے حجام سے عربی میں بات کرو۔ جب وہ عالم دین عربی میں گفتگو نہ کرسکتا تو کہتا ''تم کیسے ''مولوی'' ہو جو میرے حجام سے بھی عربی نہیں بول سکتے ؟ جاؤ اور اردو میں نماز پڑھایا کرو اور اردو میں اذان دیا کرو''۔ علماء کرام حیران تھے کہ یا اللہ! اس ملک عزیز پر یہ وقت بھی آنا تھا کہ کویت کے بھاگے ہوئے حجام ''مشیر اللسان عربیہ'' مقرر ہوں گے اور علماء کرام کی ''حجامتیں'' کرتے پھریں گے۔

ے تفو برتو اے چرخ گرداں تفو!

داتا دربار کی مسجد میں مولانا کوکب مرحوم کی علمی بساط ''کھدر پوش بھگوان'' کو پسند نہ تھی۔اس نے درس بند کرنے کا حکم دیا۔لوگوں نے احتجاج کیا مگر اب کھدر پوش بھگوان نے پولیس کی مدد سے علامہ کوکب کو مجبور کردیا کہ وہ مسند ارشاد کو خالی کر کے ''کویت کے حجام'' کے حوالے کردیں۔

اب علامہ کوکب تاجے شاہ کی مسجد میں درس دینے لگے تو لوگوں سے مسجد بھرنے لگی اور قرآن وحدیث کا یہ چشمہ جاری وساری رہا۔ان دنوں لاہور ڈویژن کے کمشنر مختار مسعود تھے۔انہوں نے اپنی نگرانی میں مینار پاکستان تعمیر کرایا۔مال روڈ پر ''مسجد شہداء'' بنوائی اور ''پنجاب پبلک لائبریری'' میں قرآنیات کا ایک شعبہ ''قرآن محل'' تیار کرایا۔اس شعبہ میں قرآن اور قرآن پر لکھی جانے والی تفاسیر اور کتابیں جمع ہونے لگیں۔مختار مسعود بڑا علم دوست، دانشور اور خوبصورت قلم کا مالک تھا۔اس کی کئی کتابیں سیاست وادب کا حسین امتزاج ہیں۔اس نے علامہ کوکب کی خدمات ''قرآن محل'' کے لیے مستعار لیں۔ مجھے یاد ہے علامہ مرحوم نے اس کام کو اتنی تندہی اور محنت سے نباہا کہ کمشنر عش عش کراٹھا۔مولانا کوکب نے بڑی بلند پایہ نادر ونایاب تفاسیر خرید خرید کر ''قرآن محل'' کو مزین کیا اور ایسے ایسے موتی لا کر جمع کیے کہ اہل علم وفضل کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔لاہور کے ایک مفسر قرآن میرے استاد مکرم مولانا نبی بخش

والی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تفسیر نبوی'' پنجابی اشعار میں پندرہ جلدوں میں لکھی تھی۔ یہ ایک نہایت اہم اور بے مثال تفسیر تھی۔مولانا باغ علی نسیم صاحب نے مولانا نبی بخش والی کے خلفیہ مجاز ہونے کی حیثیت سے، مولانا عبدالنبی کوکب کی فرمائش پر ''پنجابی تفسیر نبوی'' کا ایک مکمل سیٹ ''قرآن محل'' کو اعزازی طور پر پیش کیا تو کمشنر مختار مسعود بہت خوش ہوئے اور افتتاحی تقریر میں ''تفسیر نبوی'' کا خصوصی طور پر ذکر کرتے ہوئے مولانا کی علمی خدمات کو ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ ''قرآن محل'' میں علمی جواہر پارے جمع کرنا، انہیں سجانا مولانا کوکب مرحوم کی زندگی کا ایک سنہری کارنامہ ہے۔آج بھی میں ''قرآن محل'' دیکھنے جاتا ہوں تو مجھے ''قرآن محل'' کے درودیوار سے علامہ کوکب مرحوم کی روح جھانکتے دکھائی دیتی ہے!

حکیم محمد موسیٰ امرتسری (م:۱۹۹۹-۱۱-۱۷):

آج سے تیس سال قبل حکیم محمد موسیٰ امرتسری، بانی مرکزی مجلس رضا، کوسنیوں کی زبوں حالی پر بڑی تشویش تھی۔ان کا خیال تھا کہ سنی جلسوں، جلوسوں، مجالس نعت اور عرسوں کو بڑی شان وشوکت سے مناتے ہیں اور ان پر لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں مگر تحریری میدان میں وہ بہت پیچھے ہیں۔ان کی کتابیں لوگوں تک نہیں پہنچتیں۔اگر کوئی کتاب چھپ کر آتی بھی ہے تو بڑی بے سروسامانی کی حالت میں، جسے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔آپ کی تحریک پر دہلی دروازے کے باہر حضرت ''شاہ محمد غوث'' کے دربار کے ایک حجرے میں، جہاں مولانا سعید احمد نقشبندی، خطیب مسجد شاہ محمد غوث رہتے تھے۔ پہلا اجلاس ہوا۔اس اجلاس میں ہم چند ممبران تھے مگر اس محفل میں علامہ کوکب ہی ممبر محفل تھے اور سب کو آپ کی ذہانت اور قلم پر اعتماد اور ناز تھا۔ایک حلقہ ''دائرۃ المصنفین'' کے نام پر قائم کیا گیا۔فنڈ جمع ہوا اور عربی کتابوں کے ترجے پر کام شروع ہوا۔یہ کام مولانا کوکب نے بڑی خوبی سے سرانجام دینا شروع کیا۔
حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری چشتی نے کچھ عرصہ بعد ''مرکزی مجلس رضا'' کی

بنیاد رکھی تو ابتدائی طور پر ''یوم رضا'' برکت علی محمڈن ہال، بیرون موچی دروازہ وا
منایا جاتا تھا۔ اس ''یوم رضا'' میں علامہ کوکب مرحوم صف اول میں ہوتے۔ چنا
آپ نے ''مقالات یوم رضا'' تین سال تک ترتیب دیے، جو اہل علم میں بے حد پسند کیے
گئے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے علمی اور روحانی مقالات کے واقف علماء کرام
علامہ عبدالنبی کوکب اور حکیم محمد موسیٰ امرتسری مدظلہ العالی کی ان کوششوں کو ہدیہ تحسین
کیا اور ملک کے گوشے گوشے سے دعاؤں کے لیے ہاتھ اٹھتے ہوئے آگے بڑھے۔

محمد ابراہیم علی چشتی مرحوم:

جن دنوں مجھے ''تذکرۂ علماء اہلسنّت'' مرتب کرنے کا شوق تھا، میں لاہور کے
ایک دانشور اور صاحب قلم و علم مولانا ''محمد ابراہیم علی چشتی'' کی زیارت کو جا پہنچا۔ ان
کے ہاں ان دنوں علم و فضل کا دور چلتا اور مختلف موضوعات پر گفتگو کے دروازے کھلے
میں نے ''تذکرۂ علماء اہلسنّت، لاہور'' میں معاونت کی التجا کی تو بہت خوش ہوئے اور
بڑی خندہ پیشانی سے میری رہنمائی فرمائی۔ وہ قد و قامت کے لحاظ سے سرو قد اور تو
جسم و جان کے مالک تھے۔ سفید چہرے پر سیاہ داڑھی بجتی تھی۔ بات میں زور تھا اور گفتگو
معلومات سے لبریز ہوتی۔ ان کے ہاتھ میں ان کے والد مکرم مولانا محرم علی چشتی صاحب
مرحوم کا ایک موٹا سا ڈنڈا ہوتا جو سارے لاہور میں ان کا امتیازی نشان تھا۔ بعض
اوقات سلسلۂ گفتگو دراز ہوتا تو مجھے فرماتے آؤ ذرا سیر کر آئیں۔ وہ اٹھتے، ''انارکلی
سے نکل کر بھاٹی دروازے کے باغ سے ہوتے ہوئے ٹکسالی دروازے جا نکلتے اور وہاں
سے شاہی مسجد کے دامن میں اپنے پیر و مرشد خواجہ صابر شاہ کے مزار پر جا پہنچتے۔ حاضری
دیتے، فاتحہ پڑھتے اور اس طرح سیر مکمل کر کے واپس آجاتے۔ وہ اپنی صحت اور عمر کے
لحاظ سے سیر کو ضروری سمجھتے تھے مگر میں اپنی صحت اور عمر کے لحاظ سے سیر کو سفر سمجھتا تھا۔
کئی بار ایسا ہوا کہ میں بھاٹی دروازے پہنچ کر چشتی صاحب کی ''رفاقت سیر'' سے کنارہ کشی
کرنے لگتا تو فرماتے کہ ''سیر نہیں کرو گے'' میں نماز کا بہانہ بنا کر یہ کہہ کر جدا ہو جاتا ''الصلوٰۃ

خیر من السیر'' وہ شاہی مسجد چلے جاتے۔ میں داتا صاحب کی مسجد میں آجاتا۔

محمد ابراہیم علی چشتی مرحوم لاہور کے اسی ''خانوادۂ چشتیہ'' کی آخری یادگار تھے جو
اپنے علمی اور سیاسی اثر و رسوخ کی وجہ سے لاہور پر ایک عرصہ تک چھایا رہا۔ آپ کے
والد مولانا محرم علی چشتی اپنے وقت کے نامور وکیل، صحافی، قانون داں اور سیاسی شخصیت
ہونے کی وجہ سے لاہور کے ''بادشاہ گر'' تھے۔ آپ کے دادا مولانا احمد بخش یکدل اردو،
عربی اور فارسی کے قادر الکلام عالم اور شاعر تھے۔ آپ کے تایا نور احمد چشتی مؤلف
''تحقیقات چشتی'' ایک مورخ اور محقق تھے۔ آپ کے نانا خواجہ مستان شاہ کابلی اپنے وقت
کے ''قطب زماں'' تھے اور افغانستان کے بادشاہ امیر عبدالرحمٰن کے پیر و مرشد تھے۔

آپ نے بی۔اے، ایل۔ایل۔بی، پھر ایم۔اے صحافت کیا تو عملی زندگی میں
قدم رکھا۔ تحریک پاکستان کے ابتدائی دنوں میں آپ نے آزادی وطن میں عملی حصہ
لینے کے ساتھ ''خلافت پاکستان'' کا نظریہ پیش کیا۔ پاکستان کی جد و جہد کے دوران
صوبہ سرحد میں اگرچہ مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی مگر کانگریس کا غلبہ تھا۔ اس صوبہ
میں خان عبدالغفار خاں ''سرحدی گاندھی'' کی حیثیت سے پاکستان کی مخالفت کر رہے
تھے۔ پھر ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے۔ خان عبدالغفار
خان نے ''خدائی خدمت گار'' کے نام پر ایک ''سرخ پوش'' فوج تیار کر لی تھی جو تحریک
پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھی۔ ان دونوں قبائلی علاقوں اور افغانستان کے
مشرقی پہاڑی علاقوں میں ایک جنگجو لیڈر ''پیر آف اپی'' کا بڑا چرچا تھا۔ ''پیر آف
اپی'' کئی سالوں سے انگریزوں کے خلاف جہاد میں مصروف تھا اور انگریزوں کو ''پیر
آف اپی'' کے نشانہ بازوں کی وجہ سے قبائلی علاقہ میں پہنچنے میں بڑی دشواری تھی۔
انگریز کے کئی فوجی افسر ''پیر آف اپی'' کے مجاہدین کے ہاتھوں قتل ہوئے مگر ''پیر آف
اپی'' نے اس علاقہ میں انگریزوں کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ آزادی کی تحریک چلی۔ اب
انگریزوں کو تو اس علاقے سے دلچسپی نہ تھی مگر خان عبدالغفار خان نے ''پیر آف اپی''

کو اپنا ہم نوا بنالیا۔ تحریک پاکستان کے خلاف بیان دلوانے شروع کر دیے۔ یہ بات پاکستان مسلم لیگیوں کے لیے بڑی تشویش ناک تھی۔

ان حالات میں ''پیر آف اپی'' کے مقابلہ میں ایک جنگجو روحانی پیشوا ''بابا بلند کوہی'' قبائل میں نمودار ہوئے، جو تحریک پاکستان کے حق میں اور مسلم لیگ کی حمایت میں بیان جاری کرتے تھے۔ یہ بیانات ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور میں چھپنے لگے۔ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے نامہ نگار میاں محمد شفیع (م-ش-مرحوم) ''قبائلی علاقے کی پہاڑیوں'' میں چلے جاتے اور ''بابا بلند کوہی'' سے انٹرویو لے کر چھاپتے۔ تصویریں چھپتیں، مقالات چھپتے اور تحریک پاکستان کے حق میں تفصیلی مضامین لکھے جاتے۔ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کی اس مہم سے قبائل اور صوبہ سرحد میں تحریک پاکستان کے حق میں زمین خاصی ہموار ہوگئی اور ''پیر آف اپی'' نے بھی سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ حمید نظامی مرحوم کا ''نوائے وقت'' ابھی نیا نیا تھا مگر حمید نظامی مرحوم میاں محمد شفیع (م ش) کو ''بابا بلند کوہی'' کے بیانات چھاپنے پر ہدیۂ تحسین پیش کرتے۔ ۱۹۶۸ء میں ایک مشہور صحافی ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے یہ انکشاف کیا کہ ''بابا بلند کوہی'' قبائلی علاقہ میں کوئی ''بابا'' نہیں تھا۔ یہ دراصل محمد ابراہیم علی چشتی مرحوم تھے، جو ''پیسہ اخبار'' سٹریٹ لاہور میں اپنے گھر بیٹھ کر ''بابا بلند کوہی'' بن کر بیان دیتے اور مقالات سپرد قلم کرتے جسے م-ش-مرحوم ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں چھپوا دیا کرتے تھے۔

محمد ابراہیم علی چشتی مرحوم بڑے راسخ العقیدہ سنی دانشور اور صحافی تھے۔ میں ایوبی دور میں اکثر ان کے ساتھ سنیوں کے جلسوں میں جاتا۔ پھر مذہبی اور سیاسی ہنگاموں میں شرکت کرتا جو لاہور کے کوچہ و بازار کی رونق ہوتے تھے۔ ان کا حافظہ بڑا قوی تھا۔ یادداشت بڑی مضبوط تھی۔ انہیں دنیا بھر کی آزادی کی تحریکوں کی تاریخ یاد تھی۔ وہ مجھے عالمی سطح کے مشاہیر پر آگاہی بہم پہنچاتے۔

لاہور میں چار نوجوانوں کا عہد:

یہ روایت عام انداز میں مشہور ہے مگر تمام راوی ثقہ ہیں کہ لاہور میں انگریزی عہد کے چار نوجوانوں نے عہد کیا تھا کہ جب تک ملک کو آزادی دلوا کر اس میں ''نظام خلافت'' قائم نہ ہوگا، وہ شادی نہیں کریں گے۔ ان میں ایک میاں محمد شفیع (م ش) تھے۔ دوسرے حکیم محمد انور بابری مرحوم تھے۔ تیسرے محمد ابراہیم علی چشتی مرحوم تھے۔ چوتھے مجاہد اہل سنت، مولانا عبدالستار خان نیازی تھے۔ میاں محمد شفیع اور انور بابری نے تو عہد توڑ دیا اور شادیاں کر لیں مگر ابراہیم علی چشتی اور مولانا عبدالستار خان نیازی اپنے عہد پر قائم رہے۔ جب ان دونوں شادی زدہ نوجوانوں سے ایک بے تکلف دوست نے اس ''عہد شکنی'' کا سبب پوچھا تو جواب دیا:

بگفت ایں جا پری رویاں نغزاند
جو گل بسیار شد ''پیلاں'' بلغزند

ابراہیم علی چشتی، انگریزی کے زود نویس ادیب تھے۔ انہوں نے ہر ہٹلر کی خود نوشت کا اردو ترجمہ کیا۔ ''ملفوظات بابا بلند کوہی'' لکھے۔ ''خلافت پاکستان'' لکھی۔ پاکستان کے لیے ''جدید اسلامی دستور'' انگریزی میں ترتیب دیا۔ ان کے اکثر انگریزی مضامین برطانیہ، جرمنی اور امریکہ کے بلند پایہ اخبارات اور رسالوں میں چھپتے تھے۔ وہ اعلیٰ حضرت امام اہلسنّت مولانا احمد رضا خان بریلوی کے سخت معتقد تھے۔ ان کے سامنے ''فتاوی رضویہ'' کی ابتدائی جلدیں آئیں تو انہیں بے حد مسرت ہوئی۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری چشتی نظامی نے ''مرکزی مجلسِ رضا'' کی بنیاد رکھی اور اعلیٰ حضرت پر تعارفی مقالات اور فاضل بریلوی کی اصل کتابیں چھپوا کر تقسیم کرنے لگے تو محمد ابراہیم علی چشتی کو بے پناہ مسرت ہوئی۔ وہ حکیم صاحب کی خدمات کو سراہتے، مجلس کے دفتر میں جاتے۔ حکیم صاحب کو اپنے گھر بلا کر اعزاز و اکرام سے نوازتے اور اپنے علمی مشوروں اور تجربوں سے آگاہ کرتے۔ حکیم صاحب نے بھی ان کی خدمات کو

ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی علمی اور اعتقادی کاوشوں کو سراہا۔

ان کی دلی خواہش تھی کہ ''فتاویٰ رضویہ'' کا انگریزی ترجمہ کر کے مغربی ممالک کے مفکرین اور معتقدین تک پہنچائیں مگر زندگی نے وفا نہ کی اور وہ ۱۹۶۸ء میں راہیٔ ملک بقا ہو گئے۔

بُد از عاشقان ''بزرگان چشت''
خداوند جائش کند در بہشت

(''جہانِ رضا'' نومبر ۱۹۹۴ء)

لاہور کے خطیبوں کی رونقیں

پاکستان بنا تو اس نظریاتی مملکت کی تشکیل میں علمائے کرام نے ایسی خدمات سرانجام دیں جو سنہری حروف سے لکھی جانے کے قابل ہیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ ان میں دانشور، سکالرز، سخنور اور علماء و خطباء کی ایک نمایاں تعداد تھی۔ جو پاکستان کے مختلف شہروں اور قصبوں میں جا بسے تھے، شیعہ، وہابی، دیوبندی اور دوسرے فرقوں کے علماء کے علاوہ، علمائے اہلسنّت کی ایک خاصی تعداد پاکستان میں آبسی۔ ان سنی علماء میں بڑے بڑے جلیل القدر اور بلند پایہ اہلِ علم و فضل تھے۔ ان میں مدرس بھی تھے، معلّم بھی، مفتی بھی تھے اور فقیہ بھی مگر خوش بیاں خطباء اور مقررین کا جو طبقہ آیا۔ انہوں نے پاکستان کے گوشے گوشے کو روشنیاں بخشیں۔ کراچی، حیدر آباد اور سکھر میں بڑے شعلہ بیان سنی خطیب آ بسے۔ صرف پنجاب میں نظر ڈالیں تو مولانا احمد سعید شاہ کاظمی (ملتان) مولانا عارف اللہ شاہ قادری (راولپنڈی) قاری احمد حسن فیروز پوری (گجرات) شیخ الحدیث مولانا سردار احمد (فیصل آباد) مفتی ظفر علی نعمانی (سانگلہ ہل) مولانا محمد حسین صاحب نعیمی (لاہور) مولانا غلام علی اشرفی (اوکاڑہ) مفتی اعجاز ولی خان بریلوی (لاہور) حافظ محمد مظہر الدین رمداسی (راولپنڈی) کے علاوہ بہت سے ایسے خطیب نظر آتے ہیں جن سے خیابانِ سنّیت میں بہار آ گئی۔ ان مہاجر علماء کے علاوہ مقامی سنی علماء میں بڑے بلند پایہ خطیب تھے۔ جو آسمانِ خطابت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے رہے۔ (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین)

مقامی خطباء میں سے علامہ سید ابو البرکات (مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور) علامہ سید ابو الحسنات (مسجد وزیر خان لاہور) ابو النور مولانا محمد بشیر (کوٹلی لوہاراں)

مولانا غلام الدین (انجن شیڈ لاہور) مولانا محمد بخش مسلم، بی اے (لاہور) مولانا محمد یوسف (سیالکوٹ) مولانا محمد عمر اچھروی (لاہور) صاحبزادہ سید فیض الحسن آلومہاروی (گوجرانوالہ) شیخ القرآن عبدالغفور ہزاروی (وزیر آباد) پیر سید ولایت شاہ (گجرات) مولانا سید حامد علی شاہ (سرگودھا) سید محمود شاہ (گجرات) مفتی احمد یار خاں نعیمی (گجرات) مولانا محمد شریف نوری (قصور) پیر سید امانت علی شاہ (لاہور) (رحمۃ اللہ علیہم) اور ان کے رفقاء خطابت پنجاب میں چھائے ہوئے تھے۔ لاہور میں علامہ سید ابوالبرکات اور علامہ ابوالحسنات (مولانا سید دیدار علی شاہ الوری کے نامور فرزند) اپنی خطابت کی وجہ سے بڑے معتبر تھے۔ علامہ ابوالبرکات تدریس اور مناظرہ میں اپنے وقت کے امام تھے۔ علامہ ابوالحسنات، خطابت کے ساتھ ساتھ سیاسی میدان میں بھی بڑے قد آور رہنما تھے انہوں نے تحریکِ پاکستان کے بعد آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد میں بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ ’’تحریکِ ختمِ نبوت‘‘ میں علمائے کرام کے اس قافلے کے سردار تھے۔ جس نے حکومت وقت اور اقتداری قوتوں سے ٹکر لی تھی۔

مولانا محمد بخش مسلم بی-اے (م:۸۷-۲-۱۷):

مولانا محمد بخش مسلم، بی-اے لوہاری دروازے کے باہر ’’مسلم مسجد‘‘ کے باغ میں تحریکِ پاکستان پر بڑے بھرپور لیکچر دیا کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اپنی خوش بیانی سے عوام و خواص کو متاثر کیا۔ وہ اردو انگریزی میں یکساں تقریر کرتے۔ دیہات میں جاتے تو ٹھیٹ پنجابی میں ایسا خطاب کرتے کہ عوام کے دلوں میں اتر جاتا۔ انہوں نے اپنے طرزِ بیاں سے نوجوانوں کو بڑا متاثر کیا تھا۔

مناظرِ اسلام مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ (م:۷۱-۱۲-۲۱):

مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ ایک مناظر کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ ان کے سامنے شیعہ، وہابی اور دیوبندی مناظرہ باز آتے تو خفت اٹھا کر بھاگ جاتے۔ ٹھیٹ پنجابی میں تقریر کرتے تو دلوں کو موہ لیتے۔ دورانِ تقریر اپنے خاص انداز میں

قرآن پڑھتے تو سامعین جھوم جھوم جاتے۔ ابھی پاکستان میں ایسے لوگ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ جو اپنے ضروری کاموں کے لیے گھر سے نکلے اور مولانا اچھروی کی زبان سے قرآن سن کر اپنے ضروری کام بھول گئے۔ وہ دورانِ تقریر مناظرانہ نکتے بیان کرتے تو سامعین عش عش کر اٹھتے۔ وہ جب تک ’’جامع مسجد داتا گنج بخش‘‘ لاہور میں اعزازی خطیب رہے تو لوگ دوسرے شہروں سے کشاں کشاں چلے آتے اور ان کی تقریر سنتے۔

مولانا محمد شریف نوری رحمۃ اللہ علیہ (م:۷۲-۵-۱۳):

مولانا محمد شریف نوری بڑے خوش آواز خطیب تھے۔ قصور شہر چھوڑ کر آئے تو میو ہسپتال کے ساتھ ایک کھلی مسجد میں خطباتِ جمعہ کا آغاز کیا اور زندہ دلانِ لاہور کو کھینچ لیا۔ ان کی تقریر سننے کے لیے لوگ دور دور سے آتے اور دیر تک ان کی خوش بیانی سے حظ پاتے۔ مولانا غلام دین مرحوم پنجابی کے ایک خوش گفتار خطیب تھے۔ خطابت کا آغاز کیا تو ریلوے انجن شیڈ کے ایک کھلے میدان میں کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگے۔ یہ میدان آہستہ آہستہ سامعین سے بھرتا گیا۔ وہ اسلام کے حسن و جمال کو اس خوبی سے بیان کرتے ’’کہ قافلے راہ بھول جایا کرتے تھے‘‘۔ وہ جس میدان میں کھڑے ہوتے تھے آج وہاں ایک شاندار مسجد ان کی یاد کو تازہ کر رہی ہے اور اس کے محراب و منبر ان کی خطیبانہ یادوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

مولانا غلام محمد ترنم رحمۃ اللہ علیہ (م:۵۹-۷-۲۴):

مولانا غلام محمد ترنم، امرتسر سے لاہور آئے تو ’’مائی لاڈو‘‘ کی مسجد میں آغازِ خطابت کیا۔ ان کی زور بیانی نے مسجد کے بام و در کو سمیٹ لیا۔ سامعین کی تعداد بڑھتی گئی۔ مسجد کا دامن تنگ ہوتا دکھائی دیا۔ تو ’’پنجاب سول سیکرٹریٹ‘‘ کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد میں خطاب شروع کیا۔ ’’سول سکریٹریٹ‘‘ اِن دنوں لاٹ صاحب کا دفتر تھا۔ مگر مولانا ترنم کی تقریر نے لاٹ صاحب کے دفتر کے دروازوں کو عوام کے لیے کھول دیا۔ سارا لاہور آپ کی تقریر کو بلا دھڑک سننے کے لیے امڈ آتا اور یہ چھوٹی سی

مسجد پھیلتے پھیلتے ایک بڑی جامع مسجد بن گئی۔ مولانا غلام محمد ترنم ایک قادرالکلام مقرر تھے وہ اسلامی جنگوں اور مجاہدین کے کارناموں کے مناظر سامنے لاتے تو یوں معلوم ہوتا کہ ہم خود میدانِ جنگ میں کھڑے ہیں۔

جن دنوں کی یادوں سے ہم لاہور کے خطیبوں اور مقرروں کا تذکرہ کر رہے ہیں ان دنوں پیرزادہ اقبال احمد فاروقی (راقم الحروف) دہلی دروازے کے باہر کوتوالی کے ساتھ ایک مسجد میں تقریر کیا کرتا تھا۔ مسجد چھوٹی تھی۔ سامنے میدان کھلا تھا۔ اگر اپنی تعریف خود کی جائے تو ''مقولہ شاعر بزبانِ شاعر'' والی بات ہوگی مگر یہ امر واقعہ ہے کہ اہلِ ذوق اپنی مسجدیں چھوڑ کر اس مسجد میں آتے اور گھنٹوں تقریر سنتے۔

باز گلبانگ پریشاں می زنم آتشے در عندلیباں می زنم

اسی زمانہ میں مولانا شمیم شاہ مرحوم فیض باغ اور مولانا سلیم اللہ مرحوم ''سفید مسجد مصری شاہ'' میں پنجابی میں تقریریں کیا کرتے تھے اور علم وفضل سے اپنے سامعین کی جھولیاں بھرتے جاتے آج یہ مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ خطیب نہ رہے۔ نمازی نہ رہے۔ مگر ایک وقت تھا کہ یہ مسجدیں آباد تھیں۔ دارالارشاد تھیں۔

مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ (م:۹۸-۳-۱۲):

مفتی محمد حسین نعیمی صاحب چوک دالگراں میں ''مسجد دالگراں'' میں تقریر کرتے تھے۔ یہ مفتی صاحب کے زور کا زمانہ تھا۔ جوش کا زمانہ تھا۔ خطاب کا زمانہ تھا۔ اور تقریر کا زمانہ تھا۔ مفتی صاحب تقریر کرتے تو سننے والے مسجد کے صحن، چھت پھر بازار اور چوک میں پھیلتے جاتے۔ حق کی بات کرتے تو اقتدار کے چہرے پر سلوٹیں آ جاتیں۔ سیاست کی بات کرتے تو گورنر ہاؤس تک آواز چلی جاتی۔ میں نے انہیں اسی مسجد سے گرفتار ہوتے بھی دیکھا اور قید ہوتے بھی دیکھا اور سر بلند ہوتے بھی دیکھا۔

؎ کسی کو دشت نوردی کسی کو دار و رسن
یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کیلئے

علامہ علاء الدین صدیقی رحمۃ اللہ علیہ (م:۷۷-۱۲-۲۷):

''پنجاب ہائی کورٹ'' کی دیواروں کے ساتھ مسجد شاہ چراغ (جہاں آج ایوان اوقاف ہے) میں علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم تقریر کیا کرتے تھے۔ وہ بڑے نستعلیق انداز میں تقریر کرتے۔ ''تحریکِ پاکستان'' میں انہوں نے بڑے علمی انداز میں حصہ لیا اور پر جوش انداز میں تقریریں کیں۔ مسجد شاہ چراغ میں ان کی تقریریں نہ تھیں بلکہ لیکچرز تھے۔ انہیں جج اور وکلاء حضرات بڑے احترام سے سنتے۔ صدیقی صاحب کا اندازِ بیان بڑا موزون اور محتاط ہوتا۔ قانون داں طبقہ ان کے علمی انداز کو پسند کرتا تھا۔ وہ اپنے مخصوص اسلوب میں بڑے سلیقے سے تقریر کرتے۔ ان کے دم قدم سے ''مسجد شاہ چراغ'' روشن اور رہی، تابندہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان خدمات کا یہ صلہ دیا کہ وہ ترقی کرتے کرتے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے۔

سید امانت علی شاہ نظامی:

انہی دنوں مغلپورہ گنج میں ایک عالمِ دین سید امانت علی شاہ چشتی نظامی مرحوم نے اپنے طرزِ بیان سے لاہور والوں کو متاثر کیا۔ وہ ''مثنوی مولانا روم'' پڑھتے اور تقریر میں فلسفہ ''وحدۃ الوجود'' پر گفتگو کرتے۔ آواز میں سوز تھا۔ رومی کا کلام ہوتا اور تصوف کے اسرار و رموز پر بات ہوتی۔ تو لوگ جوق در جوق آتے۔ مسجد بھر جاتی پھر اردگرد کی گلیاں آباد ہو جاتیں۔

مولوی محمد عمر مرحوم:

شاہی قلعہ لاہور کے دامن میں ''بیگم شاہی مسجد'' میں ایک صوفی منش عالم دین، مولوی محمد عمر مرحوم بزرگوں کے واقعات اور کرامات کیا بیان کرتے تھے اس مسجد کو کبھی مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ نے زندہ کیا تھا۔ مولوی محمد عمر صوفیہ اور بزرگانِ دین کے محبت بھرے واقعات بیان کرتے۔ آواز میں گرج اور چمک تو نہ تھی۔ مگر سوز تھا جو

سنتا۔ ان کی تقریر سنتا ہی چلا جاتا۔ اٹھ کر نہ جاتا اور بار بار آتا۔

آج ہم نے لاہور کے ان سنی خطیبوں اور مقرروں کا مختصر سا تذکرہ کیا ہے۔ جن سے کبھی لاہور کی مساجد کے محراب و منبر آباد تھے۔ جن کی گفتار سے اہلِ لاہور کے دل دھڑکتے تھے۔ لیکن اگر ہم لاہور کی ان مساجد کا ذکر بھی کر دیں جہاں علمائے اہلسنّت کے علاوہ دوسرے مکاتب فکر کے خطیب اپنے سامعین کی ذہنی تربیت میں مصروف تھے تو یہ بھی ہماری یادوں کا ایک حصہ ہوگا۔

غیر سنّی علماء کے خطابات:

پاکستان بنا تو لاہور میں وہابی اور شیعہ مساجد کے خطیب تو نمایاں تھے۔ مگر دیو بندی علماء دبے دبے اور چھپے چھپے تھے۔ نہ ان کی مساجد نہ مدارس۔ ایک تو یہ لوگ ''تحریک پاکستان'' کے خلاف کام کرتے رہے تھے اور کانگریس کے ساتھ مل کر پاکستان کے خلاف تقریریں کرتے رہے تھے اور اس طرح یہ ''نیشنلسٹ علماء'' کہلاتے تھے۔ پاکستان بن گیا تو یہ ''بیچارے'' منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ کونے کھدروں میں بڑی دھیمی آواز میں تقریر کرتے۔ کچھ شرمندہ بھی تھے۔ کچھ لوگوں کے جذبات سے ڈرتے تھے، لاہور میں ان کا کوئی نمایاں مرکز خطابت نہیں تھا۔ مولوی احمد علی لاہوری اندرون شیرانوالے دروازے کی مسجد کے خطیب تھے اور بڑے پرزور دیو بندی خطیب تھے۔ بڑے جاندار مولوی تھے۔ تقریر کرتے۔ خطابت کرتے، درس دیتے، کتابیں لکھتے، مرید بناتے، تدریس کرتے، پمفلٹ چھپاتے، انہیں تقسیم کرتے اور دیو بندی نظریات کی بڑی بھرپور ترجمانی کرتے۔ لاہور میں ان کے دم قدم سے ''دیو بندیت'' قائم دائم تھی۔ یہ تحریکِ پاکستان کے حامی بھی تھے اور ترجمان بھی۔ انہوں نے مولوی اشرف علی تھانوی، مولوی شبیر احمد عثمانی، مولوی محمد حسن امرتسری کے انداز میں پاکستان کی حمایت کی۔ اور اپنی محنت و پامردی سے دیو بندیوں کا مرکز بنے رہے۔ وہ اگرچہ خود تحریک پاکستان کے ہمنوا تھے۔ مگر پاکستان کے مخالف ہندوستانی دیو بندی علماء ان کی پناہ میں

رہتے تھے۔ پاکستان بنا تو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اپنے ہندو کانگریسی دوستوں کے ہمدردوں سے ڈر کر مولوی احمد علی لاہوری کے ہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ مولوی احمد علی لاہوری بڑے زوردار مقرر تھے۔ وہ ان تھک خطیب تھے۔ ان کے بیان میں روانی تھی۔ ان کے بیان میں دلائل ہوتے وہ اپنے سامعین کو اپنے علم کا وافر حصہ دیتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ درس قرآن دیتے۔ ان کے حلقہ درس قرآن میں اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ بیٹھتے!

امرتسر سے مولوی محمد حسن صاحب لاہور آئے تو نیلے گنبد میں ''جامعہ اشرفیہ'' قائم کیا۔ وہ مولوی اشرف علی تھانوی کے خلیفہ تھے۔ انہوں نے خطابت میں تو نام پیدا کیا مگر تدریس و تعلیم میں بڑی پامردی سے حصہ لیا۔ انہوں نے دن رات ''جامعہ اشرفیہ'' کی ترقی کے لیے کام کیا اور اسے بلندیوں پر پہنچا دیا۔ آج فیروز پور روڈ لاہور پر ''جامعہ اشرفیہ'' لاہور میں دیو بندی مکتب فکر کا بہت بڑا دار العلوم ہے۔

احراری خطیب:

لاہور میں احراری خطیبوں نے پاکستان بننے کے بعد اپنی تقریروں سے شہرت خاص حاصل کی تھی یہ لوگ تحریک پاکستان کے خلاف تھے۔ یہ کانگریس کی زر بخشی کی لپیٹ میں آ گئے تھے اور پاکستان کے خلاف کام کرتے رہے۔ پاکستان بن گیا۔ تو ان لوگوں کی پناہ گاہ یہی ملک تھا۔ لاہور میں ان کے نامور خطیبوں نے چند سالوں کی خاموشی (شرمندگی) کے بعد اپنے خطیبانہ جوہر دکھانے شروع کیے۔ ان لوگوں میں اگرچہ بعض علماء کرام تھے۔ مگر ان کی سیاسی تربیت اچھی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ لاہور میں کسی مسجد کو اپنا مرکز نہ بنا سکے۔ وہ عام جلسوں میں تقریریں کرتے اور جلسے لوٹتے تھے۔ وہ تقریروں کے بادشاہ تھے۔ ان کا ہر مقرر شعلہ بار تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ساری ساری رات تقریر کرتے تو مجمع پر چھائے رہتے۔ وہ اس قدر قادر الکلام تھے کہ کسی کو اٹھانے نہ دیتے۔ ہلنے نہ دیتے، جانے نہ دیتے، ہنساتے رلاتے اور تڑپاتے۔ خوش آواز

تھے۔خوش بیان تھے۔ان کے تربیت یافتہ مقررین اور ان کے حاشیہ نشین خطیبوں میں صاحبزادہ سید فیض الحسن آلومہاروی، چوہدری افضل حق، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شیخ حسام الدین امرتسری، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولوی محمد علی جالندھری، مولوی مظہر علی اظہر اور آغا شورش کاشمیری جیسے شعلہ بیاں مقرر وقت کے بہترین مقرر مانے جاتے تھے۔احراری مقرروں کے علاوہ پاکستان بننے کے بعد ''جماعت اسلامی'' نے لاہور میں تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔جماعت اسلامی کے علماء میں پرجوش خطیبانہ انداز تو نہ تھا۔مگر وہ لیکچرانہ انداز میں مسلسل اور روانی سے گفتگو کرتے۔اپنے سامعین کی ذہنی تربیت کرتے۔ہم ان کو ''ابجدی'' مقرر کہا کرتے تھے۔مولانا مودودی نے اپنے خطابات اور مقالات سے بڑا کام لیا۔مگر وہ بھی ''ابجدی خطیب'' کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ان کی زبان اور قلم نے یکساں کام کیا۔وہ بذات خود لاہور کی سنی مساجد سے ہٹ کر بعض ویران مساجد یا پارکوں میں اجتماع کرتے اور مسلسل تقریریں کرتے۔ان کی تقریروں میں تسلسل ہوتا اور دلائل ہوتے۔اگرچہ ''جماعت اسلامی'' عوامی خطیب تو پیدا نہ کر سکی اور یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی آج تک عوامی قیادت پر قبضہ نہیں کر سکی۔مگر اس نے ڈاکٹر اسرار، نعیم صدیقی، کوثر نیازی اور چودھری طفیل محمد جیسے اچھے مقرر پیدا کیے۔

لاہور کی فضا میں وہابی (اہل حدیث) خطیبوں نے اپنی مساجد کو آباد رکھا۔اپنے سامعین کو اپنے عقائد و نظریات سے وابستہ رکھا۔مولوی عبداللہ روپڑی (مسجد قدس) بعد میں مولوی عبدالقادر روپڑی، مولوی عبدالواحد جامع مسجد چینیاں والے کے بعد مولوی احسان الٰہی ظہیر، خطیب جامع مسجد مبارک جیسے نامور وہابی لاہور کی وہابی دنیا کی رہنمائی کرتے رہے۔پاکستان کے قیام کے کچھ عرصہ بعد لاہور میں بعض دیوبندی مقررین نے اپنے نام اور مقامات پیدا کیے۔مولوی احمد علی لاہوری اور ان کے جانشین خطاب و تحریر میں اپنی روایت مضبوط نہ رکھ سکے۔البتہ مولوی اجمل خاں نے قلعہ گوجر

ایبٹ روڈ پر اپنے پُرزور خطاب سے دیوبندیوں کو مربوط رکھا۔

دیوبندی مولانا محمد اجمل خاں صاحب کی پامردی اور خوش بیانی سے ان کی مسجد کو مرکزی حیثیت ملی۔جامعہ مدنیہ کے بانی حامد میاں دیوبندی مکتب فکر کے ایک جاندار خطیب اور معلم کی حیثیت سے لاہور میں ڈٹے رہے پہلے ''مسلم مسجد'' بعد میں ''جامعہ مدنیہ'' سے ان کے علمی اثرات دور دور تک پھیلے۔لاہور کے دیوبندی خطابت، تقاریر میں تو دوسرے شہروں کے دیوبندی خطیبوں کے ہم پلہ نہیں تھے۔مگر انتظامی امور میں انہوں نے اپنی مساجد کو بڑا مربوط کیا اور درس و تدریس میں قدم جماتے گئے۔

شیعہ حضرات خطاب و تذکار میں بڑے بلند بانگ ہیں۔ان کی خطابی فصاحت و بلاغت کا اعتراف ان کے مخالف بھی کرتے ہیں۔لاہور میں ان کے نامور خطیبوں اور ذاکروں میں حافظ کفایت حسین، علامہ شمسی، زیدی، نجفی مولوی اسمٰعیل بڑے نام آور خطیب بن کر ابھرے۔مگر چونکہ شیعہ حضرات کی ماتمی مجالس اور محافل امام باڑوں (اب امام بارگاہوں) تک محدود تھیں وہ عوامی سطح پر خطاب نہ کر سکے۔انہوں نے اپنی مساجد کی طرف بہت کم توجہ دی مگر امام باڑوں کو مربوط کیا۔اس طرح وہ آج تک لاہور کی عوامی فضا کو شیعیت کے عقائد سے متاثر نہ کر سکے۔البتہ پنجاب کے دوردراز دیہات کے ان لوگ ان کی ماتمی مجلسوں میں شرکت کر کے اپنے عقائد سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

لاہور شہر میں ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب علماء اہلسنّت نے شہر کے باغات میں تقاریر کا ایک اجتماعی سلسلہ شروع کیا۔ہزاروں لوگ ان خطیبوں کی تقاریر سننے کے لیے جمع ہوتے۔پنجاب بھر کے نامور اور بلند پایہ علماء لاہور تشریف لاتے اور لاہور کے باغات میں تقریریں کرتے۔یہ سلسلہ اتنا مؤثر اور مفید تھا کہ ہر مکتب فکر کا آدمی بلاتردد ان کی مجالس میں شرکت کرتا۔اور اپنا دامن علم و فضل کے ثمرات سے بھر کر گھر آتا۔

(''جہانِ رضا'' اپریل ۱۹۹۵ء)

ایک نورانی محفل کا تذکرہ

یہ ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے جب علماء کرام اپنی تقریروں سے لاہور کے در و دیوار کو ز...
درخشاں رکھتے تھے۔ تحریک پاکستان کی ہوائیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ دوسری عالمگیر
جنگ کٹ رہی تھی۔ برصغیر پر انگریز کے اقتدار کا آخری دور تھا۔ اور وہ اس جنگ میں
بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ملک میں جہاں سیاسی راہنما اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے
تھے وہاں علمائے کرام بھی آزادی کے بعد ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے
کوشاں تھے۔ ''مجلس احرار'' کے شعلہ بار مقررین تو کانگریس کے جھنڈے تلے
کھڑے ہو کر ''حکومت الٰہیہ'' قائم کرنے کا فلسفہ پیش کر رہے تھے۔ اسی طرح ''جمعیت
علمائے ہند'' کے وہابی اور دیوبندی علماء کانگریس کے وظیفہ خوار حلیف تھے۔ یہ لوگ
آزادی تو چاہتے تھے مگر ان کی وطن کی آزادی کے نعرے میں گاندھی اور نہرو کی ہمنوائی
تھی۔ ان نیشنلسٹ علماء کرام کی تقریریں کانگریس کے سیاسی فلسفے کا عربی ترجمہ تھا۔

علمائے اہلسنت اور مشائخ کرام ''مسلم لیگ'' کی رفاقت میں ایسے پاکستان کا
مطالبہ کر رہے تھے جس کا مطلب ''لا الہ الا اللہ'' تھا۔ ہم لوگ ان دنوں سیاسی جلسوں
سے ہٹ کر ان نورانی محفلوں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے جہاں سے ہمیں محبوب خدا
حبیب کبریا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکار و نعت کی غذا ملتی تھی۔ ان دنوں لاہور میں
مختلف مقامات پر ایسی مجالس کا اہتمام ہوا کرتا تھا جہاں ملک کے خوش آواز نعت خوان
بارگاہ رسالت میں ہدیہ نعت پیش کیا کرتے تھے۔ آج ہم ایک ایسی ہی نورانی محفل کا
ذکر کر رہے ہیں۔

لاہور کے دہلی دروازے کے اندر ہر ماہ چاند کی چودہ تاریخ کو ایک ایسی ''مجلس

نعت'' منعقد ہوتی تھی جس کا اہتمام ''بابا نور'' اپنے مکان کی چھت پر کیا کرتے تھے۔
''بابا نور'' محکمہ ریلوے میں ملازم تھے۔ مگر نعت خوانی پر بڑا روپیہ خرچ کیا کرتے تھے۔
... کے ساتھ ساتھ وہ اس نورانی مجلس کے انعقاد کا اہتمام جس حسن و خوبی سے کرتے
... اس کی مثال سارے لاہور میں نہیں ملتی تھی۔ اگر مجھے اجازت ہو تو میں کہوں گا کہ
... ساری زندگی میں ایسی بے مثال محفل نعت میں شرکت کا آج تک موقع نہیں ملا۔

''بابا نور'' مجلس نعت کے لیے جو میدان منتخب کرتے اس کے در و دیوار کو سفید
... قلعی سے سفید کرا دیتے تھے۔ فرش پر سفید براق چادریں بچھاتے۔ ''مجلس نعت''
... شریک ہونے والے خراماں خراماں تشریف لاتے اور حلقہ بنا کر مجلس میں آکر بیٹھتے
... اگر کوئی ننگے سر مجلس میں آتا تو ''بابا نور'' کے کارندے اس کے سر پر سفید ٹوپی
... دیتے۔

جب مجلس جمتی تو چودھویں کے چاند کی چاندنی ساری مجلس پر اپنا نور بکھیرتی۔
نعت خوان بڑے نورانی لباس میں جلوہ فرما ہوتے۔ ان کے سامنے مراد آباد کی سفید
... ہوئی چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں سفید مصری کی ڈلیاں اور سفید الائچیاں رکھی
... تیں۔ یہ سفید طشتریاں نعت خوانوں کے علاوہ سامعین کے سامنے بھی گھومتی
... تیں۔ ''بابا نور'' خود اٹھتے اور موتیے کے سفید ہاروں کی لڑیاں اٹھا کر ساری محفل
میں گھومتے اور اپنے مہمانوں کے گلے میں ڈالتے جاتے۔ ''بابا نور'' خود ہی مہتمم مجلس
ہوتے، خود ہی میزبان اور خود ہی ''میر مجلس'' ہوتے۔ ایک گھنٹہ بھر ''ختم غوثیہ'' کا ورد
ہوتا۔ تمام اہل مجلس اس ''ختم غوثیہ'' کے کلمات بلند آواز میں، آواز سے آواز ملا کر ادا
کرتے۔ ''ختم غوثیہ'' کے اختتام پر مجلس نعت شروع ہوتی تو خود ''بابا نور'' اور ان کے
کارندے سفید چمکتی عطر دانیوں سے عطر گلاب اور کیوڑے کی ہلکی ہلکی پھوار سے ساری
مجلس کو مہکا دیتے۔ ''صلوٰۃ و سلام'' کی بارش کی پھوار کے ساتھ نعت رسول کا آغاز ہوتا
تو نعت خوانوں کی مترنم آواز گونجتی۔

لب نور، دہن نور، ذقن نور، بدن نور
سر تا بقدم ہے سرِ سلطانِ زمن نور

دندان ولب و زلف، رخِ شاہ کے فدائی
ہیں درِ عدن، لعلِ یمن، مشکِ ختن نور

تابع رخِ شاہ کے مظاہر ہیں یہ سب نور
لو بن گئے ہیں اب تو حسینوں کے دہن نور

کیا بات ''رضا'' اس چمنستان کرم کی
زہرا ہے کلی جس میں حسین اور حسن نور

میرے دل ودماغ میں ساٹھ سال گزرنے کے باوجود ابھی تک وہ سرور موجود ہے جب اس مجلس میں ایک خوبصورت خوش گلو بچے نے یہ نعت پڑھی۔

میں بلبل باغ مدینے دی ہاں، کی کرناں باغ بہاراں نوں
میں بچھڑی احمد پیارے دی ہاں، اگ لاواں ان گلزاراں نوں

یہ ساری نعت سادہ مگر دل میں اترتی جاتی۔ سبحان اللہ! ماشاء اللہ! مرحبا! جزاک اللہ! کے الفاظ سے دادو تحسین کی بارش ہوتی۔ دل ڈھل جاتے۔ دماغ مہک اٹھتے اور جسم کارواں رواں رقت سے جھوم جھوم جاتا۔

ان دنوں لاہور کی مجالس نعت میں میاں سرفراز عرف ''پپا'' کا طوطی بولتا تھا۔ اس کی باری آتی تو وہ نعت کا آغاز یوں کرتا۔

ہر جا کہ رسیدیم، سرکوئے تو دیدیم!

وہ اس انداز سے یہ فارسی نعت پڑھتا کہ لوگ جھوم جھوم جاتے۔ ایک ایک شعر کو کئی کئی بار پڑھتا اور مجلس کو لوٹ لیتا۔ اپنے سامعین کو تڑپاتا اور لوٹاتا جاتا اور نبی پاک کی نعت سناتا جاتا۔

کبھی کبھی امرتسر سے چل کر ایک نعت خواں ''جان محمد'' بھی آتا۔ جان محمد ان دنوں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا۔ آواز اونچی، سریلی مگر لے بڑی لمبی ہوتی۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی نعت پڑھتا تو لطف آجاتا۔

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے
میرا دل بھی چمکا دے، چمکانے والے

برستا نہیں دیکھ کر ابر رحمت
بدوں پر بھی برسا دے، برسانے والے

مدینے کے خطے، خدا تجھ کو رکھے
غریبوں، فقیروں کے ٹھہرانے والے

حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا؟
ارے سر کا موقع ہے، او جانے والے!

رہے گا یونہی ان کا چرچا رہے گا
پڑے خاک ہو جائیں، جل جانے والے

جان محمد کی لے اتنی لمبی اور آواز اتنی بلند ہوتی کہ چاند کو جا چھوتی۔ اور واقعی ہمارے دل سے آواز آتی کہ

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے!

کبھی کبھی اندرون موچی دروازہ لاہور کا رہنے والا ایک بلند آواز نعت خواں ''بودی شاہ'' بھی ''بابے نور'' کی نوری مجلس میں آجاتا۔ ''بودی شاہ'' ریلوے میں ملازم تھا۔ ''بابے نور'' کی رفاقت نبھانے کے لیے آجاتا۔ اس کی آواز کیا تھی، آواز اٹھاتا تو در و دیوار اس کی بلند آواز کے سامنے لرزنے لگتے۔ وہ گلا کھولتا تو یوں محسوس ہوتا کہ

آواز کا طوفان آ گیا ہے۔ سبحان اللہ! اللہ اس نعت خوان کو عالم برزخ میں بلند مقا
دے۔ اس کی نعت خوانی سے دلوں کے زنگ مٹ جاتے۔ "وجلت قلوبھم" کی
کیفیت طاری ہو جاتی۔ ہوائیں اور فضائیں گواہی دیتیں کہ یہاں نعت رسول کی بر
باریاں ہو رہی تھیں۔

ان دنوں صوفی غلام حسین گوجروی مرحوم جو بعد میں پاکستان کے ایک زبردست
خطیب کی حیثیت سے متعارف ہوئے، دہلی دروازے کے باہر جامع مسجد سُنی کوتوال
میں پڑھتے تھے۔ وہ اس وقت صرف نعت خوان تھے۔ وہ ''بابے نور'' کی مجلس میں
''راقب قصوری'' کی کہی ہوئی پنجابی نعتیں سنایا کرتے تھے اور مجلس مین ایک سماں باند
دیتے۔ مجلس نعت کے اختتام پر قیام وسلام کا دور چلتا۔ ان دنوں ابھی اعلیٰ حضرت امام
احمد رضا خان بریلوی کے کہے ہوئے سلام ''مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' کے
پڑھنے کا رواج نہیں تھا۔ ''بابا نور'' خود ''یا نبی سلامُ علیک!'' پڑھتا اور اہل مجلس کو اپنا ہم
نوا بنا لیتا۔ وہ پورا ایک گھنٹہ سلام پڑھاتا اور پڑھاتے پڑھاتے تھکا دیتا۔ جب وہ
آخری دعائیہ شعر

اے خدا کے لاڈلے، پیارے رسول
یہ سلام عاجزانہ ہو قبول!

پڑھتا تو ہم لوگ مجلس میں دوبارہ بیٹھ جاتے۔ ہم تھکے ہوتے مگر ''بابے نور'' کے
کارندے چاروں طرف سے چمکتی ہوئی سفید عطر دانیوں کو پکڑے، ہاتھ ہلاتے، اہل
محفل پر عطر اور کیوڑہ کی بارش کرتے تو ہماری تھکاوٹ چند لمحوں میں دور ہو جاتی۔ اب
اختتامی ختم شریف کے بعد دعا ہوتی اور مہمانوں کے سامنے مختلف اقسام کی چیزیں لائی
جاتیں، جس سے کام و دہن کو تسکین ہوتی۔

''بابے نور'' کی اس محفل میں کھانے پینے والی چیزوں میں بھی سفید ''نورانی''
چیزوں کا اہتمام ہوتا۔ ''بابا نور'' مہمانوں کے لیے جو چائے پیش کرتے اس میں سفید
دودھ زیادہ ہوتا اور کشمیری چائے کا رنگ واجبی۔ پیالیاں سفید چینی سے بنی ہوتیں اور

ان کے ساتھ ''ختائیاں'' آتیں جو خصوصی طور پر سفید رنگ کی تیار کرائی جاتیں۔ پانی
والے کے لیے مراد آباد کے چمکتے ہوئے سفید گلاس اور جگ مجلس کی زینت ہوتے۔
بتاشے، سفید مخانے، سفید ریوڑیاں، سفید پلیٹوں میں پیش کیے جاتے۔ ''بابے نور''
کی ایسی ''نورٌ علی نور'' نعتیہ مجالس میں تبرک بٹنے لگتا تو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی
کے اشعار یاد آتے:

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

تیرے ہی ماتھے رہا اے جان سہرا نور کا
بخت جاگا نور کا، چمکا ستارا نور کا

میں گدا، تو بادشاہ، بھر دے پیالہ نور کا
نور دن دونا تیرا، دے ڈال صدقہ نور کا

تیرے آگے خاک پر جھکتا ہے ماتھا نور کا
نور نے پایا تیرے سجدے سے سیما نور کا

جو گدا دیکھو لیے جاتا ہے توڑا نور کا
نور کی سرکار ہے، کیا اس میں توڑا نور کا؟

بھیک لے سرکار سے، لا جلد کاسہ نور کا
ماہ نو طیبہ میں بٹتا ہے مہینہ نور کا

انجمن والے ہیں انجم، بزم حلقہ نور کا
چاند پر تاروں کے جھرمٹ سے ہے ہالہ نور کا

آج ہم زندگی کی بے پناہ آسانیوں اور سہولتوں سے مالا مال ہیں اور ''محافل نعت'' اور ''مجالس میلاد پاک'' کے اہتمام میں بڑا خرچ کرتے ہیں مگر جو سلیقہ اور اہتمام ''بابِ نور'' کی مجالس میں دیکھا وہ نہ آج ''الحمراء'' لاہور کے ہال میں نظر آتا ہے، نہ اسلام آباد کے ''ہالیڈے ان'' میں دکھائی دیتا ہے۔

(''جہانِ رضا'' اگست ۱۹۹۵ء)

علماءِ کرام کی یادیں

پاکستان میں خوشحالی کے دور دورے سے ہماری معاشرتی اور معاشی اقدار بدل گئی ہیں۔ ہماری بود و باش سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک غریب ملک کے غریب شہری بھی ماشاءاللہ اپنے شب و روز میں امارت کی جھلکیاں زندگی کے دامن میں سمیٹ کر آ گئے رہے ہیں۔ اس معاشرتی تبدیلی میں ہمارے بعض علماء کرام نے بھی ''حجروں'' کو خیر باد کہہ کر کوٹھیوں میں رہنا شروع کر دیا ہے۔ پیدل چلنے کی عادت کو چھوڑ کر ائیر کنڈیشنڈ کاروں پر سفر کرتے ہیں۔ ''زکوۃ کی تملیک'' اور ''صدقہ کی تحلیل'' نے کئی خلاف الحال علماء کو زندگی کی نعمتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ ان میں سے اکثر ہمارے ہم درس، ہم سبق، ہم سفر، ہم پیالہ و ہم نوالہ ہی نہیں بلکہ فقر و فاقہ میں شریک زندگی رہے ہیں۔ آج ہم ان ''علمائے کرام'' کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ان قناعت پسند علمائے کرام کی یادوں میں اتنی بلندی دکھائی دیتی ہے کہ آسمانوں کی بلندیاں ان کے اخلاق و قناعت کی رفعتوں کے سامنے پست نظر آتی ہیں جو ہمارے ماضی کا سرمایہ تھے۔

ان علمائے کرام میں سے اگرچہ ایسے علمائے کرام خصوصاً واعظانِ اہل سنت بھی ہیں، جنہیں قارئین ''جہان رضا'' کا ایک طبقہ ذاتی طور پر جانتا ہے۔ ہم نے ان علمائے کرام کو ''فاقہ زدہ'' یا ''غربت و مسکنت کا شکار'' تو نہیں دیکھا مگر ان کی شان قناعت و استغناء دیکھ کر ان کے نام پر سر و جان تعظیماً جھک جاتے ہیں اور حوصلہ بلند ہوتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اللہ و رسول کی راہوں میں زندگیاں گزار دیں۔ مگر صبر و قناعت کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جنہوں نے دینی تبلیغ کے لیے دور دراز کے سفر کیے مگر اپنی خودی کو پامال نہیں ہونے دیا۔

مولانا محمد بخش مسلم۔بی اے (م:۱۹۸۷-۲-۱۷):

انگریز کا زمانہ تھا۔ سفر میں بے پناہ مشکلات تھیں۔ ریاست ''بہاول پور'' کے
بے لق و دق ریگستان پنجاب کے جفاکش آبادکاروں کی محنت سے سرسبز و شاداب ہو
رہے تھے۔ ان آبادکاروں کی دلی تمنا ہوتی کہ وہ اپنے علاقے میں ان باکمال خطیبوں
کی آوازسنیں، جن کی خوش بیانی سے لاہور کے در و دیوار معمور ہو رہے تھے۔ ہارون آباد
سے چودہ میل دور ایک جلسہ عام ہونا قرار پایا۔ مجھے حکم ہوا کہ میں لاہور سے مولانا محمد بخش
مسلم۔بی اے کو لے کر جلسہ گاہ میں پہنچوں۔ مولانا مسلم مرحوم کا ان دنوں خطابت میں
طوطی بولتا تھا۔ وہ اردو، پنجابی اور انگریزی میں یکساں تقریر کرتے۔ جب وہ اپنی تقریر
میں فرفر انگریزی کے جملے بولتے تو سامعین ایک نیا لطف حاصل کرتے تھے۔ مولانا
مسلم لاہور سے روانہ ہوئے تو انہوں نے ایک زبردست پنجابی شاعر ''عشق لہر'' (م
۱۹۴۸-۱۱-۲۵) کو بھی اپنا ہم سفر بنالیا۔ ''عشق لہر'' صرف پنجابی شاعر ہی نہ تھے وہ
قومی شاعر بھی تھے۔ وہ تحریک پاکستان کے دوران سارے پنجاب کے دیہات میں
مسلم لیگ کی ہم نوائی میں پاکستان کے حق میں نظمیں سناتے رہے تھے۔ ہارون آباد
جانے کے لیے صرف ایک راستہ تھا۔ پہلے ریل گاڑی پر سوار ہوکر قصور، پھر ''فیروز پور''
وہاں سے گاڑی تبدیل کر کے ''بہاول نگر'' اور وہاں سے گاڑی بدل کر ''ہارون آباد'' کا
رخ کرتے۔ اس طرح ہمارا قافلہ پورے بیس گھنٹوں میں لاہور سے ہارون آباد پہنچا۔
گاڑی لیٹ ہونے کی وجہ سے ایک بس جو ہارون آباد سے چشتیاں کے ریتلے صحرا کو
چیرتی ہوئی جاتی تھی، ہمارے جانے سے پہلے نکل چکی تھی۔ اب ہم تھے اور چودہ میل کا
سفر تھا اور سامنے ریت کے پھیلے ہوئے ٹیلے تھے اور میں نے بے بسی کے عالم میں ان
نازک شہری مہمان علماء کے چہروں پر نگاہ ڈالی تو نظریں جھک گئیں۔ مولانا مسلم مرحوم
نے للکار کر کہا ''قدم بڑھاؤ ساتھیو! یہ چودہ میل پر جلسہ گاہ ہے!''
ہم چل پڑے۔ ریت کے ٹیلے ہمارے علماء کرام کے پاؤں کے نیچے ریشم و کمخاب

اطلس بچھے جا رہے تھے۔ وہ نازک قدم جو لاہور کے باغوں میں چلتے بھی شرماتے تھے،
ریت کو روندتے ہوئے سفر پر رواں دواں تھے۔ رات کے سائے گہرے ہوتے جا رہے
تھے۔ ہم جلسہ گاہ کے قریب پہنچے تو عشاء کی اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہمارے آنے کی خبر
ملی تو ہماری راہ میں انتظار کی آنکھیں بچھانے والوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔
علمائے اہل سنت سے سٹیج درخشاں تھے۔ حد نگاہ تک سامعین کا مجمع پھیلا ہوا تھا۔
''عشق لہر'' نے اپنی پنجابی نظموں سے مجمع میں ''لہر بہر'' کردی۔ مولانا مسلم مرحوم اٹھے
تو اپنی خوش آوازی اور روانی سے دلوں کو گرماتے گئے۔ میں دوسرے علماء کرام کی
تقریروں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مگر مولانا مسلم مرحوم نے اہل محبت کو خوش کر
دیا۔ دوسرے دن آرام کیا۔ تیسرے دن لاری پر بٹھانے کے لیے پچاس آدمی آئے
منتظمین نے مولانا مسلم مرحوم کے کان میں کہا ''اللہ حافظ جزاک اللہ!''
ان بزرگوں کو اتنے لمبے سفر کی تکلیف اور پھر شاندار تقریروں کے باوجود لوگوں
نے صرف ''جزاک اللہ'' پر ٹال دیا تھا۔ میرے دل میں ملال تھا مگر راستے میں ''مولانا
مسلم'' مرحوم اور ''عشق لہر'' نے خوش ہوکر کہا ''الحمد للہ ہمیں بہت کچھ مل گیا ہے۔ ہم
نے اس صحرا میں اپنے رسول کا پیغام پہنچا کر ہزاروں دلوں کو زندہ کر دیا ہے۔ کیا یہ
''صلہ'' کسی چیز سے کم ہے!''

مولانا غلام محمد ترنم (م:۵۹-۷-۲۴):

بڑے قادر الکلام مقرر تھے۔ جب تقریر کرتے، مجمع پر چھا جاتے۔ امرتسر سے
آئے تو لاہور کے اہل ذوق کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ لوگوں کو مخاطب کرتے تو کسی کو ملنے کا
بہانہ ہوتا۔ تقریر کیا ہوتی، ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا امنڈتا سنائی دیتا۔ ''شاہدرہ ٹاؤن''
والوں نے ایک رات جلسہ پر بلالیا۔ رات ایک بجے رخصت کیا تو ہر ایک میزبان اس
غلط فہمی سے ہاتھ چوم چوم کر الوداع کہتا جاتا کہ شاید دوسرے نے خدمت کردی ہے۔
مولانا ترنم کے پاس واپسی کے لیے تانگے کا کرایہ بھی نہیں تھا۔ ان دنوں رات کو شاہدرہ
سے تانگے لاہور کو آنا گوارا بھی نہ کرتے تھے۔ مولانا تن تنہا پیدل روانہ ہوئے۔ دریائے

راوی کے پل پر کسی واقف کار نے دیکھا کہ ترنم صاحب اپنا ایک چپل ہاتھ میں اٹھائے
جس کا تسمہ ٹوٹ گیا تھا، پیدل چلے آرہے ہیں۔ واقف کار نے کہا ''حضرت یہ کیا؟''
فرمایا: ''چپ رہو! مسلمانوں کا پادری ''مولوی'' ہوں۔ اگر عیسائیوں کو پتا چل گیا کہ
مسلمانوں کا پادری یوں گھر آتا ہے تو آئندہ میری تقریر کوئی نہیں سنے گا۔ آج ہی میری
تقریر سن کر پندرہ عیسائی میرے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں''۔

خطیب پاکستان مولانا غلام دین، انجن شیڈ لاہور:

آپ بڑے خوش آواز اور خوش بیان خطیب تھے۔ تقریر کرتے تو سامعین جم
جاتے۔ بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے، دل دھڑکنے لگتے اور جس درد سے واقعات
سناتے، دل کرتا سناتے جائیں۔ آپ انجن شیڈ کی مسجد کے سامنے کھلے میدان میں تقریر
کرتے تو دور دور تک لوگ ہمہ تن گوش نظر آتے۔ ریلوے کے چند کارکن ''شاد باغ لاہور''
میں جو ان دنوں شہر کے شمالی کنارے پر واقع تھا، رہتے تھے۔ ازرہ محبت وعقیدت مولانا کو
شاد باغ تقریر کے لیے لے گئے۔ رات کا وقت مصری شاہ، وسن پورہ، تاج پورہ حتیٰ کہ
لاہور شہر کے لوگ جوق در جوق جلسہ گاہ میں پہنچے۔ بڑا بھر پور مجمع تھا۔ مولانا نے تین گھنٹے
تقریر کی۔ مجال ہے کوئی اٹھ کر جائے۔ جلسہ ختم ہوا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ جلسہ گاہ خالی
ہوگئی۔ میں نے دیکھا حضرت مولانا غلام دین مرحوم تن تنہا مسجد میں بیٹھے ہیں اور چاروں
طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں حاضر ہوا اور پانی پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ فرمانے
لگے: ''میرے میزبان شربت لا رہے ہوں گے''۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا کوئی میزبان ادھر آیا
نہ شربت لایا۔ مولانا نے مسجد کی ٹونٹیوں سے پانی پیا۔ میں نے پوچھا اس رات گئے
سواری تو کوئی نہیں۔ آپ کی واپسی کا کیا انتظام ہے؟ فرمانے لگے: ''فلاں صاحب
سواری کا انتظام کرنے گئے ہوں گے''۔ آدھ گھنٹہ مزید گزر گیا مگر نہ کوئی سواری آئی نہ
''فلاں صاحب'' لوٹے۔ میں نے ان لوگوں کے گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ ہر
شخص دوسرے کا نام لے کر اندر جا کر سو جاتا۔ صورت حال سے مولانا کو آگاہ کیا اور ساتھ
ہی عرض کیا میرا گھر قریب ہے۔ آج رات میرے گھر آرام فرمالیں۔ صبح سواری نہیں

سواریاں مل جائیں گی۔ فرمانے لگے ''میں گھر کہہ آیا تھا کہ رات واپس آجاؤں گا۔ آؤ
وسن پورہ چلتے ہیں تانگہ مل جائے گا''۔ تاج پورہ آئے، کوئی تانگہ نہ ملا۔ اب وسن پورہ کو جا
رہے تھے۔ وسن پورے سے چل کر کاچھو پورہ آئے، کوئی تانگہ نہ ملا۔ وہاں سے ہم
دونوں نے ریلوے مال گودام کا رخ کیا۔ میں مولانا کو تسلی دیتا جاتا اور یہ شعر سناتا جاتا:

کس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ریلوے مال گودام چھڑا منڈی سے ایک تانگہ ملا۔ مولانا تانگے پر سوار ہوئے۔
میں پیدل واپس ہوا تو رات کی خاموشی میں مولانا کے تانگے کے گھوڑے کی سموں کی
آواز سنتا تو مجھے ''کربلا والوں'' کے گھوڑے یاد آتے! بایں بے نیازی و بے اعتنائی۔
مجال ہے مولانا کی زبان پر کبھی شکوہ آیا ہو!

مولانا نورانی اور مولانا ازہری کا ایک جلسہ:

مجھے موچی دروازہ کا وہ جلسہ تو اب تک یاد ہے جس میں آج سے پچیس سال قبل
حضرت مولانا الشاہ احمد نورانی صدیقی اور حضرت علامہ الازہری کو خصوصی طور پر کراچی
سے تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ جلسہ بڑا کامیاب رہا۔ موچی دروازے کا باغ، بے
پناہ مجمع اور شعلہ بار تقریریں۔ جلسہ ختم ہوا تو کراچی کے یہ دونوں ''مہمانان گرامی'' غالباً
اندھیرے میں کھو گئے اور ''میزبانان مقامی'' اس غلط فہمی سے اپنے مہمانوں کو فراموش کر
گئے کہ شاید فلاں میزبان اپنی کار پر بٹھا کر گھر لے گیا ہوگا۔ سارا مجمع بکھر گیا۔ ہر شخص
تقریروں کے نشے میں سرشار اپنے اپنے گھر روانہ ہوا۔ بعض سامعین کاروں پر سوار رواں
دواں۔ حتیٰ کہ پولیس والے بھی تھکے ماندے اپنے اپنے تھانوں کی طرف جانے لگے۔
فیصل آباد (ان دنوں لائل پور) سے ایک عقیدت کا مارا مولوی رشید احمد نوری ان دو
شعلہ بار مقررین کے ساتھ ''برکت علی محمڈن ہال'' کے فٹ پاتھ پر کھڑا ہر تانگے والے کو
روکتا مگر اس اندھیری رات کے پچھلے پہر کوئی نہ رکتا۔ اب ''تینوں درویش'' پیدل موچی
دروازے سے چلتے چلتے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ نماز فجر ایک چھپے پر ادا کی اور کراچی جانے

والی پہلی گاڑی پر الوداع کہتے ہوئے روانہ ہوئے تا کہ کوئی ''لاہوری میزبان'' دیکھ نہ لے۔ مجھے کئی سال علامہ ازہری مرحوم سے ملاقات رہی۔ عرصہ تک الشاہ احمد نورانی صدیقی صدر جمعیۃ علمائے پاکستان سے نیاز مندی رہی۔ مجال ہے ان بزرگوں نے لاہور کے میزبانوں کی بے اعتنائیوں اور موچی دروازے سے ریلوے اسٹیشن تک ''اندھیرے سفر'' کا کبھی تذکرہ نوکِ زبان پر رکھا ہو۔ کتنا ظرف تھا ان لوگوں کا!

رکھ رکھا اس آنکھ کا دیکھ — چپ کی چپ اور بات کی بات
کٹتے کٹتے کٹتی ہے — سفر کی کالی لمبی رات

یہ تھے سنی علمائے کرام جو اپنے عوام کے ''حسن سلوک'' پر کبھی شکوہ بہ لب نہیں ہوتے تھے۔

اہلِ سنت کے مقررین کی اعزازی خدمات:

۱۹۵۵ء میں لاہور شہر کے چند سنی خطیبوں نے ایک انجمن بنائی اور اعلان کیا کہ ہر مقرر ''مفت'' تقریر کیا کرے گا۔ نہ خدمت، نہ وظیفہ، نہ نذرانہ، نہ تبرک، نہ کھانا، نہ کرایہ۔ اللہ اللہ!! علماء کرام اور یہ قربانیاں! اس ''انجمن مفت خطابی'' میں جو نوجوان علماء اہل سنت شامل تھے، ان میں جناب مولانا حافظ محمد عالم صاحب (جو بعد میں شیخ القرآن کے لقب سے سیالکوٹ میں دینی اہمیت کے مالک بنے) زینت القراء قاری غلام رسول صاحب (جو اپنی خوش آوازی اور قرآن خوانی کی بدولت ساری دنیا میں معروف ہوئے) حضرت مولانا الٰہی بخش صاحب (جو مستقبل میں ایک زبردست مناظر اور مقرر کی حیثیت سے ابھرے اور ''ضیائی نسبت'' سے پیر طریقت کی حیثیت سے معروف ہوئے) راقم الحروف (جو اپنی زندگی کی کامیابیوں میں ''سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر''...... کی عنایتوں سے نوازے گئے) مولانا محمد یوسف صاحب بوشیلا (جو بعد میں ایک مجذوب پیر طریقت کی حیثیت سے اہل دل کے قافلے تیار کرتے رہے) اس انجمن میں شامل تھے۔ اپنی سائیکلیں، اپنا کھانا، اپنی تقریریں، اپنا

بیان! لاہور کے لوگوں نے ان مقرر حضرات کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ مختلف علاقوں کی دینی انجمنیں وقت لیتیں، اشتہار چھپواتیں، اعلان کرتیں، اسٹیج سجاتیں، سپیکرز نصب کرتیں اور یہ نوجوان مقرر تقریریں کرتے اور رات کے پچھلے پہر جلسے ختم ہوتے تو اپنی اپنی سائیکلوں پر اپنے اپنے گھروں میں جا پہنچتے۔ ان علماء کرام کا یہ انداز اہل لاہور کو اتنا پسند آیا کہ شہر کے کسی نہ کسی علاقہ میں ہر رات جلسہ ہوتا اور یہ نوجوان علماء اپنے اپنے انداز میں تقریریں کرتے۔ قاری غلام رسول صاحب قرآن پڑھتے تو یوں محسوس ہوتا کہ دلوں پر قرآن نازل ہو رہا ہے۔ دل دھل جاتے، ذہن سکون حاصل کرتے۔ راستہ چلتے لوگ رک جاتے۔ ان دنوں کشمیری بازار لاہور میں نوجوانوں نے ایک مجلس ''اصلاح المسلمین'' کے نام سے بنائی۔ یہ لوگ قد آدم رنگین اشتہارات چھپواتے۔ لاہور کے بازاروں میں لگاتے، شاندار اسٹیج سجاتے اور مجھے یاد ہے کہ ہم اسٹیج کے مالک ہوتے اور لوگ جلسہ گاہ کے چاروں طرف ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ کبھی کبھی ان نوجوان مقررین کی اسٹیج پر صدارت کے لیے حضرت مولانا ابوالحسنات خطیب جامع مسجد وزیر خان، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان صاحب نیازی بھی تشریف لاتے۔ جلسہ ختم ہوتا تو ہماری سائیکلوں کی گھنٹیاں بجتیں اور ہم رات کے اندھیروں کو چیرتے ہوئے اپنے اپنے ''غریب خانوں'' میں پہنچ جاتے۔ اور دل میں کہتے جاتے۔

ع آقا تیری خاطر شہر کے کوچے سجائے ہیں!

تقریر کے بعد پیسے وصول کرنا ایک روایت ہے اور اس میں ایک ''مزہ'' بھی ہے مگر تقریر کرنے کے بعد نذرانہ، کرایہ اور پیسے نہ لینے میں جو ''سرور'' ہے اسے میں اب تک نہیں بھول سکا۔ میرا دل اس ''نشہ'' سے ابھی تک سرشار ہے!

(''جہانِ رضا'' ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۵ء)
(''جہانِ رضا'' اگست، ستمبر ۲۰۰۵ء)

دارالعلوم نعمانیہ لاہور کے علماء کرام

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، ایم اے نے یہ مقالہ ''کنزالایمان سوسائٹی لاہور'' کے ماہنامہ ''کنزالایمان'' کے ''تحریک پاکستان نمبر'' کی تقریب رونمائی پر الحمراء ہال لاہور میں ۱۵ جنوری ۱۹۹۶ء کو پڑھا تھا۔ اس میں پیرزادہ اقبال احمد صاحب فاروقی نے ''دارالعلوم نعمانیہ لاہور'' سے وابستہ چند علمائے کرام کی سیاسی اور علمی خدمات کو بیان کیا ہے۔ (مرتب)

صدر مکرم، علمائے کرام، مہمانانِ گرامی، بزرگانِ مجلس اور نوجوان عزیزو!

مجھے جس موضوع پر اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا ہے، وہ ہے ''انجمن نعمانیہ لاہور کا تحریک پاکستان میں حصہ'' ہے۔ اس سے پہلے کہ میں ''انجمن نعمانیہ لاہور'' کے سیاسی کردار اور تحریک پاکستان میں انجمن کے اراکین کے عظیم کارناموں پر گفتگو کروں، میں یہ ضروری خیال کرتا ہوں کہ ''انجمن نعمانیہ لاہور'' کا مختصر سا تعارف کرا دوں تا کہ آزادی وطن کے بعد آنکھ کھولنے والے حضرات کو معلوم ہو سکے کہ لاہور کی اس انجمن نے علوم اسلامیہ کی تدریس اور احیائے ملت کے لیے کتنا اہم کردار ادا کیا تھا۔ ''انجمن نعمانیہ'' آج سے ایک سو پچیس سال قبل یعنی ۱۸۸۶ء میں لاہور میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی اقتدار کے سائے میں عیسائی مشنریوں کی یلغار اور دینی فتنوں کے طوفانوں کے سامنے مسلمانوں کے عقائد کی حفاظت کے لیے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے، جو خالص دینی علوم کی اشاعت میں سرگرم عمل ہو۔ چنانچہ لاہور کے چند دردمند مسلمان آگے بڑھے۔ انہوں نے ''انجمن نعمانیہ'' کی بنیاد رکھی۔ ان بانیوں میں لاہور کے جلیل القدر علمائے کرام اور زعمائے ملت کے نام دکھائی دیتے ہیں۔ انجمن

کے بانیوں میں مولانا محرم علی چشتی، حکیم مفتی سلیم اللہ، نواب گورگانی، مولانا تاج الدین احمد، خلیفہ حمید الدین جیسے اساطین لاہور تھے۔ انجمن کی علمی اشاعت کے لیے ان عظیم الفضل علماء کرام کے نام سامنے آتے ہیں، ان میں مولانا غلام دستگیر قصوری، مولانا غلام اللہ قصوری، مولانا غلام قادر بھیروی، مولانا غلام محمد بگوی، مولانا عبداللہ ٹونکی، مولانا اصغر علی روحی، مولانا غلام احمد جیسے بلند پایہ ارباب علم وفضل کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ (رحمۃ اللہ علیہم)

ان حضرات نے غلامی کے اندھیروں میں بے سروسامانی کے عالم میں ''دارالعلوم نعمانیہ'' کی شمع کو روشن کیا۔ ابتدائی برسوں میں یہ دارالعلوم شاہی مسجد لاہور میں قائم ہوا مگر طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر اس تاریخی مسجد کے قریب ہی ۱۹۱۱ء میں ایک علیحدہ عمارت میں دارالعلوم قائم کیا گیا، جہاں ایک صدی گزرنے کے باوجود ابھی تک یہ تدریسی چشمہ رواں دواں ہے۔ جن دنوں ''انجمن نعمانیہ'' قائم ہوئی تھی، ان دنوں تحریک آزادی وطن یا تحریک پاکستان کا تصور تو موجود نہیں تھا مگر انجمن کے اراکین اور علماء کرام نے اس وقت کی بے دین قوتوں کے نظریات کا مقابلہ کرنے اور مسلمانوں کو دین اسلام سے وابستہ رکھنے کے لیے جو جدوجہد کی اس کے ثمرات بڑے دور رس ہوئے اور آگے چل کر فرزندانِ نعمانیہ نے آزادی وطن اور تحریک پاکستان میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آج ان فرزندانِ نعمانیہ کی فہرست پر نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں تحریک پاکستان میں حصہ لینے والے اکثر علمائے کرام اور سیاست داں نظر آتے ہیں، جو اس درس گاہ کے دسترخوان تعلیم و تربیت سے فیض یاب ہو کر نکلے تھے۔ امیر ملت پیر حافظ جماعت علی شاہ علی پوری، جنہوں نے تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا، اسی درس گاہ کے تربیت یافتہ تھے۔ پیر آف زکوڑی شریف، جنہوں نے سارے صوبہ سرحد میں قائداعظم کی رفاقت کا پرچم بلند رکھا، وہ مادر نعمانیہ کے نامور فرزند تھے۔ پیر آف مانکی شریف، جنہوں نے سارے مغربی قبائل میں تحریک پاکستان کو کامیاب کیا اور تحریک آزادی کشمیر میں قبائل کے ایک لاکھ

مجاہدوں کو میدان جہاد میں لا کھڑا کیا تھا، اسی دارالعلوم کے علمی دستر خوان کے خوشہ چیں
تھے۔ پاکستان کے تخیل کے خالق حضرت علامہ محمد اقبال ''دارالعلوم نعمانیہ'' کے سالانہ
جلسوں کی جان ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان میں دوقومی نظریہ کے ترجمان امام اہل سنت
اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے انجمن نعمانیہ کو اپنے ایسے تربیت
یافتہ علماء کرام مہیا کئے تھے، جن میں ان کے جلیل القدر خلفاء مولانا وصی احمد سورتی، مولانا
ظفر الدین رضوی بہاری، مولانا دیدار علی شاہ الوری رحمۃ اللہ علیہ کے نام ''انجمن نعمانیہ'' کی تاریخ
میں درخشاں نظر آتے ہیں۔

حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ نعمانیہ کے تلامذہ کی صف میں نہیں آتے،
مگر وہ جب لاہور آتے تو اپنا اکثر وقت ان عزیز اساتذہ میں گزارتے، جو نعمانیہ میں
دینی علوم کی تدریس میں مصروف تھے۔ سندھ کے معروف پیر آف بھرچونڈی شریف
جنہوں نے قائداعظم کی قیادت میں تحریک پاکستان میں نمایاں حصہ لیا، اسی ''انجمن
نعمانیہ'' کے تربیت یافتہ تھے۔

مولانا محمد بخش مسلم بی-اے:

تحریک پاکستان میں جن فرزندان نعمانیہ نے بھرپور حصہ لیا، ان میں مولانا محمد بخش
مسلم مرحوم کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ آپ اس زمانے میں دارالعلوم نعمانیہ
میں زیر تعلیم رہے تھے، جب مولانا غلام مرشد مرحوم دارالعلوم کے اساتذہ کی ٹیم میں
تھے۔ مولانا مسلم نے تحریک پاکستان میں بڑا نمایاں کام کیا۔ وہ لوہاری دروازے کے
باہر وسیع باغ میں جہاں ان دنوں مسلم مسجد کھڑی ہے، تحریک پاکستان کے حق میں
زبردست لیکچر دیا کرتے تھے۔ وہ اپنی تقاریر میں اردو، پنجابی اور انگریزی میں یکساں
اظہار خیال کیا کرتے تھے اور اپنے سامعین سے تحریک پاکستان کی اہمیت پر بڑی
جامعیت سے گفتگو کرتے۔ وہ تحریک پاکستان کے دنوں میں سارے پنجاب میں مسلم
لیگ کے جلسوں سے خطاب کرتے۔ بمبئی سے لے کر پشاور تک شاید ہی کوئی ایسا شہر

اور جہاں مولانا محمد بخش مسلم مرحوم کی آواز نہ گونجی ہو۔

آج کی محفل کے صدر نشین مجاہد ملت مولانا عبدالستار خاں صاحب نیازی تحریک
پاکستان کے سرگرم کارکن رہے ہیں۔ وہ قائداعظم کے سپاہی رہے ہیں۔ انہوں نے تحریک
پاکستان میں پرجوش حصہ لیا۔ یہ مجاہد ملت ''انجمن نعمانیہ'' میں کئی سال تک ایڈمنسٹریٹر رہے
ہیں اندریں حالات ہم انہیں ''انجمن نعمانیہ'' کا نامور فرزند تصور کرتے ہیں۔ مولانا عبد
الستار خاں نیازی ''تحریک ختم نبوت'' کے ڈکٹیٹر بنے تو ان کی تقریروں سے مسجد وزیر خان
کے در و دیوار گونج اٹھے تھے۔ ملک کے غدار اس شیر کی دھاڑ کے سامنے لومڑ دکھائی دیتے
تھے۔ تحریک پاکستان کے یہ نامور مجاہد قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پسندیدہ نوجوان تھے۔

''انجمن نعمانیہ'' کے نامور فرزندوں میں سے ایک نوجوان، جس نے تحریک
پاکستان میں شب و روز کام کیا، وہ علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم تھے، جو علوم دینیہ تو
''دارالعلوم نعمانیہ'' سے حاصل کر کے نکلے مگر ترقی کرتے کرتے پنجاب یونیورسٹی کے
وائس چانسلر بنے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، جو ملک کے عظیم دانشور اور دنیائے اردو کے بلند
پایہ ترجمان تھے، جب ہزارہ سے چل کر پہلی بار لاہور آئے تو انہیں دارالعلوم نعمانیہ میں
موذن مقرر کیا گیا۔ موذن ان دنوں ''بانگا'' کہلاتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا غلام
مرشد انہیں اپنے ساتھ سنہری مسجد لاہور میں لے گئے اور وہ ایک عرصہ تک اسی مسجد
میں اذان دیتے رہے۔ ترقی کے زینوں پر قدم رکھتے ہوئے جب سید عبداللہ اورینٹل
کالج کے پرنسپل بنے اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے بورڈ آف ڈائریکٹر کے چیئرمین
بنے تو ان کا نام علمی اور ادبی دنیا میں بڑا بلند پایہ تھا۔ وہ سرکاری ملازمت کی وجہ سے
تحریک پاکستان میں عملی حصہ تو نہ لے سکے لیکن ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ دارالعلوم
نعمانیہ کا ''بانگا'' دنیائے علم و ادب میں روشنیاں پھیلاتا رہا۔ تحریک پاکستان کے
دوران میں نے حضرت محدث کچھوچھوی کو ''دارالعلوم نعمانیہ'' کے سٹیج پر علماء اہلسنّت کو
آزادی وطن کیلئے متحد کرتے پایا۔ حضرت محدث کچھوچھوی کی کوششوں سے جب ۱۹۴۶ء

میں ''بنارس سنی کانفرنس'' منعقد ہوئی تو محدث رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر دارالعلوم کے سارے اساتذہ کانفرنس میں شرکت کے لیے بنارس پہنچے۔

حضرات محترم! اس مختصر سے وقت میں ''انجمن نعمانیہ'' کے کس کس فرزند کا نام لوں، کس کس عالم دین کی خدمات بیان کروں، کس کس دینی رہنما کی یاد تازہ کروں۔ ان علماء کرام نے تحریک پاکستان میں جو اہم کردار ادا کیا، وہ ''انجمن نعمانیہ'' کی تدریسی بساط کا ثمرہ ہے۔ آج پاکستان کی سرزمین پر جب ہم ان لوگوں کو قیادت کے جھنڈے اٹھائے دیکھتے ہیں جو ہندو کانگریس کے کیمپوں کے سامنے ''جے جے نہرو، جے جے رام'' کے نعرے لگایا کرتے تھے تو یہ شعر یاد آتا ہے کہ

نیرنگی سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی، جو شریکِ سفر نہ تھے

میں ایسے نیشنلسٹ علماء کے تذکرہ سے اس پاکیزہ محفل کو افسردہ نہیں بنانا چاہتا مگر اتنا ضرور کہوں گا ''فرزندان نعمانیہ'' نے تحریک پاکستان میں جس پامردی سے حصہ لیا ہے، وہ پاکستان کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ آج اگرچہ یہ عظیم الشان انجمن اپنوں کی بے رخی کی وجہ سے اپنا تاریخی مقام برقرار نہیں رکھ سکی، مگر اس کے درو دیوار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آزادی وطن کے کارواں یہاں سے نکلے تھے۔ تحریک پاکستان کے دینی مجاہد یہاں سے تربیت پا کر آگے بڑھے تھے۔ آزادی وطن کے متوالے یہاں سے ہی علَم آزادی اٹھائے آگے بڑھتے گئے۔ ''دارالعلوم نعمانیہ'' کے درویشوں اور بوریا نشینوں نے باطل کے تاج و تخت کو ہلا کر رکھ دیا۔

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند ـ زشاہاں تاج ستانند و خرقہ بر دوش اند

(''جہانِ رضا''، جنوری، فروری ۱۹۹۶ء)

علماءِ کرام کی یادیں اور اہلِ علم و فضل کی لطیف باتیں

حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ:

مَیں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت تو نہیں کی مگر میرے استاد مکرم شیخ الجامعہ ''جامعہ عباسیہ بہاولپور'' مولانا غلام محمد گھوٹوی اکثر اپنے مرشد پیر آف گولڑہ شریف کی باتیں سنا کر ہمارے دل و دماغ کو تازہ کر دیا کرتے تھے۔ اپنے پیر و مرشد کی باتیں اس انداز سے بیان کرتے کہ آج نصف صدی گزرنے کے باوجود وہ باتیں اور وہ یادیں حاشیۂ دماغ میں ابھی تک محفوظ ہیں۔ آپ ایک دن فرمانے لگے کہ برصغیر میں انگریزی اقتدار کے زیر سایہ بڑے بڑے مشنری پادری مغربی ممالک سے درآمد کیے گئے تا کہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو مغربی روایات میں بدل دیا جائے۔ یہ پادری بڑے پڑھے لکھے ہوتے تھے اور مذاہب عالم کی تاریخ و تمدن سے واقف بھی ہوتے تھے۔ مشنری کالج کا ایک ماہر ریاضی پادری اپنی علمیت کا لوہا منوانے کے لیے ایک دن گولڑہ شریف میں حضرت گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں آ پہنچا اور آپ سے سوال کرنے لگا: ''پیر صاحب! آپ لوگوں کا دعوٰی ہے کہ قرآن پاک میں ہر چیز کا ذکر موجود ہے۔ آپ کے نبی کے نواسے امام حسین اور امام حسن کی زندگیوں میں چھ سات برس تک قرآن نازل ہوتا رہا۔ پھر ان دونوں نواسوں نے اسلام کے لیے قربانیاں بھی دیں اور آج تک ساری امت ''یا حسین! یا حسین!'' پکارتی ہے مگر ان حضرات کا قرآن میں نہ کہیں ذکر ہے، نہ نام و نشان ہے؟'' آپ نے پادری سے دریافت فرمایا: ''آپ نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''مطالعہ بھی کیا ہے اور قرآن کا ایک نسخہ اب بھی میری جیب میں موجود ہے''۔ اس نے جیب سے قرآن نکالا۔ حضرت نے فرمایا: ''پادری

صاحب! اسے کھول کر جہاں سے دل آئے پڑھیں''۔ اس نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھی تو آپ نے فرمایا: ''پادری صاحب! بس قرآن سے آپ نے حضرت حسن اور حسین کا ذکر تو سنا دیا۔ آپ حساب دان ہیں۔ قلم نکالیے اور ایک کاغذ پر لکھیے''۔

امام حسین کے عدد ٢١٠ ہیں۔ آپ کا سنہ پیدائش ۴ ہجری ہے۔ آپ کا سنہ شہادت ٦١ ہجری ہے۔ آپ کی جائے شہادت ''کرب وبلا'' کے ٢٦١ عدد ہیں۔ امام حسن کے اعداد ٢٠٠ ہیں۔ آپ کا سنہ شہادت ٥٠ ہجری ہے اب ان سب کو جمع کریں''۔ پادری نے سب کو جمع کیا تو حاصل جمع ٧٨٦ نکلا۔ پیر صاحب نے فرمایا: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے اعداد ٧٨٦ ہیں۔ آپ قرآن میں امام حسن وحسین کا نام تلاش کرتے تھے۔ اس میں تو ان کی پوری سوانح موجود ہے''۔ آپ نے مجلس میں بیٹھے ہوئے علماء کرام کو مخاطب کر کے فرمایا: ''پادری صاحب نے سارا قرآن پڑھ لیا۔ انہیں حسن وحسین کا نام نہیں ملا۔ ہم نے اپنے استادوں سے صرف بسم اللہ پڑھی تو خاندان نبوت کے حالات زندگی پا لیے''۔ مولانا غلام محمد گھوٹوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''میں نے اس پادری کو اسلام لانے کے بعد حضرت کے پیچھے نماز پڑھتے دیکھا''۔

مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی:

صاحب ''تفسیر نبوی'' بڑے راسخ العقیدہ عالم دین مگر صوفی منش بزرگ تھے اور میرے استاد تھے۔ آپ علم وفن میں حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد بھی تھے اور ''سلسلہ نقشبندیہ'' میں خلیفۂ مجاز بھی۔ آپ کی رحلت کے بعد آپ حضرت لاثانی پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری سے بیعت ہوئے اور خلافت پائی۔ آپ کی ساری عمر عقائدِ باطلہ کے رد میں گزری۔ پندرہ جلدوں میں تفسیر قرآن لکھی۔ آپ نے حافظ ولی اللہ مناظر اسلام نائب خطیب شاہی مسجد کا ایک واقعہ سنایا کہ حافظ ولی اللہ نابینا تھے مگر عیسائی پادریوں سے مناظرہ کرتے تو انہیں شکست فاش سے عاجز کر دیتے۔ انہیں قرآن پاک تو حفظ تھا ہی مگر ساتھ ساتھ انہیں انجیل کے اکثر مقامات

تھے۔ ان دنوں عیسائیوں کا ایک زبردست پادری فادر فاونڈر علمائے اسلام کو مناظرے کے لیے للکارتا اور پنجاب بھر میں مناظرے کرتا۔ ایک بار اس نے علمائے لاہور کو مناظرے کے لیے للکارا اور لاہور میں اسلام اور عیسائیت پر مناظرے کا میدان گرم ہوا۔ سات دن تک مناظرہ ہوتا رہا۔ اس زمانے میں مناظرے ہوتے مگر کوئی فریق اشتعال اور جذبات سے مغلوب نہ ہوتا تھا۔ دونوں نظریات کے مناظر اور سامعین صبر وبرداشت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے اور سکون کے ساتھ دلائل سنا کرتے تھے۔ حافظ ولی اللہ ان دنوں لاہور سے باہر تھے۔ وہ ساتویں دن لاہور آئے تو مناظرے کی جگہ پر جا پہنچے اور پادری فاونڈر کو للکار کر کہا ''میں ہوں حافظ ولی اللہ! اب میں مناظرہ کروں گا''۔ حافظ ولی اللہ کی آواز بڑی گرجدار تھی۔ پادری فاونڈر نے دیکھا کہ ایک اندھا مولوی گرج رہا ہے۔ اس نے حافظ ولی اللہ کو حقیر جانتے ہوئے کہا: ''اس اندھے کو بھی آنے دو!''

حافظ ولی اللہ نے بھرے مجمع میں اعلان کیا کہ جب تک میں اپنے مدمقابل کو اپنی آنکھوں کی بجائے ہاتھوں سے ٹٹول کر جائزہ نہ لے لوں، مناظرہ شروع نہیں کروں گا۔ پادری فاونڈر نے یہ بات منظور کرتے ہوئے حافظ ولی اللہ کو اپنے قریب بلا لیا۔ حافظ صاحب نے پادری کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے ٹٹولا۔ گھنی لمبی داڑھی، سر پر گول کا ہیٹ، گلے میں صلیب کی زنجیر اور بڑا دیوہیکل پادری! حافظ ولی اللہ نے پادری کا چہرہ ٹٹولتے ہوئے اس کی گال پر ایک زوردار طمانچہ مارا جس سے سارا مجمع ہل گیا۔ ایک شور برپا ہو گیا۔ سارے مجمع میں افراتفری کا منظر تھا۔ سٹیج درہم برہم ہو گیا۔ پولیس آگے بڑھی اور حافظ ولی اللہ کو ارادۂ قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ پادری فاونڈر نے ایف۔ آئی۔ آر درج کرائی، اس میں حافظ ولی اللہ کے خلاف ارادۂ قتل کے لیے حملہ، دھوکا دہی اور ایک مذہبی راہنما کو برسرعام طمانچہ مار کر عیسائیوں کے جذبات مجروح کرنے کے الزامات عائد کیے گئے۔

ابتدائی عدالت نے (جس کا مجسٹریٹ ایک مسلمان تھا) فرد جرم عائد کرتے ہوئے
حافظ ولی اللہ کو مختلف جرائم کا مرتکب قرار دیا۔ اب یہ مقدمہ سماعت کے لیے ''سیشن
کورٹ لاہور'' میں گیا، جس کا جج ایک انگریز تھا۔ حافظ ولی اللہ نے اپنے خلاف تمام
الزامات کی تردید کی اور بتایا کہ وہ پادری فاونڈر کو نہ تو قتل کرنا چاہتے تھے نہ دھوکا دینا
چاہتے تھے اور نہ عیسائیوں کی دل آزاری مطلوب تھی۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا
کہ آیا پادری فاونڈر عیسائی بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ انجیل میں لکھا ہوا ہے کہ ''عیسائی وہ
ہوتا ہے جسے اگر ایک گال پر طمانچہ مارا جائے تو وہ دوسرا گال پیش کر دیتا ہے''۔ میں یہ
ٹیسٹ کرنا چاہتا تھا کہ میرا مد مقابل انجیل پر ایمان رکھتا ہے یا نہیں''۔ یہ کہتے ہوئے
حافظ ولی اللہ نے عدالت میں انجیل کے بیس نسخے پیش کیے جن میں یہ بات بلاتحریف
موجود تھی۔ حافظ صاحب نے عدالت کو مزید بتایا کہ فلاں لائبریری میں فلاں مطبع کی
چھپی ہوئی فلاں انجیل موجود ہے۔ اس کے فلاں صفحے پر یہ بات موجود ہے۔ اس
طرح آپ نے چالیس ایسے ایڈیشنوں کی نشاندہی کی، جس کو سن کر جج نے حیران ہو کر
قلم منہ میں دبا لیا کہ ایک نابینا مسلمان عالم اور حافظے کی یہ گہرائی ہے۔ وہ بے حد متاثر
ہوا۔ پادری فاونڈر سے عدالت نے پوچھا کہ آپ انجیل کے اس ارشاد کی روشنی میں
اپنے عیسائی ہونے کا دفاع کن الفاظ میں کریں گے۔ پادری فاونڈر نے عدالت کو بتایا
کہ وہ انجیل کو نہیں جھٹلاتے اور اپنا مقدمہ واپس لیتے ہیں اور اعلان کیا کہ انجیل کے
ارشاد کے مطابق واقعی مجھے چاہیے تھا کہ میں اپنا دوسرا گال پیش کر دیتا۔ آج کے بعد
میں حافظ ولی اللہ سے کبھی مناظرہ نہیں کروں گا۔

تحریف القرآن پر ایک مناظرہ:

میرے والد مکرم اگرچہ پیر تھے مگر وہ علماء کرام کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جہاں
کہیں کسی عالم دین کی آمد کا سنتے ہمہ تن شوق بن کر دست بوسی کے لیے جا پہنچتے اور
نذرانہ پیش کرتے۔ بچپن میں مجھے ان کی وساطت سے کئی عالمان دین کی زیارت کا

موقع ملا۔ ہمارے علاقہ میں ان دنوں اعلان ہوا کہ ''وزیر آباد'' کے مضافات میں شیعہ
سنی مناظرہ ہو رہا ہے۔ دونوں طرف سے بڑے بڑے جید علماء کرام اور مشہور شیعہ
الدین اس مناظرہ میں شریک ہوئے۔ ہزاروں شیعہ سنی سامعین دور دور سے آ کر
اس مناظرہ میں جمع تھے۔ میرے والد بھی اپنے مریدوں کی ایک جماعت لے کر
وزیر آباد پہنچے۔ ان دنوں ایک سنی عالم دین ''باہری والا مولوی'' جس کا اصل نام اب
مجھے یاد نہیں رہا، زبردست مناظر مانا جاتا تھا۔ مناظرہ کا موضوع ''قرآن میں تحریف''
تھا۔ شیعہ علماء کہتے تھے کہ تین خلفاء کے زمانے میں، پھر بنوامیہ نے اپنے زمانہ اقتدار
میں قرآن میں تحریف کر دی تھی اور جہاں جہاں اہل بیت کی تعریف کی آیات تھیں،
انہیں قرآن سے نکال دیا تھا۔ بعض شیعہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ جن آیات قرآنیہ پر
اہل بیت کی تعریف و تحسین تھی، انہیں حضرت عائشہ کی بکری کھا گئی تھی۔ دو دن مناظرہ
کا بازار گرم رہا۔ تیسرے دن ''مولوی باہری والا'' مناظرہ کے مجمع میں آ پہنچا اور سٹیج پر جا
کر مناظرہ کرنے کی اجازت چاہی۔ وہ شیعہ مناظر کے مقابلہ میں اپنے دلائل کے لیے
اٹھتے ہی خطبہ پڑھا اور اس میں ''الحمد لله رب العٰلمین'' کی بجائے ''الحمد
لله ربَ العٰلمین'' ادا کیا۔ شیعہ مجتہد نے ٹوکا۔ سٹیج پر بیٹھے سنی علماء نے بھی مولوی صاحب
کو روکا۔ آپ نے رک کر دوبارہ خطبہ پڑھنے کی اجازت چاہی۔ دوسری بار پھر ''ربِ
العٰلمین'' کی بجائے ''ربَ العٰلمین'' پڑھا۔ اب تو مقابل میں سارے شیعہ مجتہد
اٹھ کھڑے ہوئے۔ سنی علماء بھی بیزار ہوئے کہ ہمارا مناظر کیا کر رہا ہے۔ سارے مجمع
میں شور مچ گیا۔ مولوی صاحب نے لوگوں سے دوبارہ معافی مانگی۔ جب مجمع میں
ٹھہراؤ ہوا تو تیسری بار پھر انہوں نے ربَ العٰلمین پڑھا۔ اب تو لوگوں کی بے چینی کی
انتہا نہ رہی۔ شیعہ علماء کہنے لگے ''اس جاہل مولوی کو بٹھاؤ''۔ سنی علماء بھی سرنگوں ہو
گئے۔ مجمع میں بے زاری کا طوفان برپا ہو گیا۔ اس موقع پر مولوی باہری والا گرجا اور
کہنے لگا: حضرات! آج ہم چودھویں صدی کے لوگ ہیں۔ میں نے قرآن پاک کے

ایک حرف پر زیر کی بجائے زبر پڑھ دی تو سارا مجمع چیخ اٹھا ہے۔ سارے عالم
کر رہے ہیں، سارے شیعہ تڑپ رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں جب خلافت
کے زمانے میں قرآن کے دس سپارے منسوخ کر دیے گئے، جب قرآن
اہل بیت کی تعریف کی آیات ختم کر دی گئی تھیں، جب حضرت عائشہ کی بکری
کی تعریف کا حصہ کھا رہی تھی تو کسی مسلمان کو، کسی صحابی، کسی عاشق رسول اور کسی
بیت کے فرد کو حتیٰ کہ حضرت علی شیر خدا کو آواز اٹھانے کی جرات نہ ہوئی؟
بولے، حسین نہیں بولے۔ بنوامیہ کے زمانے میں امام جعفر صادق نہیں بولے۔
اس گئے گزرے زمانے میں کوئی مسلمان قرآن کے کسی لفظ پر زیر کی بجائے زبر
کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر جن کے سامنے قرآن نازل ہوا تھا، جن کے واسطے
نازل ہوا تھا، جن لوگوں نے اپنے نبی پر قرآن نازل ہوتے دیکھا اور اپنے
زبان سے قرآن سنا، وہ کئی سپارے گم کرنے پر کیوں خاموش رہے؟

مجھے یاد ہے کہ اب مجمع خاموش تھا۔ شیعہ خاموش تھے مگر مولوی باہری والا
رہا تھا۔ مجمع اس کے کنٹرول میں تھا۔ وہ مجمع میں چھایا ہوا تھا۔ وہ قرآن میں تحریف
خلاف دلائل دے رہا تھا۔ تحفظ قرآن پر آیات تلاوت کر رہا تھا، احادیث سنا رہا
اس طرح وہ ایک گھنٹہ تقریر کرتا رہا۔ جب تقریر ختم ہوئی، شیعہ مجتہد اپنی اپنی کتابیں
میں دبائے بھاگ رہے تھے اور عام شیعہ منہ لٹکائے گھروں کو جا رہے تھے۔

یادش بخیر پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان مرحوم بڑے زوردار
اعظم تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ ''رعنا لیاقت علی'' ایک ہندو خاتون تھیں، جس نے اسلام قبول
کر لیا تھا۔ بڑی خوبصورت اور خوش لباس عورت تھی۔ اس نے پاکستانی تہذیب میں
سب سے پہلے ''غرارے'' کو رواج دیا اور اعلیٰ سوسائٹی کی پاکستانی خواتین ''غرارے''
پہن کر سر بازار آنے لگیں۔ رعنا لیاقت علی نے پاکستان میں عورتوں کو پردے سے باہر
لانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آل پاکستان ویمن آرگنائزیشن (اپواء) کی

اگرچہ آگے چل کر جنرل ایوب خان نے اپنی آمریت کے دور اقتدار میں
مسلمان عورتوں کو پردے سے باہر لانے کو رواج دیا اور اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو تو
عورتوں کو پکڑ پکڑ کر پردے سے باہر لائے اور ''ہے ہے جمالو'' کی تان پر پاکستانی
خواتین اپنے گھروں سے باہر نکلیں مگر پاکستان بننے کے بعد سب سے پہلے خواتین کو
بے پردہ کرنے کا سہرا بیگم رعنا لیاقت خان کے سر ہے۔ اس نے لاہور میں آ کر اعلان
کیا کہ وہ اسمبلی ہال کے سامنے پانچ سو خواتین کو غرارے پہنا کر بے پردگی کا مظاہرہ
کریں گی۔ رعنا لیاقت علی خان کے اس اعلان نے ملک کے دینی حلقوں میں اضطراب
اور اضطرار پھیلا دیا۔

ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں:

ان دنوں ابوالنور مولانا محمد بشیر صاحب کوٹلی لوہاراں بڑی زوردار تقریریں کیا
کرتے تھے۔ وہ لاہور پہنچے اور انہوں نے اس اعلان بے پردگی کے خلاف ایک
زبردست احتجاجی جلسہ کیا۔ مولانا محمد بشیر شیخ الحدیث مولانا محمد شریف آف کوٹلی
لوہاراں کے نامور فرزند ارجمند ہیں۔ مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف لاہور سے آج
سے ساٹھ سال پہلے دستار فضیلت لے کر میدان خطابت میں آئے۔ ان کی تقریروں
میں جوش بھی تھا اور خطاب میں بقدر ضرورت مزاح بھی۔ وہ ایک طرف تو عام جلسوں
میں تقریر کرتے اور جلسہ لوٹ لیتے۔ دوسری طرف ان کا خوشگوار قلم ''ماہ طیبہ'' کوٹلی
لوہاراں سیالکوٹ کے کالموں میں گلہائے رنگا رنگ بکھیرتا اور لوگ ان کی تقریر اور تحریر
دونوں کے گرویدہ تھے۔ روزنامہ ''زمیندار'' لاہور میں مزاحیہ کالم عطا محمد چشتی بہ تخلص
''حاجی لق لق'' لکھا کرتے تھے مگر ابوالنور مولانا محمد بشیر صاحب ''ماہ طیبہ'' کے صفحات
پر ''حاجی حق حق'' کے تخلص سے بڑی مزاحیہ نظمیں لکھتے تھے۔

مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں نے اپنی تقریروں کے زور سے سارے پنجاب کو ہی
نہیں، سارے برصغیر کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ خوش آواز تھے، جوش میں تقریر کرتے تو مجمع

پر چھا جاتے۔ ترنم کے ساتھ شعر پڑھتے، دلوں کو موہ لیتے۔ انہوں نے زبان وقلم سے یکساں اسلام کی ترجمانی کی اور اہل سنت کے نظریات کو پھیلایا۔ ان کی بے شمار تقریروں کے علاوہ ان کی نہایت بلند پایہ اور عمدہ کتابیں ''واعظ، الخطبات، الخطیب، عورتوں کی حکایات، شیطان کی حکایات اور مثنوی کی حکایات کے ناموں سے سامنے آئیں۔ آج ساٹھ سال گزرنے کے بعد ہمارے عزیز دوست مولانا ضیاء اللہ قادری صاحب ان کے ماہنامہ ''ماہ طیبہ'' کو سیالکوٹ سے چلا رہے ہیں اور سید اعجاز احمد شاہ مالک ''فرید بک سٹال'' اردو بازار لاہور سے ان کی کتابیں شائع کر رہے ہیں اور ان کا قلمی فیض رواں دواں ہے مگر آج نہ ''حاجی حق حق'' کی مزاحیہ نظمیں اور نہ مولوی بشیر کوٹلی لوہاراں کی للکار سنائی دیتی ہے۔

؎ نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے ''زلف ایاز'' میں

یہی ابوالنور مولانا محمد بشیر صاحب کوٹلی لوہاراں سیالکوٹ سے چل کر لاہور کے جلسے میں آئے۔ اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان خان لیاقت علی خان کی بیگم رعنا لیاقت علی صاحبہ کو جلسہ عام میں للکارا۔ اس کے غرارے پر ایک مزاحیہ نظم سنائی، جس پر لاہوریے لوٹ پوٹ ہوتے گئے۔ پھر پورے دو گھنٹے پردے پر دلائل دیتے گئے۔ میں ان دنوں طالب علم تھا۔ مجھے دلائل کی گہرائیاں تو یاد نہ ہوتی تھیں مگر جب انہوں نے اپنی خاص طرز اور لے میں لاہور والوں کو مخاطب کیا ''توں قصائی دی دکان تے جاناایں! سیر گوشت لیناایں! قصائی تینوں گوشت دیندا اے! اربی دیاں پتیاں وچ چھپا کے دیندا اے۔ فیر توں کاغذ دے لفافے وچ چھپا لیناایں۔ فیر توں کپڑے دے رومال، دستر خوان وچ بن لیناایں۔ اونہوں چھپاناایں۔ اوہ توں انج کیوں کرناایں'' خود ہی گرج کر بتایا ہاں ہاں! اس لیے کہ ایک سیر گوشت کا ٹکڑا ننگا دیکھ کر کوئی کوا نہ جھپٹ پڑے، کوئی چیل نہ جھپٹے، کوئی گدھ نہ چھین لے، کوئی کتا نہ سونگھ لے، کوئی بلا نہ اچھل پڑے۔ مولانا

نے یہ مثال پیش کرنے کے بعد زور سے للکارا ''او لیاقت علی خان ہوش کرو''۔ لاہور کے مسلمان تو بکری کے ایک سیر گوشت کی اتنی حفاظت کرتے ہیں اور پردے میں رکھتے ہیں مگر تمہاری بیگم کی ڈیڑھ من کی لاش اپنی سہیلیوں کو سولہ سنگار کر کے مال روڈ پر مظاہرہ کر رہی ہے۔ کیا ان پر کوئی کوا، کوئی چیل، کوئی کتا، کوئی بلا نہیں جھپٹے گا۔ انہیں پردوں میں رکھو، گھروں میں رکھو! اپنی نظروں کے سامنے رکھو، انہیں حیا میں رکھو! انہیں سنبھالو نہیں تو انہیں کوے چیلیں کھا جائیں گے۔

مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ:

بڑے بلند پایہ عالم دین، خطیب اور مناظر تھے۔ وہ قصور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ پنجاب اور دہلی کے دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی۔ اہل حدیث کے دار العلوم سے سند فضیلت پائی مگر اعتقادی طور پر بڑے پختہ ذہن کے آدمی تھے۔ ان کی تقریریں اردو اور پنجابی میں ہوتیں۔ خاص انداز میں اور میٹھی طرز میں قرآن پڑھتے تو ان کی آواز کانوں میں سماتی جاتی۔ وہ محنت شعار اور شب بیدار عالم دین تھے۔ مجھے ان سے شرف نیاز اس وقت حاصل ہوا، جب وہ اپنی مناظرانہ شہرت کی بلندیوں پر تھے۔ وہ ''حضرت داتا گنج بخش لاہور'' کی مسجد کے جب اعزازی خطیب مقرر ہوئے تو مجھے مولانا محمد بخش مسلم اور مولانا محمد شریف نوری مرحومین کی رفاقت میں مولانا محمد عمر کی مجالس میں بیٹھنے کا زیادہ موقع ملا۔ وہ فن مناظرہ میں بے مثال شخصیت کے مالک تھے۔ طبیعت کے ٹھنڈے، اصول کے پکے، للکار میں شیر، مخالف پر مناظرانہ وار کرنے میں دلیر اور مخالف کا وار سہنے میں بڑا جگرا رکھتے تھے۔ وہابیوں کے صف اول کے مناظر ان کی زد میں ہوتے۔ مولوی عبداللہ روپڑی لاہور، مولوی غلام اللہ خان راولپنڈی، شیعہ مجتہدین اور دوسرے فرقوں کے بڑے بڑے مولوی ان کے سامنے ٹھہر نہ سکتے تھے۔ جہاں کوئی بدعقیدہ مولوی سر اٹھاتا تو آپ وہاں کے لوگوں کی دعوت پر خم ٹھوک کر جا پہنچتے تھے اور مناظرانہ انداز میں انہیں للکارتے۔ انہوں نے مناظرانہ انداز میں ''مقیاس وہابیت، مقیاس

حنفیت، مقیاس خلافت، مقیاس نور، مقیاس صلوۃ اور مقیاس مناظرہ'' جیسی کتابیں لکھیں
مقیاس مناظرہ میں انہوں نے اپنے مناظروں کی روئیداد بھی لکھی ہے اور مخالفین کے
اعتراضات کا جواب بھی لکھا ہے۔

پاکستان میں ایک ایسا دور بھی آیا، جب سنی اور دیوبندی علمائے کرام اعتقادی
موضوعات پر آپس میں الجھ پڑے۔ دونوں طبقوں کے علماء اپنی اپنی تقریروں
تحریروں، جلسوں اور خطبوں میں ایک دوسرے کے خلاف پرجوش بیان بازی کرتے
تقریروں کے علاوہ دونوں طبقوں کے اخبارات، رسالے، میگزین اور کتابیں ایک
دوسرے کے خلاف زبردست مکالمے لکھا کرتے۔ ان دنوں شورش کاشمیری کا ہفت
روزہ ''چٹان'' اس ''جنگ'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ شورش کا قلم ہجونگاری میں
برہنہ شمشیر تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ''سودا کا غنچہ'' اس کے قلم کی نوک پر ناچ رہا ہے
اپنے مخالفین پر زبردست وار کرتا اور اسے اپنے بیگانے سب خریدتے اور پڑھتے
شورش کاشمیری نے ''چٹان'' کے ایک شمارے میں ایک شعلہ بداماں ہجویہ نظم لکھی جس کا
عنوان تھا ''اچھرے کا ابوجہل''۔

نظم کا ایک ایک شعر مولانا اچھروی مرحوم کے خلاف تیغ وسناں بن کر آیا تھا مگر
مولانا بے خبر تھے کہ ان کے خلاف کیا کیا لکھا جا رہا ہے۔ میرے دوست بشیر حسین
صاحب ناظم نے مولانا کو بتایا کہ آج شورش کاشمیری نے آپ کو ''اچھرے کا ابوجہل''
لکھا ہے اور آپ کی ذات پر نظم میں زبردست حملے کیے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ناظم
صاحب کی اس اطلاع پر مولانا اچھروی سٹپٹا جائیں گے مگر مولانا کے چہرے پر
مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اپنے بیٹے عبدالوہاب (جو بعد میں برطانیہ میں جا کر پیر
طریقت کی حیثیت سے مشہور ہوئے) کو بلایا اور جیب سے کچھ پیسے نکال کر دیے اور
کہا! سائیکل پر جاؤ اور ''چٹان'' کے پانچ رسالے لاؤ۔ ہم بھی دیکھیں ''اچھرے کے
ابوجہل'' کیسے ہوتے ہیں! عبدالوہاب رسالے لایا تو مولانا اچھروی نے اپنے عقیدت

مندوں کی بھری محفل میں بشیر حسین صاحب ناظم کو کہا ناظم صاحب شورش نے ہماری
''تعریف'' میں جو کچھ لکھا ہے، اسے پڑھ کر سناؤ! ہم حیران تھے کہ مولانا اپنی ہجو اپنے
عقیدت مندوں کی محفل میں سنانے کا کہہ رہے ہیں۔ تاہم بشیر حسین صاحب ناظم
نے بڑے چٹخارے لے لے کر مولانا کے خلاف نظم بھری محفل میں سنائی۔ مجال ہے
مولانا کے چہرے پر کوئی شکن بھی آیا ہو۔ پھر آپ نے جو لطیفے شورش کاشمیری کی کہی
ہوئی ہجو کے جواب میں سنائے، وہ شنیدنی اور بار بار شنیدنی تھے۔ لطف آ گیا۔ کتنا
ظرف تھا اس شخص کا ''گالیاں کھا کے بدمزہ نہ ہوا''۔

مولانا کو سٹیج پر بیٹھے ہوئے ایک مخالف شیعہ عالم مناظر نے آپ کو دبانے کے لیے
لاؤڈ سپیکر پر پوچھا عمر! ''سنی'' اور ''سور'' میں کیا فرق ہے۔ نہایت ٹھنڈے انداز میں
اپنی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے یہ سنی ہے اور اس کی طرف اشارہ کر کے کہا'' یہ سور
بیٹھا ہوا ہے۔ فرق اور فاصلہ خود ناپ لو''۔ ایک مناظرہ کے دوران ایک شیعہ مناظر
نے بھرے مجمع میں مولانا اچھروی سے سوال کیا ''مولانا! مرغ سنی ہوتا ہے یا شیعہ''؟
آپ نے فرمایا: ''ٹوکرے کے نیچے ہو تو سنی، ٹوکرے سے باہر آ جائے تو مرغیوں کے
جھمگٹے میں ''شیعہ'' بنجاتا ہے اور متعہ کرتا چلا جاتا ہے''۔

مولانا مفتی شجاعت علی قادری مرحوم:

سنیوں کے بلند پایہ مفکر، عالم دین اور فقیہ ہوئے ہیں۔ وہ ترقی کرتے کرتے
''اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان'' کے رکن بنے اور ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے فقہی مسائل
پر صف اول کے مشیر بنے، پھر وفاقی شرعی عدالت کے جج بنے۔ میں نے ''فتاویٰ رضویہ''
کی پانچویں جلد چھپوائی تو آپ نے اس پر ایک بھرپور دیباچہ لکھا جسے اہل علم و فضل نے
بہت سراہا۔ ان کے فقہی مقالات عالم اسلام کے رسائل میں چھپتے اور پسند کیے جاتے
تھے۔ ایک وقت آیا کہ وہ عالمی سطح پر منعقد ہونے والے سیمینارز میں شرکت کرنے کے لیے
مختلف ممالک میں جاتے۔ ایسے ہی ایک سیمینار پر وہ انڈونیشیا گئے ہوئے تھے کہ سفر

میں ہی دل کا شدید دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔

مفتی شجاعت علی قادری مرحوم سے زیادہ شناسائی تو نہ تھی مگر ''بانی مرکزی مجلس رضا''، حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب مدظلہ العالی جب کبھی آپ کو لکھنے کے لیے کہتے تو نہایت خندہ پیشانی سے مجلس کے لیے لکھتے۔ آپ نے کبھی اپنے منصب، علم وفضل اور عالمی اعزازات کو حجاب نہیں بننے دیا۔ مجھے انہوں نے بتایا کہ جنرل ضیاء الحق کے دور اقتدار میں جب تدوین قوانین اسلام کے لیے علماء کرام کی آراء کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تو اسلامی حدود وتعزیرات پر کئی دنوں تک بحث چلتی رہی۔ حنفی فقہ میں چور کا سارا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے جب کہ شیعہ فقہ میں صرف انگلیوں کے پوٹے کاٹے جاتے ہیں۔ شیعہ حضرات کا اصرار تھا کہ تعزیرات کے سلسلہ میں اگر چار کی سزا شیعہ فقہ کی روشنی میں رکھی جائے تو حدود وتعزیرات کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے اور لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ''مقطوع الید'' بھی نظر نہیں آئیں گے۔ مفتی شجاعت علی قادری نے ازراہ تفنن شیعہ علماء کو مخاطب کر کے فرمایا اگر آپ کی تجویز کو قانونی حیثیت مل گئی تو آپ لوگ بدنام ہو جائیں گے۔ کیونکہ سارے معاشرے میں جہاں کہیں انگلی کٹے لوگ نظر آئیں گے تو لوگ کہیں گے کہ پاکستان میں جتنے چور ہیں وہ سب ''شیعہ'' ہیں۔ ان کی انگلیاں کٹی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی سنی چوری کرتا تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا۔ شیعہ عالم دین نے کہا بات تو آپ کی درست ہے چلو اب اکثریتی فقہ پر ہی متفق ہو جاتے ہیں''۔

(''جہانِ رضا'' مارچ ۱۹۹۶ء)

علماء کرام کی یادیں

''خیابان سادات علی پور سیداں'' سیالکوٹ کے گل سرسبد صاحبزادہ سید علی اصغر شاہ علی پوری (رحمۃ اللہ علیہ) جب اپنے استاد مکرم مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی لاہوری کو ملنے آتے تو ان کے ساتھ ایک ابھرتا ہوا نوجوان نعت خوان بھی ہوتا تھا۔ اس نعت خوان کا نام ''محمد یوسف'' تھا۔ سادہ لوح نوجوان سادہ پنجابی میں نعت سناتا اور سادہ دلوں کو موہ لیتا۔ مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد زادہ کے اس نعت خوان سے بڑا پیار کرتے۔ پیرزادوں اور عام مہمانوں سے علیحدہ بلا کر اسے کچھ کھلاتے پلاتے اور جیب میں چاندی کے سکے بھی ڈال دیتے۔ اگرچہ صاحبزادہ علی حسین شاہ علی پوری، صاحبزادہ علی اکبر، صاحبزادہ علی اصغر علی پوری کے ساتھ ملک کے ایک نامور نعت خواں طوطی ہند محمد علی ٹرپٹی مرحوم بھی ہوتے تھے مگر وہ عمر کے آخری دور میں تھے جب کہ محمد یوسف ابھی ابھرتا ہوا نوجوان تھا وہ طلبہ میں بیٹھ کر بلا تکلف نعتیں سنا دیتا تھا۔ ہم محمد علی ٹرپٹی کی نسبت محمد یوسف سے زیادہ مانوس تھے۔ محمد یوسف سیدھا سادہ دیہاتی نعت خوان تھا اور دیہاتی انداز میں نعتیں پڑھتا اور سناتا۔ کئی سال گزر گئے جب محمد یوسف پاکستان کے معروف نعت خوانوں کی صف اول میں کھڑے ہو کر ''محمد یوسف نگینہ'' کے نام سے ابھرا۔

''محمد یوسف نگینہ'' جس دینی جلسہ میں نعت پڑھتا، اہل درد کو لوٹ لیتا۔ لوگ اس کے انداز نعت خوانی کو بے حد پسند کرتے اور بے پناہ داد دیتے۔ عام نعت خوانوں کے رویے کے برعکس محمد یوسف نگینہ علمائے کرام کی تقریروں کو نہایت دلچسپی سے سنتا۔ ان کے علمی نکتوں کو ذہن نشین کرتا اور علماء کرام کی عوام میں بے پناہ مقبولیت دیکھ کر اس کا دل تڑپتا کہ کیوں نہ وہ بھی ایک عالم دین کی حیثیت سے عوام میں اپنا مقام پیدا

کرے۔ چنانچہ اس درویش نعت خوان نے دن رات کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اردو کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ عربی کتابوں کا مطالعہ بھی کرنے لگا۔ صرف مطالعہ نہیں، تفاسیر واحادیث کی مستند اور بڑی بڑی کتابیں اس کے سامنے ہوتیں۔ مجھے یاد نہیں، لیکن جب وہ پہلی بار حج پر گیا تو وہاں سے تفسیر روح المعانی، تفسیر روح البیان، تفسیر در منثور''، تفسیر ابن عباس''، مواہب اللدنیہ'' اور نسیم الریاض جیسی بلند پایہ کتابیں لایا۔ میں ملاقات کے لیے گیا تو ''آب زم زم'' اور ''مدینہ منورہ کی کھجوریں'' عنایت کرنے کی بجائے مجھے یہ علمی خزانے دکھا دکھا کر بے پناہ خوش نظر آیا۔

میں نے پوچھا آپ یہ بلند پایہ کتابیں کیا کریں گے؟ فرمایا: پڑھوں گا۔ میں ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے کہا ''او یار پنجابی نعتیں سنایا کرو، کتابیں اور یوسف نگینہ!'' پھر میں نے دیکھا کہ محمد یوسف نگینہ ان کتابوں کو پڑھنے ڈوب کر مطالعہ کرنے لگا۔ علم وفضل سے اپنے شفاف سینہ کو مالا مال کرنے لگا۔ وہ صرف کتابیں پڑھتا، بلکہ کتابیں کھاتا جاتا، ذہن نشین کرتا جاتا۔ مجھے یوسف نگینہ نے بتایا کہ اس نے دو ہزار عربی کتابوں کا مطالعہ مکمل کر لیا ہے۔ اللہ اللہ! اور میں نے دیکھا ایک نعت خوان عالم دین بن گیا۔ خوش آواز تو تھا ہی، تقریر کرتا، اور میٹھے شعروں کے ساتھ علمی نکتے پیش کرتا جاتا تو یوں محسوس ہوتا کہ موتی بکھیر رہا ہے۔ سامعین کے دل ودماغ پر علمی نگینے جڑ رہا ہے۔ اب وہ یوسف نگینہ نہیں تھا، ایک خوش بیاں، ایک خطیب شیریں لسان اور ایک مقرر ذیشان کی حیثیت سے ملک کے گوشے گوشے میں خطاب کرنے جاتا۔

ایک زمانہ تھا میں ''فیصل آباد'' پہنچا۔ جہاں ایک ضلعی افسر کی حیثیت سے میری تعیناتی ہوئی۔ میں سرکاری رہائش گاہ کی بجائے شیخ الحدیث مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے دست راست مولانا عبدالقادر کے اس مکان میں رہنے لگا، جہاں آپ کو شہید کر دیا گیا تھا۔ یہ مکان مجھے سرکاری مکان کی نسبت اس لیے عزیز تھا کہ اس کے درودیوار میں

شہادت'' کی خوشبو سی بسی تھی۔ پھر درویشوں کا آنا جانا آزادانہ تھا اور میرے ... احمد نوری ان درویشوں کی خدمت کرتے۔ ان دنوں جناح کالونی میں ... مسجد'' کی تعمیر ہو رہی تھی۔ حضرت مولانا قبلہ الحاج محمد یوسف نگینہ اس مسجد ... جاتے اور رات کسی امیر عقیدت مند کی کوٹھی کی بجائے میرے مکان میں ... اور اپنی گفتگو میں اپنے علم وفضل سے مجھے بہت کچھ دیتے۔ وہ فیصل آباد ... بھر اہل علم سے ملتے۔ ''صائم چشتی'' کے ڈیرے پر نعت پر گفتگو فرماتے۔ ... رضویہ'' کے اساتذہ کے ساتھ علمی نکتے بیان کرتے۔ رات کو میرے چوبارے ... جب تک میں جاگتا، گفتگو کرتے۔ جب مجھے نیند دبوچ لیتی تو وہ کھڑے ... نفل پڑھنے لگتے۔ میں نیند کا متوالا جب کروٹ لیتا تو مولانا یوسف نگینہ نفل پڑھتے ... ہچکیاں لے کر رہے ہوتے۔ اگرچہ مجھ جیسے غافل سرکاری افسر کو ان کے نوافل ... سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مگر مجھے رومی کا وہ شعر یاد آتا جو انہوں نے ''صحرائے ... میں مجنوں کی شب بیداری اور آہ وزاری پر کہا تھا:

... نماید نالۂ شبہائے تو   ذوقہا دارم ز ''یارب ہائے'' تو!

... ناشتے پر بیٹھتے تو میں از رہ مذاق کہتا ''یوسف! تم نعت خواں تھے، پھر عالم بنے، ... مقرر بنے۔ اب تم نے شب بیداری سے ولی اللہ بننا شروع کر دیا ہے۔ کہیں ... ہاتھ سے نکل نہ جانا''۔ فرماتے نہیں آپ کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ ایسے لمبے ... والے کو میں چھوڑ نہیں سکتا۔

صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری نے قصور شہر میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام ... قصور کے لوگ اولیاء اللہ کی تربیت کی وجہ سے دینی محبت سے سرشار ہیں۔ میاں ... جمیل احمد صاحب شرقپوری نے بھی قصور پر کافی توجہ دی۔ اس جلسہ میں میرے دوست ... حسین صاحب ناظم، مولانا محمد بخش مسلم مرحوم اور دوسرے علماء کے علاوہ مولانا محمد ... نگینہ بھی تھے۔ صاحبزادہ جمیل احمد صاحب مجھے بھی اس نورانی محفل میں لے

گئے۔ علمائے کرام نے بڑی زبردست تقریریں کیں۔ علماء کرام نے اہل جلسہ کو
بیانات سے خوش کر دیا۔ مولانا الحاج محمد یوسف نگینہ کی باری آئی تو آپ نے حضور نبی
کریم ﷺ کو "عالم ماکان و ما یکون" ثابت کرنے کے لیے دلائل کے انبار لگا دیے۔
کتابوں کے حوالے، اہل علم کے نکتے، پھر معاندین کے اعتراضات کے جواب
انداز سے بیان کیے کہ اہل قصور کو "حضرت نگینہ" نے لوٹ لیا۔ اور لوگ عش عش کرا اٹھے۔

صبح ہوئی، ناشتا پر بیٹھے تو مولانا محمد بخش مسلم مرحوم، مولانا محمد یوسف نگینہ کو "چکر"
دینا چاہتے تھے۔ فرمانے لگے حضرت رات آپ نے حضور کو "عالم ماکان و ما یکون"
کہہ کر علمائے اہل سنت کے نظریے کی نفی کی ہے "ماکان و ما یکون" سے پہلے اور بعد
کے علوم رسول کی نفی کر دی ہے۔ میں نے بھی مسلم صاحب کی تائید کی اور کہا:

"واقعی! کن فیکون تے کل دی گل اے اساں ہورا گیرے جانے ہاں"

پھر بشیر حسین ناظم صاحب نے "مولانا جامی" کے دو اشعار پڑھ کر ثابت کیا کہ
"عالم ماکان و ما یکون" تو واقعی حضور کے علوم کے سمندروں کے سامنے ایک مقام ہے۔
مسلم صاحب نے مزید "علمی چکر" دیئے۔ مولانا محمد یوسف نگینہ مرحوم تو سید ھے سادے
عالم تھے واعظ تھے۔ مناظرانہ اور منطقیانہ بھول بھلیوں سے آشنا نہ تھے۔ گھبرا گئے۔ ہم
نے مزید گھیرا تنگ کیا تو مجلس سے اٹھ کر چلے گئے اور صاحبزادہ جمیل احمد صاحب
شرقپوری کو علیحدگی میں کہنے لگے "یہ عجیب لوگ ہیں۔ رات سارا قصور عش عش کرا اٹھا۔
میرے ساتھی کہتے ہیں کہ میں نے حضور کے علوم کی نفی کی ہے"۔ یہ بات صرف مسلم مرحوم
کی "چکر بازی" کی تھی۔ ورنہ یوسف نگینہ واقعی اہل علم و محبت میں "نگینہ" تھے۔

کچھ وقت اور گزرا تو آپ نے وعظ و بیان کی منزل سے آگے بڑھ کر بیعت
طریقت کی وادی میں قدم رکھا۔ ہزاروں لوگوں کو گناہ کی وادیوں سے نکال کر شریعت
کا پابند بنایا۔ سیکڑوں نوجوانوں کو طریقت و حقیقت کی راہوں سے آشنا کیا۔ وہ ایک
عرصہ تک وسن پورہ لاہور کی جامع مسجد میں صوفی اللہ دتہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس خاص میں رہے۔

دونوں عقیدے کے پکے اور اپنے کام میں سچے تھے۔ ان دونوں حضرات کی علمی،
فکری اور روحانی خدمات نے ایک زمانے کو متاثر کیا۔

مجھے مولانا الحاج محمد یوسف نگینہ رحمۃ اللہ علیہ کے سارے نامور مریدوں کا تو علم نہیں مگر
لاہور میں علامہ محمد منیر یوسفی ایم-اے نے اپنے پیرو مرشد حضرت مولانا محمد یوسف نگینہ کی
علمی اور روحانی جانشینی کا جو حق ادا کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نگینہ کی تربیت
نے کیسے کیسے اہل علم و فضل تیار کیے ہیں۔ مولانا محمد یوسف فیصل آباد کے ایک گاؤں پیلے
گجراں میں پیدا ہوئے۔ وہاں ہی آپ کا مزار مرجع خلائق ہے...... نور اللہ مرقدہ۔

ان کے سوانح حیات محمد محسن منور یوسفی صاحب نے "سیرت نگینہ رسول" عنوان
سے قلم بند کیے ہیں۔ جبکہ ان کے مرید خاص مولانا منیر احمد یوسفی نے بھی ان کی سوانح
عمری بعنوان "یوسف مصر محبت" چھاپ دی ہے۔ (مرتب)

مولانا محمد سعید نقشبندی، خطیب داتا گنج بخش (م: ۸۶-۱۲-۱۷):

مولانا محمد سعید نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سے اس وقت سے نیاز مندی رہی ہے جب وہ
"دار العلوم محمدیہ رضویہ" بھکھی شریف منڈی بہاء الدین سے حضرت سید حافظ حدیث
سید جلال الدین شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ علم و فضل سے دستار فضیلت لے کر لاہور پہنچے۔
"جامع مسجد شاہ محمد غوث" بیرون دہلی دروازہ لاہور کے ایک حجرے میں آپ نے
رہائش اختیار کی تو لاہور کے علماء کرام کا آنا جانا شروع ہوا۔

مولانا محمد سعید نقشبندی مرحوم خود بھی اہل علم و فضل سے ملاقاتیں کرتے اور ان
کے خرمن علم سے خوشہ چینی کرتے۔ وہ ایک محنتی اور متجسس عالم دین تھے۔ جہاں سے
علم کی کرن ملتی، اپنے سینۂ بے کینہ کو منور کرتے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے تدریس کا
سلسلہ شروع کیا۔ کچھ طلبہ ان کے ذاتی حلقہ میں بیٹھتے اور کتابیں پڑھتے مگر بعض
اوقات باقاعدہ دینی مدارس کی مسند ارشاد پر بیٹھ کر اپنے علم کے پھولوں کو بکھیرتے۔
انہوں نے "حزب الاحناف"، جامعہ غوثیہ، نعیمیہ اور جامعہ نظامیہ سے بہت کچھ حاصل

کیا۔ پھر انہیں مدارس میں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ جب محکمہ اوقاف مساجد کو اپنی تحویل میں لیا تو وہ آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی جامع مسجد کے محراب و منبر کو اپنے خطابات سے آباد کرنے لگے۔ لاہور کی مسجد ایک روحانی اور مرکزی مسجد ہے، جہاں سامعین کو دعوت نہیں دینا پڑتی۔ لوگ خود بخود جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ صرف ان حضرات کو سنبھالنا ضروری ہوتا ہے۔ مولانا محمد سعید نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مرکز کو مرکز علم و فضل بنا دیا۔ جمعہ کے خطبہ کے علاوہ آپ داتا کی مسجد میں ''درس قرآن'' دیتے۔ عصر کے بعد ''کشف المحجوب'' کا درس دیتے۔ پھر نقشبندی اور مجددی عالم دین ہونے کی حیثیت سے میانی شریف میں حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ حضرت طاہر بندگی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر ''مکتوبات مجدد الف ثانی'' کا درس دیتے، جہاں مجددی حضرات باقاعدگی سے آتے۔

مولانا محمد سعید تدریسی و تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف میں بڑی ہمت سے کام لیتے تھے۔ آپ نے مجددی ہونے کی نسبت سے ''مکتوبات امام ربانی'' فارسی اپنی نگرانی میں مکتبہ سلمان انارکلی لاہور سے شائع کرائے۔ پھر مکتوبات کا اردو ترجمہ کر کے ''مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی'' سے چھپوایا۔ یہ ترجمہ بے حد مقبول ہوا۔ امام غزالی کی کتاب ''کیمیائے سعادت'' اور ''منہاج العابدین'' کا ترجمہ کیا۔ ''مسلک امام ربانی'' جیسی بلند پایہ کتاب لکھی جس میں حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات اور نظریات کو مسخ کرنے والوں کا جواب تھا۔ آپ نے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''اشعۃ اللمعات'' کا اردو ترجمہ کیا۔ حضرت داتا گنج بخش کی جامع مسجد میں کئی علماء، فضلاء اور خطباء آئے مگر تمام کے تمام وعظ و نصیحت کی ''اپنی اپنی بولیاں بول کر'' اور دانا دنکا چن کر چلے گئے۔ صرف مولانا محمد سعید نقشبندی مرحوم وہ واحد خطیب اور عالم دین تھے، جنہوں نے اپنی علمی یادگاریں چھوڑیں اور اس مسند پر بیٹھ کر علمی فیضان کو عام کیا۔ حضرت داتا گنج بخش کی مسند کو آباد رکھا۔

مولانا محمد سعید نقشبندی مرحوم نے لاہور کی قدیم درسگاہ ''دارالعلوم نعمانیہ لاہور'' میں تدریس و تعلیم کی ذمہ داریاں قبول کیں اور اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ دارالعلوم نعمانیہ کو آباد رکھا اور کئی سال تک اس دارالعلوم کے ''شیخ الجامعہ'' کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ''دارالعلوم نعمانیہ'' کے علاوہ حضرت داتا گنج بخش کے مزار کے سامنے ایک درسگاہ قائم کی، جو آج تک قائم ہے اور آپ کا مزار اسی درسگاہ کے پہلو میں ہے۔ اب دربار کی توسیعات کی وجہ سے آپ کا مزار حضرت داتا گنج بخش کے مزار کے شمال میں منتقل کرایا گیا ہے۔

مولانا محمد سعید نقشبندی نے ''مجددی طریقت'' میں حضرت کیلیانوالہ شریف سے نسبت روحانیت حاصل کی۔ اور ایک مرید باصفا کی حیثیت سے اس درگاہ سے آخری دم تک وابستہ رہے۔ موجودہ دور کی مصروف زندگی اور دوڑ دھوپ کی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد سعید نقشبندی مرحوم کو بڑا سکون اور ثبات بخشا تھا۔ اور ان کی زبان و قلم سے دین کا بڑا کام لیا۔ آپ اپنے ہم عصر علماء میں سے تدریسی اور تالیفی میدان میں سبقت رکھتے ہیں۔ آج کے علمائے کرام خصوصاً ہمارے علمائے اہل سنت جتنی بڑی مسجد کے خطیب مقرر ہوتے ہیں، اتنے ہی بڑے غفلت شعار بن جاتے ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ علمائے کرام کی ایک گمنام ''انجمن غافلاں'' کے رکن ہیں۔ مگر مولانا سعید احمد نقشبندی مرحوم ایک مثالی خطیب، مدرس، معلم اور مصنف تھے۔ ان کا علمی مقام اور تالیفاتی کام اتنا اہم ہے کہ اس پر جس قدر ہدیۂ تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ مگر با ایں علم و فضل وہ مجھ سے بعض مسائل پر گفتگو کرتے، مشورہ لیتے مشورہ دیتے اور اس طرح وہ مجھ جیسے بے بضاعت فقیروں کو بھی اعتماد میں لیتے۔ یہ ان کی علمی عظمت کی دلیل ہے۔

(''جہانِ رضا'' جون، جولائی ۱۹۹۶ء)

علمائے کرام کی یادیں

تیس سال قبل لاہور کی دنیا بڑی پرسکون تھی۔ نہ آج کی طرح شور شرابا تھا نہ ذہنوں کی بے سکونی۔ لوگ دین کی بات بڑی محبت سے سنتے اور علماء کرام کا بے حد احترام کرتے تھے۔ میں اپنے استاد مکرم حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی مولف تفسیر نبوی کی جامع مسجد میں تقریر کیا کرتا تھا۔ میری تقریر میں عالمانہ باریکیاں تو نہ تھیں مگر مجھے یاد ہے کہ جب میں خوش آوازی سے شعر پڑھتا تو لوگ چلتے چلتے رک جاتے اور اس وقت تک رکے رہتے جب تک میری تقریر ختم نہ ہو جاتی۔

صدر المشائخ پیر فضل عثمان فاروقی:

دہلی دروازہ لاہور کے باہر جامع مسجد میں مجھے ''یومِ فاروقِ اعظم'' منانے کا شوق چرایا تو میں نے زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔ میرے احباب ''یوم فاروق اعظم'' کو منفرد اور شایان شان طریقے سے منانا چاہتے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اس اجلاس کی صدارت کوئی ایسا فاروقی (روایتی نہیں) عالم دین یا بزرگ کرے جس کی تقریر سے حضرت فاروق اعظم کی یادیں تازہ ہو جائیں۔ ان دنوں افغانستان کے ایک بزرگ وہاں کی حکومت سے کبیدہ خاطر ہو کر پاکستان میں قیام پذیر تھے۔ ان کا اسم گرامی ''صدر المشائخ پیر فضل عثمان فاروقی مجددی'' (م: ۳-۱۹۷۳-۴-۱۰) تھا۔

میں حضرت مولانا ابو الحسنات قادری، خطیب جامع مسجد وزیر خان لاہور کی وساطت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ''یوم فاروق اعظم'' کی تیاریوں کا تذکرہ کیا ساتھ ہی اپنا ''رشتہ فاروقی'' بیان کیا تو آپ صدارت کے لیے مان گئے۔ یہ میرے لیے ایک بڑا اعزاز تھا۔ مولانا محمد بخش مسلم مرحوم اور مفتی محمد حسین صاحب نعیمی

اور مقررین میں سے تھے۔ مسجد کے فرش کو مخملین غالیچوں سے سجا دیا گیا اور چھت کو برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنا دیا گیا۔ میں نے صاحب صدر سے فارسی میں تقریر کرنے کی استدعا کی۔ خود مرصع فارسی میں سپاسنامہ تیار کیا اور سامعین کی صفوں پر عام لوگ نہیں علماء کرام اور دانشور حضرات نورانی لباس میں جلوہ فرما تھے۔ حضرت پیر فضل عثمان فاروقی نے ''محفل فاروقیہ'' کے اس رنگ ڈھنگ کو دیکھا تو حضرت فاروق اعظم کی بارگاہ میں اس جوش اور ولولے سے ہدیۂ تحسین پیش کیا کہ سامعین جھوم جھوم رہے تھے۔ صدر المشائخ کے اس بیان کی چاشنی اور شیرینی کا سرور آج تک میرے دل و دماغ کو مسرور رکھے ہوئے ہے۔

صدر المشائخ پیر فضل عثمان مجددی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ افغانستان کے ایک جلیل القدر عالم حضرت نور المشائخ مولانا فضل عمر عرف ملا شور بازار (۱۸۵۸-۱۹۵۶) کے فرزند ارجمند تھے۔ ملا شور بازار کابل کے خاندان مجددیہ کے نامور عالم دین تھے۔ جو افغانستان کی دینی اور سیاسی زندگی کے ہر پہلو پر گہری نظر رکھتے تھے۔ پیر فضل عثمان مجددی کابل کے ''مدرسہ مجددیہ'' کے تعلیم یافتہ تھے اور اپنے والد مکرم کی نسبت روحانی کی وجہ سے ''سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ معصومیہ'' کے ترجمان تھے۔

ہندوستان پر تسلط حاصل کرنے کے بعد جب انگریزوں نے افغانستان کو فتح کرنے کے لیے عسکری مہموں کا آغاز کیا۔ تو جن قوتوں نے انگریزوں کی مزاحمت کی ان میں جنوبی افغانستان کے ''تل'' کے مقام پر انگریزوں کے خونخوار دستوں کو شکست دینے والے مجاہدوں میں پیر فضل عثمان مجددی نے مجاہدانہ کردار ادا کیا تھا۔ جب ''بچہ سقہ'' نے غازی امیر امان اللہ خاں کے خلاف بغاوت کی تو پیر فضل عثمان مجددی جنرل غلام نبی کی قیادت میں بچہ سقہ کے لشکروں کے خلاف نبرد آزما رہے۔ بچہ سقہ کے گورنر عطاء محمد نے آپ کو گرفتار کر لیا اور ایک فوجی حکم کے ذریعہ سزائے موت کا اعلان کر دیا۔ ابھی آپ تختہ دار کے منتظر ہی تھے کہ جنرل غلام نبی نے زبردست حملہ کر کے مزار شریف، بلخ اور

ترکستان کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔اس طرح آپ رہا ہو کر تاشقند چلے گئے۔ نادر
نے بچہ سقہ کی حکومت کا تختہ الٹ کر پورے افغانستان پر اپنا اقتدار قائم کرلیا تو آپ
کابل بلا کر وزارت انصاف (عدلیہ) کا رکن مقرر کردیا گیا۔

۱۹۴۸ء میں یہودیوں نے فلسطین کے مسلمانوں کو اپنے گھروں سے نکالنا شروع
کیا تو صدر المشائخ نے اپنے والد کے ساتھ پورے افغانستان کا دورہ کیا اور لاکھوں
روپے جمع کر کے مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی مرحوم کو پیش کرنے کے لیے خود
المقدس پہنچے۔

تحریک خلافت میں آپ نے مولانا محمد علی اور شوکت علی کے ساتھ دوسر
لیڈروں کو افغانستان کے دورے کی دعوت دی۔ آپ تحریک پاکستان کے زبرد
حامی تھے اور جہاد کشمیر میں آپ کے مریدوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ کے مرید
کا وسیع حلقہ افغانستان اور پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بمبئی، کلکتہ، کاٹھیاواڑ
مشرقی پاکستان میں پھیلا ہوا تھا۔ آپ نے اس وقت کے سیاسی حالات کے پیش
پاکستان اور افغانستان کو ایک متحدہ اسلامی قوت بنانے کا منصوبہ پیش کیا اور دوسر
اسلامی ممالک سے اتحاد کے لیے آواز بلند کی۔ پاکستان میں صدر المشائخ پیر فضل عثما
مجددی کی حسین شہید سہروردی، فیروز خان نون کی خارجہ وزارتوں نے بڑی پذیرائی
اور اس وقت کی پاکستانی قیادت نے آپ کی خدمات کی قدر کی۔ آپ پہلے کراچی،
لاہور میں قیام فرما ہوئے۔

مجھے گلبرگ لاہور میں آپ کی قیام گاہ پر حاضری کا وقتاً فوقتاً موقع ملتا رہتا تھا
میں علماء کرام کا دامن پکڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو مجھے ''یوم فاروق اعظم
کی رونق کے حوالے سے قریب بٹھاتے۔ صدر ایوب کے زمانۂ اقتدار تک آپ کی
محفل علماء، مشائخ، سیاست دانوں اور عقیدت مندوں سے بھری رہتی تھی۔ ایوب
خان بھی آپ کی خدمات کا مداح تھا۔

آپ ۱۸ اپریل ۱۹۷۳ء کو لاہور میں فوت ہوئے اور ایک خصوصی چارٹرڈ طیارے
آپ کے جسد خاکی کو کابل پہنچایا گیا۔ اس طیارے میں آپ کے خانوادے
افراد کے علاوہ مرکزی مجلس رضا کے بانی حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری اور
پیر جمیل احمد صاحب شرقپوری بھی کابل پہنچے اور آپ کو خانقاہ عالیہ مجددیہ قلعہ
دفن کردیا گیا۔

فضل عثمان مجددی کی شفقت سے مجھے جو حصہ ملا تھا اس کی وجہ سے آپ کے
فضل الرحمان مجددی رحمۃ اللہ علیہ بھی مجھے نگاہ التفات سے دیکھتے تھے اور جب
افغانستان کے عظیم سیاسی راہنما سابق صدر سلطنت افغانستان پروفیسر صبغۃ اللہ
سے ملاقات کا موقع ملا تو انہوں نے بھی آپ کے تذکرہ سے نوازتے ہوئے
واقعات سنائے۔

مولوی نور محمد ایمن آبادی:

عالم نہیں تھا نہ مدرسہ میں پڑھا نہ مکتب سے کچھ سیکھا۔ وہ ایمن آباد کا سنار
(زرگر) تھا۔ اور اپنے فن میں یکتا تھا وہ سونے چاندی کے زیورات کی تراش خراش
نویلی دلہنوں کو چار چاند لگا دیا کرتا تھا۔ اس خوبصورت فن کے ساتھ ساتھ اسے
علماء کرام کی تقریریں سننے کا بہت شوق تھا۔ جہاں کوئی واعظ شیریں بیان آتا، مولوی
نور محمد ایمن آبادی صف اول میں بیٹھا دکھائی دیتا۔ جہاں کوئی عالم خوش کلام تقریر کرتا،
مولوی نور محمد ایمن آبادی سارا کام چھوڑ چھاڑ کر اس کے سامنے ہوتا۔ تقریریں سن کر گھر
آتا۔ زیورات بناتا تو علمائے کرام کی تقریروں میں سنے ہوئے میٹھے شعروں کو اپنی میٹھی
طرز میں دہراتا۔ اپنے دل کو خوش کرتا اور سننے والوں کو بھی موہ لیتا۔ علماء کرام کی
تقریریں سننے کے ذوق نے اسے یہاں تک پہنچا دیا کہ کئی نویلی نجیلی دلہنیں زیور کے
بغیر ہی ڈولی میں بیٹھ کر روتی روتی پیا کے گھر چلی جاتیں۔

ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے!

کئی بابل تو اپنی ہیر جیسی بیٹیوں کو زیورات کے بغیر ہی ڈولی میں ڈال کر
نور محمد ایمن آبادی کو کوستے۔ جو دوسرے دن ان بابلوں کی گالیاں سننے سے پہلے
ان علماء کرام سے سنے ہوئے اشعار سنا دیتا جن کی تقریروں کے عشق میں اس نے ان
دلہنوں کو زیور کے بغیر ہی سسرال بھیج دیا تھا۔

مولوی نور محمد ایمن آبادی ایک عرصہ تک خوش بیان علمائے کرام کی تقریروں کا
درد اور اپنی خوش آوازی کے ذوق کو اپنے سینہ میں پالتا رہا۔ مگر ایک دن ایک مجلس وعظ
سے واپس آیا تو اس کا جوان سال بیٹا سڑک کے ایک حادثہ کا شکار ہو کر خون میں لت
پت پڑا تھا۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی نے اسے دیکھا تو اس کا سینہ پھٹ گیا۔ اس کی
آنکھوں سے آنسوؤں کی نہریں ابل پڑیں۔ وہ پاگل ہو گیا۔ دیوانہ ہو گیا کہتے ہیں
ایک عرصہ تک وہ جوان بیٹے کی یاد میں دردناک شعر پڑھتا رہا:

؎ سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بہ گویم، شرح دردِ اشتیاق

''وہ کئی سال تک اپنے گم کردہ فرزند کا ماتم کرتا رہا۔ وادی و صحرا کو درد دیتا رہا۔
کوچہ و بازار کو رلاتا رہا۔ جو بھی اس کی دردناک کہانی سنتا، تڑپ اٹھتا''۔

؎ من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفت بدحالاں و خوش حالاں شدم

''کسی ولی اللہ نے اس کے دردمند سینے پر ہاتھ پھیرا تو اسے سکون قلب
ملا۔ اب وہ زرگری چھوڑ کر لوگوں کو واقعات درد سے دمساز بناتا''۔

ایک وقت تھا کہ لاہور کے باغات میں بڑے بڑے بلند پایہ علمائے کرام اپنے
وعظ و بیان سے لاہور کے لوگوں کو خوش کرتے۔ خصوصاً شاہ عالمی دروازے سے لے
کر بھاٹی دروازہ تک کے باغات علماء کرام کی تقریروں سے گونجتے اور سامعین کے
ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے۔ ان دنوں لاہور کے باغ آج کل کی آلائشوں اور تجاوزات
سے محفوظ تھے۔ خوش گوار سبز گھاس اور ٹھنڈے درختوں کے سائے اہل محبت کی
درسگاہیں تھیں۔ لاہور سے ہٹ کر اب دوسرے شہروں کے لوگ بھی ان جلسوں میں

آنے لگے۔ میں نے ان باغوں میں صاحبزادہ سید فیض الحسن آلومہاروی کے بیان کی
قوالیاں سنیں۔ میں نے ان باغوں میں مولانا محمد بخش مسلم بی۔ اے کی انگریزی کے
الفاظ سے مزین اردو تقریریں سنیں۔ میں نے ان باغوں میں مولانا محمد عمر اچھروی کو
سماں باندھتے دیکھا۔ میں نے ان باغوں میں اپنے دوست مولانا محمد شریف نوری کی
خوش آوازی کو سنا۔ میں نے ان باغوں میں مولانا غلام محمد ترنم اور مولانا غلام دین
(اکمل شہید) کو مجمعوں پر چھائے دیکھا۔ اللہ ان علمائے کرام کی قبروں کو نور سے بھرپور
کرے (نور اللہ مرقدہم) ان کی تقریروں کو سن کر لوگ اپنا آپ بھلا جاتے تھے اور
ہزاروں کی تعداد میں ان باغوں میں ڈیرے ڈالے پڑے رہتے تھے۔

مولوی نور محمد ایمن آبادی ان علمائے کرام کے سٹیج پر تو نہ آتے مگر بھاٹی دروازے
کے مغربی باغ میں اپنی مسند وعظ بچھاتے اور گھنٹوں بیان کرتے۔ ان کے سامعین پر
کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جب چاہیں، آئیں اور جب چاہیں چلے جائیں۔ جس طرح
چاہیں بیٹھیں، جس طرح چاہیں لیٹیں مگر مولوی نور محمد ایمن آبادی اپنے بیان اور
خطاب کو جاری رکھتے۔ یہ فری لانسر مجمع اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد مجمع ہوتا تھا۔
مستورات زیادہ ہوتیں۔ لاہور کی یہ خواتین بلا تکلف چادریں اوڑھے آتیں، وعظ
سنتیں۔ انہیں وعظ کے دوران گھر کے لیے سبزیاں بنانے، سویٹر بننے، سوتر کی الجھنیں
دور کرنے، حتیٰ کہ بچوں کو دودھ پلانے کی کھلی آزادی تھی۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی
اپنی میٹھی آواز میں ''ہرنی کا قصہ'' سناتے۔ ''جابر کے فرزندوں کی قربانی'' کے واقعات
سناتے۔ مدینہ کے سفر پر جانے والے کبوتروں کی اڑانوں پر روشنی ڈالتے۔ حضرت
بلال کے درد کو اپنی درد بھری تقریر میں شامل کرتے۔ حضرت اویس قرنی کے عشق کو اپنی
تقریر کا موضوع بناتے اور جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹے حضرت یوسف
کے فراق میں تڑپنے کا بیان کرتے تو انہیں اپنا جوان بیٹا یاد آ جاتا تو مجمع کو رلا دیتے۔

ایک ایسا دور آیا کہ پاکستان میں ''اسلامی سوشلزم'' کا دور دورہ ہوا۔ ذوالفقار

علی بھٹو نے بڑے بڑے کارخانے نیشنلائز کر لیے۔ بڑی بڑی ملیں پیپلز پارٹی کے جیالوں کے قبضے میں آگئیں۔ کل کے کنگلے آج کے رئیس بن گئے۔ یہ وبا اس قدر عام ہوگئی کہ منڈیاں اور بازار تک نیشنلائز ہونے لگے۔ مولوی ایمن آبادی کے ایک عزیز کی دکان پر جیالوں نے یہ کہہ کر قبضہ کر لیا کہ یہ زرگر ہے، سنار ہے، زرفروش ہے اور سونے کا ذخیرہ اندوز ہے۔ اس بات نے مولوی نور محمد ایمن آبادی کی طبیعت پر بھی اثر ڈالا۔ وہ کھلے بندوں اس ظلم کے خلاف آواز تو نہ اٹھا سکتے تھے مگر ان کے پاس ایک ایسا فورم تھا جس پر کھڑے ہو کر اپنا مدعا بیان کر سکتے تھے۔ وہ بھاٹی دروازے کے باہر میں بڑے درد سے کہتے:

گھگّی بیٹھی وِچہ وظیفے لُٹ کھادا گھر کانواں!

وہ اس شعر کی یوں وضاحت فرماتے گھگّی (فاختہ) سے مراد پاکستانی بے بس عوام ہیں جو بے بسی کے عالم (وظیفے) میں بیٹھتے ہیں اور کوؤں (پیپلز پارٹی کے شکروں) نے ملک کو لوٹ لیا ہے۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی اس موضوع کی وضاحت کرتے تو حاضرین کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ فاختہ، کوؤں اور وظیفے کی بڑے لطیف انداز میں وضاحت کرتے۔ اس مصرع کو وہ کئی کئی بار سناتے اور ہر بات پر نئی تشریح فرماتے۔ جب وہ دوسرا مصرع پڑھتے کہ

باز عقاب اڈن جس ویلے پُت نہ سانبھن ماواں!

ان ظالمانہ حالات کے ردعمل میں جب ''باز اور ''عقاب'' پرواز کریں گے تو مائیں اپنے جگر گوشوں کو بھول جائیں گی۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی کی آواز سن کر مجمع میں بیٹھی ہوئی عورتیں اپنے بچوں کو سینے سے بھینچ لیتیں اور کہتیں ''دیکھو مولوی باز اور عقاب اڑا رہا ہے''۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی کے یہ اشعار تو درد والم کی داستان کو پیش کر رہے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چند دنوں بعد جنرل ضیاء الحق بڑی بڑی مونچھیں سجائے ''باز'' اور ''عقاب'' بن کر ٹیلی ویژن پر آئے تو واقعی جیالوں کی مائیں اپنے

...کو کبھی نہ سنبھال سکیں۔

مولوی نور محمد ایمن آبادی کی درد بھری آواز اور خوش آوازی نے شاید ان کے غم ...اوں یا نہیں مگر وہ عوام میں درد و غم بکھیرتے گئے اور ساری عمر اہل درد کو ہمدرد ...رہے۔ ان کی میٹھی آواز کو ریڈیو کے ایک افسر نے سنا تو مولوی نور محمد ایمن آبادی کو ریڈیو پاکستان لے گیا۔ وہ ایک عرصہ تک ریڈیو پاکستان سے بھی اپنے درد ...بھرے نغمے فضا میں بکھیرتے رہے۔ (برد اللہ مرقدہ)

(''جہانِ رضا'' ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۶ء)

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ

صاحبِ تفسیر نبوی (م: ۱۹۴۴ء)

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ لاہور کے ان علماء کرام میں ... ہوتے ہیں جنہوں نے بیسویں صدی عیسوی میں دینی اور اسلامی اقدار کی نشو ونما ... بھرپور حصہ لیا اور ساری زندگی علم وعرفان کی خدمت میں صرف کر دی۔ آپ لا... کے قدیم آرائیں خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ شہری اور زرعی جائیداد کے ما... تھے۔ والد کا اسم گرامی میاں محمد وارث تھا۔ آپ کا سنہ ولادت ۱۸۵۰ء ہے مگر تذ... علمائے اہلسنت لاہور میں آپ کا سنہ ولادت ۱۸۶۰ لکھا ہے اور آپ کا سنہ وصال ۱۹۴۴ء ہے۔ آپ کے والد میاں محمد وارث اپنے والد مکرم میاں الٰہی بخش المعرو... میاں بالیا کی زرعی زمینوں کے نگران تھے۔ ان زمینوں میں کھیتی باڑی کے لیے حضر... مولف علّام کے بڑے بھائی میاں قادر بخش ہی اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

آپ کا آبائی گھر اور جائے پیدائش اکبری منڈی اندرون دہلی دروازہ میں ا... تک اصلی حالت میں موجود ہے۔ یہ محلّہ لاہور کے آرائیں خاندانوں کا مشہور محلّہ مولا... کہلاتا تھا جہاں آرائیں قبیلے کے اشراف قیام پذیر تھے۔

آپ کے والدین نے آپ کو اپنے محلّہ میں ایک ''حلوائی'' کی شاگردی میں دے دیا، جہاں آپ نے اپنی ابتدائی زندگی کا قیمتی حصہ گزارا، اور اپنے استاد گرامی کی نگرانی میں حلوائی اور حلوہ سازی کے تمام امور میں مہارت حاصل کی۔ مولانا حلوائی کے استاد گرامی بڑے نیک سیرت اور صالح آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے شاگرد رشید کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ کام کے ساتھ ساتھ قریبی مسجد میں قرآن مجید پڑھیں۔

...آپ قرآن مجید ناظرہ ختم کر چکے تو ایک دینی مکتب میں ابتدائی کتابیں پڑھنے کی ...اجازت دی۔ آپ حلوائی کی دکان میں اپنے کام کے ساتھ ساتھ مکتب عربیہ میں بڑی ...آسانی سے اسباق پر عبور حاصل کرتے گئے اور ابتدائی صرف ونحو اور دوسری دینی ...کتابوں کو ازبر کرتے گئے۔

...حاصل مؤلف مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ سن شعور کو پہنچے تو آپ نے اپنے ...گھر کے قریب ہی تکیہ سادھواں کے ''مدرسہ غوثیہ'' میں دینی کتابوں کی تعلیم حاصل کرنا ...شروع کی۔ اس مدرسہ کے ناظم و مہتمم کشمیر کے ایک بزرگ پیر عبدالغفار شاہ قادری ...کشمیری رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو شیخ طریقت بھی تھے اور معلم علوم دینیہ بھی تھے۔ مولانا حلوائی ...نے اس مدرسہ میں دینی علوم کے مختلف مراحل طے کیے اور ساتھ ساتھ اپنے استاد مکرم ...پیر عبدالغفار شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی مجالس میں بھی شریک ہو کر عرفان وتصوف ...کے ابتدائی رموز سے واقفیت حاصل کی۔

علامہ حلوائی سرخ وسفید رنگت کے مالک تھے، میانہ قد اور خوبصورت متوازن ...اجسام سے متصف تھے۔ آپ لاہور کے آرائیں خانوادہ کا معروف لباس زیب تن ...کرتے اور مروجہ عالمانہ جبہ ودستار سے اجتناب فرماتے۔ آپ کے سر پر عمامہ سجتا، ...جس کے نیچے سفید ٹوپی ہوتی اور بدن پر کھلے گلے اور ڈھیلے بازوؤں والی سفید قمیص ...ہوتی۔ جسے آج کے الفاظ میں کھلا کرتہ کہا جا سکتا ہے، لباس سفید براق ہوتا۔ کھدر اور ...کے لباس کو زیادہ ترجیح دیتے۔ آپ اپنے پاؤں میں ''گاے شاہی'' جوتا جو سرخ ...چمڑے سے بنا ہوتا پہنتے۔ بڑھاپے میں ریش مبارک کو رنگ حنا سے مزین فرماتے مگر ...زندگی کے آخری ایام میں ریش حنائی کی بجائے چہرے پر سفید داڑھی سجنے لگی۔

اپنی عادات واطوار کے لحاظ سے حضرت علامہ حلوائی رحمۃ اللہ علیہ لاہور کی ایک مقتدر ...شخصیت کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ وہ عام علماء کرام کی بود وباش ...سے ہٹ کر ایک کارکن اور کاسب کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ دن بھر کام

کرتے، رات علماء اور صوفیہ کی مجالس میں بیٹھتے۔ اس طرح آپ ''ہم دنیا و ہم دین''
کی مصروفیتوں میں مصروف رہتے۔ آپ اپنے ہمعصر علماء میں ممتاز عالم دین کی
حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ عمر کے آخری پندرہ سال آپ نے اپنا کاروبار ترک
کر کے صرف اور صرف دینی اور علمی مشاغل کو اپنا لیا تھا۔ اپنی شبانہ روز محنت سے حاصل
کی کمائی ہوئی دولت سے دہلی دروازے کے باہر کوتوالی کی شمالی دیوار کے ساتھ ایک
منزلہ مسجد بنائی جس کے پہلو میں حجرے تعمیر کروائے، جنوبی حجروں میں آپ کے شاگرد
رہتے تھے اور شمالی حجروں میں آپ زندگی کے آخری ایام تک بذاتِ خود رہائش پذیر
رہے اور آپ کا شعبہ تصنیف و تالیف انہیں حجروں میں قائم تھا۔ یہ دو منزلہ مسجد آپ
کے شاگردوں اور زیرِ تربیت سالکوں سے ہمیشہ آباد رہتی تھی۔ آپ وقت کے جید علماء
دین کے پاس خود جاتے، دینی حلقوں میں حاضری دیتے، اگر کوئی شیخِ طریقت آتا تو
ہمہ تن ادب بن کر ان کی مجلس میں حاضری دیتے۔

آپ کا یہ معمول تھا کہ نمازِ جمعہ کے بعد اپنی مسجد میں بیٹھ جاتے، احباب کی محفل
ہوتی، لوگ مختلف مسائل پر گفتگو کرتے اور آپ ان پر روشنی ڈالتے۔ آپ کی محفل میں
خصوصی طور پر اعتقادی معاملات پر گفتگو ہوتی اور آپ اہلسنّت و جماعت کا نقطہ نظر پیش
کرتے اور لوگوں کی اعتقادی صورت حال کی اصلاح کے لیے بڑی دلچسپی لیتے تھے۔

آپ اپنے وقت کے جید عالم دین اور امام اجل تھے۔ بدعقیدہ علماء کے پراپیگنڈہ
کا جواب دیتے۔ معاندین کی تحریروں کا جواب تحریر سے دیتے۔ ان کی کتابوں کا رد
کتابوں سے کرتے۔ آپ نے غیر مقلد عالم دین حافظ محمد لکھنوی کی ''تفسیر محمدی'' کی بے
راہ رویوں اور بداعتقادیوں کو اپنی ''تفسیر نبوی'' کے علمی مباحث سے رد کیا۔

آپ کی روحانی زندگی کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ آپ سحری کے وقت نمازِ تہجد
سے فارغ ہو کر صبح کی نماز تک مسجد کے فرش پر بیٹھ کر بارگاہِ رسالت ﷺ میں درود
شریف کا نذرانہ پیش کرتے۔ صبح ہوتی تو اپنے شاگردوں کے حلقہ میں بیٹھ کر ہزاروں

بار درود پاک پڑھتے اور پڑھاتے۔ پھر تلاوت قرآن پاک اور دوسری کتابوں کی
تدریس فرماتے۔ آپ کے تلامذہ، شاگرد اور مسجد کے نمازی آپ کے ان معمولات
سے استفادہ کرتے۔ دن بھر تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے اور نماز ظہر کے بعد عام
لوگوں میں بیٹھ کر مسائل دینیہ پر گفتگو فرماتے۔ نمازِ عصر کے بعد چند مخصوص احباب
کے ساتھ بیٹھ کر ختم خواجگان پڑھتے۔ ختم خواجگان میں سترہ آدمیوں سے زیادہ آدمی
شرکت نہیں کیا کرتے تھے اور آپ کا یہ معمول زندگی بھر رہا۔ آپ نے حلوائی کی
دکانداری میں زندگی کا اکثر حصہ بسر کیا۔ دودھ دہی کی تیاری کے علاوہ آپ حلوہ کا
خصوصی دیگچہ تیار کرتے جس سے دور دور سے آنے والے گاہک اپنا حصہ لیتے۔ ان
گاہکوں میں سے اکثر ایسے حضرات بھی تھے جو حلوہ کھانے کے ساتھ ساتھ آپ سے
دینی مسائل کا حل بھی دریافت کرتے تھے۔

آپ کے تذکرہ نویسوں نے مدرسہ غوثیہ پیر عبدالغفار شاہ قادری الکاشمیری رحمۃ اللہ علیہ
کے علاوہ آپ کو مدرسہ فتحیہ اچھرہ کا شاگرد بھی بتایا ہے اور آپ کے اساتذہ میں مولانا
غلام قادر بھیروی خطیب بیگم شاہی مسجد، مولانا معوان حسین خطیب بادشاہی مسجد، مولانا
غلام دستگیر قصوری خلیفہ خواجہ غلام محی الدین قصوری دائم الحضوری اور دوسرے علماء کے نام
لکھے ہیں۔ مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ آپ کے نہ صرف استاد بلکہ پیر و مرشد بھی
تھے۔ ان اہلِ علم کے علاوہ آپ نے دوسرے سنی معاصر علماء سے بھی اکتساب علم کیا۔

آپ ساری زندگی بدعقیدہ علماء سے برسرِ پیکار رہے مگر علمائے اہلسنّت و جماعت
سے کبھی اختلاف نہیں کیا اور آپ ہمیشہ عام سنیوں سے بھی محبت اور شفقت سے پیش
آتے۔ وہ رافضی، قادیانی، وہابی، دیوبندی، نیچری اور دوسرے بدعقیدہ علماء پر تنقید
کرتے رہتے اور اپنے عقیدہ کی اشاعت میں سرگرم رہتے۔ وہ عقیدہ میں متزلزل اور
مختلف عقائد کی مجالس میں حصہ لینے والے سنی علماء کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور انہیں
مذبذبین کہا کرتے۔ آپ غربا، مساکین، طلبہ اور یتامیٰ پر ہمیشہ مہربانی فرماتے اور

اپنی شب و روز کی کمائی کا زیادہ حصہ ایسے لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا
آپ کا مدرسہ بے سہارا طلبہ، یتیموں و مساکین کے لیے جائے پناہ تھا۔ یہاں
انہیں طعام و قیام کے علاوہ شفقت و محبت کی دولت بھی ملتی تھی۔

آپ زندگی کے ستر (۷۰) سال مکمل کر چکے تو آپ کی نگاہ کمزور ہوگئی۔ پھر
میں تکلیف ہوگئی جس کی وجہ سے آپ یکم نومبر ۱۹۴۴ء مطابق ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۶۳ھ
واصل بحق ہوئے اور اپنی مسجد کے ایک حجرے میں ہی آسودہ خاک ہوئے۔

شدیم خاک و لیکن زبوئے تربت ما
تواں شناخت کہ زیں خاک مردمی خیزد

آپ کا مزار مبارک آج بھی مرجع علماء و اساتذہ ہے۔

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے کاروبار زندگی کے
ساتھ ساتھ علوم متداولہ دینیہ کے حصول کے لیے بڑی محنت کی اور لاہور کی معروف
دینی درسگاہوں کے قابل اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے مختلف اصناف
علوم پر عبور حاصل کیا۔ آپ نے عربی میں علم صرف، نحو، منطق، معانی، فقہ، اصول
تجوید میں مہارت حاصل کرنے کے بعد احادیث نبوی اور تفاسیر قرآن پاک کا
وسیع مطالعہ کیا۔ آپ کے استاد مکرم مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم نعمانیہ
لاہور کے بانی اساتذہ میں سے تھے۔ اس لیے آپ نے دارالعلوم نعمانیہ لاہور سے علم
حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم فتحیہ اچھرہ میں داخلہ لیا۔ اگرچہ ہمیں آپ کے تمام
اساتذہ کے اسمائے گرامی نہیں ملے تاہم آپ کی تحریروں میں پیر عبدالغفار شاہ قادری
کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مدرسہ غوثیہ تکیہ سادھواں اندرون کشمیری بازار لاہور کا نام نمایاں
نظر آتا ہے۔ انہی دنوں انجمن نعمانیہ لاہور نے موچی دروازہ کے اندر جامع مسجد بکن
خان لاہور اور عالمگیری مسجد لاہور میں دینی مدارس قائم کیے تو مولانا ''حلوائی'' مسجد
بکن خان کے مدرسہ میں بھی زیر تعلیم رہے۔ یہ انجمن نعمانیہ کے دارالعلوم کا وہ شعبہ

جہاں حضرت پیر حافظ جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ اور پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی
بھی زیر تعلیم رہے۔ دارالعلوم غوثیہ مسجد تکیہ سادھواں لاہور میں حضرت مولانا
حلوائی جنوری ۱۹۱۵ء میں زیر تعلیم تھے۔ ان دنوں وہاں وقت کے جلیل القدر معلم اور
فرائض تدریس سر انجام دے رہے تھے۔ مولانا احمد علی بٹالوی، مولانا نور بخش
توکلی، مولانا اصغر علی روحی، مولانا تاج الدین قادری، مولانا محمد الشاہ میر الواعظ جیسے
اساتذہ کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ آپ نے اس دارالعلوم کی تعریف میں اپنی مشہور
کتاب ''شفاء القلوب فی الذکر المحبوب'' میں ایک طویل نظم لکھی ہے۔

کشمیروں تشریف لیایا وچہ لاہور شہر دے
اہلسنّت نوں خوشیاں ہویاں بنے غلام نظر دے

رستے پاون والا آیا نور کھنڈاون والا
''عبد غفار'' ہے نانواں روشن رب ملاون والا

لطف عنایت رب دی ہوئی میںنوں عبد غفاروں
میرے اوپر کرم کماندے نال ہزار پیاروں

میں بھی عاجز اوسے در دا عاجز اک گدائی
''نبی بخش'' ہے ناںواں میرا المشہور ''حلوائی''

دل جانوں شاگرد ایناں دا عاجز ہے حلوائی
صاحبزادہ اک حضرت دا ہے اوہ بھی صالح بھائی

مولانا غلام قادری بھیروی رحمۃ اللہ علیہ (م:۹-۱۹۰۹-۴-۱۰):

مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے نامور اساتذہ میں سے تھے۔ آپ بھیرہ
(سرگودھا) میں ۱۲۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ آپ لاہور آئے تو مولانا غلام محی الدین بگوی

اور مولانا احمد دین بگوی کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی چلے گئے جہاں
آپ نے مولانا صدر الدین آزردہ کے دار العلوم سے تکمیل علوم کی۔ لاہور میں آپ
اورینٹل کالج میں عربی استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور ۱۸۹۷ء تک اورینٹل
کالج میں پڑھاتے رہے۔

حضرت مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ روحانی طور پر سلسلہ چشتیہ سیالویہ میں خواجہ
شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ آپ بڑے راسخ العقیدہ سنی عالم
دین تھے۔ عقیدہ کے معاملہ میں کسی سے رو رعایت نہیں برتتے تھے۔ آپ نہ غلط فتویٰ
دیتے اور نہ بداعتقادی پر کسی قسم کی رعایت برتتے تھے۔ انہوں نے اورینٹل کالج سے
صرف اس بات پر استعفادے دیا تھا کہ انگریز کے کہنے پر غیر اسلامی معاملات پر وہ جواز
کا فتویٰ نہیں دیں گے۔ آپ اورینٹل کالج سے مستعفی ہونے کے بعد دار العلوم نعمانیہ
میں استاد مقرر ہوئے، پھر بیگم شاہی مسجد لاہور میں مستقل خطیب اور نگران مقرر ہو گئے۔

حضرت مولانا بھیروی رحمۃ اللہ علیہ تدریس و خطابت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف
میں بھی مشغول رہے۔ آپ نے اسلام کی دس جلدوں کے علاوہ شمس الضحیٰ، عکازہ اشراق
الصمدیہ، النور الربانی، جوہر ایمانی، شمس الحنفیہ جیسی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔ آپ
سے ہمارے مؤلف علام مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے علمی اور اعتقادی طور پر بھرپور
استفادہ کیا۔ آپ نے ۱۳۲۸ھ میں وصال فرمایا۔ آپ کے ایک اور شاگرد مولانا محمد عالم
آسی امرتسری نے ''در خلد بریں رفت قبلہ من'' سے تاریخ وفات نکالی ہے۔

مولانا غلام محمد بگوی (م: ۱۹۰۰-۹-۳۰):

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی کے جلیل القدر اساتذہ میں سے مفتی غلام محمد
بگوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مولانا بگوی انجمن اسلامیہ لاہور کے زیر اہتمام
آنے کے بعد عالمگیری شاہی مسجد لاہور کے پہلے خطیب تھے۔ آپ نے اس شاندار
مسجد کو علم و فضل کا مرکز بنا دیا اور شبانہ روز محنت سے نصف صدی بند رہنے والی مسجد کو از

سر نو رونق و شباب تازہ سے ہمکنار کر دیا۔ آپ لاہور کے قدیم اساتذہ میں سے تھے۔
آپ کے حلقۂ تدریس سے مولانا محمد نبی بخش حلوائی کے علاوہ مولانا غلام قادر بھیروی،
مولانا محمد ذاکر بگوی، پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور، مولانا محمد عالم آسی امرتسری، مولانا غلام دستگیر
قصوری رحمۃ اللہ علیہ جیسے برگزیدہ علمائے کرام خوشہ چینی کرتے رہے۔ آپ کے دو عالم و فاضل
بیٹے مولانا محمد رفیق بگوی اور مولانا محمد شفیق بگوی خطیب شاہی مسجد لاہور صدقہ جاریہ کی
حیثیت سے ایک عرصہ تک دینی علوم کی اشاعت میں مصروف رہے۔

مولانا معوان حسین مجددی:

پنجاب کے ان علمائے کرام کے علاوہ رامپور (ہندوستان) کے علمی اور روحانی
خانوادہ کے ایک عالم دین حضرت مولانا معوان حسین رامپوری خطیب شاہی مسجد لاہور،
لاہور میں تشریف لائے تو فاضل مؤلف مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی
شاگردی بھی اختیار کی۔ مولانا معوان حسین رامپوری رحمۃ اللہ علیہ مولانا ارشاد حسین رامپوری
رحمۃ اللہ علیہ کے نامور فرزند تھے۔ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے، اپنے گرامی قدر والد سے تعلیم حاصل
کرنے کے بعد مولانا سلامت اللہ رامپوری اور مولانا عبد الغفار خان رامپوری سے مروجہ
علوم میں تکمیل کی۔ مولانا معوان حسین رامپوری اپنے والد کے علاوہ مولانا عنایت اللہ
خان سے بیعت تھے۔ آپ نے مدرسہ ''الارشادیہ'' کے نام سے ایک تدریسی شعبہ
قائم کیا جو سیکڑوں طلبائے علم کی تشنگی کا سامان بنا۔ مولانا معوان حسین رامپوری رحمۃ اللہ علیہ
دار العلوم نعمانیہ لاہور جو ان دنوں شاہی مسجد میں قائم تھا، کے سالانہ جلسہ میں تقریر
کرنے آئے تو انجمن اسلامیہ لاہور نے آپ کو شاہی مسجد کا خطیب مقرر کر دیا۔

حضرت علامہ حلوائی رحمۃ اللہ علیہ علوم شریعت کے ساتھ ساتھ روحانی منازل طے
کرنے میں اپنے معاصرین میں صف اول پر تھے۔ آپ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ
میں حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ خلیفۂ مجاز، دائم الحضوری حضرت مولانا غلام
محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز تھے۔ آپ نے اپنی تصنیف ''تحصیل العرفان

فی آداب المشائخ والاخوان'' میں سلوک وطریقت پر بڑی مفید باتیں کی ہیں۔ آپ
تصوف کو ذکرِ الٰہی اور اطاعت رسول ﷺ کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ آپ ان صوفیا
خام پر سخت تنقید کرتے تھے جو مزامیر، ساز ورنگ اور رقص وسرود کو اپنی مجالس ذکر میں
روا رکھتے تھے۔ آپ کے نزدیک وہ صوفیائے خام قابل مذمت تھے جو عوام کو دھوکہ
دینے کیلئے لباسِ فقر اختیار کرتے تھے۔ آپ اپنے پیرومرشد شیخ مولانا غلام دستگیر
قصوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد پنجاب کے بلند پایہ شیخ طریقت پیر سید جماعت علی
شاہ لاثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ اگرچہ آپ ابتدائی طور پر اپنے
استاد پیر عبدالغفار شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ سے قادریہ سلوک میں استفادہ کر چکے تھے۔ مگر
سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے مراحل روحانیت طے کرنے میں مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ
اور حضرت سید پیر جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے زیرِ تربیت رہ کر بھرپور استفادہ
کیا۔ معمولات نقشبندیہ پر ساری زندگی کاربند رہے۔ پھر ایسے سالکان طریقہ
نقشبندیہ مجددیہ کو تربیت دی جن سے یہ سلسلہ عالیہ چشمے کی طرح جاری وساری رہا۔
آپ کے زیرِ تربیت سالکان کی ایک خاصی تعداد پاکستان اور ہندوستان کے مختلف
خطوں میں سلوک مجددیہ کی اشاعت میں سرگرم رہی، خصوصاً ریاست جموں وکشمیر اور
گجرات میں آپ کے مریدوں کا ایک سلسلہ وسیع پیمانے پر کام کرتا رہا۔

مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۳۱۵ھ):

آپ کے پیرومرشد الشیخ ابوعبدالرحمٰن، مولانا غلام دستگیر قصوری الہاشمی القریشی
صدیقی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے بلند پایہ بزرگ تھے۔ ان کے علمی اور روحانی کمالات کا
برِصغیر پاک وہند کے علاوہ علمائے حرمین الشریفین نے بھی اعتراف کیا۔ آپ لاہور
موچی دروازہ کے اندر محلہ چہل بیبیاں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ گرامی حضرت
مولانا حسن علی صدیقی اپنے زمانہ کے مقتدر علماء کرام میں سے تھے۔ آپ حضرت خواجہ
دائم الحضوری مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے خواہرزادہ اور داماد تھے۔

آپ اپنے وقت کے مروجہ علوم وفنون پر دسترس رکھتے تھے۔ آپ شیخ طریقت
...ہ ساتھ وقت کے بلند پایہ عالم دین اور مناظر کی حیثیت سے آسمان شہرت پر
...اں رہے۔ آپ کی تصانیف اہلِ علم وفضل کے ہاں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ تحفہ
...تحقیق الصلوٰۃ الجمعہ، ظفر المقلدین، جواہر قضیہ رد نیچریہ اور تقدیس الوکیل عن توہین
...الخلیل خصوصی طور پر کئی بار چھپ کر ملک میں پھیلیں۔ آپ نے ۱۳۱۵ھ میں
...قصور میں وصال فرمایا اور آپ کا مزار قصور کے بڑے قبرستان میں مرجع خلائق ہے۔
حضرت مؤلف علام مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے علمی اور روحانی
...ل طے کرنے میں ایک عرصہ گزارا۔ جب مؤلف نے ''تفسیر نبوی'' کی تالیف کا
...از کیا تو آپ کے پیرومرشد نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا پنجابی شعر میں جو ترجمہ کیا وہ
...نا حلوائی نے ''تفسیر نبوی'' کی ہر سورۃ کی تفسیر کے ابتداء میں بطور تبرک لکھا۔

اسم اللہ دے نال شروع ہے جو بخشش داسائیں
کامل مہر محبت والا پالے آخر تائیں

مرشد اول مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد مؤلف علام نے
...الہ کے معروف شیخ طریقت حضرت سید پیر جماعت علی شاہ لاثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ سے
...ت کی اور تاحیات نقشبندی مجددی طریقہ عالیہ پر گامزن رہے۔

...جماعت علی شاہ لاثانی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۵۱-۸-۳۰):

حضرت پیر سید جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ علی پور سیداں سیالکوٹ سنہ ۱۲۳۳ھ میں پیدا
...ے اور مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا مظہر اللہ خان سہارنپوری، مولانا فیض الحسن
سہارنپوری اور الشاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے علوم دینیہ میں کمال حاصل کیا۔
آپ نے کتابی علوم کے ساتھ ساتھ روحانی سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی اشاعت سے
بے پناہ مخلوق خدا کو فیضیاب کیا۔ آپ چورہ شریف کے حضرت خواجہ فقیر محمد تیراہی رحمۃ اللہ علیہ
کے خلیفہ تھے۔ آپ کا وصال ۱۳۷۰ھ میں ہوا اور علی پور سیداں میں آسودۂ خاک ہوئے۔

مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے سابقہ پیر و مرشد کے وصال کے بعد حضرت
پوری لاثانی رحمۃ اللہ علیہ سے جو فیض پایا تھا اس کا اعتراف اپنی کتاب ''شفاء القلوب'' میں
اشعار میں کیا ہے۔

بعد وصال محبوب اپنے دے اس عاجز حلوائی
صوفی علی پوری تھیں پایا فیض اتے وڈیائی

غریب یتیماں دی تربیت کردے جیونکر مرد رحمانی
اودیں حضرت لاثانی رحمۃ اللہ علیہ بخشے فیض روحانی

چوہاں طریقیاں وچ اجازت حضرت صاحب پائی
ماہر رمز فقر دے اندر رکھ دا قلب صفائی

فاضل جلیل حضرت مؤلف علام مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے جب علمی
روحانی اقدار کی نشو و نما میں حصہ لیا اس کا اعتراف آپ کے معاصر علماء کرام اور مشائخ
عظام نے بھی کیا۔ آپ نے مختلف تصانیف اور عقائد باطلہ کی تردید میں بڑی وسیع اور
معیاری کتابیں لکھیں۔ آپ نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ قرآن پاک کی بلند پایہ تفسیر
''تفسیر نبوی'' کی تالیف میں صرف کیا۔ یہ تفسیر پندرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور
پنجابی اشعار کا ایک بے بہا خزانہ ہے۔ احسن القصص، قصص المحسنین، تفسیر نبوی کی جلد
ششم کا ایک حصہ ہے جسے اردو نثر میں مولانا پروفیسر غلام مصطفیٰ صاحب مجددی ایم اے
کے قلم سے شائع کیا گیا۔ آپ نے ''تفسیر نبوی'' کو قرآن پاک کے بیشمار موضوعات
کے علاوہ اعتقادی اور نظریاتی مسائل کا ایک عظیم الشان مرقع بنا کر پیش کیا ہے۔

ہم سابقہ صفحات میں ضمناً بیان کر آئے ہیں کہ حضرت مؤلف علام رحمۃ اللہ علیہ نے
اپنے وقت کے جید علمائے اہلسنّت سے علومِ دینیہ پر عبور حاصل کیا۔ خصوصاً آپ کے
استادِ گرامی مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی تربیت پر خصوصی توجہ دی اور اصلاح

...د کے لیے اپنے اس شاگردِ رشید کو تیار کیا۔ اس وقت برِصغیر میں انگریزی حکومت
کے زیر سایہ جن دینی فتنوں نے سر اٹھایا تھا ان کی سرکوبی میں فاضل مؤلف نے اہم
کردار ادا کیا۔ آپ نے تصنیف و تالیف کے مؤثر ہتھیاروں سے بدعقیدہ مولویوں
کے اثرات کو بے اثر کر کے رکھ دیا۔ اس اہم کام کے لیے آپ نے تمام دنیاوی فوائد
سے دستبردار ہو کر صرف اور صرف اعتقادی اصلاح کا کام کیا۔ آپ نے اپنی زرعی
زمینیں، کاروبار، آبائی مکان او دوسری جائیداد تمام کی تمام اس کام میں لگا دی۔ لاہور
میں ایک مسجد تعمیر کرائی، ایک مدرسہ قائم کیا، پھر ''تفسیر نبوی'' کی تالیف و تصنیف اور
اس کی اشاعت پر سارا مال و زر صرف کر دیا۔ دہلی دروازہ لاہور کے باہر سٹی کوتوالی کے
فصل دو منزلہ مسجد بنوائی۔ مسجد کے ساتھ حجرے تعمیر کروائے اور اس میں مدرسہ قائم
کیا۔ اس وقت جن دینی فتنوں کا سامنا تھا ان سے اپنے مرکز کو محفوظ رکھنے کے لیے
اپنی مسجد کی پیشانی کے پتھر پر یہ عبارت لکھوا دی۔

''یہ مسجد خالص حنفیہ کرام کی ہے کوئی غیر مذہب یہاں آ کر اپنے افعال ادا
نہیں کر سکتا جس سے مناقشت پیدا ہو''۔

فقیر محمد نبی بخش حلوائی متولی مسجد ہذا (مؤلف تفسیر نبوی) ۱۳۵۴ھ

آپ کے استادِ گرامی مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ کی بیگم شاہی مسجد لاہور کے
بعد یہ دوسری مسجد تھی جسے اہلسنّت کا اعتقادی اور نظریاتی مرکز بنا دیا گیا تھا اور یہاں
سے اعتقادی اصلاح کی جو کرنیں پھوٹیں انہوں نے سارے پنجاب کو منور کیا۔ آپ
کے اس مرکز کی شہرت سارے پنجاب میں پھیلی اور دور دور سے علماء کرام اور مشائخ
نے آپ سے اعتقادی مسائل کا حل دریافت کیا۔

مولانا باغ علی نسیم رحمۃ اللہ علیہ (م: ۲۹-۲-۲۰۰۰):

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے تدریسی شعبہ نے کئی قابلِ ذکر طلبہ
اور شاگردوں کو زیورِ تعلیم سے نوازا تھا مگر آخری دور میں آپ کے زیرِ تعلیم رہنے والے

جن تلامذہ نے تکمیل کے بعد دنیائے علم وفضل میں بڑا نام پیدا کیا ان میں آپ کے خلیفہ مجاز مولانا باغ علی صاحب نسیم کا نام سرِ فہرست ہے۔ مولانا باغ علی نسیم نقشبندی نے آپ سے پڑھا اور مرکزی دار العلوم حزب الاحناف لاہور سے دستارِ فضیلت حاصل کی۔ پھر استادِ گرامی کی جانشینی اور علمی مسند کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ کی مسجد کو نگران کی حیثیت سے قائم و دائم رکھا، آپ کے مدرسہ کو جاری وساری رکھا، آپ کے کتب خانہ اور تالیفات کو زیورِ طباعت سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ پھر آپ کے نام کو زندہ رکھنے کیلئے آپ کے نام پر لاہور میں ''مکتبہ نبویہ'' قائم کر کے بے پناہ کتابیں شائع کیں اور ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچائیں۔ مولانا باغ علی نسیم نے اپنے پیر و مرشد کے سالانہ عرس کے اہتمام کو بڑی پامردی سے جاری رکھا۔ آپ کے مریدوں کو ہر سال عرس کی تقاریب میں بلا کر سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی تربیت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:

مولانا باغ علی نسیم نقشبندی کی رفاقت میں حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اور شاگردِ رشید پیرزادہ اقبال احمد فاروقی ایم۔اے (راقم) نے حضرت کے تالیفی اور تصنیفی کام کو جاری رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ حضرت حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر تحقیقی کام کرنے والے ایک عالم دین نے لکھا تھا کہ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی نے ایک عرصہ تک اپنے استاد حضرت مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی تعمیر کردہ مسجد میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۶ء تک خطابت جمعہ کی خدمت کو سرانجام دیا اور اپنی قوت بیانیہ اور اعلیٰ طرزِ خطابت سے لاہور میں خطیبانہ انداز کو امتیاز بخشا۔ آپ کا نام اپنے وقت میں لاہور کے ان چند خطباء میں شامل تھا جنہوں نے اپنی اپنی مساجد میں اپنے خطیبانہ انداز کو منوایا۔ حضرت کی جامع مسجد میں سامعین کا اتنا عظیم مجمع آپ کے اس شاگرد کی خطابت کی کشش سے ہوا کرتا تھا۔

پیرزادہ مولانا اقبال احمد فاروقی نے خطابت کے ساتھ ساتھ ''مکتبہ نبویہ'' کے سٹیج

نہایت ہی گراں قدر مطبوعات کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ بڑی بڑی بلند پایہ کتابوں کے تراجم کیے، عمدہ تصانیف لکھیں اور اپنے رنگین قلم سے عمدہ تحریروں کی اشاعت میں شہرت حاصل کی۔ پیرزادہ فاروقی ایک اعلیٰ قلمکار کی حیثیت دنیائے علم و ادب میں ابھرے اور اہلِ علم وفضل سے داد و تحسین حاصل کی۔ آپ مکتبہ نبویہ کی مطبوعات کی اشاعت و ترتیب کے ساتھ ساتھ ''مرکزی مجلسِ رضا لاہور'' کی مطبوعات کو تقسیم و اشاعت کرنے میں بڑی جدوجہد کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں بھی ان کے قلم وفکر نے مرکزی مجلس رضا کے ماہنامہ ''جہانِ رضا'' کو بڑی افادیت سے ہمکنار کیا۔ (جہانِ رضا کے اداریوں پر مشتمل ایک کتاب ''فکرِ فاروقی'' کے نام سے مولانا محمد عالم مختارِ حق نے مرتب کر کے مکتبہ نبویہ لاہور سے شائع کی ہے)

مولانا محمد عالم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ (م:۹۹-۸-۲۰):

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اور شاگردِ رشید حافظ محمد عالم صاحب نے تدریسی اور علمی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ مولانا حافظ محمد عالم صاحب حضرت مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہ کا مرکز رہے اور آپ نے دینی علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد سیالکوٹ میں ایک دار العلوم کی بنیاد رکھی۔ حافظ محمد عالم صاحب نے اپنی شبانہ روز محنت اور کوششوں سے سیالکوٹ میں ہزاروں حافظانِ قرآن اور دینی علوم کے ماہر علمائے کرام کی تربیت کا زبردست کام سرانجام دیا۔ سیالکوٹ حافظ محمد عالم صاحب کی تدریسی اور دینی خدمات سے ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ آپ نے نہ صرف تدریسی اور علمی میدان میں نام پیدا کیا بلکہ عوام میں اعتقادی نشو ونما کو فروغ دیا۔ آج حافظ محمد عالم صاحب کے ہزاروں شاگرد علمائے دین اور حفاظ کی شکل میں ملک کے مختلف گوشوں سے علم دین کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ آپ نے جب جمعیت علمائے پاکستان کے ٹکٹ پر انتخابی میدان میں قدم رکھا تو سیالکوٹ کے عوام نے آپ کو بڑھ چڑھ کر ووٹ دیے۔

صوفی غلام حسین گوجروی:

صوفی غلام حسین گوجروی مرحوم مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد تھے، اگرچہ صوفی غلام حسین گوجروی سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت سید علی حسین شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ مگر آپ نے دینی علوم کی تحصیل مولانا حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ سے کی تھی۔ مولانا گوجروی نے دارالعلوم مرکزی الاحناف لاہور سے فارغ التحصیل ہو کر ایک خطیب کی حیثیت سے بڑا نام پاکستان کا ایک ایک شہر اور ایک ایک قریہ مولانا گوجروی کی خوش بیانیوں اور گونجتا رہا۔ خوش آواز تھے اور اپنی خوش بیانی سے سامعین کو مسحور کر دیتے تھے۔ تقریر سننے کے لیے ہزاروں لوگ دور دور سے آتے۔

ان تین نامور شاگردوں کے علاوہ آپ کے مدرسہ سے سیکڑوں طلبہ علوم سے فیضیاب ہو کر نکلے اور زندگی کے مختلف امور میں مصروف ہوئے۔ مگر ایک حیثیت جو آپ کے شاگردوں میں پائی جاتی ہے وہ ان کے حنفی سنی عقیدہ کی محبوب کبریا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے محبت ہے جو ان کی زندگیوں کا حسن ہم ان سیکڑوں طلبہ کا تذکرہ لکھنے سے قاصر ہیں جنہوں نے آگے چل کر حضرت علام رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ اور تدریس کا نام روشن کیا۔

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان میں معمولی سی جس کی وجہ سے آپ ایک خطیب یا مقرر کی حیثیت سے تو شہرت نہ پا سکے مگر آپ تصنیف و تالیف کے میدان میں جو مقام حاصل کیا وہ آپ کے علاوہ لاہور پنجاب بھر میں شاید ہی کسی دوسرے سنی اہلِ قلم کو ملا ہو۔ آپ پنجابی کے ایک شاعر تھے، اگرچہ آپ نے عقائد کی اصلاح پر مختلف کتابیں تصنیف کیں مگر پنجابی میں ان کی تصانیف کا بہت بڑا ذخیرہ سامنے آیا جس سے پنجاب کے دور دراز میں ایک علمی اور اعتقادی انقلاب برپا ہو گیا۔ آپ پنجابی کے علاوہ اردو، فارسی

کے بلند پایہ شاعر اور ادیب بھی تھے آپ جس طرح نثر میں لکھتے اسی روانی بلکہ اس روانی کے ساتھ شعر میں بات کرتے۔ دراصل آپ کے سامنے خطہ پنجاب میں والے دینی فتنوں کی اصلاح تھی۔ چنانچہ آپ کی تصانیف کا زیادہ حصہ پنجابی میں ہے۔ آپ نے پندرہ جلدوں میں قرآن پاک کی پنجابی اشعار میں تفسیر لکھی جسے نبوی'' کے نام سے شہرت ملی۔ یہ تفسیر ایک بے مثال تفسیر ہے جسے چالیس تفاسیر کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اتنی بڑی پنجابی تفسیر کہیں نہیں ملتی۔ صغیر میں لکھی جانے والی تفسیریں ''تفسیر نبوی'' کی تشریح معانی تک نہیں پہنچ پاتیں۔

حضرت علامہ حلوائی دین اسلام کے سچے ترجمان تھے۔ وہ فقہ حنفی کے شارح تھے ور عقائد اہلسنّت کے دفاع کے لیے اعتقادی قلعہ کے محافظ تھے۔ آپ کی منظوم اور تصانیف کا ہر صفحہ اس بات کی شہادت دیتا ہے۔ کہ آپ بے مثال مفسر قرآن اور پایہ پنجابی شاعر تھے ''تفسیرِ نبوی پنجابی'' کی پندرہ ضخیم جلدوں کے علاوہ آپ نے ذیل کتابیں تصنیف کیں جو عوام میں مقبول و مطبوع ہوئیں:

- شفاء القلوب بالصلوٰۃ علی المحبوب (پنجابی اشعار)
- خیر الہدیٰ فی عدم الجمعۃ فی القریٰ (اردو، عربی، فارسی)
- الامتیاز بین الحقیقت والمجاز (اردو)
- النار الحامیہ لمن ذم المعاویہ (اردو)
- مجموعۃ الرسائل اربعہ (اردو، پنجابی اشعار)
- مجموعۃ الرسائل خمسہ (اردو، پنجابی اشعار)
- رسالہ جامع الشواہد (اردو)
- انتباہ المنکرین من الصلوٰۃ سید المرسلین (اردو)
- احسان الاموات بالصدقات والاسقاط (اردو)
- اطلاع الناس فی طلاق الثلاث (پنجابی، اردو)

- اظہار انکار المنکرین من صلوٰۃ المحبین (اردو)
- انواع نبوی (پنجابی اشعار)
- سبیل الرشاد فی حق الاستاد (اردو)
- تحصیل العرفان فی آداب المشائخ والاخوان (اردو)

ان کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن چھپے اور تقسیم ہوئے مگر ہم جس اہم اور ضخیم کتاب
تعارف کرانا چاہتے ہیں وہ آپ کی مشہور زمانہ تصنیف ''تفسیر نبوی'' پنجابی (اشعار)
ہے۔ جس کی چھٹی جلد تفسیر سورۂ یوسف (احسن القصص و قصص المحسنین)

تفسیر نبوی

تفسیر نبوی پندرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، یہ تفسیر پنجابی اشعار میں لکھی گئی
اس کے کئی ایڈیشن چھپے اور تقسیم ہوئے۔ مولف علام رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ''وہابیوں''
نے خطہ پنجاب میں بڑے مکروہ اثرات مرتب کیے تھے اور وہابی علماء نے
عبدالوہاب نجدی کی ''کتاب التوحید'' سے متاثر ہوکر اعتقادی دنیا میں طوفان بدتمیزی
برپا کر دیا تھا۔ خصوصاً پنجاب کے دیہاتوں میں وہابی علماء عوام کے سامنے شرک اور
بدعت کا مسئلہ اٹھا کر عام مسلمانوں کو مشرک اور بدعتی قرار دیتے جاتے۔ حافظ محمد لکھوی
نے خصوصیت کے ساتھ پنجاب کے دیہاتوں میں اس دینی فتنے کو فروغ دیا اور ''تفسیر
محمدی'' لکھ کر دیہاتی علماء کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے
اس فتنہ کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے قلم اٹھایا اور آہستہ آہستہ پندرہ جلدوں میں
''تفسیر نبوی'' لکھی اور دیہات میں تقسیم کی۔ اس تفسیر نے بڑے اچھے اثرات مرتب
کیے اور عوام میں پھیلی ہوئی وہابیت کو روک دیا اور اس کے اثرات زائل ہونے لگے۔

- تفسیر نبوی کی جلد اول کا پہلا ایڈیشن لاہور کے مطبع مفتی فخر الدین سے ۱۳۱۷ھ
میں چھپا۔ جلد اول تین سو بیاسی ۳۸۲ صفحات پر مشتمل تھی اور سورۃ البقرہ کی تفسیر
تھی۔ اس کی ابتداء یا ابتدائی شعر آپ کے پیر و مرشد اور استاد گرامی حضرت

مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دست پاک سے خود لکھا۔

اسم اللہ دے نال شروع ہے جو بخشش دا سائیں
کامل مہر محبت والا پالے آخر تائیں

- اس تفسیر کی جلد دوم لاہور ہی میں ۱۳۲۰ھ میں چھپ کر سامنے آئی جو چار سو چھیاسی ۴۸۶ صفحات پر مشتمل تھی۔ یہ سورۂ آل عمران اور سورۃ النساء کی ترجمان ہے۔
- تفسیر نبوی جلد سوم لاہور میں ۱۳۳۴ھ میں لکھی گئی مگر گلزار محمدی سٹیم پریس لاہور سے ۱۳۴۱ھ میں چھپی تھی۔ یہ جلد دو سو نوے ۲۹۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ سورۂ یونس اور سورۂ ہود کی تفسیر ہے۔
- جلد چہارم (سورہ اعراف تا سورہ توبہ) ضخامت ۴۶۰ صفحات مطبوعہ لاہور (س-ن)۔
- تفسیر نبوی جلد پنجم (سورہ یونس تا سورہ ہود) لاہور سے ۱۳۳۱ھ میں چھپی۔ مشتمل بر ۱۹۲ صفحات۔
- جلد ششم (احسن القصص اور قصص المحسنین) سورۂ یوسف کی تفسیر و تشریح ہے۔ یہ کریمی سٹیم پریس لاہور سے ۱۳۴۳ھ میں پہلی بار چھپی۔ یہ سورۂ یوسف کی ضخیم اور طویل تفسیر ہے اور چھ سو ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ واقعہ یوسف پر بڑی بلند پایہ پنجابی تفسیر ہے۔

ہم اس جلد کو قارئین کی خدمت میں اردو میں پیش کر رہے ہیں۔ اس کتاب نے
پنجاب کے دیہات میں بڑی مقبولیت حاصل کی تھی اور اس کے کئی ایڈیشن چھپ کر
تقسیم ہوئے۔ آج یہ از سر نو اردو لباس میں ملبوس آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

- تفسیر نبوی کی ساتویں جلد کریمی سٹیم پریس لاہور سے چھپی۔ یہ چار سو تیس ۴۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سورۃ الرعد، ابراہیم، الحجر، النحل اور سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر ہے۔

- آٹھویں جلد سورۂ کہف سے لے کر سورۂ المومنون پر مشتمل ہے یہ جلد دو سو ۲۲۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسے بھی لاہور کے مطبع کریمی سٹیم پریس سے چھپوایا گیا۔
- جلد نہم پانچ سو باون ۵۵۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسے سورۂ نور سے لے کر عنکبوت تک لکھا گیا تھا اور یہ بھی کریمی سٹیم پریس لاہور سے چھپی تھی۔
- جلد دہم لاہور کے مطبع کریمی سٹیم پریس سے چھپی تھی یہ سورۃ الروم سے لے سورۂ فاطر تک لکھی گئی تھی اور یہ جلد دو سو چار ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔
- گیارہویں جلد لاہور کے مطبع کریمی سٹیم پریس سے ایک سو ساٹھ ۱۶۰ صفحات چھپ کر سامنے آئی۔ یہ سورۃ یٰسین سے لے کر سورۂ سجدہ تک کی سورتوں پر مشتمل ہے۔
- بارہویں جلد دو سو تیس ۲۳۰ صفحات پر مشتمل ہے یہ سورۂ شوریٰ سے لے کر سورۂ ذاریات کے مضامین کی تفسیر ہے۔ یہ بھی کریمی سٹیم پریس لاہور سے چھپی تھی۔
- تیرہویں جلد مطبع کریمی سٹیم پریس لاہور میں چھپی جو ایک سو انتیس ۱۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ تفسیر سورۂ طور سے لے کر سورۂ تحریم تک کا مجموعہ ہے۔
- "تفسیر نبوی" کی چودھویں جلد لاہور کے مطبع کریمی پریس میں چھپ کر سامنے آئی یہ ایک سو سولہ ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ سورۂ الملک سے لے کر سورۂ المرسلات تک پھیلی ہوئی ہے۔
- تفسیر نبوی کی پندرہویں جلد ۱۳۵۱ھ میں چھپی یہ سورۂ النباء تیسویں ۳۰ پارے کے آغاز سے لے کر سورۃ الناس تک ہے اور اس طرح یہ بے بہا خزانہ پنجابی اشعار میں عوام الناس تک پہنچا۔

اس طرح یہ عظیم الشان تفسیر چار ہزار چار سو انتالیس ۴۴۳۹ صفحات پر مشتمل دنیائے علم میں آئی اور آپ کی زندگی کے ۳۴ سالوں (۱۳۱۷-۱۳۵۱ھ) میں مکمل ہوئی۔

نبوی کی تالیف میں مؤلف علام رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک طویل حصہ صرف ہوا اور اس آپ کی زندگی میں ہی اس کی شہرت اور مقبولیت سامنے آتی رہی۔ آپ نے اسے کے مختلف علاقوں میں پھیلانے میں بھرپور حصہ لیا۔ خصوصاً ریاست جموں کے علاقوں میں اسے پھیلایا گیا۔ پھر گجرات کے دیہاتوں میں اس کی پذیرائی تفسیر محمدی جسے حافظ محمد لکھوی نے چھپوا کر پنجاب میں تقسیم کیا تھا اور اس کا اثر پنجاب کے ضلع فیروزپور، قصور، اوکاڑہ، بہاولنگر اور دوسرے علاقوں میں مرتب تھا "تفسیر نبوی" نے ان علاقوں میں بھی اپنے اثرات مرتب کیے اور عقائد کی اصلاح کا کام کیا۔ اس تفسیر پر علمائے اہلسنّت نے اپنے گہرے تاثرات کا اظہار کیا اور کے جید علمائے کرام نے مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کو داد و تحسین نوازا۔ اس وقت کے جلیل القدر علمائے کرام کی آراء تفسیر نبوی کی بعض جلدوں کے اور آخرین صفحات پر ہمارے سامنے آئی ہیں۔

اگرچہ حضرت مؤلف علام رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و تصانیف پر راقم (پیرزادہ اقبال فاروقی ایم-اے) نے مختلف تحریروں پر تبصرے کیے اور مختلف کتابوں میں احوال مقامات حضرت حلوائی رحمۃ اللہ علیہ پر گفتگو کی ہے مگر حال ہی میں (۱۹۹۵ء) میں ہمارے فاضل اور نوجوان سکالر الحافظ خورشید احمد القادری نے آپ پر عربی میں ایک مفصل کتاب لکھی ہے جس کا نام "العلامة محمد نبی بخش الحلوائی ...... جهاته ومعانته" ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے بڑی تفصیل سے عربی زبان میں حضرت الشیخ الحلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و مقامات پر محنت اور تحقیق سے قلم اٹھایا۔ ہم الحافظ خورشید القادری کی اس محنت کو داد و تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے عربی زبان میں مؤلف علام رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کو جمع کر کے دنیائے علم و فضل کو خاص کر عالم عرب کو ایک پنجابی مفسر قرآن کو متعارف کروایا ہے۔ ہم ان کی اس کاوش کے لیے بھی ممنون

ہیں کہ اس مقدمہ کی تیاری میں ہمیں آپ کی اس عربی کتاب سے بڑی مدد ملی۔

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی اہل فضل کے حلقہ میں بسر کی اور وقت کے جلیل القدر علمائے کرام اور مشائخ عظام سے علمی اور روحانی استفادہ کیا مگر عمر کے آخری حصہ میں آپ کے چند معاصرین کا تذکرہ اس کے لیے آپ کے علمی اور اعتقادی حلقہ کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہوگا۔

مؤلف علام رحمۃ اللہ علیہ کے استادِ محترم مولانا غلام دستگیر قصوری اپنے وقت کے زبردست عالمِ دین تھے اور پھر ایک باکمال مناظر تھے۔ انہوں نے عیسائی، ہندو، آریہ، ملحد، رافضی، نیچری، مرزائی، وہابیوں اور دیوبندیوں سے مناظرے کیے۔ آپ کے شاگردِ رشید حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے قلمی جہاد میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ کی ان قلمی خدمات کو جہاں دوسرے علماء کرام نے قدر کی نگاہ سے دیکھا وہاں جب امام اہلِسنّت، مجدد مائۃ حاضرۃ، اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بے پناہ مسرت کا اظہار فرمایا۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی تفسیر نبوی کی اشاعت پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے کئی خط لکھے۔ آج تفسیر نبوی کا اردو نثری ایڈیشن کنز الایمان کے الفاظ سے مزین ہے۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کا اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات تک آپ سے قریبی رابطہ رہا۔

صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی انجمن حزب الاحناف لاہور کے جلسوں میں تشریف لاتے تو حضرت مولانا حلوائی رحمۃ اللہ علیہ ان کی دینی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں ملنے جاتے اور آپ کی علمی خدمات کی قدر کرتے اور حوصلہ افزائی کے طور پر آپ کی مسجد میں ہر سال ملاقات کے لیے خصوصی طور پر تشریف لایا کرتے تھے۔

صدر الافاضل کے ایک شاگرد رشید مفتی احمد یار خاں نعیمی بدایونی رحمۃ اللہ علیہ جب گجرات میں آئے تو انہوں نے ایک شعبۂ تصنیف و تالیف قائم کیا۔ ''تفسیر نعیمی'' کی

اول جلدیں حضرت مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر سے گزریں تو آپ نے بڑی تعریف کی۔ پھر مولانا مفتی احمد یار نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ''جاء الحق و زہق الباطل'' آئی تو آپ کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ خود گجرات پہنچے، کتاب کی اشاعت پر ہدیۂ تبریک پیش کیا، نذرانہ دیا اور ایک سو جلدیں خرید کر اپنے حلقۂ احباب میں مفت تقسیم کیں۔

حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ الوری (م ۱۳۵۴ھ) لاہور میں آئے تو سب سے پہلے دار العلوم نعمانیہ میں مدرس مقرر ہوئے۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ سے مراسم قائم ہوئے، ان کی نسبت سے آپ کے دونوں صاحبزادگان حضرت مولانا ابوالحسنات الخطیب مسجد وزیر خان اور علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہما سے تادمِ آخر مراسم قائم رہے۔ حضرت مولانا غلام قادر بھیروی، مولانا معوان حسین رامپوری خطیب شاہی مسجد لاہور، پیر عبدالغفار شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ تو حضرت مؤلف کے اساتذہ میں سے تھے۔ انہی کے رفقائے علم مولانا اصغر علی روحی (م ۱۳۷۲ھ) مولانا تاج الدین قادری علامہ تاج الدین چشتی، مولانا محرم علی چشتی، سید احمد علی بٹالوی (م ۱۳۲۶ھ) علامہ نور بخش توکلی سیکرٹری انجمن نعمانیہ لاہور (م ۱۳۶۷ھ) جیسے بلند پایہ علمائے اہلِسنّت آپ کے حلقۂ احباب میں تھے۔ مشائخ کرام میں حضرت پیر سید جماعت علی شاہ لاثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ تو آپ کے پیر و مرشد تھے مگر آپ میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۴۷ھ) پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ خان عالم محی الدین باولی شریف رحمۃ اللہ علیہ ضلع گجرات اور امیر ملت حضرت پیر حافظ جماعت علی شاہ صاحب علی پوری رحمۃ اللہ علیہ جیسے مشائخ کرام کو آپ کو بے حد عقیدت تھی۔ مولانا محمد مہر الدین نقشبندی (م ۱۹۸۹ء) آپ کے مدرسہ کے جز وقتی استاد رہے ہیں اور ایک عرصہ تک آپ کے مدرسہ کے استاد اعلیٰ اور تصنیفی و تالیفی کام کے نگران بھی رہے ہیں۔ آپ کے احباب میں سے چند معاصرین کے نام آپ کی تصانیف میں بھی ملتے ہیں۔ حافظ فتح محمد مجددی اچھروی بانی دار العلوم حنفیہ اچھرہ لاہور، مولانا محمد عالم لاہوری، مولانا محمد شریف سیالکوٹی، مولانا صاحبزادہ

عبدالرسول قصوری، مولانا یار محمد گڑھی اختیار خان، مولانا محمد عبداللہ گجراتی، مولانا
محی الدین باولی شریف، مولانا محمد سعید بریلوی، مولانا فضل حسین لوہارکی، مولانا عبد
قصوری، صاحبزادہ محمد حسین علی پوری، مولانا عبدالحکیم پشاوری، مولانا اکرام الدین
بخاری (خطیب مسجد وزیر خان)، مولانا عبدالحکیم کلانوری، مولانا احمد بخش المتخلص
قصوری، سید حامد حسین اجمیری، مولانا محمد نذیر عرشی، (صاحب مفتاح العلوم شرح
مثنوی مولانا روم) مولانا شفیق احمد بگوی، مولانا ذاکر حسین بگوی، مولانا محمد شرف
الدین شاہ پوری، مولانا ضیاء الدین گجراتی، مولانا محمد حسین پسروری، مولانا امام الدین
کوٹلی لوہاراں سیالکوٹ، مولانا محمد شریف کوٹلی لوہاراں، مولانا محمد نعیم پشاوری، مفتی ولی
جالندھری اور حضرت مولانا وصی احمد سورتی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین آپ کی مجالس
کے مخلص احباب تھے۔

حضرت مؤلف علام رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے آخرین چند برسوں میں راقم کو آپ
کے دستر خوان علم وعرفان سے خوشہ چینی کی سعادت ملی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ
شباب کی وادیاں طے کرنے کے بعد زمانہ پیری میں قدرے آرام پسندانہ وقت گزارنے
لگے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ باعث پیری وکہولت آپ کے بعض معمولات میں تبدیلی
ضرور آئی تھی مگر کوتاہی نہیں آئی تھی۔ آپ شب وروز دین کی خدمت میں مشغول رہتے
شب بیداری معمول بن گیا تھا، رات کا اکثر حصہ نوافل کی بجائے حضور نبی کریم ﷺ کی
بارگاہ میں درود پاک پیش کرنے میں گزرتا۔ تہجد کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہ ہوتی، آپ
اس معاملہ میں اتنے سخت گیر تھے کہ طلبہ کو تو معاف کر دیتے مگر جو سالک درویش آپ
کے زیر تربیت تھے ان کی معمولی کوتاہی کا بھی سخت نوٹس لیتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد
تمام اساتذہ طلبہ اور درویش کھجور کی گٹھلیوں پر درود پاک کا ورد کرتے۔ درود پاک کی
محفل ختم ہوتی تو طالبانِ طریقت فرداً فرداً تلاوت قرآن پاک میں مصروف ہو جاتے اور
طلبہ اپنے اپنے اساتذہ کے حلقوں میں تدریس میں جا بیٹھتے۔

اس زمانہ میں آپ کی نظر کمزور ہو چکی تھی مگر تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری تھا۔
آپ اپنے شاگردوں میں کسی ایک کو اپنے پاس بٹھا لیتے اور کتاب لکھواتے جاتے۔
حوالے کے لیے مختلف کتابوں سے حوالوں کی نشاندہی خود فرماتے اور لکھنے والا ان
عبارتوں کی تفصیل پہلے آپ کو سناتا پھر انہیں موقع محل پر درج کرتا۔ اس سلسلہ میں
مولانا باغ علی نسیم، مولانا برکت علی شہید اور غلام حسین شہید آف جموں آپ کے
کاتبان تصانیف میں سے تھے۔ کبھی کبھی راقم کو بھی اپنے پاس بٹھا کر چند صفحات کی املا
دیتے اور اس سعادت میں تربیت دیتے۔

نمازِ عصر کے بعد ختم خواجگان کی مجلس ہوتی۔ اس میں سترہ آدمیوں سے زیادہ
شریک نہ ہوتے۔ اس مجلس میں بیٹھنے والوں پر یہ پابندی تھی کہ وہ سارے دن میں کسی
نماز کی قضا کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔ حقہ یا سگریٹ نہیں پیتے، ختم کے دوران مکمل
خاموشی ہوتی، صرف میر مجلس کسی کلمہ کی تبدیلی کے وقت ''حقا'' بلند آواز سے کہتا اور اس
کلمہ کی طرف متوجہ کرتا جو آگے پڑھنا ہوتا۔

آپ کو بعض وظائف اور عملیات روحانیہ پر بڑا عبور حاصل تھا۔ ضرورت مند لوگ
دور دور سے تعویذات حاصل کرنے آتے۔ آپ ان عملیات کی روشنی میں ان ضرورت
مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرتے۔ آپ کے پاس محبت کا نقش اور کسی گم شدہ فرد کی بازیابی
کا عمل اتنا مجرب تھا کہ اس تیر کا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا۔ آپ نے ایسے کئی عملیات اپنی
تفسیر میں بھی درج کیے ہیں۔ لیکن جب ان تعویذات کے ثمرات سامنے آتے تو لوگوں
کو یقین دلاتے کہ یہ میرے درویشوں کی دعاؤں کا اثر ہے اور انہیں تلقین کرتے کہ

''حب درویشاں کلید جنت است!''

آپ ایک عالم دین تھے، پنجابی کے بے مثال شاعر تھے اور مفسر قرآن تھے۔ پھر
مدرس تھے، معلم تھے۔ آپ کو تعویذات اور عملیات کو زیادہ وقت دینا گوارا نہ تھا مگر
نقشبندی مجددی سلوک کی منازل طے کرتے وقت بعض بزرگانِ دین سے انہیں ایسے

فیضان سے حصہ ملا تھا جسے وہ ضرورت مندوں اور پریشان حال لوگوں تک پہنچانے
میں بخل نہیں کرتے تھے۔

آپ بزرگانِ دین سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی کرامات اور خرق
عادات کو بڑے یقین سے بیان کرتے اور انہیں بزرگان دین کی کرامات پر کسی قسم کا
شک وشبہ نہیں تھا۔ لاہور میں بے پناہ بزرگانِ دین کے مزارات ہیں آپ ان تمام بزرگان
دین کے کمالات اور مکاشفات پر پورا یقین رکھتے تھے مگر انہیں حضرت داتا گنج بخش
رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی عقیدت تھی۔
وہ حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کے کنویں کا پانی ہمیشہ اپنے حجرے میں رکھتے
اور وقت ضرورت اسے پیتے۔ وہ ہر جمعہ کے پچھلے پہر حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے
مزار پر پیدل چل کر حاضری دیتے اور بڑھاپے سے جسمانی کمزوری اور نظر کی کمی کے
باوجود اپنے کسی شاگرد کا ہاتھ پکڑتے، گرتے پڑتے حضرت سید ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ
میں حاضر ہو کر مراقبہ کرتے، فاتحہ پڑھتے، دعا کرتے اور وقت گزارتے مگر واپسی پر
سواری حاصل کرتے اور گھر آتے۔ راقم نے آپ سے اس معمول پر ایک بار استفسار
کیا کہ آپ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی طرف اس وقت سورج کی دھوپ
میں گرتے پڑتے حاضری دیتے ہیں مگر جب موسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے، سورج پیچھے چلا
جاتا ہے پھر سواری پر واپس آجاتے ہیں۔ آپ واپس جاتے وقت پیدل جایا کریں اور
آتے وقت سواری پر آیا کریں۔ آپ نے فرمایا حاضری کے وقت پیدل افتاں خیزاں
آنا چاہیے، واپس جس طرح چاہیں جائیں۔ آپ نے مجھے ایک بار بتایا کہ مجھے جب
کوئی علمی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور کتابوں کے صفحات اس کے حل سے خاموش ہوتے
ہیں تو میں حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر مراقبہ میں بیٹھ کر اس مسئلہ کا حل تلاش
کرتا ہوں، حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ میری راہنمائی فرماتے ہیں مگر بعض اوقات ایسا
بھی ہوا کہ میرے مسئلہ پر حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ اور

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ نے باہم مل کر میری تسلی فرمائی۔ یہ مکاشفاتی احوال فاضل
مؤلف کی صفائی قلب کے مرہون منت تھے۔

آپ کو اپنے طالب علم درویشوں سے بے پناہ محبت تھی، آپ ان پر اس قدر
شفقت فرماتے کہ ان کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ آپ بعض افراد سے صرف
اس لیے کبیدہ خاطری کا مظاہرہ کرتے کہ وہ لوگ آپ کے درویشوں کا خیال نہیں رکھتے
تھے۔ آپ اپنے درویشوں کو ہر طرح خودداری اور بے نیازی کی تربیت دیتے۔

ہر موسم کا پھل افراط سے منگوا کر درویشوں کے سامنے رکھتے، ہر دل پسند کھانا
بڑی محبت سے درویشوں کو کھلاتے، آپ اپنی جیب خاص سے عمدہ کھانے پکوا کر اپنے
درویشوں کی تواضع کرتے تا کہ آپ کے درویش کسی امیر کے دستر خوان یا اس کی
امیرانہ طرز زندگی سے مرعوب نہ ہوں اور باوقار انداز سے رہنا سیکھیں۔

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ اسلامی تقریبات کا خصوصی اہتمام
کرتے۔ حضور ﷺ کی آمد کی خوشی میں عید میلاد النبی کو درود وسلام کے پھولوں سے
سجاتے، نعت ومدحت رسول ﷺ کے گلدستوں سے نوازتے۔ گیارہویں کا ختم ہر ماہ
اہتمام سے کراتے، خود زیادہ پڑھتے درویشوں سے تھوڑا پڑھواتے، مگر انہیں زیادہ
کھلاتے۔ شب معراج، شب برات، لیلۃ القدر اور اپنے پیر ومرشد کے سالانہ عرس کی
تقریبات کو قصور میں بڑے اہتمام اور حسن وخوبی سے مناتے۔ آپ ان تقریبات میں
درود وسلام، تلاوتِ قرآن پاک کا خصوصی اہتمام کرتے۔

(''جہانِ رضا'' اپریل ۱۹۹۷ء)

کاروانِ علم و فضل کی عالمِ بقا کو روانگی

پچھلے دو ماہ کے دوران پاکستان کے سنی علمائے کرام یکے بعد دیگرے موت کی وادی میں گم ہوتے گئے۔ ''موت سے کس کو رستگاری ہے'' مگر جس انداز سے موت کا ریلا قد آور اہل علم و فضل کو بہالے گیا ہے اس سے عقل و فکر مبہوت ہو کر رہ گئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں جس تعداد سے یہ سنی علمائے کرام ملک بقا کو روانہ ہوئے اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ علم و فضل کا ایک کارواں ہے جو موت کی وادی میں گم ہو رہا ہے۔

موت العالم موت العالم۔

''ایک عالم کی موت ایک جہان کی موت ہوتی ہے''۔

مگر جب کئی علماء موت کی وادی میں قدم رکھیں تو کئی جہانوں کی موت سامنے آتی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ط

پیر کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۹۸-۴-۷):

عید الاضحیٰ ۱۴۱۸ھ کی صبح یہ المناک خبر لے کر آئی کہ جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ پیر صاحب علم و فضل کا ایک آفتاب جہان تاب تھے جس کی ضیاؤں نے عالم اسلام کو روشن کیا تھا۔ وہ ہمیں ''ضیاء القرآن'' دے کر گئے ''ضیاء النبی'' دے کر گئے۔ وہ ہمیں دار العلوم محمدیہ بھیرہ شریف دے کر گئے، وہ ہمیں ''ضیاء القرآن پبلی کیشنز'' دے کر گئے، وہ ہمیں ''ضیائے حرم'' دے کر گئے، وہ علامہ علوم کتاب حدیث تھے، وہ فہامہ فہوم، اصول و فروع تھے۔

نطقش چہ خوش زبان و خوش الحان و خوش بیان
ذہنش چہ نکتہ سنج و سخن فہم و نکتہ بین

حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری بھیروی سلطان العارفین پیر محمد شاہ ہاشمی بھیروی کے قابلِ فخر فرزندِ ارجمند تھے۔ ۲۱ رمضان ۱۹۱۸ء کو بھیرہ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد قاسم بالاکوٹی سے حاصل کی فلسفہ و منطق کی فنی کتابیں حضرت مولانا محمد دین بدھوی ضلع کیمبل پور (حال اٹک) سے پڑھیں۔ مولانا غلام گودڑ پپلاں میانوالی سے ادب، فقہ اور ریاضی کا مطالعہ کیا۔ مولانا غلام محمود ان دنوں بھیرہ کے جامعہ محمدیہ غوثیہ میں پڑھاتے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں بی-اے کیا۔ سندِ حدیث جامعہ نعیمیہ مراد آباد سے صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی سے حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں جامعہ ازہر مصر میں داخلہ لیا۔ تین سال تک مصر کی اس فقید المثال یونیورسٹی میں امتیازی حیثیت سے کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں درجہ تخصیص میں سند حاصل کر کے وطن لوٹے اور اپنے مدرسہ میں سلسلۂ تعلیم و تدریس جاری کیا۔ خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ خلافت و اجازت حاصل کی پھر خواجہ قمر الدین سیالوی سے اجازت و خلافت حاصل کی آپ نے تفسیر ''ضیاء القرآن'' لکھ کر دنیائے علم میں اپنی شہرت کا سکہ جما لیا۔ ''سنت خیر الانام'' نے اپنی مقبولیت پر خراج تحسین حاصل کی۔ ''پھر ضیاء النبی'' نے سیرت رسولِ پاک پر نہایت اہم مواد دیا۔ ضیائے حرم (ماہنامہ) اعلیٰ معیار پر نکال کر دنیائے صحافت میں ایک معیار قائم کیا۔ اس ماہنامے نے جہاں اپنے بلند پایہ مضامین سے قارئین کو متاثر کیا وہاں آپ کے ادارتی نوٹ ''سرِ دلبراں'' نے اہلِ علم سے خراج تحسین حاصل کیا۔ آپ عالم باعمل، باکمال مدرس اور صائب الرائے سیاستدان تھے۔ دنیائے سنیت کو آپ پر ناز رہا ہے۔ راقم آپ کی نگاہ لطف و کرم کا مرہون منت رہا ہے۔ سجادہ نشین بھیرہ شریف میرے مکتبہ نبویہ کی اشاعتی کوششوں سے متاثر ہو کر ملتے اور حوصلہ افزائی فرماتے۔ یہ میری حقیر کوششوں کا نتیجہ تھا کہ آپ نے مشہور رسالہ ''ضیائے حرم'' گنج بخش روڈ لاہور سے نکالنا شروع کیا اور مجھے مضامین لکھنے کی سعادت سے بھی نوازا۔ یہ

رسالہ سنیوں کے لیے باعثِ صد افتخار بن کر آج بھی زیورِ اشاعت سے مزین ہے۔ پیر صاحب کا اداریہ ''سرِ دلبراں'' رسالہ کی جان ہوتا اور میں رسالہ صرف سرِ دلبراں کے لیے پڑھتا۔

پاکستان کی سب سے بڑی شرعی عدالت کے جسٹس تھے مگر اس منصب کے باوجود ان کی انکساری مثالی تھی۔ انہوں نے کئی بلند و بالا حکومتی مناصب پائے مگر مناصب اور علمی اعزازات ان کے علمی اور روحانی سفر میں زنجیر پا نہ بن سکے اور وہ اپنے مقاصد کے حصول میں ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے۔ آج وہ برملا یہ کہتے ہوئے ہم سے جدا ہوئے ہیں۔ کہ

''شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم!''

اللہ تعالیٰ نے آپ سے بڑا کام لیا۔ ساری زندگی علم و عرفان کی آبیاری میں گزاری۔ آپ کے جسم خاکی کو آپ کے خانقاہی قبرستان بھیرہ میں آپ کے والد کے مزار کے پہلو میں سپردِ مرقد کیا گیا۔

مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۹۸ء):

مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ نعیمیہ لاہور نے سولہ مارچ ۹۸ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ جامعہ نعیمیہ کے بانی اور دارالعلوم سراجیہ (برائے مستورات) کے نگرانِ اعلیٰ تھے۔ مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت نے دنیائے اہلسنّت کا ایک عظیم عالم دین، ماہر تعلیم دینیہ بلند پایہ منتظم، صاحب بصیرت دینی اور سیاسی راہنما چھین لیا۔ آپ کی رحلت اتنا بڑا علمی نقصان ہے جس کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکے گی۔

نعیمی رحمۃ اللہ علیہ سے ہماری نیاز مندی اس وقت سے ہے جب آپ ''دارالعلوم نعمانیہ'' لاہور کو خیر باد کہہ کر چوک دالگراں کی جامع مسجد میں مسند تدریس بچھا کر طلبائے علوم دینیہ کو دعوتِ تعلیم دینے لگے تھے۔ آپ نے اپنے استاد محترم صدرالافاضل سید نعیم الدین مراد آبادی کے نام پر لاہور میں ایک تدریسی ادارہ ''جامعہ نعیمیہ'' قائم کیا اور بے سروسامانی

کے عالم میں کام کرنے لگے۔ مولانا نعیمی مرحوم نے اپنے احباب میں سے ایک تدریسی کام کا انتخاب کیا جو اعزازی طور پر جامعہ نعیمیہ کے ابتدائی دور میں حضرت مفتی صاحب کے معاون بنے۔ ان دنوں مفتی صاحب تہی دست، بے نوا اور بے سروسامان تھے مگر آپ نے پورے عزم کے ساتھ اس کام کا آغاز کیا اور صبح سے شام تک طلبہ کی تعلیم ہی نہیں ان کے خورونوش اور رہائشی اخراجات کو پورا کرنے کیلئے بھی تگ و دو کرتے۔ بسا اوقات طلبہ کے کھانے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو گھر کی کوئی ضروری چیز بیچ کر کھانا تیار کراتے اور طلبہ کو کھلاتے۔ آہستہ آہستہ بعض احباب نے مفتی صاحب کا ہاتھ بٹانا شروع کیا مگر یہ لوگ مستقل معاون نہیں تھے۔ وقتاً فوقتاً امداد کرتے جو ''حق دہد مانند مرغاں روزیت'' کے مصداق ہوتی۔ دو سال اسی کشمکش میں گزر گئے صبح سے شام اور شام سے صبح ہوتی مفتی صاحب اپنا سفر جاری رکھتے۔ دو سال کے بعد چوک دالگراں کے چند تاجروں نے ہاتھ بٹانا شروع کیا اور جامعہ کے طلبہ کے خورونوش میں مالی تعاون کرنے لگے۔

مفتی صاحب تدریسی مصروفیتوں کے ساتھ مسجد دالگراں میں وقت کے بلند پایہ علماء کرام اور بلند گفتار خطیبانِ شہر کو دعوت تقریر و خطاب دیتے۔ اس طرح آپ کے طلبہ، اساتذہ، احباب اور علاقہ کے عام رہائشی بھی دینی مسائل سے آگاہی حاصل کرنے لگے۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب نے سیاسی و دینی راہنماؤں کے لیے بڑے بڑے اجلاس منعقد کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا اور چوک دالگران کی سڑکوں پر رات کے وقت بڑے بڑے جلسے ہوتے جس میں لاہور کے مختلف علاقوں سے سامعین چلے آتے۔

ہم لوگ جمعہ کی نماز پڑھ کر مفتی صاحب کے پاس چوک دالگراں کی مسجد میں چلے آتے۔ آپ کے حجرے میں مشاورتی میٹنگ ہوتی، احباب سے ملاقات ہوتی، معاونین سے ملتے اور علماء کرام سے تعارف ہوتا۔ مفتی صاحب مرحوم کی محنت اور ریاضت سے جامعہ نعیمیہ کو وسعت ملتی گئی اور آپ کے روابط بڑھتے گئے حتیٰ کہ برانڈرتھ روڈ کے سنی تاجروں نے ایک بورڈ قائم کیا جو جامعہ نعیمیہ کے تمام اخراجات کی کفالت

کی ذمہ داری اٹھاتا۔ اب مفتی صاحب کو کھل کر کام کرنے کا موقع مل گیا۔

حضرت مفتی محمد حسین جامعہ نعیمیہ لاہور کے بانی شیخ الحدیث، مہتمم اور ممتاز دینی عالم دین تھے۔ وہ دینی علوم کی اشاعت کی عملی قوت کے ساتھ ساتھ سیاسیاتِ حاضرہ پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں سنبھل ضلع مراد آباد انڈیا میں پیدا ہوئے۔ والد مکرم ملا تفضل حسین مرحوم سنبھل کے ایک ممتاز تاجر تھے۔ جنہیں دین اور شعائرِ اسلام سے دلی محبت تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو عالم دین اور مبلغ اسلام دیکھنے کے خواہاں تھے۔ ۱۹۳۳ء میں حضرت مولانا نعیمی جامعہ نعیمیہ مراد آباد میں داخل ہوئے۔ دو سال میں فارسی کی کتابیں اور سات سال میں درس نظامی پر عبور حاصل کیا۔ جامعہ نعیمیہ میں ان دنوں آپ کے مولانا محمد یونس صاحب (جو حضرت صدر الافاضل کے وصال کے بعد جامعہ کے مہتمم اعلیٰ بنے) تدریس پر مقرر تھے۔ ان دنوں حضرت صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے چند طلبہ پر خصوصی توجہ دینے کیلئے چند ذہین طلبہ کی ایک علیحدہ جماعت بنائی جس میں حضرت مفتی محمد حسین نعیمی کے علاوہ مولانا حافظ نذیر الاکرم (مبلغ اسلام افریقہ و یورپ)، مفتی حبیب اللہ صاحب، مولانا ریاض الحسن صاحب اور مخدوم معین الدین نعیمی (مدیر سوادِ اعظم لاہور) شامل تھے۔ صدر الافاضل کی زندگی کا یہ آخرین خصوصی حلقہ طلبہ تھا۔ مفتی صاحب ۱۹۴۲ء میں سند فراغت لے کر میدانِ عمل میں نکلے۔ تعلیم کے دوران جن اساتذہ سے مفتی صاحب نے استفادہ کیا ان میں سے مولانا وصی احمد سہسرامی، مولانا محمد عمر نعیمی (مدفن کراچی) اور مولانا محمد یونس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری نے لاہور سے صدر الافاضل کو دارالعلوم حزب الاحناف لاہور کے لیے ایک مدرس کے لیے لکھا تو صدر الافاضل نے مفتی محمد حسین نعیمی کو ۱۹۴۲ء میں لاہور بھیجا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک دارالعلوم حزب الاحناف میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک دارالعلوم نعمانیہ میں مدرس رہے۔

تحریک ختم نبوت زوروں پر تھی۔ مفتی صاحب نے صاحبزادہ سید محمود احمد رضوی کے

مل کر دارالعلوم حزب الاحناف اندرون دہلی دروازہ میں ایک ایسا مرکز قائم کیا۔ جہاں پولیس اور فوج کے نوجوانوں کو تحریکِ ختمِ نبوت کی اہمیت پر ذاتی مشین پر پمفلٹ چھپوا کر تقسیم کرتے۔ آپ مارشل لاء کے دوران اگرفتار کر لیے گئے۔ مگر فوجی عدالت نے بری کر دیا لیکن ایک دوسرے مقدمہ کی سماعت جاری تھی کہ مارشل لاء کا زور ٹوٹ گیا اور آپ بری ہوگئے۔ مفتی صاحب جیل سے رہا ہو کر آئے تو دارالعلوم نعمانیہ سے استعفاد دے دیا اور اپنی مسجد چوک دالگراں میں ایک دینی دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ اس دارالعلوم میں پہلی بار جن اساتذہ نے مفتی صاحب کے ساتھ علمی دست تعاون بڑھایا ان میں حافظ محمد عالم صاحب سیالکوٹی، مولانا عبدالمصطفیٰ ازہری، مولانا عبدالغفور صاحب لاہور، مولانا عبدالحی اور صاحبزادہ ارشاد حسین چوراشریف کے اسماء گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جامعہ نعیمیہ کی بڑھتی ہوئی شہرت نے طلبہ کی ایک خاصی تعداد جمع کر لی۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں مسجد میں جگہ کی کمی کی وجہ سے دارالعلوم کو چوک دالگراں سے عیدگاہ چوک گڑھی شاہو میں منتقل کر لیا گیا اور اس ویران مسجد اور عیدگاہ پر طلبہ کے لیے رہائش اور تدریس کا کام ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ یہاں ایک عظیم الشان مسجد اور دارالعلوم کی قابل رشک عمارت کی تعمیر شروع ہوگئی۔ مفتی صاحب کی شبانہ روز محنت اور خلوص نے لوگوں کے اندر بے پناہ جذبہ تعمیر و تدریس پیدا کیا چنانچہ یہاں اس وقت کے ۸ لاکھ روپے کی لاگت سے شاندار دارالعلوم قائم ہوگیا۔

ان دنوں اس دارالعلوم میں جناب مولانا غلام رسول صاحب سعیدی، مولانا غلام رسول قادری، مولانا احمد حسن نوری اور دیگر نامور علماء کرام مصروف تدریس تھے۔ مفتی صاحب کے نامور شاگردوں میں سے مولانا الٰہی بخش، مولانا باغ علی نسیم صاحب، مولانا ارشد پناہوی، محمد اشرف کاظمی، (مفتی کشمیر)، حافظ محمد عالم صاحب سیالکوٹی، قاری غلام رسول صاحب، مولانا فیض الحسن تنویر، مولانا عبدالحکیم صاحب شرف، مولانا ابوسعید نقشبندی (خطیب داتا گنج بخش)، صاحبزادہ حبیب اللہ خطیب سرائے عالمگیر

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۶۷ء میں جمعیت العلماء پاکستان کی تطہیر کے لیے مفتی صاحب نے زبردست مہم چلائی۔ وہ جمعیۃ العلماء کو ایک فعال جماعت بنانا چاہتے تھے۔ حکومت وظیفہ خوار اور حاشیہ بردار درباری علماء سے علیحدہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ کی کوش سے ملک بھر کے سنی علماء ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے اور جمعیۃ العلماء پاکستان کی قیا شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی کے ہاتھ آگئی۔ چوک دالگراں کی جامع مسجد کو اوقاف نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ صدر ایوب کے دور میں جب تمام علماء کو حکومت مرضی پر عید پڑھانے کو کہا گیا تو مفتی صاحب نے سخت احتجاج کیا۔ چنانچہ آ کو دوسرے علماء کے ساتھ گرفتار کر کے مچھ جیل بلوچستان میں قید کر دیا گیا۔

آپ بڑے باہمت، مخلص اور باشعور علماء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کی ہمت محنت کی ترجمانی دار العلوم کی عظیم عمارت اور خوش انتظامی کرتی ہے وہ دوستوں کی قدر کرتے اور اپنی سیاسی بصیرت کی وجہ سے عالم اسلام کی نامور شخصیتوں کو دعو دے کر جامعہ کی مختلف تقاریب میں جمع کرتے۔ محکمہ اوقاف کی بے جا سختیوں باوجود وہ اپنا کام کرتے جاتے اور علم دین کی اشاعت کے لیے ''اوراقِ غم'' ''الخیرات الحسان'' اور کتاب الشفاء عربی میں اس وقت طباعت کرائیں جب کوئی ان کی اشاعت کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔

تدریس و تقاریر کے علاوہ مفتی صاحب چاہتے تھے کہ جامعہ نعیمیہ کو مرکز تبلیغ اسلام دیا جائے۔ ماہانہ ترجمان ہو، چنانچہ مفتی صاحب کے ایک معتقد موچی دروازہ سے ا رسالہ ''حنفی'' شائع کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی تنگ دستی کی وجہ سے اس رسالے کی نظامت مفتی صاحب کے سپرد کر دی۔ یہ رسالہ ایک سال چلا مگر مفتی صاحب کے ا مضمون پر ایڈیٹر رسالہ کی باز پرس ہوئی تو وہ ڈر گیا اور ''ماہنامہ'' حنفی کی نظامت سے صاحب کو دستبردار ہونا پڑا۔ ان دنوں یورپ کے ایک شہرت یافتہ سکالر ڈاکٹر اسد لاہو

سے انگریزی زبان میں ایک ماہنامہ ''عرفات'' نکالتے تھے وہ پاکستان بننے کے جاری نہ رکھ سکے، ہمیں ڈاکٹر اسد سے شناسائی تھی چنانچہ ماہنامہ ''عرفات'' کا شن مفتی صاحب کے نام تبدیل کرایا گیا، اس طرح یہ جامعہ نعیمیہ کا ترجمان بنا۔ یشن پر میدانِ عرفات کی جو تصویر لگی وہ ڈاکٹر اسد نے مہیا کی تھی جو انہوں نے ہور کتاب A CRASS Road To Mecca میں شائع کی تھی۔ بعد فظ محمد یوسف سدیدی مرحوم سے عرفات کا ٹائٹل لکھوایا گیا اور یہ ماہنامہ جاری و رہا۔ ہمیں یاد ہے کہ کئی مضامین کے علاوہ ایک مستقل عنوان ''اور راوی بہتا رہا'' قلم راوی بن کر لکھتا گیا اور قارئین کو دعوت فکر دیتا رہا۔

مسجد اور جامعہ کی عمارات کی تعمیر اگرچہ بہت بڑا منصوبہ تھا مگر مفتی صاحب مرحوم یک اینٹ اور ایک ایک پتھر کی تنصیب کی نگرانی کرتے۔ ہاتھوں میں تیشہ و لے کر ان کوتاہیوں کو دور کرتے جو معماروں اور مزدوروں کی نظر سے بچ ۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جامعہ نعیمیہ کی تعمیر و تکمیل میں زندگی وقف کر دی، طلبہ داد بڑھتی گئی، اساتذہ آتے گئے، تعلیم کا معیار بلند ہوتا گیا، تدریس کے زاویے تے گئے اور آپ کی قابلیت، محنت، بصیرت اور شخصیت آسمان شہرت کی بلندیوں کو گئی۔ آپ نہایت مستقل مزاجی سے اس شاہراہ پر گامزن رہے حتیٰ کہ ایک دن آیا اپنے احباب، علماء و مشائخ، اساتذہ و تلامذہ، لائق فرزندوں، جانشینوں ہزاروں ندوں اور لاکھوں غمگساروں کے عظیم الشان اجتماع کے سامنے جامعہ نعیمیہ کے حفظ و قرات کے دامن میں ابدی نیند کی گود میں چلے گئے۔

''زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!''

نا احمد حسن نوری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۹۹۸ء):

مولانا احمد حسن نوری علیہ الرحمہ مغلپورہ لاہور کی ایک جامع مسجد پوسٹ آفس کے ب تھے۔ سادہ مزاج، مخلص اور محنتی عالمِ دین تھے۔ آپ نے تیس سال سے زیادہ

آپ کی رفاقت میں رہے۔ یہاں مولانا نے تمام علوم منقولات اور معقولات کی
کی۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا سردار احمد لائلپوری رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ منظر الاسلام
لائل پور میں دورۂ حدیث پڑھا اور دستار فضیلت ۱۹۵۶ء میں حاصل کی اور پھر
چھاؤنی لاہور میں مولوی جان محمد کی مسجد میں خطیب مقرر ہوئے۔ ایک سال آپ
نواب شاہ سندھ میں بطور خطیب اور مدرس کی خدمات انجام دیں۔ مگر لاہور کی
نے آپ کو پھر کھینچا اور مسجد رام گڑھ میں خطیب مقرر ہوئے۔ شیخ الحدیث مولانا
رسول صاحب رضوی لائل پور منتقل ہوئے تو آپ مدرسہ نظامیہ رضویہ میں مدرس
ناظم مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں مولانا اعجاز ولی خان مرحوم کے مشورہ پر ''مکتبہ
قائم کیا اور راقم کے اصرار پر گنج بخش روڈ پر چلے آئے۔ مکتبہ کی مصروفیت سے آپ
جامعہ نظامیہ سے استعفادے دیا اور ہمہ تن اشاعت کتب میں مصروف ہو گئے۔
نے خون کے آنسو، مسلک امام ربانی اور مسلم الثبوت جیسی کتابیں طبع کرائیں۔
البحار فی فضائل بنی المختار تصنیف علامہ امام یوسف نبہانی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ
۱۹۷۳ء میں حج کیا۔ مکتبہ حامدیہ کے ساتھ ساتھ جامعہ شیرازیہ لاہور میں
مدرس رہے۔ تصنیف و تالیف کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ جمعہ کی خطابت کو باقاعدگی
سے ادا فرماتے اور تقریر و بیان سے عمر بھر وابستگی رکھی۔ آپ عالمانہ تقریر کرتے
اہلِ علم و دانش سے داد پاتے۔ وہ نظریاتی اعتبار سے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی
کے پیروکار تھے۔ سیاسی دنیا میں ''جمعیت علماء پاکستان'' سے وابستہ تھے۔
علمائے پاکستان کی شکست و ریخت کے باوجود انہوں نے آخری دم تک اس کا ساتھ
دیا۔ قائدِ اہلسنّت، صدر جمعیت علمائے پاکستان مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی
سے انہیں قلبی لگاؤ تھا۔ وہ ان کی محبت و عقیدت اور سیاسی نظریات پر پورا یقین رکھتے
تھے۔ جب علمائے اہلسنّت کی اکثریت مولانا نورانی سے منہ پھیر کر انتشار اور افتراق
کی وادی میں گم ہو گئی تو آپ دل گرفتہ ہو کر کڑھتے اور خون کے آنسو روتے۔ مولانا

نورانی کی عظمت کو سلام کرتے، مولانا شاہ احمد نورانی بھی آپ کے خلوص محبت اور
اخوت کی قدر کرتے تھے اور انہیں اپنے محبوب ترین احباب میں شمار کرتے۔ مولانا
دارالاسلام کی موت سے دنیائے اہلسنّت کے علمی سرمایہ کا ناشر اور جمعیت علمائے
پاکستان کا ایک جانباز سپاہی چھن گیا، جس کی ایک عرصہ تک کمی محسوس کی جائے گی۔

مولانا خلیل احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۹۸-۳-۲۶):

امین الحسنات مولانا خلیل احمد قادری حضرت مولانا ابوالحسنات قادری رحمۃ اللہ علیہ کے
فرزند ارجمند اور اپنے والدِ محترم کی رحلت کے بعد تادمِ حیات مسجد وزیر خان کے
خطیب رہے۔ مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف لاہور سے دستارِ فضیلت حاصل کی اور
حکمت میں اپنے والدِ مکرم کے مخصوص نسخوں اور طریق علاج کے امین رہے۔ آپ نے
کے دور میں دینی تحریکوں میں عملی حصہ لیا۔ ''تحریکِ ختمِ نبوت'' میں ایک مجاہد کی
حیثیت سے جلوہ گر ہوئے۔ گرفتار ہوئے، لاہور کے قلعہ کے عقوبت خانہ میں رہے اور
عذاب کی تکالیف کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ مارشل لاء نے انہیں سزائے موت کا حکم
لیا مگر ثابت قدم رہے۔ والدِ مکرم مولانا ابوالحسنات کے حکم پر تحریکِ ختم نبوت میں
ایک طویل عرصہ تک پس دیوار زنداں رہے۔ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خلیل احمد
قادری ابتلائی منازل سے بڑی پامردی سے گزرے۔ لاہور میں مسجد وزیر خان کے پاس
''دارالعلوم حسنات العلوم'' قائم کیا۔ مسجد کی خطابت کو تادمِ زیست اپنایا۔ ''تفسیر الحسنات''
کے آخری حصوں کو مکمل کیا اور انہیں چھپوایا۔ آپ اپنے والد مولانا ابوالحسنات اپنے دادا
مولانا سید دیدار علی شاہ الوری رحمۃ اللہ علیہ کی مسند خطابت پر عمر بھر قائم رہے۔

(''جہانِ رضا'' اپریل، مئی ۱۹۹۸ء)

’’میری زندگی کے چار مقاصد ہیں: قرآن کا حفظ کرنا، دینی علوم کی تحصیل وتدریس، حج بیت اللہ شریف اور شہادت اور الحمد للہ، مجھے پہلی تین چیزیں میسر ہیں، مگر شہادت کی سعادت حاصل نہیں کر سکا۔ مجھے اس کی تمنا ہے، اگر آپ کلمۂ حق پر شہادت کا رتبہ دے سکیں تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی‘‘۔ بادشاہ نے مولانا یار محمد اور دوسرے سنی علماء کرام کو گرفتار کر کے پسِ دیوارِ زندان بھیج دیا۔

شاہی مسجد پر شیعوں کی امامت کا تنازعہ:

بادشاہ کے اس رویہ پر لاہور کے علاوہ پنجاب بھر کے علماء نے احتجاج کیا۔ ان دنوں لاہور میں ایک لاکھ افغان موجود تھے۔ انہوں نے بادشاہ کے فیصلے پر مزاحمت کرنے کا اعلان کیا مگر بادشاہ نے حکم دیا کہ لاہور کے قاضی القضاہ (چیف جسٹس) اور بادشاہ کے بیٹے شہزادہ عظیم الشان بذات خود بادشاہی مسجد میں جائیں اور کسی عالم دین کو لے جا کر خطبہ جمعہ میں ’’علی ولی اللہ وصی رسول اللہ‘‘ کا اضافہ کریں۔ جمعہ کے دن جب ایک عالمِ دین کو لے کر بادشاہی مسجد میں قاضی القضاۃ اور شہزادہ عظیم الشان پہنچے تو ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر جمعہ کا خطبہ پڑھنے کے لیے آنے والے عالمِ دین کا سر قلم کر دیا۔ اب بادشاہ نے ۲۲ اکتوبر ۱۷۱۱ء کو اعلان کیا کہ ’’بادشاہی مسجد لاہور میں وہی خطبہ پڑھا جائے گا جو اورنگزیب کے عہدِ حکومت میں پڑھا جاتا تھا‘‘۔

لاہور کی مساجد سکھوں کے قبضہ میں:

مغلوں کا آخری دور اورنگزیب کے نااہل جانشینوں کا دور تھا۔ وہ نہ تو مسلم رعایا کو اعتماد میں لے سکے، نہ غیر مسلم رعایا سے اچھا سلوک کر سکے، وہ نہ تو سرحدوں کا دفاع کر سکے، نہ اندرونی شورشوں پر قابو پا سکے۔ وہ اقتدار کی جنگ میں ایسے الجھے کہ پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ مسلمانوں کی مساجد، قصبے، مدرسے، خانقاہیں سکھ لٹیروں کی زد میں رہے۔ انہیں کوئی روکنے اور ٹوکنے والا

نہیں تھا۔ لاہور خصوصی طور پر تباہ ہونے لگا۔ سکھوں کے حملے بڑھتے گئے مسلمانوں کی مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں پامال ہو رہی تھیں۔ ایک وقت آیا کہ لاہور کی بادشاہی مسجد سکھا شاہی کا نشانہ بنی اور اسے سکھ فوجیوں کے گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا گیا، بیگم شاہی مسجد لاہور کو بارود خانہ بنا دیا گیا، مسجد شاہ چراغ، مسجد دائی انگہ اور مسجد مائی لاڈو فوجیوں کی رہائش گاہیں بنادی گئیں۔ لاہور ایک عرصے تک سکھا شاہی کے مظالم کا شکار رہا۔ بادشاہی مسجد ویران ہوگئی۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ سکھ جرنیل اقتدار کی جنگ لڑتے ہوئے مسجد کے میناروں پر ’’دمدمہ‘‘ نصب کر کے شاہی قلعہ میں اپنے مخالف کو نشانہ بناتے۔ دوسری طرف سے توپوں کے گولے شاہی مسجد کے در و دیوار کو مجروح کرتے اور میناروں کو نقصان پہنچاتے۔

شاہی مسجد کی واگذاری کے بعد پہلا خطیب:

سکھوں کا دَور ختم ہوا تو انگریزی اقتدار آیا، انگریزوں نے ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو ایک فرمان جاری کیا کہ آج کے بعد سکھ حکومت ختم کی جاتی ہے۔ لاہور برٹش سلطنت کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ پنجاب کی تمام رعایا اپنے مذہبی معاملات میں آزادی سے کام کر سکے گی، سکھوں نے جن مساجد کو قبضہ میں لیا تھا انہیں مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے گا اس اعلان کے بعد بھی بادشاہی مسجد انگریزی فوجوں کا ملٹری کیمپ بنی رہی مگر ۱۸۵۶ء کو چیف کمشنر لاہور جان لارنس نے مسجد کو مسلمانوں کے حوالے کرنے کا اعلان کیا اور سید بزرگ شاہ ولد قاضی غلام شاہ کو بادشاہی مسجد کا متولی قرار دیا گیا۔

بادشاہی مسجد کی آزادی اور بحالی کے بعد مسلمانوں میں اطمینان اور سکون کی فضا قائم ہوئی اور اس تاریخی مسجد کے میناروں سے کئی سالوں کے بعد اذان کی آواز گونجنے لگی اور مسجد میں نمازیں پڑھی جانے لگیں۔ لاہور کے مسلمانوں نے بادشاہی مسجد کے صحن میں یومِ تشکر منایا اور صلوٰۃ وسلام کی دلنواز آوازوں سے شاہی مسجد کے در و دیوار معمور ہونے لگے۔

مولانا احمد دین بگوی رحمۃ اللہ علیہ:

بادشاہی مسجد کی آزادی کے بعد جس خطیب نے نمازِ جمعہ کا پہلا خطبہ دیا وہ ملک کے مایہ ناز سنی عالمِ دین مولانا احمد دین بگوی تھے۔ مولانا احمد دین بگوی موضع بگہ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے تھے۔ دہلی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے دارالعلوم سے سند فضیلت لے کر لاہور آئے۔ وہ زبردست عالمِ دین تھے سنی العقیدہ تھے، حنفی اہل کے ترجمان تھے، تدریس میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے وہ چار سال تک بادشاہی مسجد کے خطیب رہے پھر انہیں اپنے وطن مالوف بگہ جانا پڑا تو ان کے بھائی مولانا غلام محمد بگوی (م ۱۹۰۰ء) بادشاہی مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔

مولانا غلام محمد بگوی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا غلام محمد بگوی نے بادشاہی مسجد کو علم و ارشاد کا مرکز بنادیا۔ آپ نے شاہی مسجد کے وقار کو بحال کرنے میں شب و روز کام کیا ''تذکرہ علمائے اہلِ سُنّت لاہور'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ مولانا غلام محمد بگوی اپنے بھائی مولانا احمد دین بگوی کی رفاقت میں ۱۸۵۶ء میں بادشاہی مسجد کے امام و خطیب مقرر ہوئے۔ آپ نے شاہی مسجد لاہور کو علم و فضل کا سرچشمہ بنادیا۔ اس عظیم الشان مسجد کو علماء و طلبہ سے بھر دیا۔ آپ کی کوششوں سے بادشاہی مسجد میں دارالعلوم نعمانیہ کے طلبہ کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ آپ انجمن نعمانیہ لاہور کے بانی او، دارالعلوم نعمانیہ کے صدر مدرس بھی تھے۔ بادشاہی مسجد کے اس دارالعلوم نے علمائے حنفی اور طلبائے اہلِ سُنّت کی ایسی تربیت کی کہ سارا پنجاب گونج اٹھا۔

مولانا غلام محمد بگوی رحمۃ اللہ علیہ بھیرہ سرگودھا کے نزدیک قصبہ ''بگہ'' کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ پنجاب، سرحد اور دہلی کے دینی مدارس سے مختلف علوم سے مزین ہو کر لاہور پہنچے تو ان کی قابلیت اور علمی اہمیت کے پیشِ نظر آپ کو بادشاہی

مسجد کا خطیب بنادیا گیا۔ آپ نے انجمن مستشار العلماء قائم کی جو لوگوں کے دینی مسائل کا حل بتاتی، دینی راہنمائی کرتی۔ آپ نے اس سلسلہ میں حنفی علماء کا ایک بورڈ قائم کیا جو دینی مسائل کو حل کرتے۔ ۱۸۸۷ء میں انجمن نعمانیہ لاہور نے آپ کی زندگی میں دارالافتاء قائم کیا تو اس کا بورڈ شاہی مسجد میں ہی کام کرتا تھا۔ مولانا غلام محمد بگوی ۴۴ سال تک بادشاہی مسجد کے خطیب رہے اور ۱۹۰۰ء میں فوت ہوئے۔

مولانا محمد شفیق بگوی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا غلام محمد بگوی کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے مولانا محمد شفیق بگوی بادشاہی مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔ آپ نے دینی تعلیم بھیرہ سے مکمل کی تھی۔ تکمیل علوم لاہور سے کی۔ دارالعلوم نعمانیہ لاہور سے سند فضیلت حاصل کی۔ خواجہ شمس العارفین سیالوی سے بیعت تھے۔ آپ بادشاہی مسجد کی بحالی کے بعد تیسرے عالمِ دین تھے جو اپنی اہلیت کی وجہ سے اس اہم منصب پر فائز ہوئے۔ آپ بادشاہی مسجد کی خطابت کے ساتھ ساتھ اعزازی طور پر سنٹرل جیل لاہور میں قیدیوں کو دینی تعلیم بھی دیتے۔ ایچی سن کالج میں دینیات پر لیکچر دیتے۔ آپ کے شاگردوں میں پنجاب کے جاگیرداروں اور اعلیٰ افسروں کے بیٹے تھے جو آگے جا کر حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچے۔ آپ ۱۹۱۳ء میں بادشاہی مسجد کی خطابت سے فارغ ہو کر بھیرہ میں شمس العلوم کے ناظم اعلیٰ ہو گئے۔

پروفیسر مولانا محمد ذاکر بگوی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا محمد شفیق بگوی کی سبکدوشی کے بعد مولانا محمد ذاکر بگوی خطیب بادشاہی مسجد مقرر ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم بھیرہ سے پائی تھی مگر لاہور کے جید علمائے کرام سے تفسیر و احادیث کے علوم حاصل کیے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی اور عربی میں مہارت حاصل کرتے رہے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے ''مدرسہ حمیدیہ'' کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ آپ حضرت خواجہ محمد دین سیالوی کے مرید تھے۔ ان سے خلافت پائی۔

۱۹۱۳ء میں بادشاہی مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔ تادمِ حیات (۱۹۱۶ء تک) [illegible]
کے فرائض سرانجام دیتے رہے وہ لاہور میں پرنس آف ویلز کی آمد پر شاہی [illegible]
خطیب تھے مگر اس کے استقبالیہ اجلاس میں شرکت سے معذرت کر دی۔ آپ [illegible]
میں فوت ہوئے مگر اپنے آبائی قبرستان بگہ میں دفن کیے گئے۔

پروفیسر سید احمد علی شاہ بٹالوی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا محمد ذاکر بگوی کی وفات کے بعد ایک زبردست عالمِ دین مولانا پروفیسر
احمد علی بٹالوی بادشاہی مسجد کے خطیب مقرر کیے گئے۔ آپ بٹالہ سے چل کر لاہور آئے
تو آپ کی خطابت نے اہلِ لاہور کو گرویدہ بنا لیا۔ وہ عیسائی مشنریوں سے مناظرے
کرتے اور انہیں برسرِ عام شکستِ فاش دیتے۔ ۱۸۸۲ء میں آپ نے مشن ہائی سکول
رنگ محل لاہور کے ہیڈ ماسٹر پادری پورن چند کو ایک مناظرہ میں شکست دی اور اسے
لاہور چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ آپ بلند پایہ خطیب، مناظرِ اسلام اور عالمِ دین ہونے
کے ساتھ ادیب، مصنف اور عربی کتابوں کے مترجم بھی تھے۔ آپ نے بادشاہی مسجد
کی خطابت کے دوران بڑی بلند پایہ کتابوں کے ترجمے کیے۔ دارالعلوم نعمانیہ اور
مدرسہ غوثیہ تکیہ سادھوان لاہور میں تدریسی فرائض سرانجام دیئے۔ ہر سال عید میلاد
النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر بادشاہی مسجد میں جلسۂ عام کا اہتمام کرتے اور سیرتِ رسول
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر علمائے کرام کی تقاریر کراتے۔ آپ ۱۹۲۶ء میں فوت ہوئے آپ تادمِ
حیات بادشاہی مسجد کے خطیب رہے۔

مولانا معوان حسین مجددی رحمۃ اللہ علیہ:

۱۹۲۶ء کو رامپور (ہندوستان) کے خانوادہ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک فاضل عالم
دین مولانا معوان حسین مجددی رحمۃ اللہ علیہ بادشاہی مسجد کی خطابت کے لیے منتخب ہوئے۔
آپ بے مثال مقرر تھے۔ اور خانوادۂ امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علماء کرام کی

[illegible] رکن تھے۔ آپ نے بادشاہی مسجد کی خطابت کے ساتھ ساتھ سلسلہ عالیہ مجددیہ
[illegible] روحانی تربیت کا آغاز کیا اور آپ کے زیرِ نگاہ مراقبے اور اذکار کی مجالس قائم
[illegible] لگیں۔ اس طرح بادشاہی مسجد علم اور روحانیت کا مرکز بن گئی۔ پنجاب کے علاوہ
[illegible] ہندوستان سے اور کابل وقندھار کے سالکانِ طریقت بھی تربیت پانے لگے۔
[illegible] دنوں جنوبی ہندوستان میں شدھی تحریک چلی تو آپ لاہور چھوڑ کر رام پور چلے گئے
[illegible] اس تحریک کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے علماء کرام کے ساتھ کام کر سکیں۔

مولانا غلام مرشد رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا معوان حسین مجددی کے بعد علامہ اقبال مرحوم نے انجمن اسلامیہ پنجاب
[illegible] کو سفارش کی کہ وہ مولانا غلام مرشد کو بادشاہی مسجد کا خطیب مقرر کریں۔ چنانچہ
مولانا غلام مرشد ۱۹۲۷ء کو بادشاہی مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔ وہ ایک عرصہ تک
دارالعلوم نعمانیہ لاہور میں تدریسی فرائض سرانجام دے چکے تھے۔ مولانا غلام مرشد
سرگودھا کے ایک گاؤں انگہ میں ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حضرت خواجہ
[illegible] تونسوی کے مرید تھے۔ اپنے مرشد سے ارادت کی وجہ سے بیٹے کا نام ”غلام
مرشد“ رکھا۔ مولانا غلام مرشد بڑے ذہین اور فطین تھے۔ قرآن حفظ کیا۔ درسی کتابیں
[illegible] پڑھیں۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور پہنچے۔ اورینٹل کالج لاہور کے قابل اساتذہ سے
[illegible] عربی میں مہارت پیدا کی۔ درسی کتابوں کو پڑھا۔ مولوی فاضل کیا۔ درس نظامی
[illegible] مکمل کیا پھر لاہور سے نکل کر دہلی، رامپور، اجمیر شریف اور مراد آباد سے مختلف علوم پر
[illegible] عبور حاصل کیا۔ لاہور کے دارالعلوم نعمانیہ کے صدر مدرس بنے اور بیس سال تک مسندِ
تدریس پر فائز رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاک وہند میں مختلف سیاسی اور دینی تحریکیں ابھر
رہی تھیں۔ آپ آل انڈیا مسلم لیگ کے رکن بنے، ”تحریکِ خلافت“ میں شرکت کی۔
انہیں دنوں حجازِ مقدس میں نجدیوں نے جنت البقیع کو پامال کر دیا۔ صحابہ کرام
کے مزارات کو پیوست زمین کر دیا، ان کی اس جارحیت پر سارا عالم اسلام تلملا اٹھا۔

ہندوستان میں زبردست تحریک چلی، لاہور میں مظاہرے ہونے لگے۔ مولانا
خان ایڈیٹر روزنامہ ''زمیندار'' نجدیوں کی حمایت کررہا تھا اور مولوی غلام مرشد
تائید کرتے تھے۔ اس سے برِصغیر کے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہور ہے
یہ دونوں دینی راہنما ان پر نمک پاشی میں مصروف تھے۔ مولانا غلام مرشد کو دار
نعمانیہ سے علیحدہ کردیا گیا۔ جو بھاٹی دروازے کی اونچی مسجد میں درس دینے لگے
نہ سکے۔ پھر وہ کناری بازار کی مسجد میں درسِ قرآن دینے لگے مگر مقامی علما
سوالات کی زد میں آکر پریشان رہنے لگے۔ دوسری طرف وہ عوام الناس کی
حمایت سے محروم ہوگئے، ان دنوں آپ کے نامور شاگردوں میں سے ڈاکٹر محمد
تاثیر، مولانا محمد بخش مسلم، ایم مسعود کھدرپوش، ڈاکٹر سید عبداللہ اور دوسرے کئی
آپ کے حلقۂ درس میں آئے، مگر مولانا غلام مرشد کا مضبوط دینی حلقہ بکھر گیا تھا
آپ کی علمی مسند بھی خالی ہوگئی۔

علامہ اقبال نے آگے بڑھ کر اس عالمِ دین کو بادشاہی مسجد کا خطیب
آپ ۱۹۲۷ء کے آخر میں منصب پر فائز ہوگئے اور ۱۹۵۶ء تک اسی منصب پر
مولانا غلام مرشد کا دورِ خطابت بڑے لمبا عرصہ کا دور تھا۔ اس دوران لاہور بڑی
تحریکوں کا مرکز تھا، غازی علم دین شہید، مسجد شہید گنج لاہور، علامہ مشرقی کی خاکسار
تحریک، تحریکِ خلافت اور سب سے بڑھ کر تحریکِ پاکستان نے لاہور کو سیاسی
مذہبی طور پر بیدار کردیا تھا۔ مولانا غلام مرشد ان تحریکوں میں برائے نام حصہ
حالانکہ ان تمام تحریکوں کا مرکزی مقام بادشاہی مسجد تھا۔ پیر مہر علی شاہ گولڑوی
بادشاہی مسجد کے سٹیج سے ہی مرزا قادیانی کو للکارا تھا۔ امیر ملت پیر جماعت علی شاہ
پوری نے شاہی مسجد سے ہی شہید گنج کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ علامہ مشرقی کی ''عسکری
تحریک'' کا اجلاس بادشاہی مسجد میں ہوا تھا۔ تحریک پاکستان کے دوران قائداعظم
علی جناح نے بادشاہی مسجد میں جلسۂ عام کیا تھا، پھر اسی مسجد کے قریب ۱۹۴۰ء میں

میں قائداعظم کی قیادت میں مسلمانانِ برِصغیر نے قراردادِ پاکستان منظور کی تھی،
تحریکوں میں مولانا غلام مرشد کا کردار خاموش تماشائی کا سا تھا۔

پاکستان بنا تو مولانا غلام مرشد بادشاہی مسجد کے خطیب تھے بادشاہی مسجد کی
مرمت کا آغاز ہوا، مگر مولانا صرف خطبہ جمعہ ادا فرماتے اور گھر چلے جاتے۔
پاکستان کے بعد سب سے پہلی ''تحریکِ ختمِ نبوت'' چلی تو پاکستان کے تقریباً تمام
علمائے کرام قید و بند میں تھے، مگر مولانا غلام مرشد ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مولانا غلام
مرشد ایک بدنصیب خطیب اور عالمِ دین تھے وہ ۳۸ سال تک بادشاہی مسجد کے خطیب
رہے مگر انہوں نے ایک دینی فیصلہ نہ کیا، ایک فتوی نہ دیا، ایک کتاب نہ لکھی، کوئی دینی
کام نہ کیا، دینی راہنمائی کے لیے ایک قدم نہ اٹھایا اور کسی دینی کام میں نمایاں کردار ادا
نہ کیا، حالانکہ وہ عالم و فاضل تھے، حافظِ قرآن تھے۔ بقول مولانا مسلم، حافظ بخاری
شریف تھے، وہ بادشاہی مسجد کی خطابت کے دوران وقت کے حکمرانوں کی خوشامد میں
لگے رہے، پاکستان بنا تو میاں ممتاز دولتانہ، سردار شوکت حیات خان، عبدالحمید دستی
اور دوسرے وزیروں کی کوٹھیوں کے اردگرد گھومتے رہتے اور دعوتیں کھاتے۔ ایک بار
شاہی مسجد کے سٹیج پر انہوں نے اعلان کیا کہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ جانوروں کی قربانی
کرنے کے بجائے اپنا روپیہ ملکی دفاع میں دے دیں۔ ایک بار حکومت نے چاند
دیکھے بغیر عید کرنے کا اعلان کیا تو مولنا غلام مرشد نے حکومت کے فیصلے کی تائید کی۔
ان کی ان آراء سے عام مسلمانوں کو ان سے نفرت ہوگئی لوگوں نے ان کو ''سرکاری
درباری مولوی'' کہہ کر مسترد کردیا۔

مولانا عبدالقادر آزاد (دیوبندی):

۱۹۶۳ء میں محکمہ اوقاف قائم ہوا تو بادشاہی مسجد بھی محکمہ اوقاف کی تحویل میں
آگئی۔ ان دنوں مولانا غلام مرشد کے نامور شاگرد مسعود کھدرپوش چیف آف اوقاف
مقرر ہوکر آئے تو مولانا غلام مرشد کو بادشاہی مسجد سے علیحدہ کردیا گیا پھر محکمہ اوقاف کا

ایک چھوٹا سا مولوی ''سنی عالمِ دین قیوم الٰہی عرفانی مرحوم'' کو بادشاہی مسجد کا خطیب مقرر کر دیا گیا۔ مولانا عرفانی عملیات وتعویذات کے بڑے ماہر تھے وہ رات کو وظائف کرتے اور دن کو اپنے افسروں پر پھونک مارتے رہتے۔ اس طرح وہ تین سال تک بادشاہی مسجد لاہور کی خطابت فرماتے رہے، انہی دنوں بہاولپور سے ایک جوان سال مولوی عبدالقادر آزاد اٹھے اور ایک سیاسی گروہ کے زور سے بادشاہی مسجد کے خطیب بن گئے۔ یہ پہلے ''دیوبندی مولوی'' تھے جو اورنگزیب عالمگیر کی مسجد کے محراب و منبر پر بیٹھے نظر آئے۔ مولانا آزاد پورے تیس سال بادشاہی مسجد کے خطیب رہے۔ مولانا آزاد نہایت ہی مستقل مزاج حکومت نواز عالمِ دین تھے، وہ خوشامد درآمد کے فن کو خوب جانتے تھے اور اسے استعمال میں لاتے۔ انہوں نے اپنے تیس سالہ دورِ خطابت میں ہمیشہ سرکاری لوگوں کو ہاتھ میں رکھا، جو حکومت آئی، اس کی تعریف کی، اس کے گن گائے۔ ذوالفقار علی بھٹو آئے تو بادشاہی مسجد کے محراب ومنبر ''اسلامی سوشلزم'' کا گہوارہ بن گئے۔ جنرل ضیاء الحق آئے تو عسکری نظام ''نظامِ رحمت'' تھا، وزیر اعظم نواز شریف آئے تو بینظیر پر لعنت بھیجتے اور اسے ووٹ دینے والے کا نکاح توڑ دیتے۔ بینظیر آئی تو اس کی جمہوریت کے لیے دعائیں کرتے، میاں نواز شریف دوبارہ آئے تو بینظیر کا نام لینا بھی گوارا نہ کرتے۔ یہ مولانا آزاد کی سیاسی حکمت عملی تھی جو بڑی کامیاب رہی۔ ہر آنے والے کا استقبال اور ہر جانے والے پر لعنت بھیجتے۔ انہوں نے اپنے تیس سالہ دورِ خطابت میں مولانا غلام مرشد کی طرح ایک دینی فتویٰ بھی جاری نہ کیا، ایک کتاب نہیں لکھی، ایک دینی کام نہیں کیا، ایک دینی ادارہ قائم نہیں کیا۔ جب حکومت نے انہیں بادشاہی مسجد سے نکالا تو نہایت حسرت ویاس سے

ع تھے دونوں ہاتھ خالی ''باہر کفن'' سے نکلے!

وہ افسروں کے محترم تھے، وہ حکمرانوں کے دعا گو تھے، وہ خوشامد کے بادشاہ تھے، وہ اپنی عمر عزیز کو سرکاری کاغذات میں گھماتے رہے، مگر کوئی کام نہ کر سکے، وہ

ساری زندگی ''آزادانہ'' انداز میں گزار کر ''راہی ملک فراغت و بے کاری'' ہو گئے۔

''حق مغفرت کرے عجب ''آزاد'' مرد تھا!''

ان کی جگہ حال ہی میں ایک دیوبندی مولوی اصغر علی عباسی بادشاہی مسجد کے خطیب بن کر آئے ہیں، انہوں نے اپنی نوکری کو ''برحق'' ثابت کرنے کے لیے اعلان فرمایا کہ بادشاہی مسجد ہمیشہ دیوبندی علماء کے پاس رہی ہے۔ یہ اتنا بڑا فریب ہے کہ ایک مسجد کا خطیب زبان پر نہیں لا سکتا۔ پھر شاہی مسجد کے خطیب کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔ بہر حال۔

لوگ یزداں کو بیچ دیتے ہیں ۔۔۔ اپنا مطلب نکالنے کے لیے

ہمارے ملک میں یہ ایک دینی المیہ ہے کہ جب سے مساجد محکمہ اوقاف کی تحویل میں آئی ہیں اس دن سے امامت اور خطابت کے بجائے ''نوکریاں'' لگ گئی ہیں حکومت کی حکمرانی کا انداز اپنا ہوتا ہے جو قابلِ ستائش نہیں مگر علمائے کرام اپنے منصب امامت وخطابت کے بجائے ''نوکریوں'' کے حصول میں سرگرمی سے لگے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج تک بادشاہی مسجد کا ایک ''نوکر خطیب'' کوئی دینی فیصلہ نہیں دے سکا، کوئی دینی معرکہ سرانجام نہیں دے سکا، مولانا غلام مرشد مرحوم سے لے کر آج تک جتنے خطیب اورنگزیب عالمگیر کی بادشاہی مسجد میں آئے ہیں، وہ ''نوکری'' پکی کرنے کے لیے، امیروں، وزیروں اور حکمرانوں کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں یا باہر سے آنے والے مہمانوں سے سونے کی گھڑیوں کے حصول کے لیے خوش آمدید کہتے رہتے ہیں۔

چناں نالیم اندر مسجد شہر ۔۔۔ کہ دل در سینۂ ملا گدازیم!

(''جہانِ رضا'' دسمبر ۱۹۹۸ء)

(''اخبارِ اہلِ سنت، لاہور'' جنوری ۲۰۰۰ء)

روشنی سے ملتا جلتا انسان

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عالمِ دین، ماہر تعلیم او
بلند پایہ مصنف اور مؤلف تھے۔ آپ کی ساری زندگی دینِ اسلام کی سربلندی او
قرآن واحادیث کی تفہیم واشاعت میں گزری۔ آپ عصرِ حاضر کے علمائے اہلِ سنت
میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور آپ نے اپنے قلم وفکر سے لوگوں کی جس قدر راہنمائی
فرمائی ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

آپ کے والدِ مکرم، پیر محمد شاہ ہاشمی بھیروی، خانوادۂ چشتی کی سیالوی نسبت میں ایک
بلند پایہ روحانی راہنما تھے۔ آپ کے حلقہ ارشاد میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ روحانی
تربیت حاصل کرتے رہے ہیں۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری ۲۱ رمضان ۱۳۳۶ھ کو بھیرہ ضلع
شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھیرہ میں اپنے والدِ مکرم کے زیرِ نگرانی مولانا محمد
قاسم بالاکوٹی سے حاصل کی تھی پھر آپ نے وقت کے ممتاز ماہرِ تعلیم مولانا محمد دین، مولانا
غلام محمود پپلاں میانوالی سے علومِ دینیہ کے مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کی۔ یہ علمائے
دین ان دنوں بھیرہ کی جامعہ محمدیہ غوثیہ میں تعلیم وتدریس میں مصروف تھے ان دنوں مراد
آباد بھارت میں صدرالافاضل سید نعیم الدین مرادآبادی کا دارالعلوم "جامعہ نعیمیہ" بڑی
تدریسی شہرت رکھتا تھا۔ چنانچہ آپ ۱۹۴۳ء میں وہاں پہنچے۔

احادیث کی کتابیں صدرالافاضل سے پڑھیں اور سند احادیث حاصل کر کے
وطن لوٹے۔ آپ نے عربی علوم اور دینی مروجہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ۱۹۴۵ء میں بی اے
کیا۔ پھر عالمِ اسلام کے بلند پایہ دارالعلوم جامعہ ازہر مصر میں داخلہ لیا۔ جامعہ ازہر

میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۴ء تک زیرِ تعلیم رہ کر جامعہ ازہر کی اعلیٰ سند علمیہ وادبیہ حاصل کی۔
آپ نے ۱۹۵۵ء میں ازہر یونیورسٹی مصر سے ہی ڈاکٹریٹ کی اور ایک سال بعد وطن
واپس آئے۔

آپ خانوادہ چشت میں حضرت پیر محمد ضیاء الدین سیالوی سے بیعت تھے۔
یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے پیرومرشد کی نسبت کو اپنی زندگی کی تمام تر کامیابیوں میں
شامل کیا۔ آپ کی تفسیر ضیاء القرآن، آپ کی سیرت پر بے مثال کتاب "ضیاء النبی"،
آپ کا ماہنامہ "ضیائے حرم"، آپ کا اشاعتی ادارہ "ضیاء القرآن پبلی کیشنز" اس
روحانی نسبت کا آئینہ دار ہے۔

خانوادۂ چشت کے ایک زبردست عالمِ دین خواجہ محمد قمرالدین سیالوی ملک کی
سیاسی اور دینی زندگی میں قائدانہ مقام پر فائز تھے۔ آپ نے تحریکِ پاکستان میں بڑی
خدمت کی۔ آپ نے تحریکِ ختمِ نبوت میں رہنمایانہ کردار ادا کیا۔ آپ نے جمعیت
علمائے پاکستان کے بانی رکن کی حیثیت سے ملکی سیاست میں اہم مقام حاصل کیا۔

حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری نے حضرت خواجہ محمد قمرالدین سیالوی کی قیادت
میں جمعیت علمائے پاکستان کے سٹیج سے ملکی سیاست میں قدم رکھا۔ اور نظامِ مصطفیٰ
صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد شروع کی۔ خواجہ قمرالدین سیالوی ان دنوں صدر
جمعیت العلمائے پاکستان تھے۔ پیر محمد کرم شاہ خواجہ سیالوی کے دستِ راست تھے۔
زیرِ قیادت تھے۔ ایک جاں نثار مرید کی حیثیت سے شب وروز کام کرتے رہتے۔
پاکستان میں نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کے لیے جب تحریک چلی تو جن علمائے کرام
نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں پیر محمد کرم شاہ الازہری صفِ اول میں کھڑے
تھے۔ آپ نے قید وبند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ اہل وعیال سے جدا کر دیئے گئے۔ حتیٰ
کہ آپ کو ایک عرصہ تک شاہ پور اور سرگودھا کی جیلوں میں پسِ دیوارِ زنداں رہنا پڑا۔
شاہ صاحب کی بلند علمی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اپنی مشہور تفسیر قرآن "ضیاء القرآن" قید

وبند کے دوران لکھی۔ اور اسے حافظہ کی مدد سے مختلف حوالوں سے مزین فرما کر اہل علم وفضل کے لیے ایک بے مثال تفسیر کی حیثیت سے زیورِ طباعت سے آراستہ کیا۔

ان دنوں انکارِ ختمِ نبوت کے ساتھ ساتھ پاکستان میں ایک دینی فتنہ انکار حدیث رسول پر مشتمل تھا۔ اس فتنہ کے سربراہ اور ترجمان مسٹر غلام احمد پرویز جنہوں نے اپنے ماہنامہ ''طلوعِ اسلام'' اور دوسری کتابوں میں یہ پراپیگنڈا شروع کیا کہ مسلمانوں کو صرف قرآن کی تعلیمات ہی کافی ہیں۔ حدیثِ نبوی اور سنت رسول اللہ کی کوئی حیثیت نہیں اس فتنہ کے خلاف علمائے اسلام نے آواز اٹھائی۔ احتجاج کیا اور اسے مسترد کیا۔ مگر پیر محمد کرم شاہ نے ایک زبردست کتاب ''سنت خیر الانام'' لکھی جس میں دلائل اور شواہد کے ساتھ احادیث کی ضرورت اور مقام کو واضح کیا۔ یہ کتاب ہزاروں کی تعداد میں کراچی سے چھپی اور ملک میں تقسیم کی گئی۔ آپ کی اس کتاب سے پیر محمد کرم شاہ بھیروی کی علمی تحقیق اور حدیث رسول پر قابلیت کا لوہا علمی دنیا میں تسلیم کیا گیا۔

ایسے دینی فتنوں کی آئے دن سر اٹھانے کی روش نے علمائے دین کو بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ پیر محمد کرم شاہ بھیرہ سے ۱۹۷۰ء میں لاہور آئے۔ ایک دینی اشاعتی ادارے کی بنیاد رکھی۔ ماہنامہ ''ضیائے حرم'' جاری کیا۔ اور دینی صحافت کے آسمان پر آپ کا یہ ماہنامہ ایک آفتاب بن کر اہلِ علم وفضل کے دل ودماغ کو روشن کرنے لگا۔ پیر صاحب اس رسالے کا اداریہ ''سر دلبراں'' کے عنوان سے لکھتے۔ تو علم وفضل کے دریا بہا دیتے۔ حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالتے۔ سیاسی اور دینی تحریکوں میں رہنمایانہ کردار ادا کرتے تھے۔ آپ کے اداریے، فتنہ انکار حدیث، فتنہ ختم نبوت اور فتنہ اسلامی سوشلزم پر کاری ضربیں لگاتے۔

تحریکِ نظامِ مصطفیٰ چلی تو آپ قائدِ اہلِ سنت الشاہ احمد نورانی کی قیادت میں صفِ اول کے سیاسی راہنما کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے۔ قید وبند کی صعوبتوں کو لبیک کہا۔ نظامِ مصطفیٰ کا پرچم بلند رکھا اور صبح سے شام تک ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ کر

آواز بلند کرتے رہے۔ آپ نے اپنے مریدوں میں سے جس کو بھی جمعیت علمائے پاکستان کا ٹکٹ لے کر دیا وہ صوبائی اور قومی اسمبلی میں بھاری اکثریت کے ساتھ پہنچا، یہ آپ کا سیاسی مقام تھا کہ آپ کا نمائندہ آپ کے مریدوں کے ووٹوں سے کامیاب ہوتا۔ ۱۹۷۴ء میں آپ کا دار العلوم جامعہ محمدیہ غوثیہ بھیرہ پاکستان کی اعلیٰ درسگاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ جہاں سیکڑوں طلبہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ پیر محمد کرم شاہ نے کئی سال تک اس دار العلوم کے طلبہ کو بذاتِ خود مسند تدریس پر بیٹھ کر علم وفضل سے آشنا کیا۔ پنجاب کے پیروں میں پیر محمد کرم شاہ واحد پیر تھے جو بیک وقت پیر بھی تھے، معلم بھی تھے، استاد بھی تھے۔ عالمِ دین بھی تھے، صاحبِ قلم ادیب بھی تھے، سیاسی راہنما بھی تھے اور اسلامی تحریکوں میں عملی حصہ بھی لیتے تھے۔ ان دنوں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت دینی مدارس پر پابندیاں لگا رہی تھی۔ ان پر قبضہ کر رہی تھی۔ اس نے پیر محمد کرم شاہ کو بھی حکم دیا کہ ان کا دار العلوم بند کر دیا جائے گا۔ پیر صاحب نے اس وقت کی حکومت کے اس اقدام کے جواب میں کہا کہ ''تم لوگ میرا مدرسہ چھین سکتے ہو، دار العلوم پر قبضہ کر سکتے ہو مگر میں تو ایسا درویش ہوں کہ بھیرے کے جنگلوں کے درختوں کے سایہ میں بیٹھ کر بھی دینی علوم پڑھاتا رہوں گا''۔

آپ نے تفسیر ''ضیاء القرآن'' کی اشاعت کا اہتمام کیا تو آپ کے پاس روپیہ پیسہ نہیں تھا آپ نے لاہور کے ایک تاجر غلام رسول اینڈ سنز اردو بازار لاہور کو آمادہ کیا کہ وہ تفسیر ضیاء القرآن کو زیورِ طباعت سے آراستہ کرے ان دنوں تاج کمپنی لاہور اور مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی بڑے بلند پایہ اشاعتی ادارے تھے۔ مگر ان اداروں نے تفسیر ''ضیاء القرآن'' چھاپنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ شاید یہ عوام میں مقبول نہ ہو سکے غلام رسول اینڈ سنز نے پہلی جلد شائع کی۔ مگر اس کا معیار پیر صاحب کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ ایک عرصہ کے بعد یہ تفسیر پیر صاحب نے خود چھپوانی شروع کی۔ آج اس کی ہزاروں نہیں لاکھوں جلدیں چھپ چھپ کر ملک اور بیرون ملک پھیل رہی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ پیر صاحب نے جب ''ضیائے حرم'' کی بنیاد رکھی تو میں ان
رفقائے قلم و اشاعت میں تھا۔ آپ نے میرے ہی مکتبہ کے ساتھ ضیائے حرم کا
قائم کیا اور مَیں ابتدائی پرچوں میں مختلف قلمی ناموں سے مضامین لکھتا رہا۔ ان دنوں
پیر صاحب ماہنامہ ''ضیائے حرم'' کو خصوصی توجہ دیتے۔ محنت کرتے ایک ایک مضمون
آپ کی نگاہ سے گزرتا۔ ایک ایک سطر پر آپ محاسبہ کرتے۔ ان کی اس توجہ اور محنت کا
یہ نتیجہ ہوا کہ یہ ماہنامہ سابقہ تیس سال سے دینی صحافت میں ایک اہم مقام رکھتا ہے اور
اب تک نہایت باقاعدگی سے جاری ہے۔

جنرل صدر ضیاء الحق مرحوم نے پیر صاحب کی اہلیت اور قابلیت کو تسلیم کیا۔ قدر
افزائی کی۔ اپنے قریب کیا اور تفسیر ضیاء القرآن کے مطالعہ کے بعد آپ کو بھرپور خراج
عقیدت پیش کیا اور برملا کہا کہ ''اگر آج کے زمانے میں اہلِ علم و فضل کو سونے سے
تولنے کا رواج ہوتا تو مَیں پیر کرم شاہ ازہری کو سونے سے تولتا''۔ صدر ضیاء الحق نے
آپ کو ترازو کے پلڑے میں تو نہ بٹھایا مگر آپ کو واقعی سونے سے تول دیا۔ ملک کی
سب سے بڑی شرعی عدالت کا جج مقرر کیا اور آپ کو دینی فیصلوں میں پورا پورا اختیار
دیا۔ جو حکومتیں بدلنے کے باوجود تادم رحلت آپ کے پاس رہا۔

پیر محمد کرم شاہ ازہری خالص سنی العقیدہ، حنفی مسلک اور چشتی طریقت پر ساری
زندگی رواں دواں رہے۔ وہ معتدل مزاج کے مالک تھے۔ مذہب میں سختی، یک رخی
اور تعصب کو نہیں لاتے تھے۔ آپ کی اس اعتدالی روش کو بعض سخت گیر سنی علماء کرام
گوشے والا پیر اور کچھ ''صلح کل'' کہا کرتے تھے۔ آپ کی ساری تصانیف میں اعتدال
روش نمایاں نظر آتی ہے۔ آپ نے سیاست میں بھی اعتدالی روش اختیار رکھی۔ کبھی
مزاحمت، ہڑتال، نعرہ بازی یا احتجاجی روش کو نہیں اپنایا۔

(اجالوں کا نقیب، عمران حسین چودھری، سنی فاؤنڈیشن بریڈفورڈ۔ یو کے ۱۹۹۸ء)

شیخ الحدیث حافظ محمد عالم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

اس سال علمائے اہلسنّت کا وہ کاروان جو ملک بقا کی راہوں پر چل کر ایک نئی
زندگی کا آغاز کر رہا ہے اس میں حافظ محمد عالم سیالکوٹی بھی شریک ہو کر ۲۰ اگست
۱۹۹۱ء کو راہی ملک دار القرار ہو گئے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ٥ آپ اپنی بیٹی کو
برطانیہ گئے تھے چند روز وہاں ٹھہرے، واپسی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں، جہاز کی
بک تھی، سینے میں تھوڑا سا درد اٹھا، ہسپتال پہنچے، ماہر ڈاکٹروں نے اپنی زندگی بھر
کے تجربات کی روشنی میں جان بخش دوائیاں دیں مگر داعی اجل نے ہاتھ بڑھایا اور
محمد عالم صاحب نے لبیک کہتے ہوئے جان، جان آفرین کے حوالے کر دی۔

حافظ محمد عالم سیالکوٹی کی موت نے دنیائے علم و فضل کا ایک روشن چراغ گل کر
دیا۔ کاشانۂ اہلسنّت و جماعت کی روشنیاں بجھ گئیں اور تعلیم و تدریس کا ایک درخشاں
آفتاب غروب ہو گیا۔ آپ کی رحلت پاکستان کے گوشے گوشے تک غم و اندوہ کا سامان
لے کر آئی۔ آپ کے اہل خاندان، آپ کے شاگردان عزیز، آپ کے احباب، آپ
کے ارباب کار، آپ کے حلقۂ علم کے خوشہ چین، آپ کے سیاسی رفقاء، آپ کے
سیاسی ہمنوا، آپ کے اعتقادی بادیہ پیما اور آپ کے ہزاروں آشنا دل گرفتہ اور دیدۂ تر
ہو کر رہ گئے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

حافظ محمد عالم مرحوم کے جنازے پر جتنے علمائے کرام شریک ہوئے شاید ہی کسی
جنازے پر آئے ہوں۔ حافظ محمد عالم کے غم میں جتنی آنکھیں اشکبار ہوئیں شاید ہی کسی

مرنے والے پر ہوئی ہوں۔ حافظ محمد عالم کی رحلت پر جس قدر غم و رنج کا اظہار کیا گیا
شاید ہی کسی کے حصے میں آیا ہو۔ وہ سیالکوٹ ہی نہیں سارے پاکستان کو اداس کر
گئے۔ سارے سینوں کو غمگین بنا گئے۔ سارے شہر علم و فضل کو ویران کر گئے۔

ع ''اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا''

اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دامن رحمت سے ڈھانپے اور انہیں جوار رحمت میں اعلیٰ
جگہ ملے جہاں مغفرت کے دریا بہتے ہیں۔

حافظ محمد عالم مرحوم ۱۹۲۷ء میں ریاست جموں و کشمیر میں جموں شہر سے تقریباً
بیس میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں ''سکہ'' میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی حاجی
شاہ محمد تھا۔ اور ریاست جموں و کشمیر کے گوجر خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے
زندگی کے ابتدائی سالوں میں سیالکوٹ آ کر قرآن مجید حفظ کیا۔ سیالکوٹ کے محلہ
''میانہ پورہ'' میں آپ کے پھوپھا تدریس قرآن کا ایک مدرسہ قائم کیے ہوئے تھے۔
یہاں سے حافظ محمد عالم مرحوم نے قرآن پاک کو اپنے سینے میں سمیٹا۔ ان دنوں
ریاست جموں کے دیہات میں لاہور کے ایک عالم اجل حضرت مولانا محمد نبی بخش
حلوائی (مولف تفسیر نبوی) اعتقادی تربیت کے لیے دور دراز علاقوں میں جایا کرتے
تھے۔ اعتقادی اصلاح کے ساتھ ساتھ مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ نقشبندیہ
مجددیہ بہ فیضان حضرت پیر جماعت علی شاہ لاثانی رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی تربیت بھی دیا کرتے
تھے۔ اس خطہ میں آپ کے ہزاروں مرید مختلف دیہاتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ حافظ
محمد عالم قبلہ بھی مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہوئے۔ مولانا نے اس ذہین
حافظ بچے کو اٹھایا اور لاہور لے آئے اور اعلان کیا کہ اسے ''عالم دین'' بنانا ہے۔

حافظ محمد عالم مرحوم لاہور پہنچے تو دہلی دروازے کے باہر ٹبی کوتوالی کے ساتھ جامع
مسجد کے مدرسہ میں داخل ہو گئے اور صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھنے لگے۔ یہ ایک
مختصر سا تدریسی ادارہ تھا جس میں ذہین بچے دینی علوم کی ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے۔

حافظ محمد عالم کے ابتدائی اسباق کے شریک درس چند ایسے طلبہ بھی تھے جو آگے جا کر
اپنے اپنے مقام پر بڑے معروف ہوئے۔ ان میں صاحبزادہ محمد اسلم ابن سید علی اکبر
شاہ علی پوری، صوفی غلام حسین گوجروی (مرید صاحبزادہ سید علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ)
اور پیرزادہ اقبال احمد فاروقی شامل ہیں۔ ان طلبہ کو ''مرکزی دار العلوم انجمن حزب الاحناف
لاہور'' کے ایک قابل استاد حضرت مولانا مہر دین رحمۃ اللہ علیہ خصوصی طور پر پڑھانے آتے
تھے۔ ابتدائی کتابوں سے ابھرے تو حافظ محمد عالم دار العلوم حزب الاحناف اندرون
دہلی دروازہ کے باقاعدہ طالب علم بن گئے۔ وہ سارا دن پڑھتے اور شام کو اپنے استاد و
مرشد مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں آ جاتے۔

حافظ محمد عالم مرحوم کی ذہنی اٹھان اتنی تیز تھی کہ وہ دینی مدارس کی سست روی کی
ہمنوائی کرنے سے قاصر تھی۔ وہ تعلیم کے لیے تڑپتے، تیز رو بن کر کتابیں پڑھنے کے
لیے بے چین رہتے مگر تدریسی حلقوں کی پابندی انہیں آگے بڑھنے نہ دیتی۔ ان کا ایک ہم
سبق (پیرزادہ اقبال احمد فاروقی - راقم) تعلیم و تدریس کی تلاش میں ریاست بہاولپور
کے ایک دینی مدرسے میں جا پہنچا تھا۔ جہاں اساتذہ تازہ جذبے سے پڑھاتے تھے۔
پیرزادہ اقبال احمد فاروقی نے لاہور آ کر بہاولپور کے تیز رفتار اساتذہ کی تعریف کی تو
حافظ محمد عالم مرحوم کسی کو بتائے بغیر ''زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت'' کہتے ہوئے
ریاست بہاولپور جا پہنچے۔ تدریس کا آغاز ہوا، کئی ماہ پڑھتے رہے مگر یہاں کے اساتذہ
بھی ان کی ذہنی تیزی کی ہمنوائی نہ کر سکے۔ آپ نے وہاں سے رخت سفر باندھا،
نواب آف ممدوٹ کی ریاست جلال آباد میں ایک عالم دین مولانا محمد علم الدین مرحوم
کے دینی درس میں آ بیٹھے مگر ایک ماہ کے بعد یہاں سے بھی اپنے دل ناصبور کے
ہاتھوں تنگ آ کر واپس لاہور آ گئے اور اپنے استاد مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے
مدرسہ میں دوبارہ داخل ہو گئے۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ''حافظ محمد عالم!
میں تجھے (عالم دین) بنانا چاہتا ہوں اور تم بہاولپور کے ریگستانوں میں مارے مارے

پھرتے ہو"۔

اب حافظ محمد عالم دارالعلوم حزب الاحناف، دارالعلوم نعمانیہ اور مدرسہ
کے اساتذہ سے کتابیں پڑھنے لگے۔

"دانہ می چیدیم ہر جائے کہ خرمن یافتیم!"

آپ نے چند سالوں میں نہ صرف دینی علوم کی متداول کتابوں پر دسترس حاصل
کرلی بلکہ منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات میں بھی کامیابیاں حاصل کر لیں۔
آپ دارالعلوم حزب الاحناف سے دستار فضیلت لے کر نکلے تو مختلف مدارس میں
بن کر مسند تدریس پر آبیٹھے۔ حزب الاحناف اور نعمانیہ کے علاوہ آپ نے دارالعلوم
جامعہ نعیمیہ چوک دالگراں لاہور کے اساتذہ کی اس ٹیم میں حصہ لیا جسے مفتی محمد
نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے منتخب کیا تھا۔ یہاں حافظ محمد عالم مرحوم نے دو سال پڑھایا
اکبری دروازے کے اندر ایک مسجد کی امامت سنبھالی۔ شاہ محمد غوث کی جامع مسجد میں
خطابت کا آغاز کیا۔ اور مسلم ماڈل ہائی سکول کے عربی استاد مقرر کر دیے گئے۔

زندگی کے اس موڑ پر حافظ محمد عالم مرحوم نے اپنے شہر سیالکوٹ پر نگاہ ڈالی
ایک عالم دین، ایک مفتی مدرس، ایک پختہ عقیدہ رکھنے والے سنی کی ضرورت تھی۔ آپ
کا گھر سیالکوٹ میں تھا۔ آپ کے قبیلے کے ہزاروں لوگ سیالکوٹ کے اردگرد
دیہات میں آباد تھے۔ جموں وکشمیر سے ہجرت کر کے آنے والے بے پناہ لوگ
سیالکوٹ میں آبسے تھے۔ حافظ محمد عالم مرحوم نے لاہور کی علمی مصروفیتوں اور رونقوں کو
خیرباد کہتے ہوئے شہر سیالکوٹ کے دل میں دو دروازہ کی جامع مسجد کو اپنا مرکز بنالیا۔
حافظ محمد عالم کے سیالکوٹ میں آنے کے بعد دو دروازہ کی مسجد تدریس علوم اسلامیہ اور
حفظ قرآن کا مرکز بن گئی۔ طالب علموں کے قافلے یہاں آنے لگے۔ حفظ کے علاوہ
دینی کتابیں پڑھنے والے طلبہ کے جمگھٹے لگ گئے۔ سیالکوٹ کے کوچہ و بازار اس بات
کی شہادت دیں گے کہ حافظ محمد عالم نے شبانہ روز درس و تدریس کا وہ کام کیا جس کی

مثال نہیں ملتی۔ آج سیکڑوں نہیں ہزاروں ایسے نوجوان علمائے کرام اور حافظ موجود
ہیں جو حافظ محمد عالم کے شاگرد رہے ہیں۔

حافظ محمد عالم نے ایک مدرس کی حیثیت سے دن رات کام کیا۔ مگر وہ سیالکوٹ کی
دینی مجالس میں بھی صف اول کے خطیب نظر آئے۔ دینی قیادت کی صف اول میں
دکھائی دیئے اسلامی تقریبات میں وہ ہمیشہ نمایاں نظر آئے۔ مرنے جینے کے موقع پر وہ
ہر حالت میں شریک ہوتے۔ وہ جدھر جاتے ان کے شاگردوں کا حلقہ ان کے ساتھ
ہوتا۔ اور سیالکوٹ شہر کے اکثر دکانداروں اور صنعت کاروں میں کوئی نہ کوئی فرد ان کا
شاگرد ہوتا۔

حافظ محمد عالم مرحوم نے سیاست میں قدم رکھا تو انہیں "جمعیت علماء پاکستان" کی
قیادت پسند آئی۔ وہ میدان انتخاب میں نکلے تو جمعیت العلماء پاکستان نے انہیں ٹکٹ
دیا تو سیالکوٹ کے شہریوں نے انہیں ووٹ بھی دیئے اور نوٹ بھی۔ پھر محبت اور پیار
سے ان کے ساتھ رہے۔ جب آپ پی این اے کی تحریک میں آگے بڑھے تو انہیں قید
و بند کی منزلیں بھی طے کرنا پڑیں۔ ان پر کئی مقدمات بنائے گئے۔ کئی گرفتاریاں
ہوئیں، کئی چھاپے پڑے۔ مگر وہ ہر ابتلا میں کامیاب نکلے۔ ہر امتحان میں کامران رہے۔
وہ ملک بھر کی دینی تقریبات میں ہمیشہ نمایاں نظر آتے۔ وہ اہلسنت و جماعت کی
آواز پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کے بیٹے حافظ محمد رضا نے جب آزاد
کشمیر کے انتخابات میں حصہ لیا تو حافظ محمد عالم مرحوم کا علمی اور سیاسی اثر نمایاں نظر آیا
اور آپ کا بیٹا ایم ایل اے ہو گیا۔ حافظ محمد عالم ایسے خوش قسمت عالم دین تھے جن کے
سارے بیٹے اور بیٹیاں حافظان قرآن ہیں۔ ان کے داماد عالمان دین ہیں۔ ان کے
بیٹے ان کے علمی جانشین ہیں۔

آپ ابتدائی طور پر حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور
مرید صادق تھے۔ ۱۱۔ اس طرح آپ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے وابستہ رہے۔ پہلے پیر و مرشد

کی رحلت کے بعد پیر قندھاری علیہ الرحمہ سے بیعت ہوئے۔ آپ کتابی علمی [illegible]
باوجود سلوک و روحانیت کی منازل طے کرنے لگے۔ انہیں جہاں علمائے مصر [illegible]
حیثیت دی وہاں وقت کے مشائخ نے آپ کو بڑی عزت دی۔ آپ خاندان [illegible]
سے عقیدت رکھتے تھے۔ وہ پیر محمد شفیع قادری آف ڈھوڈا شریف (گجرات) [illegible]
مند تھے۔ وہ حضرت پیر کرم شاہ بھیرہ شریف کی علمی رفاقت سے چشتی [illegible]
مقبول تھے۔

آج ہم اپنے دوست حافظ محمد عالم مرحوم کی رحلت پر اظہار غم کر رہے [illegible]
کے علمی اور تدریسی کارناموں کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام [illegible]
شاگردوں اور ان کی فاضل اولاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ مرحوم کے علمی [illegible]
مقامات پر ایک مکمل کتاب مرتب کریں۔ ایسے عالم دین کو جو ذرہ بن کر [illegible]
پہاڑیوں سے آیا اور آفتاب بن کر پاکستان کے دینی اور علمی آسمان پر چمکا [illegible]
دینا بڑی زیادتی ہے۔ علمی حلقوں میں ایک جملہ بڑا مشہور ہے۔

''موت العالِم موت العالَم''

ایک عالم کی موت ایک جہان کی موت ہوتی ہے۔ اس جملے کی روشنی میں [illegible]
یہ کہنے کی اجازت دیں کہ موت العالم، موت العالَم اور موت العالم موت العالَم [illegible]
حافظ محمد عالم کی موت ایک عالم دین کی موت ہے اور ایسے عالم کی موت [illegible]
کی موت ہوتی ہے!

؎ آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

(''جہانِ رضا'' ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۹ء)

بھاٹی دروازہ - لاہور کا علمی خیابان

[illegible] ایک قدیم شہر ہے۔ وہ دریائے راوی کے کنارے پر آباد ہونے کی وجہ [illegible] شاداب وادی میں اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر [illegible] شہر بنا دیا تھا اور اس میں ایک قلعہ تیار کیا جو ہندوستان کی دفاعی [illegible] کرتا تھا۔ قلعہ کی تعمیر کے وقت جب اس کا ملبہ جمع کیا گیا تو ایک بلند ٹیبہ [illegible] بعد میں ''ٹبی'' کا نام دیا جانے لگا۔ ٹبی کا یہ علاقہ لاہور سے اونچا تھا اور [illegible] سے لے کر مستی دروازہ اور ٹکسالی دروازہ کے درمیان بلند سطح پر لاہور [illegible] محلات اور مکانات بننے لگے اور ان محلات پر اعیانِ مملکت کے علاوہ اہلِ [illegible] لگے۔ قلعہ اور بادشاہی مسجد کے دامن میں یہ علاقہ سارے لاہور کا سول [illegible] یہاں وی۔ آئی۔ پی لوگوں کے مکانات تھے۔ بھاٹی دروازہ کا نام اصل میں [illegible] تھا اور یہی وہ مقام ہے جہاں مغلوں کی سلطنت سے پہلے بھٹی قوم کے [illegible] نے فتح ملتان کے بعد لاہور کے دامن میں آ کر پڑاؤ ڈالا اور یہاں ہی آباد [illegible] زمانہ سے بگڑتے بگڑتے بھٹی دروازہ ''بھاٹی دروازہ'' بن گیا۔

بھاٹی دروازہ کے اندر داخل ہوں تو کچھ دور چل کر بائیں طرف ایک کوچہ ہے [illegible] ''کہتے ہیں۔ آج سے کوئی سو برس پہلے اسی کوچے کے ایک مکان [illegible] مولوی محمد شفیع جیسے نامور ماہر السنہ اشرقیہ کے استاد مولوی اصغر علی روحی رہتے [illegible] (اب یہاں ان کی مسجد روحی موجود ہے) مولانا روحی مجمع کمالات تھے اور [illegible] و رشد۔ ان کے درس کلام مجید کا شہرہ دور دور تھا، بعد میں انہوں نے [illegible] میں بھی قرآن مجید کے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ بڑے پاک باطن اور فرشتہ

صورت انسان تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جن کی صورت دیکھ کر اسلام [illegible]
نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ لاہور شہر کے اکثر اہل علم وفضل آپ [illegible]
میں آتے۔ خصوصاً آپ علمائے اہلِ سنت کے حلقہ میں ایک گل سرسبد کی [illegible]
نظر آتے۔ وہ کٹھالہ (گجرات) سے چل کر لاہور آئے اور شہر کے دینی [illegible]
میں بڑے مقبول ہوئے۔ پچاس سال تک اسلامیہ کالج کے پروفیسر [illegible]
ادبی کتابیں تصنیف کیں جن میں ''العروض والقوافی''، دبیر عجم، ''مافی [illegible]
مشہور ہوئیں، آپ کے دو بیٹے مولانا صوفی محمد ضیاء الحق اور محمد بہاء الحق [illegible]
فارسی کے نامور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ آپ ۱۹۵۴ء میں فوت ہو [illegible]
وطن گجرات کٹھالہ میں دفن ہوئے۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع:

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جو بعد میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مقرر [illegible]
طالب علمی کے زمانے میں اور اس زمانے میں جب تک ان کا تعلق [illegible]
سے رہا، اسی کوچے کے قریب ایک مکان میں رہتے تھے اور ان کے [illegible]
مطابق انہوں نے مولانا روحی کی شاگردی کے فیض صحبت ہی سے عربی اور [illegible]
علوم میں وہ دستگاہ حاصل کی جو آگے چل کر ان کی ناموری کا باعث ہوئی [illegible]
بدولت انہوں نے ان دونوں زبانوں کی مشہور کتابوں اور دستاویزوں کے [illegible]
کاوش اور کوشش سے ریسرچ کی۔ ان کی تصانیف میں سے ''فہارس [illegible]
عبدربہ'' جوان کی پندرہ سال کی محنت کا نتیجہ ہے اور چودہ سو صفحات پر [illegible]
یونیورسٹی نے دو جلدوں میں شائع کی۔ مولوی محمد شفیع کے اہم علمی کارنامو [illegible]
دستاویزات کی فہرست اتنی طویل ہے اور ان کے مندرجات اس قدر [illegible]
ہیں کہ اس مضمون میں ان کے بیان کی گنجائش نہیں۔ یہاں تو ان کے ذکر [illegible]
مدعا ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی بھاٹی دروازے کے اندر اس علمی اور ادبی [illegible]

[illegible] اس مضمون کا موضوع ہے۔ آپ کے کتب خانہ میں سید ابوالحسن علی الہجویری
[illegible] حضرت داتا گنج بخش کی تصوف پر مشہور کتاب ''کشف المحجوب'' کا ایک
[illegible] قدر نسخہ تھا جسے ان کے بیٹے احمد ربانی نے، جو ریلوے میں آفیسر تھے،
[illegible]

[illegible] اورینٹل کالج لاہور کے پرانے استادوں میں چار پانچ ایسے بزرگ ہیں جن کا
[illegible] وقت بھی لوگ عزت واحترام سے لیتے تھے اور جن کی یاد سے آج بھی اس
[illegible] کے نقوش ابھر آتے ہیں جو اس زمانہ کے استادوں کے علمی تصرفات کا خراج
[illegible] تھا۔ اسے حسنِ اتفاق کہیے یا بھاٹی دروازے کی خوبی تقدیر کہ یہ سب لوگ
[illegible] دروازے ہی کے اندر رہتے تھے اور شاید اس لیے کہ یہ علاقہ اورینٹل کالج سے
[illegible] قریب تھا۔
اورینٹل کالج اپنے ابتدائی زمانہ میں بھاٹی دروازے کے اندر راجہ دھیان سنگھ کی
[illegible] میں واقع تھا۔ اگر میں ان صاحبانِ علم وفضل کے کمالات گنوانے بیٹھوں تو ان
[illegible] ایک ایک بزرگ کے فضائل کی تفصیل کے لیے دفتر چاہئیں۔
یہاں اگر اورینٹل کالج کی مختصر سی تاریخ بیان ہو جائے تو مناسب ہے۔ انگریزی
[illegible] کے ابتدائی زمانے میں لاہور میں علوم مشرقیہ کی ترویج کے مقصد کو پیشِ نظر
[illegible] ایک انجمن قائم کی گئی تھی جس کا نام ''انجمن پنجاب'' تھا۔ اس کی داغ بیل ۲۱
[illegible] ۱۸۶۵ء کو لاہور میں ڈالی گئی تھی۔ ڈاکٹر لائٹنر اس انجمن کے روحِ رواں تھے۔
[illegible] انجمن کی سرپرستی اور ڈاکٹر لائٹنر کی رہنمائی میں اسی سال ''مجلسِ علومِ شرقیہ'' کی
[illegible] گئی اور اسی جگہ جہاں لاہور سکھشا سبھا نے ''۱۸۶۳ء میں ہیرا منڈی کے قریب
[illegible] پاٹھ شالہ قائم کیا تھا اور جس میں محض ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ
[illegible] قائم ہوا اور انجمن پنجاب نے اس پاٹھ شالہ کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کے
[illegible] میں اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم کا اضافہ کر دیا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں آج کل

ہیرا منڈی میں حضرت پیر نوگزہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے سامنے لاہور کارپوریشن کا ہسپتال
واقع ہے۔ اسی مکان کے مقابل راجہ دھیان سنگھ کی حویلی ہے جہاں گورنمنٹ کالج
لاہور پہلے پہل قائم ہوا تھا۔

مارچ ۱۸۷۲ء تک علوم السنہ شرقیہ کا یہ ادارہ اورینٹل سکول کہلاتا تھا۔ اس کے بعد
اس کا نام اورینٹل کالج رکھ دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اورینٹل کالج کے لیے راجہ کھڑک
سنگھ کی حویلی حاصل کر لی گئی۔ یہ حویلی لوہاری دروازے کے اندر نہال چند کے مندر
کے سامنے واقع تھی۔ ۱۸۷۳ء میں اورینٹل کالج انارکلی میں کرائے کی ایک عمارت
میں منتقل ہو گیا۔ ۱۸۷۶ء میں جب گورنمنٹ کالج کی عمارت مکمل ہو گئی تو اس کے لیے
اس عمارت کا شمال مشرقی گوشہ مقرر ہوا اور ڈاکٹر لائٹنر اس کے پہلے پرنسپل نامزد کیے
گئے۔ اس وقت مولوی فیض الحسن سہارنپوری صدر مدرس عربی تھے اور مولوی عبدالحکیم
کلانوری صدر مدرس فارسی، یہ دونوں بزرگ بھاٹی دروازے ہی میں رہتے تھے۔ جس
زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس زمانے میں مفتی محمد عبداللہ ٹونکی صدر مدرس عربی
تھے۔ مفتی عبداللہ ٹونکی بازار حکیماں میں مستری حاجی محمد کے مکان میں رہتے تھے
جہاں سے چند قدم آگے "انجمن نعمانیہ" کا دارالعلوم نعمانیہ، عربی، فارسی اور دینی علوم کا
بے مثال ادارہ ہے۔

علامہ اقبال کی رہائش گاہ:

کوچہ پٹرنگاں سے کچھ آگے چلیں تو ایک گلی آتی ہے جو نائیوں کی گلی کہلاتی ہے۔
اس کوچے سے ذرا آگے چل کر دائیں طرف کو ایک کوچہ ہے جسے محلہ جلوٹیاں کہتے
ہیں۔ اس کے بالمقابل وہ مکان ہے جہاں سر محمد اقبال رہتے تھے۔ وہ سیالکوٹ سے
لاہور آئے تو کئی برس تک یہیں رہے۔ یہ وہی محلہ ہے جس کی ایک گلی کوچہ مجاوراں میں
ہے، جہاں پیر شاہ عنایت قادری رحمۃ اللہ علیہ کی رہائش تھی۔ اس سے ذرا آگے چلیں تو ایک
اور محلہ آتا ہے جسے "چومحلہ" کہتے ہیں۔ اس میں اونچی مسجد کے خطیب مولوی عالمِ دین

مترجم "مکتوباتِ مجدد الف ثانی" رہتے تھے جو اپنے علم و فضل کے باعث بہت مشہور
ہے۔ یہ مسجد دراصل حضرت بلھے شاہ کے پیر و مرشد شاہ عنایت قادری رحمۃ اللہ علیہ نے بنائی
گئی اور آپ نے اسے روحانیت کا مرکز بنا دیا۔ اس مسجد کے سامنے کوچہ شاہ عنایت
قادری ہے۔ اس مسجد میں بڑے بڑے علماء خطیب کی حیثیت سے آئے۔ مولانا غلام
قادر بھیروی جیسے معروف عالمِ دین خطیب رہے۔ آج کل مولوی محمد مظفر اقبال رضوی
خطیب ہیں جو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے شاگردِ رشید اور خلیفہ مجاز مفتی غلام جان
ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کے نامور فرزند ہیں۔

اسی محلے میں مولانا غلام مرشد خطیب مسجد شاہی رہتے تھے۔ وہ ایک عرصہ تک
دارالعلوم نعمانیہ میں مدرس رہے۔ معارف دین اور عربی ادب پر جن کی آگاہی کی
تعریف اقبال کی زبان سے بھی سنی گئی ہے اور جن کا درس قرآن مجید ایک عرصہ تک
مرجع راہروانِ راہِ ہدیٰ رہا ہے۔ اس سے کچھ دور آگے بازار کے بائیں طرف نور محلہ
واقع ہے اور دائیں طرف "محلہ شیش محل" ہے۔ یہی وہ محل ہے جسے اعلیٰ حضرت فاضل
بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پردادا حافظ شاہ کاظم علی خاں مرحوم نے بنایا تھا جو مغل عہد میں فوج
کے ایک لشکر کے کمانڈر تھے۔ یہ مغل اقتدار کے آخرین سپہ سالاروں میں سے تھے۔
سکھ دور میں "شیش محل" پر سکھوں نے قبضہ کر کے اس کے علمی اور عسکری نوادرات تباہ
کر دیے تھے۔

"شیش محل" سے آگے چل کر رائے بہادر میلہ رام کی حویلی تھی جس کا دستبرد زمانہ
سے اب نام و نشان بھی باقی نہیں رہا بلکہ خود رائے بہادر میلہ رام اور ان کے بعد ان
کے بیٹے رائے بہادر رام سرن داس کی شخصیت ایسی تھی کہ اس علاقے کے لوگ ان کی
بڑی عزت کرتے تھے۔ یہ ہندو نہیں تھے بلکہ سناتن دھرم کے پیروکار تھے اور پرانی وضع
کے رئیس۔ خود ادیب نہ تھے مگر ادیبوں اور شاعروں کے سرپرست تھے۔ ۱۸۸۰ء میں
جب امرتسر سے لاہور تک ریل چلی اور لاہور کا اسٹیشن تعمیر ہوا تو لنڈا بازار والے یہاں

سلطان موچی دروازے والے میاں محمد بخش دال گر اور رائے بہادر میلہ رام کی
ٹھیکیداری میں یہ کام سرانجام پایا۔ رائے بہادر میلہ رام اور رائے بہادر رام
جب تک زندہ رہے ہندو مسلمانوں اور سکھوں کے تہوار بڑی شان سے منائے
ہر تہوار پر اپنی لال کوٹھی میں جو بھاٹی دروازہ کے باہر واقع ہے۔ محفل رقص
سجاتے اور اپنے تمام احباب بلاتفریق مذہب وملت بلا کر اس کی رونق بڑھاتے
اقبال، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، میاں سراج الدین، راجہ نریندر ناتھ،
کشن کول، نواب زادہ لیاقت علی خان، نواب احمد یار خان دولتانہ، سر سکندر
خان، میاں محمد نصیر الدین خان، خان بہادر سید مراتب علی، سردار سندر سنگھ
سردار جوگندر سنگھ اکثر ان محفلوں میں گھل مل کر بیٹھتے تھے۔ یہی وہ کوٹھی ہے
سنیوں کا مشہور ''مرکزی دار العلوم حزب الاحناف'' ہے جسے علامہ سید ابوالبرکات
احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ نے خرید کر علم وفضل کا مرکز بنا دیا اور دہلی دروازہ کے
دار العلوم کو یہاں لاکر مسند تدریس بچھا دی۔

بھاٹی دروازے کے اندر ایک کوچہ ہے جسے ''موتی مبہ'' کہتے ہیں۔ اس
میں سر عبدالقادر رہتے تھے جن کا نام محتاج تعارف نہیں۔ اورینٹل کالج کے
کے سربراہ اور سنیوں کے بلند پایہ عالم دین مولانا عبدالحکیم کلانوری بھی
تھے۔ اس محلے سے کچھ دور آگے جا کر یہ بازار جوگی محلے کو جا نکلتا ہے۔ مسٹر میراں
بیرسٹر ایٹ لاء، جو جرنیل میراں بخش کے نام سے معروف تھے، انگلستان جانے
پہلے اسی محلے میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں ایک مشہور
بیرسٹر ٹیگین اور اس کے بعد ایک اور انگریز بیرسٹر مسٹر رینلڈز کے ساتھ کام
رینلڈز اس مشہور ومعروف افسانہ نگار جارج ڈبلیو ایم رینلڈز کے بیٹے تھے
''مسٹریز آف دی کورٹ آف لنڈن'' لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اسی
اس زمانے میں منشی طاہر الدین بھی رہتے تھے۔ یہ اپنے ابتدائی زمانے میں میاں

ایٹ لاء کے منشی تھے اور قانونی رموز سے خوب واقف۔ جب میاں سر محمد
ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہو کر دہلی چلے گئے تو انہی منشی طاہر الدین
سے ڈاکٹر سر محمد اقبال انارکلی میں اسی مکان میں چلے آئے جس میں سر محمد
کیا کرتے تھے۔ سر محمد شفیع اپنے باقی ماندہ مقدمات کی پیروی کا کام سر محمد
گئے تھے اس لیے منشی طاہر الدین اس کام میں ان کے بہت ممد ومعاون
بعد میں انہوں نے اقبال کے دل میں اپنی بے لوث خدمت سے ایسا
کر لیا کہ انہوں نے اپنی وصیت میں اپنے دو اور دوستوں کے ساتھ ان کو بھی
اور جائیداد کا ولی مقرر کیا۔ اس محلے میں ایک اور مکان ہے جس میں محمد طفیل
صاحبزادے رہتے تھے۔ ان کو خوش نویسی کا بڑا شوق تھا۔ ان کا ذکر اس لیے
کہ آگے چل کر انہوں نے اسی محلے سے ''نقوش'' کے نام سے اردو کا ایک
کئی لحاظ سے لاثانی مجلہ شائع کرنا شروع کیا جو پہلے ایبک روڈ، اب اردو
سے شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی ضخامت، مضامین کے تنوع اور کتابت
کے اعتبار سے اپنے تمام پیش رو رسالوں سے مختلف اور ایک منفرد حیثیت
اور اس کے بعض شمارے تو ایسے ہیں کہ زمانہ مستقبل میں ایک تاریخی مقام
گے اور ان مصنفین کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے جنہیں موجودہ اردو
تاریخ مرتب کرنے میں حوالوں کی تلاش ہو۔ ''نقوش'' نے مختلف نمبر نکالے،
لاہور نمبر، رسول نمبر اور قرآن نمبر اتنے اہم ہیں کہ دینی حلقوں میں اپنے
کو منوا لیا۔

آگے چل کر شیخ سید ولی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کے پہلو میں محلہ کاغذیاں واقع
میں میر ناظر حسین ناظم شروع شروع میں رہتے تھے، وہ بعد میں کوچہ فقیر خانہ
بازار میں واقع ہے، رہنے لگے۔ میر ناظر حسین ناظم بھاٹی دروازے کے
العلوم انجمن نعمانیہ کے سالانہ جلسوں میں اپنی نظمیں سناتے اور اہل علم وسخن

سے داد پاتے تھے۔

محلہ کاغذیاں کے بالمقابل لال حویلی کا کوچہ ہے جس میں سکھوں کے
کے زمانے میں فقیر سید نورالدین اور فقیر شمس الدین رہتے تھے۔ ان کی وفا
یہ حویلی دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ ایک حصے میں فقیر سید قمرالدین اور دوسرے
فقیر سید شہاب الدین رہنے لگے۔ آگے چل کر ''کوچہ دربار صاحب''
میں ایک مسجد اور اس سے ملحق ایک مکان واقع ہے جسمیں وہ تبرکات
ہیں جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مشیر فقیر سید عزیزالدین نے شاہ شجاع الملک
کیے تھے۔ یہاں دن رات قرآن مجید کی تلاوت ہوا کرتی تھی۔ اسی مکان
حافظ محمد حفیظ رہتے تھے جو اپنے زمانے میں قرات کے ماہر تھے اور جن کے
کا فیض عام تھا۔

اسی کوچے کے قریب پہلوانوں کا کوچہ واقع ہے جہاں پنجاب کے ایک
پہلوان محمد حسین جو ''حسا پہلوان'' کے عرف عام سے مشہور تھے، رہتے تھے۔
بیٹے وہ حسن محمد حیات ہیں جو بعد میں سیاستِ ہند میں مولانا محمد علی جوہر
راست تھے اور اس کے بعد ریاست بھوپال میں لیجسلیٹو کونسل کے سیکرٹری
ان کی جوانی انہیں گلیوں میں گزری ہے۔ کوچہ دربار صاحب بازار حکیماں
ہے۔ اس بازار میں چار مکان بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حکیم حسام الدین کا مکان
کے بیٹے حکیم امین الدین تھے جو ان مسلمان طلبہ میں سے تھے جو پہلے پہل
گئے اور جنھوں نے قانونی سند لے کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ یہی وہ مکان
میں ۱۸۹۵ء میں حکیم شجاع الدین کی سرپرستی میں ایک اردو بزم مشاعرہ قائم ہوئی
جس کے دوسرے مشاعرے میں اقبال نے جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج
پڑھتے تھے، اپنی اردو غزل پڑھی۔ حکیم حسام الدین لاہور اور امرتسر دونوں جگہ
کے فرائض انجام دیتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں لاہور کا بازار

کا کوچہ حکیماں انہیں کے دم قدم سے آباد تھا۔ یہ مہاراجہ کشمیر کے طبیب خاص
کے علاوہ ریاست ہائے پھلکیاں کے ہر والی ریاست کے طبی مشیر بھی تھے اور
مرض اور حذاقت کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کی خدا پرستی اور
گاری کا یہ عالم تھا کہ لوگ دوا سے زیادہ ان کی دعا کے طالب نظر آتے تھے۔ وہ
بیماروں کو دوا کے بجائے دم کر کے تندرست کر دیتے تھے۔

اس کے بالمقابل میرے دوسرے عم زاد بھائی حکیم شہباز دین کا مکان تھا۔ یہ
لاہور کی ادبی زندگی میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی بیٹھک میں ۱۸۹۵ء
سے ۱۹۱۱ء تک جب تک حکیم شہباز دین زندہ رہے، ہر روز شام کو لاہور کے ادیبوں،
شاعروں، عالموں اور سیاست دانوں کا ایک جمگھٹا رہتا تھا۔ موجودہ زمانے کی
اصطلاح کے مطابق یہ ایک قسم کا لٹریری کلب تھا۔ اس میں جو لوگ باقاعدہ ہر شام کو جمع
ہوا کرتے تھے، ان میں مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، مولانا محمد
حسین جالندھری، مولوی اصغر علی روحی، سید محمد شاہ وکیل، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین،
محمد اقبال، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین اور
مولا بخش کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اسی محفل احباب میں کبھی کبھی سر محمد
دین، سر محمد شفیع، فقیر سید افتخار الدین اور مرزا سلطان احمد بھی آ بیٹھتے تھے۔

انجمن حمایت اسلام کے بانیوں اور اربابِ نظم و نسق میں حاجی شمس الدین، خواجہ
پروفیسر مولوی حاکم دین نقشبندی اور خلیفہ حمید الدین بھی اس بزمِ احباب میں
مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کی گتھیاں سلجھاتے تھے۔

اس سے آگے چل کر ''آستانہ شریف'' کا کوچہ آتا ہے جس میں فقیر سید جمال
الدین کی تعمیر کی ہوئی لال مسجد واقع ہے اور اسی کی بغل کے ساتھ ایک چھوٹا سا
قبرستان ہے جس میں فقیر خاندان کے جدامجد فقیر سید غلام محی الدین کا مزار ہے جو
ثانی'' کے لقب سے ملقب تھے۔ اسی احاطے میں سکھ دور کے معتمد و اہلِ علم فقیر

سید عزیز الدین، فقیر سید امام الدین، فقیر سید نور الدین اور فقیر سید شمس الدین
بھی ہیں۔ اسی کوچے میں سر سید مراتب علی شاہ کی اہلیہ محترمہ سیدہ مبارک بیگم کا
باڑہ ہے اور ان کے والد فقیر سید افتخار الدین کی جدی حویلی بھی۔ اسی حویلی میں
فقیر سید امام الدین کی حویلی ہے جو سکھوں کے زمانے میں قلعہ گوبند گڑھ کے
صوبیدار اور شاہی خزانے کے محافظ تھے۔ اس کے سامنے فقیر سید حفیظ الدین کی حویلی
میں مرزا عظیم بیگ ایک پرانی وضع کے رئیس رہتے تھے۔ ان کے بیٹے مرزا اسلم بیگ کو
شعر و شاعری کا شوق وافر تھا اور وہ مرزا ناظر حسین ناظم کے تلامذہ میں ایک امتیاز
رکھتے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد اس قدر زیادہ دولت ان کے ہاتھ آئی کہ وہ لکھ پتی
مشہور ہو گئے۔ اس لوٹ میں ان کے ذوقِ سخن کو بھی کافی مال غنیمت ملا۔ انہوں نے
اپنی حویلی میں ایک محفلِ مشاعرہ قائم کی جس کے میر مشاعرہ ان کے استاد میر ناظر
حسین ناظم تھے۔ اس بزم میں زیادہ تر موصوف کے شاگرد ہی اپنا کلام پڑھتے اور
اپنے استاد سے دادِ سخن پاتے۔ اس بزم مشاعرہ کے سیکرٹری فقیر سید امام الدین کے
پوتے فقیر سید سعید الدین تھے جو میر ناظر حسین ناظم ہی کے شاگرد تھے اور بہت صاف
شعر کہتے تھے اور اسی کوچے میں اپنے دادا کی حویلی میں رہتے تھے۔ فقیروں کا
خاندان طبیبوں اور حکیموں کا خاندان تھا جو سکھوں کے شاہی خاندان کے معالج تھے۔
ان کو وزیر اور مشیر کا درجہ حاصل تھا۔ ان کی اس حویلی میں سید مراتب علی شاہ نے اب
ایک خوش نویسی کا سنٹر قائم کر دیا ہے اور تبرکات کا عجائب گھر بھی ہے۔

شاید اس ناقدری کے زمانے میں یہ بیان کر دینا موجب تعجب ہو کہ مرزا اسلم
بیگ نے اپنے استاد میر ناظر حسین ناظم کے دولت کدے کو حقیقت میں دولت کدہ بنا
دیا تھا۔ مرزا اسلم بیگ کی وفات کے ساتھ ہی اس محفل کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ یہاں
یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال اور ان بزرگوں کی محفل جن کے نام اوپر گنوائے گئے
ہیں۔ بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین ہی کی بیٹھک میں جمتی تھی اور اس محفل کا رنگ

[…] بیگ کی بزم مشاعرہ سے کچھ الگ تھا۔ وہاں زیادہ تر ادبی و قومی مسائل کا
[…] اور اس محفل میں وہی کاکل و رخسار کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس کوچے کے
[…] حکیم عبداللہ انصاری کی بنائی ہوئی مسجد واقع ہے جس کی تعمیر کی تاریخ اس
[…] نکلتی ہے۔

کرد با صدق ایں عبادت گاہ عبداللہ حکیم

انہوں نے بازار حکیماں کی بنیاد ڈالی تھی اور اپنا گھر بنانے سے پہلے اللہ کا گھر بنایا
[…] اس مسجد میں ایک عرصہ تک مولانا غلام محی الدین بگوی درس دیا کرتے تھے جہاں
مولانا غلام قادری بھیروی نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی بگوی خاندان کے
[…] کرام نے ایک طویل عرصہ تک شاہی مسجد کی خطابت کی۔ اس کے سامنے ہی حکیم
[…] کی حویلی تھی جس کا اب نام و نشان بھی موجود نہیں مگر اس کے کھنڈرات میں ان
[…] باقی ہے۔ یہ اپنے زمانے میں بہت بڑے طبیب تھے اور اپنے تمول اور فیاضی
[…] باعث مرجع خلائق۔

چند قدم آگے چلیں تو بازار کے بائیں طرف کوچہ فقیر خانہ آتا ہے جس میں فقیر
[…] الدین رہتے تھے اور ان کے سامنے ہی وہ مکان ہے جس میں میر ناظر حسین
ناظم عمر بھر اقامت گزیں رہے۔ اس مکان سے ذرا آگے چل کر فقیر سید حسین الدین کا
مکان اور امام باڑہ ہے۔ اس میں ان کے بڑے داماد سید علی شاہ رہتے تھے جن کی
مصوری کی شہرت اس امر کے باوجود کہ انہوں نے اسے ایک پیشے کی حیثیت سے کبھی
اختیار نہ کیا محتاج بیان نہیں۔ بڑے بڑے مصوران کی خدمت میں آتے اور ان سے
رنگ آمیزی کا فن سیکھتے۔ مناظر قدرت کی جو صحیح عکاسی ان کے موئے قلم نے کی، وہ کسی
دوسرے مصور کی چابک دستی کو نصیب نہ ہوئی۔ ان کی سخن فہمی کا یہ عالم تھا کہ جو اشعار
بھی ان کے ذہن میں محفوظ تھے اور ان کی تعداد حد و شمار سے باہر تھی۔ بڑے بڑے
شعراء کے نتائج فکر کا آئینہ تھے۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر یہی محسوس ہونے لگتا کہ

فطرت کے عجائبات کا ایک نگار خانہ ہے جس کے پٹ کھل گئے ہیں اور نو
ایک چمنستان ہے جس پر بہار آ گئی ہے۔ انہوں نے بڑی طویل عمر پائی
قریب ایک سوبیس سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔

فقیر عزیز الدین رحمۃ اللہ علیہ:

بازار میں آگے چل کر دائیں طرف فقیر سید عزیز الدین کی حویلی
بعد ان کے بیٹے فقیر سید جمال الدین کو ورثے میں ملی۔ آج کل اس میں ان
واقع ہے۔ اس امام باڑے کے سامنے ایک قدیم مسجد تھی جسے مغل دور
نے بنایا تھا، مگر اب زمانے کے گرد و غبار نے اسے خستہ کر دیا تھا۔ آج
سال پہلے محلّہ کاغذیاں کے ایک جواں سال عالم دین حافظ محمد شاہد اقبال
اٹھے، انہوں نے اس مسجد کو سنبھالا اور اسے از سر نو تعمیر کروا کر آباد کر دیا۔
حافظ شاہد اقبال کی نگرانی میں ''مسجد سیدنا صدیق ابوبکر'' کے نام سے ایک
ایک دار التصنیف اور ایک دار التبلیغ بن گئی ہے۔

کچھ دور آگے چل کر تحصیل بازار آتا ہے جہاں اس زمانے میں لاہور
کی کچہری ہوا کرتی تھی۔ اس کچہری کے مقابل ایک مکان ہے جس میں
پنجاب اور رسالہ ''تہذیب نسواں'' کے مالک سید ممتاز علی رہتے تھے اور اسی
ایک عرصے تک مولانا محمد حسین آزاد بھی رہے۔ اس کوچے کے مقابل ایک
جسے اس زمانے میں سمیاں کا بازار کہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی جج بازار
بازار میں ایک طرف سر شہاب الدین کا مکان اور چھاپہ خانہ تھا اور دوسری
''تاریخ لاہور'' کے مشہور مصنف جج سید محمد لطیف کی حویلی۔ وہ اس زمانے میں
جج تھے اور اسی نسبت سے یہ بازار اب ''جج محمد لطیف بازار'' کہلانے لگا
بازار میں ایک اور بزرگ بھی رہتے تھے جن کا نام مولوی عبدالغنی تھا۔ وہ
کے عہدے پر فائز تھے۔ انہی کے بھانجے نے میاں شمس الدین کے مکان میں

مدت تک قیام رہا اور یہیں ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔

اس مکان سے ذرا آگے چل کر پروفیسر عبدالغنی کا مکان تھا جو اپنے زمانے میں
اسلوب نگارش کے فہم میں بڑی مہارت اور شہرت رکھتے تھے، بعد میں اپنے
کی بدولت اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ انگریزی ادب کے
ماہرین میں شمار ہوتے اور ایک معلم کی حیثیت سے بڑے باکمال استاد تھے۔

کچھ دور آگے چلیں تو وہ بازار آتا ہے جو آج کل ٹبی بازار کہلاتا ہے۔ زمانے کی
بھی عجیب ہیں۔ مغلوں کے زمانے میں اور اس کے بعد سکھوں کے عہد میں
بازار میں عمائدِ حکومت کی حویلیاں تھیں مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس
میں اس بازار میں زیادہ تر طوائفوں ہی کے ڈیرے آ جمے تھے۔ ہاں اس بازار
ایک عالیشان شاہجہانی مسجد بھی ہے اور انجمن نعمانیہ کا مدرسہ بھی ہے۔ جس میں
اسلامیہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ طوائفوں کے محلے کے درمیان چشمہ فیض جاری ہوا
طوائفوں کے مکانوں کے گھیرے میں اس مسجد کو دیکھ کر ایک دن میر ناظر حسین
انجمن نعمانیہ کے سالانہ جلسہ میں ایک زبردست نظم سنائی جس میں غالب کا یہ
برجستہ دہرا دیا اور سننے والوں نے لطف اٹھایا۔

ع مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے!

مولانا محرم علی چشتی رحمۃ اللہ علیہ:

جہاں یہ بازار ختم ہوتا ہے اس کی بائیں طرف شیخوپوریوں کا بازار ہے۔ اس کے
کونے پر ایک مکان ہے جس میں اس زمانے میں مولوی محرم علی چشتی رہتے تھے۔ یہ
خاندان چشتیہ لاہور کے ایک نامور فرزند تھے۔ یہ پنجاب کے ایک اخبار ''رفیق ہند''
کے ایڈیٹر تھے اور رفتہ رفتہ ان کا اثر و رسوخ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ جسے وہ چاہتے لاہور
میونسپل کمیٹی کا ممبر منتخب کرا دیتے۔ اسی لیے لوگ انہیں ''کنگ میکر'' کہتے تھے۔ بعد
میں وہ اس مکان سے اٹھ کر ہیرا منڈی کے عقب میں ایک وسیع حویلی میں رہنے لگے۔

بڑے علم دوست تھے اور خود بھی اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر
کابلی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ ان کے ہاں اکثر حال و قال کی مجالس
تھیں۔ ان کا دستر خوان اس قدر وسیع تھا کہ مشائخ کرام اپنے مریدوں
کے ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے سے آتے اور انہیں کے ہاں قیام فرماتے
کے نیچری خیالات سے اختلاف رکھتے تھے اور ان کی مخالفت میں اپنے
ہند" میں اداریے لکھتے تھے۔ آپ عقیدہ کے لحاظ سے سخت سنی تھے اور اعلیٰ
فاضل بریلوی کے نظریات کے نہ صرف قدردان تھے بلکہ ترجمان تھے۔

میاں شمس الدین کے چھوٹے بھائی میاں جلال الدین کے صاحبزادے
پنجاب کے سابق گورنر میاں امین الدین بارود خانے کے بازار میں رہتے تھے
بڑے علم دوست بزرگ تھے۔ ان کا گھر علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ ادیبوں شاعروں
اور ماویٰ تھا۔ یہاں شعراء کی مجالس جمتی تھیں۔ دونوں بزرگ غریب شعراء اور
کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی رئیس اعظم لاہور میاں امیر الدین
مرحوم کا مکان تھا۔ میاں شمس الدین کے چھوٹے بھائی کے صاحبزادے
امیر الدین نے لاہور کی سیاست میں بڑا نام پایا۔ علامہ اقبال کی بیٹی
الدین اسی میاں امیر الدین کے صاحبزادے میاں صلاح الدین سے بیاہی گئی
اور میاں محمد اسلم جن کا نام ایک ناولسٹ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے محتاج تعارف
نہیں۔ میاں نظام الدین کے بیٹے ہیں۔ محمد الدین تاثیر جن کے علم و فضل کا
اردو انگریزی دونوں زبانوں میں جن کا اسلوب نگارش آج بھی طلبہ کے دل
ہے اور جو ایک مدت تک اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے، اسی خاندان سے تعلق
رکھتے تھے اور بارود خانے ہی میں رہتے تھے۔

حکیم یوسف حسن جو "نیرنگ خیال" جیسے مقبول عام اردو رسالے کے مالک
تھے اور ایڈیٹر بھی، شروع شروع میں اسی بازار میں رہتے تھے، وہ طبیب بھی

تھے اور خاکسار بھی۔ ہر اسلامی تحریک میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے اور اردو
مقبول عام بنانے میں انہوں نے اپنے رسالے کی قیمت اتنی کم کر دی کہ اپنا
پر لٹا بیٹھے۔ بارود خانے کا علاقہ جن مایہ ناز ادیبوں کی سکونت کی بدولت
میں شہرت رکھتا تھا، ان میں حکیم یوسف حسن کا مرتبہ کسی سے کم نہیں۔

بارود خانے سے آگے جائیں تو شاہی قلعے کے عقب میں ایک میدان آتا ہے جو
کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کسی زمانے میں مغل فوجوں کی خیمہ گاہ تھی، جس
میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت یہ ایک بے آب و گیاہ ڈھلوان تھی۔ اس سے
چلیں تو ایک بازار آتا ہے، جسے موتی بازار کہتے ہیں۔ یہ چوک سرجن سنگھ سے
اور مستی دروازے تک چلا جاتا ہے۔ اس میں ایک بہت مشہور طبیب اور نیک
انسان حکیم سید بزرگ شاہ رہتے تھے جو لاہور کے سادات کے ایک معزز
کے نامور رکن تھے۔ خدا نے انہیں ایک ایسا دست شفا بخشا تھا اور ان کی دعا
تھی کہ لوگ دور دور سے آتے اور نسخوں کے ساتھ ساتھ ان کے تعویذ بھی
یہ وہی حکیم سید بزرگ شاہ ہیں کہ جب بادشاہی مسجد انگریزوں نے
تو آپ کو اس کا پہلا متولی مقرر کیا گیا تھا۔

لاہور کے خاندان:

پرانے زمانے ہی سے لاہور کے دو چار خاندانوں میں طبابت کا پیشہ موروثی
تو بازار حکیماں میں ہمارا خاندان تھا کہ اس کا ہر رکن طب کے فن میں ماہر تھا
حکیم کہلاتا تھا۔ میں بھی اسی نسبت سے حکیم کہلاتا ہوں۔ دوسرا موتی بازار میں انہی
حکیم سید بزرگ شاہ کا خاندان تھا۔ ان کے صاحبزادے بھی بیرسٹر ہونے کے باوجود
حکیم سید عباس علی ہی کہلاتے تھے۔ تیسرا شاہ عالمی دروازے کے اندر حکیم عالم شاہ کا
خاندان جو ان کی ذات والا صفات کے باعث بہت مشہور ہوا۔ چوتھا موتی دروازے
اور تیلیوں والے رڑے میں حکیم سید مراتب علی اور حکیم سید نوازش علی کا خاندان۔

حکیم سید نوازش علی نے سو برس کے قریب عمر پائی۔ پاکستان بننے کے بعد
ہوا اور بعد میں ڈاکٹر سید دلاور حسین قادری جو سلسلہ غوثیہ کے رکن رکین
نعمانیہ کے صدر رہے تھے، اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور
منڈی میں حکیم سید بہادر شاہ کا خاندان۔ یہ شیخوپورہ کے راجہ دھیان
طبیب تھے۔ اگرچہ سکھوں کے زمانے میں لاہور میں لالہ حاکم رائے اور
رام جیسے مشہور ہندو اطباء فن طب میں یکتائے روزگار مانے جاتے تھے
کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں ہندو زیادہ تر مغربی طریقہ علاج کی طرف
تھے اور مغربی طب میں دو تین مسلمان ڈاکٹروں کے سوا جس طرف بھی
ہی نظر آتے تھے۔

اسی گلی کے اندر ایک مسجد ہے جس کے امام خطیب حافظ خیر محمد ایک
بزرگ تھے۔ ان کا ذکر میں نے اسی لیے کیا ہے کہ یہ اسلام کی حقیقی
تھے۔ دن بھر کتابوں کی جلد بندی کرتے اور اس کی مزدوری ہی پر گزر
کرتے لیکن مسجد میں پانچوں وقت باقاعدہ نماز پڑھاتے اور صبح و شام
دیتے۔ انہیں طبابت میں بھی بہرہ وافر حاصل تھا اور لوگ ان کے تعویذوں
اعتقاد رکھتے تھے۔ اس قسم کے بزرگوں کا اب قحط الرجال ہے۔ کوئی مانے
میرا تو اس بات پر یقین ہے کہ جس دینی یا دنیاوی خدمت کا مآل و مقصد
نمائش و شہرت ہو نہ تو وسیلہ عزت ہوتی ہے نہ باعث برکت۔

مولانا غلام قادری بھیروی رحمۃ اللہ علیہ:

اس بازار کے آگے چل کر مستی دروازے کے قریب ایک مسجد ہے
شاہی مسجد" کہتے ہیں جو سکھوں کے زمانہ میں بارود خانہ بنادی گئی تھی۔ اس
اور خطیب مولانا غلام قادر بھیروی تھے۔ حسب و نسب کے لحاظ سے یہ بھیرہ
تھے اور چمکنی کے صاحب فیض پیر صاحب کے سلسلۂ قادریہ میں مرید

سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز ہونے کی وجہ سے چشتی سلسلہ سے بھی وابستہ
اور فارسی کے علوم میں ان کو وہ دستگاہ حاصل تھی کہ بڑے بڑے عالم و فاضل
سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ میرے والد جو اپنی زندگی کے ابتدائی
دہلی میں قاضی القضاۃ ہند، صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ سے
علم کر چکے تھے، عربی زبان کے فاضلِ اجل ہونے کے باوجود اپنی عربی اور
کی تصنیفات مولانا غلام قادر بھیروی ہی کو دکھاتے تھے اور ان سے اصلاح
مجھے بھی اپنے بچپن میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اور میں نے اکثر
درس دیتے وقت بھنے ہوئے چنے اور منقیٰ چباتے رہتے تھے۔ بعد میں مجھے
اسی پر ان کی خوراک کا دار و مدار ہے۔ ہاں میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان
و تدریس کا سلسلہ انہیں لوگوں تک محدود ہے جو علم و فضل میں منتہائے کمال کو
تھے۔ بچوں کو درسِ قرآن دینے کے لیے ان کے ایک شاگرد اور مرید تھے جو
جی" کہلاتے تھے۔ اس فقیر گوشہ نشین کو میں نے اس زمانے میں دیکھا جب
ان کے علم و فضل کو پرکھنے کی استعداد نہ تھی۔ میں تو ان کی خدمت میں محض
سعادت و شرف کے لیے حاضر ہوتا تھا اور وہ اس لیے کہ میری "بسم اللہ" کی
مرد حق آگاہ کی زبان سے ادا ہوئی تھی۔ نام و نمود سے ان کو نفرت تھی اور اپنے
کام۔ میں نے جب کبھی انہیں دیکھا، مسجد کے محراب کے قریب ایک مصلی پر
دیکھا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ہمارے گھر میں ان کا نام بڑے احترام سے لیا
وہ راسخ العقیدہ سنی عالمِ دین تھے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ادنیٰ سی
بے اعتنائی برداشت نہیں کرتے تھے۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ:

اس مضمون میں بعض بزرگوں کے علم و فضل کا تذکرہ محض اشارۃً کیا گیا ہے لیکن ہم
روزگار شخصیت حضرت مولانا فیض الحسن سہارنپوری کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مولانا فیض الحسن سہارنپور کے رہنے والے تھے اور قاضی القضاۃ [illegible]
مفتی صدرالدین آزردہ کے شاگرد۔ اپنی تعلیم کے زمانے میں انہیں مولانا امام [illegible]
صہبائی، حکیم مومن خان مومن، میرزا اسداللہ خان غالب اور شیخ محمد ابراہیم [illegible]
صحبت کا بھی شرف حاصل رہا تھا، ابتدا میں اپنا کلام مولانا امام بخش صہبائی [illegible]
رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران دلی سے نکل کر اپنے وطن مالوف [illegible]
پور چلے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ جا کر عربی کی چند کتابوں کا اردو میں [illegible]
۱۸۷۰ء میں لاہور آ گئے۔ ڈاکٹر لائٹنر ان کے علم و فضل سے اس قدر متاثر [illegible]
انہیں اسی سال اورینٹل کالج میں شعبہ عربی کا صدر مقرر کر دیا۔ لاہور میں ان [illegible]
بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں رہا ۱۸۷۱ء میں انہوں نے اسلام کی [illegible]
اور علمی تاریخ پر دو جلدوں میں ''سنین اسلام'' کے نام سے ایک بڑی مفید تالیف [illegible]
کی۔ ان کی تصنیفات سے ان کے علم و فضل کی وسعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ '' [illegible]
شبلی'' میں سید سلیمان ندوی کا یہ قول مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے علم و فضل کی [illegible]
پر شاہد ہے۔

''مولانا فیض الحسن سہارنپوری اس پائے کے ادیب تھے کہ خاک ہند نے
صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو''۔

میرے والد حکیم شجاع الدین شاعری میں انہیں کے شاگرد تھے۔ مولانا فیض [illegible]
سہارنپوری کا ہر شعر ان کے جوہر کمال کا آئینہ دار ہے۔ میں نے حضرت علامہ [illegible]
بھی اکثر ان کے اشعار پڑھتے اور ان کی تعریف کرتے سنا ہے۔ مولانا فیض [illegible]
سہارنپوری نے سترہ برس تک اورینٹل کالج لاہور کے طلبہ کو اپنی شاگردی کی [illegible]
سے فیض یاب کرنے کے بعد ۱۸۸۷ء میں انتقال فرمایا۔

مولانا عبدالحکیم کلانوری رحمۃ اللہ علیہ:

شمس العلماء مولانا عبدالحکیم کلانوری اورینٹل کالج لاہور میں ۱۸۷۲ء سے ۱۹۱۶ء [illegible]

[illegible] مدرس فارسی کے عہدے پر فائز رہے۔ وہ سنی العقیدہ عالم دین تھے۔ ان کو
[illegible] بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ بہت وجیہ انسان تھے اور ان کی گفتگو کا انداز
[illegible] کوئی اچھی طرح سوچ سمجھ کر بات کر رہا ہو۔ شام کے وقت اکثر میرے
[illegible] شہباز دین کی بیٹھک میں آ بیٹھتے۔ جب وہ آتے تو حضرت علامہ اقبال بھی ان
[illegible] بیٹھتے اور زیادہ تر انہیں سے مخاطب ہوتے اور شعر و شاعری کے ادبی محاسن
[illegible] کرتے۔ انہوں نے قواعد فارسی کے علاوہ عروض صنائع و بدائع اور املاء کے
[illegible] پر کئی رسالے لکھے ہیں جن سے فارسی ادب کے طلبہ کو اکتساب علم میں بڑی
[illegible] ہے۔ ان کے مکان پر ان کے شاگردوں کا جمگھٹا رہتا تھا اور جب بازار میں
[illegible] تو اس وقت بھی ان کے شاگرد ان کے ساتھ ساتھ چلتے اور شعر و سخن کی گتھیاں
[illegible] میں ان کی رہنمائی کے طالب نظر آتے۔ سر پر بہت بڑا عمامہ ہوتا اور بدن پر
[illegible] ڈھیلا ڈھالا چغہ۔ ہاتھ میں عصا کی وضع کی لکڑی رکھتے تھے۔ آخر کار اورینٹل کالج
[illegible] چالیس برس تک استادی کے فرائض انجام دینے کے بعد ملازمت سے سبکدوش
[illegible] ۔ اردو فارسی اور عربی میں ان کی کئی تصنیفات مشہور ہیں۔

[illegible] محمد عبداللہ ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ:

شمس العلماء مفتی محمد عبداللہ ٹونکی ۱۸۸۳ء میں اورینٹل کالج میں عربی کے مدرس
[illegible] ہوئے اور ۱۸۸۷ء میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے انتقال کے بعد عربی
[illegible] صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے صاحبزادے مفتی انوار الحق
[illegible] میں ایک مدت تک ناظم تعلیمات رہے۔ مفتی عبداللہ ٹونکی فقہ اسلامی کے بہت
[illegible] عالم تھے۔ اسلامی قانون اور شرعی تنازعات میں ان کا فتویٰ ناقابلِ تردید سند
[illegible] ہوتا تھا۔ وہ بہت کم بولتے تھے لیکن جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا، برہان قاطع
[illegible] رکھتا تھا۔ یہ بھی ہر شام حکیم شہباز دین کی علمی اور ادبی بیٹھک میں آ بیٹھتے تھے۔
[illegible] میں بیٹھنے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا پیشہ وکالت تھا اور کچھ ایسے

بھی جن کو قرآنی احکام کی حکمتوں کو سمجھنے کا شوق تھا۔اس باب میں مفتی محمد
کی رہنمائی ان لوگوں کے بڑے کام آتی۔

مفتی محمد عبداللہ بہت دبلے پتلے انسان تھے۔ پان ہر وقت چباتے
جب بات کرتے تو منہ پر رومال رکھ کر بات کرتے تھے۔ڈاکٹر سر محمد اقبال
کرتے تھے کہ اُس ناتواں جسم میں علم وفضل کا اتنا ذخیرہ ہے کہ کوزے میں
کی مثل ان پر صادق آتی ہے۔ ۷۷ سال تک اورینٹل کالج میں مختلف عہدوں
رہنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور لاہور کو جسے وہ اپنا دوسرا وطن
تھے، داغ مفارقت دے گئے۔شرع محمدی پر چار جلدوں میں ان کی کتاب
ایک قابلِ قدر سرمایہ ہے۔کئی مسائل پر ان کے فتاوی رسالوں کی صورت
ہوئے اور تشنگانِ رموز ونکات شرع اسلامیہ نے ان سے بڑا فیض پایا۔
کچھ عرصہ تک دارالعلوم ندوہ میں کام کیا۔اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر
ہوئے۔۱۹۲۰ء میں رحلت فرمائی۔ان کی وفات سے عربی زبان ایک فاضل
اسلامی شریعت ایک بے نظیر نکتہ دان کی ذات سے محروم ہوگئی۔سید سلیمان ندوی
کے مطابق وفات کے وقت مفتی محمد عبداللہ کی عمر کوئی ستر برس کے قریب تھی
عبداللہ ٹونکی دارالعلوم نعمانیہ کے علمی معاون اور حلقۂ اہل سنت کے بلند پایہ عالم

مولوی محمد حسین آزاد:

اسے بھائی دروازے کی خوش قسمتی کہیے کہ جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے
دلی اجڑی تو دلی کے سب سے پرانے اردو اخبار کے مالک اور ایڈیٹر مولوی محمد
کے بیٹے مولوی محمد حسین آزاد نے انقلاب زمانہ کے گوناگوں مصائب سے
اپنے وطن مالوف سے ہجرت کی اور آخر کار لاہور آ کر بھائی دروازے کے اندر
بازار میں گوشہ نشین ہو گئے۔ان کے علم وفضل کا جوہر ایسا نہ تھا کہ چھپائے
رشتہ تعلیم پنجاب نے لاہور میں ان کی آمد کو غنیمت جانا اور انہیں رشتہ ملازمت

کے جہاں ان کے جوہر کمال کی قدردانی کی وہاں ان کے لیے ایسے مواقع
پایا کہ ان کی شہرت کا آفتاب جسے گردشِ تقدیر سے گہن لگ چکا تھا، افق علم
بڑی درخشانی سے چمکنے لگا۔محکمہ تعلیم میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد
حسین آزاد ۱۸۸۷ء میں اورینٹل کالج میں شعبہ فارسی کے سپرنٹنڈنٹ مقرر
اور اسی سال انہوں نے شمس العلماء کا خطاب بھی پایا۔مولانا محمد حسین آزاد کے
محتاج تعارف نہیں۔ پنجاب میں اردو زبان کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے
جو سنہری کارنامے ان کی ذات سے منسوب ہیں وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتے
آبِ حیات، نیرنگِ خیال، قصص الہند اور دربارِ اکبری جیسی مستند تصانیف ان
کی وسعت اور دنیائے ادب میں ان کے مرتبے کی عظمت پر شاہد ہیں لیکن سب
احسان جو انہوں نے اردو زبان کے طلبہ پر کیا ہے، یہ ہے کہ انہوں نے کرنل
کے ایما پر جو اس زمانے میں سررشتہ تعلیم کے ناظم الامور تھے، اردو نصاب کی
کتابیں لکھیں۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ان کے لکھے ہوئے نصاب
اس سلسلے میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ انہیں کی دکھائی ہوئی راہ کی پیروی تھی، مگر کسی
وہ بات بن نہ آئی جس کی طرح وہ ڈال چکے تھے۔ایک اور احسان جو انہوں
اردو شاعری پر کیا، وہ یہ تھا کہ اسے غزل کے پرانے ڈگر سے ہٹایا اور اس کی انگلی
اسے نیچرل شاعری کی نئی راہوں پر چلانے لگے۔انجمن پنجاب کے مشاعرے
"خال ورُخِ یار"، "گیسوئے خم دار" اور "حسن وعشق" اور "ہجر ووصال" کے خیالی
نہ رہے بلکہ مظاہر فطرت کے وہ عجائب خانے بن گئے جن کے نوادر کو دیکھ
عقل دنگ رہ جاتی ہے۔وہ ایک بے مثال ادیب اور ایک عدیم النظیر شاعر تھے۔
تو انہیں لاہور کے شیعوں نے تکیہ گامے شاہ بیرون بھائی گیٹ میں دفن کردیا۔

شہاب الدین مرحوم:

بھائی دروازے کے اندر سر شہاب الدین جیسے معروف علم دوست اور سخن نواز

سیاسی راہنما رہتے تھے۔ وہ ہر شام کو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے تھے۔ علامہ
اقبال سے ان کے بے تکلفانہ مراسم پر بے شمار لطائف شاہد ہیں۔ جن کے حالات
اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ اپنی محنت اور مشقت سے بہت دولت کمائی اور اس
دولت کا بیشتر حصہ یا تو خدا کی راہ میں صرف کیا یا اپنے دور و نزدیک کے رشتہ داروں
دیا۔ نادر اور بیش قیمت کتابیں جمع کرنے کے شوق نے ان کی ذاتی لائبریری کو ایک
بے نظیر کتب خانہ بنا دیا تھا۔ یہ کتب خانہ ان کی وصیت کے مطابق اب
یونیورسٹی لائبریری کا ایک بے بہا سرمایہ ہے۔ اسی وصیت کے مطابق وفات سے پہلے
وہ اپنی قیمتی زمین جو شاہدرہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے واقع ہے، انجمن حمایت اسلام
دے گئے تھے۔ عمر بھر ان کا دولت کدہ سیاسی تحریکوں کا اکھاڑہ بنا رہا جس میں
سیاست فروش نے زور آزمائی کی۔ سر شہاب الدین نے کبھی اس پہلوان کی پیٹھ
کبھی اس پہلوان کو پٹکنی دی۔ سیاست کے فن میں ایسے ماہر تھے کہ جیت ہمیشہ انہی کی
رہتی تھی۔ بڑے بلند قامت اور رعب داب والے انسان تھے۔ آواز میں ایسا جلال
کہ جب ٹیلی فون پر بات کرتے تو ٹیلی فون کے تار رعشہ بر اندام ہو جاتے۔
قانون ساز میں ان کی آواز کسی مائیکروفون کی محتاج نہ تھی۔ قوت حافظہ کا یہ حال
پارلیمنٹری پریکٹس کی کتابوں کے صفحوں کے صفحے ازبر تھے۔ ان کی قانون دانی سے
قانون ساز کا ہر رکن مرعوب رہتا تھا اور ان کی نکتہ وری کا لوہا سبھی مانتے تھے۔ مَیں نے
سے ان کے دم واپسیں تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور سچ بات تو یہ ہے کہ اس رفاقت سے
فیض پایا۔ اس سرچشمہ فیض کی اتنی خوبیاں مجھے یاد ہیں کہ ان کے بیان کے لیے اس
مضمون میں نہ گنجائش ہے نہ وسعت۔ بس یہی کہہ دینا کافی ہے کہ سر شہاب الدین
خود ایک محفل تھے اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو یہ محفل بھی سونی ہو گئی۔

مولانا تاج الدین احمد منصرم، انجمن نعمانیہ:

ماہر قانون مولوی احمد دین بھی تحصیل بازار میں ''وان والی گلی'' میں رہتے تھے۔

ان کے مکان سے ملحق مولوی تاج الدین کا مکان تھا جو ان مسلمان گریجویٹوں میں
تھے جنہوں نے انگریزی زبان میں بے مثال مہارت پیدا کرنے میں بڑا نام
یہ بھی پہلے سررشتہ تعلیم پنجاب میں ملازم ہوئے اور بعد میں ریاست پٹیالہ کے محکمۂ
تعلیم کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ بڑے متین اور صائب الرائے بزرگ تھے، شیخ
عبدالقادر، مولوی احمد دین اور مولوی تاج دین پرانی وضع کے اس قدر پابند تھے کہ مَیں
نے انہیں ان کی جواں سالی کے زمانے میں بھی کبھی بے ریش نہیں دیکھا۔ یہی مولوی
تاج الدین ایک عرصہ تک انجمن نعمانیہ کے سیکریٹری رہے اور اس دار العلوم کے
انتظامی معاملات کو احسن طریقے سے سرانجام دیتے رہے۔

علامہ اقبال کے اساتذۂ سخن:

وان والی گلی سے آگے چل کر اسی تحصیل بازار میں ایک اور کوچہ ہے جسے بھابڑوں
کی گھڑیاں کہتے ہیں۔ خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش اور خواجہ امیر بخش تینوں بھائی اسی
کوچے میں رہتے تھے۔ یہ بزرگ اپنی عزلت گزینی کے باعث منظر عام پر نہیں آئے،
مگر وہ اس محفل کی روح و رواں تھے جو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں ہر شام کو جمتی
تھی۔ ان کی جرات تنقید اور جوہر شناسی نے اس زمانے کے نوجوان ادیبوں اور
شاعروں کی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔ جب تک سر محمد اقبال اپنا کلام ان بزرگوں کو نہ سنا
لیتے تھے، اسے کسی مجلس عام میں نہ پڑھتے تھے۔ ''نالۂ یتیم''، ''ہلالِ عید''، ''تصویر درد''
''شمع و شاعر'' کی سی مشہور و معروف نظمیں اقبال نے پہلے انہیں لوگوں کے سامنے
پڑھیں اور پھر ان سے دادِ سخن پا کر انہیں انجمن حمایتِ اسلام اور انجمن نعمانیہ کے
سالانہ جلسوں میں پڑھ کر دنیائے اسلام سے خراجِ تحسین و عقیدت وصول کیا۔ خواجہ
فیروز الدین بیرسٹر ایٹ لاء جو اقبال کے ہم زلف تھے اور جنہوں نے آگے چل کر ایک
کامیاب وکیل کی حیثیت سے بڑا نام پایا اور تحریک پاکستان میں بڑا کام کیا۔ انہی
خواجہ رحیم بخش کے بیٹے تھے۔ اور خواجہ عبدالمجید ''جامع اللغات'' جیسی جامع اور ضخیم

لغت کے مصنف خواجہ کریم بخش کے صاحبزادے تھے۔اس لغت کی
کے مؤلف کی وسعت نظر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ رموز ادب
سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود عمر بھر کس انہماک سے اس
کی تکمیل کے درپے رہا جو آج اردو ادب کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔
کہ یہ فیض اسی گھرانے کا ہے جس کے جوار عاطفت میں ان دونوں
پرورش پائی۔

دارالعلوم نعمانیہ:

بھاٹی دروازے کے اندرونی محلوں اور گلیوں کے جن اہل علم و
حضرات کا ذکر کیا گیا ہے ان کی وجہ سے یہ علاقہ لاہور کا گہوارۂ علم و ادب
انگریزوں نے اس محلّہ کو جب طوائفوں کے حوالے کیا تو یہاں کی علمی اور
مغنیہ کی دھنوں اور رقص و سرود کی محافل میں دب گئیں۔علاقہ کے معززین
کر کے لاہور کے دوسرے علاقوں میں جا بسے۔شاعری کی محفلیں اور تعلیمی
منتقل ہونے لگے۔ با ایں ہمہ اس علاقہ میں ''انجمن نعمانیہ'' کا واحد دارالعلوم
کی گندگی کے باوجود بھاٹی دروازے کے اندر علم و فضل کے چشمے کی طرح
میں برصغیر کے جلیل القدر علماء آتے، قیام کرتے، تقاریر کرتے، تدریس کا کام
اور ہزاروں طلبہ دینی علوم سے دامن شوق بھرتے۔اس دارالعلوم میں امیر
جماعت علی شاہ علی پوری، سید دیدار علی شاہ الوری اور پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی
علیہم جیسے باکمال لوگ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ قیام فرما
مولانا محمد حسین فیضی، مولانا غلام احمد صاحب حافظ آبادی، حافظ قرآن و بخاری
غلام مرشد، محرم علی چشتی ایڈووکیٹ، مولانا غلام قادری بھیروی، مولانا وصی احمد
مولانا عبداللہ ٹونکی جیسے بلند پایہ علماء علم و عرفان کے دریا بہاتے۔انجمن نعمانیہ
دارالعلوم ۱۸۸۷ء میں بادشاہی مسجد میں قائم ہوا تھا، مگر ۱۹۱۱ء میں اپنی عمارت

بھاٹی دروازے کے اندر ہے اور یہاں سے ہزاروں طلبہ دینی علوم پڑھ کر
انجمن کے کارپردازان صحیح سنی العقیدہ تھے جنہیں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی
امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی حاصل رہی۔اعلیٰ حضرت کے شاگرد، ان
ان کے خلفاء اس دارالعلوم کی علمی خوشبوؤں کو چاردانگ عالم میں پھیلاتے
دارالعلوم نعمانیہ کے بلند پایہ علماء کا ذکر کیا جائے تو ہمیں ایک اور ''محفل اذکار''

بھاٹی دروازہ لاہور کا مرکز علم و ادب رہا ہے۔اس کے گلی کوچے اور خستہ حال
ابھی تک ان مشاہیر علم و ادب کی نشاندہی کرتے ہیں جنہوں نے بیسویں
میں اپنا نام پیدا کیا اور جہاں سے علم و فضل کے قافلے روانہ ہوتے رہے ہیں۔

(''جہان رضا'' اپریل، مئی ۲۰۰۰ء)

مضمون حکیم احمد شجاع کے مضمون ''لاہور کا چیلسی'' مطبوعہ مجلّہ نقوش لاہور سے
ہے لہٰذا جہاں کہیں صیغہ واحد متکلم استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد حکیم احمد شجاع

لاہور کے پچاس سالہ خیابانِ علم وسخن پر ایک نظر

''جہانِ رضا'' اپریل مئی کے شمارے میں ''بھاٹی دروازہ لاہور کا علمی خیابان'' کے موضوع پر ایک مضمون شائع ہوا تھا جسے بہت سے قارئین نے پسند کیا۔ اہل علم و فضل حضرات نے بڑی تعریف کی۔ خصوصاً عمر رسیدہ حضرات نے تو یہاں تک لکھا کہ ہم نے اکثر علمائے کرام اور ان مقامات کو اپنی آنکھوں دیکھا ہے، جن کا ذکر اس مضمون میں آیا تھا۔ ان حضرات کے ذوقِ مطالعہ اور یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ہم سابقہ پچاس سالہ لاہور کی علمی شخصیات کی یادوں سے وقت کی غبار کو جھاڑ کر قارئین ''جہانِ رضا'' کو دعوتِ مطالعہ دے رہے ہیں۔

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ:

پاکستان بنا تو لاہور میں مہاجر اہلِ علم وفضل بھی لٹے پٹے قافلوں کے ساتھ آئے۔ مقامی اہلِ علم بھی اپنی اپنی قیام گاہوں میں موجود تھے۔ ان ''مہاجرین اور انصار'' علمائے کرام کے باہمی روابط نے لاہور کو خیابانِ علم وفضل بنا دیا۔ لاہور شہر کی شکست و ریخت کے باوجود اس کے گلی کوچے ان حضرات کی علمی خوشبوؤں سے مہکتے رہے۔ لاہور کے دروازوں کے اندر تمام محلوں میں علماء و شعراء کا بسیرا تھا۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ ان چراغوں سے روشن تھا۔ مسجد وزیر خان لاہور کے قلب میں واقع ہے۔ اپنی شان و شوکت اور خوبصورتی کے ساتھ سارے شہر کے حسن و جمال کو دوبالا کرتی ہے۔ پاکستان بنا تو اس مسجد کے خطیب مولانا ابوالحسنات سید محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑی باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ الوری کے فرزندِ ارجمند تھے، جنہوں نے لاہور کے دینی حلقوں میں اپنا لوہا منوا رکھا تھا۔ مولانا سید ابوالحسنات

ایک عمدہ قاری تھے۔ قرآن پڑھتے تو لطف آجاتا۔ آپ نے اردو زبان میں فصاحت و بلاغت کا وافر حصہ پایا تھا۔ تقریر کرتے تو سننے والے دادِ سخن دیتے۔ جمعہ کے خطبہ کے علاوہ جب جلسہ عام میں تقریر کرتے تو سننے والے واہ واکیے بغیر نہ رہتے۔ وہ مسجد وزیر خان لاہور میں مختلف موضوعات پر اہلِ علم کے اجلاس بلاتے اور اس طرح مسجد وزیر خان کی علمی شان قائم رہتی۔ جب مرکزی انجمن حزب الاحناف کے سالانہ اجلاس ہوتے تو لوگ دور دراز سے آتے اور مسجد وزیر خان کی رونقیں عروج پر ہوتیں۔

قاری محمد طفیل امرتسری:

پاکستان بنا تو امرتسر کے ایک قاری محمد طفیل صاحب نقشبندی لاہور آئے۔ وہ مختلف مساجد میں مسند تدریس بچھا کر بیٹھے مگر دل نہ لگا۔ وہ بہت بڑے خوش الحان قاری تھے۔ قرآن پڑھتے تو در و دیوار جھوم جھوم اٹھتے۔ جب انہوں نے مسجد وزیر خان میں مسند تجوید وقرأت بچھائی تو طالب علموں کے جمگھٹے لگ گئے۔ ہم لوگ رمضان شریف میں اپنی اپنی مساجد میں تراویح پڑھ کر مسجد وزیر خان پہنچتے۔ قاری محمد طفیل صاحب قرآن کیا پڑھتے، دلوں کو دھو ڈالتے۔ محراب میں کھڑے تلاوت کرتے تو مسجد وزیر خان کے بیرونی دروازے میں کھڑے لوگ ایک ایک لفظ سن پاتے۔ اتنی بڑی مسجد میں نمازیوں کی صفیں دیدنی ہوتیں۔ چند سال بعد قاری محمد طفیل کو ملتان اور حیدرآباد سندھ کے عقیدت مند لے گئے اور انہوں نے زندگی کا آخری دور وہاں تدریسِ قرات میں گزار دیا۔

مسجد وزیر خان کے حجروں میں کئی حضرات زہد و عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ غزنی کے ایک جواں سال عابد سارا دن عبادت کرتے مگر آدھی رات ہوتی تو حجرے سے باہر آتے۔ پانی کے حوض کے کنارے بیٹھ کر پانی سے کھیلتے۔ وہ دو تین گھنٹے حوض کے کنارے بیٹھے رہتے اور اللہ اللہ کرتے۔ ہم لوگ کبھی کبھی ان کے پاس جا بیٹھتے اور ان کے ہاتھوں سے اٹھنے والے پانی کے چھینٹوں سے لطف اندوز ہوتے۔ بس ان

چھینٹوں کو ہی ہم تبرک سمجھتے۔ ایک حجرے میں استاد فیروز الدین مصور کا قبضہ تھا۔ وہ
بڑے نفیس مصور تھے۔ انہوں نے وزیر خان کی مسجد کے درودیوار کے تمام نقوش اپنے
ٹریسنگ پیپروں پر اتارے تھے۔ ان کے رنگوں کو محفوظ کرتے جاتے۔ اس طرح وہ
صرف وہ مغل مصوری کے وارث تھے بلکہ ان کے کئی شاگرد بھی مغل دور کی مصوری کی
مشق کرتے تھے۔ ان دنوں نہ ایسے کیمرے آئے تھے نہ ایسے کمپیوٹرز جو نقش کا عکس
اتار لیتے ہیں۔

مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ:

دہلی دروازہ کے باہر کوتوالی ہے۔ اس کی شمالی دیوار کے ساتھ مولانا محمد نبی بخش
حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد ہے۔ اس میں مولانا حلوائی نے ایک دینی درس گاہ قائم کی
ہوئی تھی جس سے بڑے بڑے اہل علم اپنا اپنا حصہ لے کر نکلتے تھے۔ مولانا حلوائی تو
۱۹۴۴ء میں انتقال کر گئے تھے مگر ان کی "تفسیر نبوی پنجابی" کے چرچے سارے شہر میں
ہی نہیں سارے پنجاب میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بڑے راسخ العقیدہ سنی عالم دین
تھے۔ حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری اور پیر جماعت علی شاہ لاثانی علی پوری رحمۃ اللہ
علیہ کے خلیفہ مجاز تھے۔ آپ کی یہ مسجد اگرچہ چھوٹی سی تھی مگر علم و ادب کی وجہ سے
ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ اب اس مسجد کو از سرِ نو تعمیر کیا جا رہا ہے۔ سنا ہے کہ
یہاں کے رہنے والے اس وقت کے درویشوں کے ہاتھوں میں جنت کے دروازوں
کی کنجیاں تھیں۔ وہ شیخ عطار کا مصرع برملا پڑھتے۔

ع حُبِ درویشاں کلید جنت است!

کوتوالی کے سامنے دہلی دروازے کے باغ کے ایک کنارے پر ایک چھوٹی سی
مسجد تھی۔ اب یہ "میلاد چوک والی مسجد" کہلاتی ہے مگر جس زمانے کی ہم بات کرتے
ہیں، ان دنوں یہ "باغ والی مسجد" کہلاتی تھی۔ اس کے امام ایک افغانی عالم دین تھے۔
وہ گزر اوقات گھڑیوں کی مرمت کی مزدوری سے کرتے مگر تعویذات دے کر للہ فی اللہ

بیمار اور لاچار لوگوں کی چارہ گری کرتے۔ ہم جب بیمار ہوتے تو مولوی صاحب سے
تعویذ لے کر تندرست ہو جاتے۔ اس مسجد کے ساتھ لاہور کے دہلی دروازہ کے باہر
ایک وسیع باغ تھا جس میں پاکستان بننے سے پہلے "مجلسِ احرار اسلام" کے جلسے ہوا
کرتے تھے۔ مگر پاکستان کے بننے کے بعد احراری مقرر اور مولوی چھپے رہتے تھے انہوں
نے تحریک پاکستان میں پاکستان کی سخت مخالفت کی تھی۔ "مجلسِ احرارِ اسلام" کا
مرکزی دفتر حضرت شاہ محمد غوث کے مزار کے سامنے واقع تھا۔ اس میں سید عطاء اللہ
شاہ بخاری، مولانا احسان احمد شجاع آبادی، چودھری افضل حق، مولوی محمد علی جالندھری،
شیخ حسام الدین امرتسری، تاج الدین انصاری، مولوی مظہر علی اظہر، شیعہ ذاکر علامہ
شمسی، غلام نبی جانباز، آغا عبدالکریم شورش کاشمیری اور دوسرے اصاغر و اکابر احراری
جمع ہوتے۔ ان سے ملنے کے لیے سیکڑوں دیوبندی مولوی بھی آتے اور ان کی بجھی
بجھی مجالس لگتیں۔ چونکہ یہ تمام لوگ تحریکِ پاکستان کے خلاف تھے اور گاندھی اور نہرو
کے وظیفہ خوار تھے۔ لاہور کے لوگ انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔

لاہور کے اخبارات کے دفاتر:

اس جگہ سے ذرا ہٹ کر شمال کی طرف ایک بڑی حجازی بلڈنگ سے "روزنامہ
احسان" نکلتا تھا۔ جس کے ایڈیٹر ملک احسان الٰہی تھے۔ زبردست مسلم لیگی اور تحریکِ
پاکستان کے زبردست حامی۔ جہاں "روزنامہ انقلاب" کے دو "ایڈیٹران کرام"
عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر اپنے قلم کے جوہر دکھاتے۔ وہاں "روزنامہ احسان"
کے قلم کار اور "روزنامہ زمیندار" کے آخری دور کے قلم طراز ایک دوسرے سے چونچیں
لڑاتے اور خوب لڑاتے۔ شورش کاشمیری کا "چٹان" اپنی انفرادی شان سے چھپتا اور
اس کے زور قلم کو ہر پڑھا لکھا پسند کرتا۔ وہ نظم و نثر میں یکساں کمال رکھتے تھے۔ اور
"اک رنگ کا مضمون ہو سو رنگ سے باندھوں" کی تصویر تھے۔ چونکہ شورش کاشمیری
احرار کے "پیر مغان" کا "مغ بچہ" تھا اس کی سنی اہلِ علم و فضل سے چشمک رہتی تھی۔

ہمارے ایک دوست اس کے بڑے مداح تھے مگر کہا کرتے تھے۔

احرار کی خطاؤں پر رو رو کے عمر بھر
شورش، چٹان زیست سے سر پھوڑتا رہا

جامع مسجد شاہ محمد غوث قادری رحمۃ اللہ علیہ کے خطیب:

مجلس احرار کے دفتر کے سامنے محدث کبیر حضرت شاہ محمد غوث قادری گیلانی کا دربار گوہر بار ہے۔ اس کے ساتھ ایک جامع مسجد ہے۔ اس کے ایک خطیب مولانا عبدالحنان کابلی تھے۔ ایک عابد و زاہد پیر بخاری صاحب تھے۔ پاکستان بنا تو مسند خطابت پر ایک دیوبندی مولوی مطیع الحق براجمان ہو گئے مگر لوگوں کے احتجاج پر انہیں علیحدہ ہونا پڑا۔ مولانا سلطان محمد مرحوم خطیب بنے۔ وہ انگریزی اقتدار میں چودہ سال جیل میں رہے تھے مگر پاکستان بنا تو آزادی ملی۔ بڑے متوکل اور درویش منش انسان تھے۔ غریبوں کی امداد کرتے رہتے اور گھر کے سامنے ہر شام کے وقت بیٹھ جاتے اور ایک سو غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ہمارے ایک دوست حافظ محمد عالم سیالکوٹی جو مولانا محمد نبی بخش حلوائی کے مرید اور دارالعلوم حزب الاحناف کے فارغ التحصیل تھے، خطیب بنے۔ وہ سیالکوٹ گئے تو مولانا محمد سعید نقشبندی (مترجم مکتوبات امام ربانی اور کیمیائے سعادت) منبر خطابت پر جلوہ گر ہوئے۔ مولانا محمد سعید نقشبندی کی جگہ ہمارے دوست قاری عطاء اللہ صاحب نے مسند خطابت پر اپنی تقاریر کا آغاز کیا۔ مولانا محمد سعید نقشبندی کچھ عرصہ بعد حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی جامع مسجد کے خطیب مقرر ہوئے اور تاحیات اس منصب پر فائز رہے۔ شاہ محمد غوث کی جامع مسجد کے یہ دونوں خطیب اپنے وقت میں بڑے قد آور علمائے اہل سنت میں شمار ہوتے تھے۔ حافظ محمد عالم نے سیالکوٹ پہنچ کر مسند تدریس بچھائی تو ہزاروں طلبہ کو حافظ، قاری اور عالمِ دین بنایا اور مولانا محمد سعید نقشبندی نے دارالعلوم نعمانیہ لاہور میں مسندِ تدریس بچھائی اور تالیف و تصانیف میں اپنا نام پیدا کیا۔

سردار عبدالرب نشتر اور پیر محمد امیر شاہ قادری:

حضرت شاہ محمد غوث کے سجادہ نشینوں سے پنجاب کے نیک نام گورنر عبدالرب نشتر کے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ اس دربار پر حاضری دیتے اور حکومت کی مشینری بھی اس مزار کے اردگرد گھومتی مگر پشاور کے ایک عالم و فاضل سجادہ نشین مولانا سید محمد امیر شاہ قادری گیلانی مدظلہ العالی جو سلسلہ قادریہ کا ایک روشن چراغ ہیں، اور ہمارے کرم فرما ہیں۔ ہمارے ان سے نیازمندانہ مراسم ہیں۔ جب انہوں نے تذکرہ علماء مشائخ سرحد، ترجمہ شرح بخاری مولفہ حضرت شاہ محمد غوث اور انوار غوثیہ شائع کیں تو اہلِ علم نے انہیں ہدیۂ تحسین پیش کیا۔

دارالعلوم حزب الاحناف لاہور:

مرکزی انجمن حزب الاحناف کا دارالعلوم ان دنوں دہلی دروازے کے اندر چنگڑ محلہ میں واقع تھا۔ یہ دارالعلوم حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ الوری رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۲۳ء میں قائم کیا پھر ان کے نامور بیٹے ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ علامہ ابوالبرکات نے زندگی کا ایک طویل حصہ اس دارالعلوم کے لیے وقف کر دیا تھا اور سیکڑوں طلبہ کو دولت علم و اعتقاد سے مالا مال کر کے دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔ آج فرزندانِ حزب الاحناف دنیا کے تمام ممالک میں پھیلے ہوئے خدمات دینیہ سرانجام دے رہے ہیں۔ اس دارالعلوم کے نامور اساتذہ میں سے ایک عالم دین مولانا مہرالدین جماعتی نے تدریسی اور فنی دنیا میں بڑا مقام پایا۔ انہوں نے پورے چالیس سال دارالعلوم حزب الاحناف کے طلبہ کو پڑھایا۔ بڑے زبردست مدرس تھے۔ صرفی، نحوی، منطقی، معقولی، بیانی و لسانی ہر شعبہ فن میں کمال رکھتے تھے۔ وہ شام کو مولانا نبی بخش حلوائی کے مدرسہ متصل کوتوالی آتے اور طلبہ کی ایک شبینہ کلاس کو پڑھاتے ہم لوگ انہیں کے دسترخوان فیضان کے خوشہ چین ہیں۔ مولانا مہرالدین

جماعتی بڑے شفیق استاد تھے۔ چاہ میراں کے نزدیک اپنا گھر بنایا اور ساری زندگی تدریس علوم اسلامیہ کے لیے وقف کر کے رخصت ہوئے۔

مولانا محمد بخش مسلم رحمۃ اللہ علیہ:

لوہاری دروازے کے باہر ایک باغ کے کنارے پر گل فروشوں کی دکانیں تھیں۔ انہیں ''پھلیرے'' کہا جاتا تھا۔ ان دکانوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد تھی جہاں اب ''مسلم مسجد'' کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے۔

اس چھوٹی سی مسجد کے سامنے ایک باغ تھا جہاں گراسی پلاٹ کے علاوہ سایہ دار درخت سایہ گستر رہتے تھے۔ اس چھوٹی سی مسجد کے خطیب مولانا محمد بخش مسلم بی۔اے تھے۔ وہ تحریکِ پاکستان کے سچے ترجمان اور خوش آواز مقرر تھے۔ اپنی تقاریر میں انگریزی جملے بولتے تو حاضرین متاثر ہوتے۔ مولانا مسلم جمعہ کی نماز سے پہلے تقریر کرتے تو لوگوں سے سارا باغ کھچا کھچ بھر جاتا۔ لوگ دور دور سے آپ کی تقریر سننے آتے۔ آپ نے ساری زندگی یہاں ہی خطبہ جمعہ دیا۔ پاکستان بننے سے پہلے یہ لاہور کی واحد مسجد تھی جہاں تحریک پاکستان کے حق میں آواز بلند ہوتی اور تحریکِ پاکستان کے خلاف کانگریسی اور احراری مولویوں کے اعتراضات کا کھل کر جواب دیا جاتا۔ مولانا مسلم گورے رنگ کے دبلے پتلے عالمِ دین تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی پہنتے اور تقریر کرتے تو سیاسی اور دینی معلومات کا چشمہ ابلتا۔ مجلسی گفتگو کرتے تو لطف آ جاتا۔ لطائف علمیہ سنانے پر آتے تو دل خوش کر دیتے۔ ان کی شبانہ روز کوششوں نے نہ صرف ایک زمانے کو متاثر کیا بلکہ اپنی زندگی میں ایک شاندار مسجد کی تعمیر کرا دی۔ آج اسی مسجد کے زیر سایہ آپ آرام فرما ہیں۔ یہ مسلم مسجد کسی وقت میں دینی رونقوں کا مرکز تھی مگر آج محکمہ اوقاف کے زیرِ اثر مسجدیں ''مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے'' کا نمونہ ہے۔

مولانا محمد شریف نوری رحمۃ اللہ علیہ:

مسجد سے تھوڑا سا آگے آئیں تو شاہ عالمی دروازے کے باغ میں مولانا محمد

شریف نوری قصور سے آ کر تقریر کرنے لگے تھے۔ مولانا نوری ایک خوش آواز مقرر تھے۔ مولانا نور اللہ صاحب نعیمی کے مدرسہ بصیر پور سے پڑھ کر آئے تو ''نوری'' کہلائے۔ اہلِ قصور کو اپنی آواز سے گرویدہ بنا لیا۔ وہاں سے نکلے، لاہور آئے تو تازہ مجمع اکٹھا کیا۔ شاہ عالمی دروازے کے باغ سے اٹھے تو میو ہسپتال کے قریب سرائے رتن چند کی مسجد میں اپنا مرکز قائم کر لیا۔ اپنی خوش آوازی اور خوش بیانی سے لاہور کے اہلِ ذوق کو دعوتِ سماعت دی۔ مسجد میں جگہ تنگ ہو گئی تو راوی روڈ پر ایک عظیم الشان ''مسجدِ محمدیہ'' کی تعمیر شروع کر دی۔ اور اسے مرکز علم و ادب بنا دیا۔ فوت ہوئے تو اسی مسجد کے دامن میں دفن ہوئے۔ آج یہ بڑی مسجد مولانا محمد ارشد رانا صاحب کی زیر کفالت ہے مگر

؎ نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں!

مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ:

سید ابو الحسن علی الہجویری داتا گنج بخش کے مزار پر انوار کے پہلو میں لاہور کی غالباً سب سے پہلی مسجد ہے جو حضرت داتا کے روحانی فیضان سے ہمیشہ نمازیوں سے لبالب بھری رہتی ہے۔ اس مسجد میں بڑے بڑے معروف خطیب آئے مگر پاکستان بننے کے بعد کچھ عرصہ کے لیے مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی پنجابی تقاریر سے نہ صرف اہل لاہور کو متاثر کیا بلکہ دوسرے شہروں سے جوق در جوق نمازی آتے اور آپ کی تقاریر سنتے۔ مولانا پنجابی کے قادر الکلام خطیب تھے۔ وہ نہ صرف پنجابی کے مخصوص الفاظ استعمال کرتے بلکہ بعض اوقات الفاظ گھڑتے۔ مجھے جب کبھی مولانا محمد بخش مسلم مرحوم اور مولانا محمد شریف نوری مرحوم کے ساتھ ''دار المقیاس'' میں آپ کی ذاتی مجالس میں بیٹھنے کا موقع ملتا تو پنجابی کے بے تکلف جملے سن کر ہم لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ مولانا محمد بخش مسلم مرحوم کو اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا۔ مگر مولانا محمد عمر اچھروی مرحوم کے محاورے سنتے تو نہ صرف عش عش کر اٹھتے بلکہ کئی بار رقص کرنے لگتے۔ مولانا

محمد عمر اچھروی صرف خطیب ہی نہیں تھے، زبردست مناظر تھے۔ شیعہ، دیو
وہابی مناظر مولانا محمد عمر اچھروی کی للکار کے سامنے شکست کھا کر بھاگ جاتے
محمد عمر جس مجمع میں تقریر کرتے کئی کئی گھنٹے لوگوں کو ہلنے نہ دیتے۔ ہر شخص کی
ہوتی کہ مولانا اچھروی تقریر کرتے جائیں اور وہ سنتے جائیں۔

پھر چھیڑا "عمر" نے اپنا قصہ
لو آج کی رات بھی سو چکے ہم!

مولانا غلام دین رحمۃ اللہ علیہ (انجن شیڈ):

پاکستان کے قیام کے بعد مولانا غلام دین نے انجن شیڈ کے ایک ویرانے میں
خطبہ جمعہ دینا شروع کیا۔ ریلوے کے مزدور آپ کے سامعین ہوتے۔ آہستہ آہستہ
مجمع مزدوروں کے علاوہ عام لوگوں کا مجمع بن گیا۔ لاہور کے اہلِ ذوق جوق در جوق
آنے لگے۔ کھلا میدان لوگوں سے بھرنے لگا۔ دور دور سے لوگ پہنچنے لگے۔ مولانا
غلام دین مرحوم نہایت میٹھے انداز میں تقریر کرتے۔ وہ اپنی تقریروں کے بل بوتے
سارے ملک پر چھا گئے۔ دور دراز سے لوگ آتے اور آپ کو دعوت خطاب دیتے
مولانا کی کوششوں سے انجن شیڈ میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر ہوئی جس کے پہلو میں
آپ آرام فرما ہیں۔ آج یہ مسجد بڑی عمارت ہے مگر خاموش ہے۔ نہ ریلوے کے
انجنوں کا شور رہا نہ علماء کی تقریروں کا زور رہا!

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:

اگرچہ بات اپنی ہے مگر "گفتہ آید در حدیث دیگراں" دہلی دروازے کے باہر
کوتوالی کے متصل ہمارے استاد مفسر قرآن مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی بنائی
ہوئی دومنزلہ مسجد ہے۔ جب ہم نے اس میں تقریر کا آغاز کیا پہلے تو رک رک کر، آہستہ
آہستہ، پھر قدم بقدم تقاریر کا آغاز کیا مگر ایک وقت آیا کہ یہ مسجد لاہور کے خطبات جمعہ

ایک اہم مقام بن گئی۔ لوگ قطار در قطار آتے۔ مسجد کا صحن بھر جاتا۔ چھت بھر جاتی۔
سامنے گھاس منڈی کا وسیع میدان بھر جاتا۔ پھر ساتھ کوتوالی کا احاطہ بھرا جانے لگا۔
نہیں بلکہ لوگ دوسری مساجد میں جمعہ پڑھ کر سڑکوں پر آ کھڑے ہو کر تقریر سنتے۔
ماشاء اللہ الحمدللہ اس مسجد نے اہلِ ذوق کو کھینچ لیا۔ اہلِ محبت نے پسند کیا اور کئی سال
تک یہ مسجد تقریری ذوق کا لطف اٹھانے والوں کا مرکز بنی رہی۔ لاہور کے مقررین کی
بات چلتی تو اس مسجد کے خطیب (پیرزادہ اقبال احمد فاروقی) کا ذکر ضرور آتا۔

بات جب چھڑ گئی قیامت کی
قصہ پہنچا تیری جوانی تک

لاہور خطیبانِ اہلِ سنت کا گہوارہ:

ایک وقت آیا کہ پنجاب کے چوٹی کے خطیبوں نے لاہور کو اپنا مرکز خطابت بنا
لیا۔ لوہاری دروازے سے لے کر بھاٹی دروازے تک کا وسیع باغ سامعین سے لبالب
بھر جاتا اور پنجاب کے چیدہ چیدہ سنی علمائے کرام آتے اور تقاریر کرتے۔ صاحبزادہ
سید فیض الحسن آلومہاروی، شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا محمد بخش مسلم،
مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا غلام دین انجن شیڈ، مولانا محمد عمر
اچھروی، مولانا محمد شریف نوری جیسے بلند پایہ مقرر خود بخود آتے اور تقریریں کرتے۔
ادھر لاہور کے لوگ بھی سارا سارا دن ان تقاریر سے مستفیض ہونے کے لیے دور دراز
سے آتے۔ یہ دور سنی خطیبوں کا ایک مثالی دور تھا جو بلا کسی دعوت، کرایہ یا نذرانے کے
عوام کے سامنے تقاریر کرتے تھے۔

مولانا نور محمد ایمن آبادی:

ان علمائے کرام کے سٹیج سے تھوڑا سا آگے جائیں تو پیر مکی کے مزار کے سامنے
ایک خوبصورت باغ آتا ہے جہاں ایک سوز خواں سنی عالم دین مولوی نور محمد ایمن

آبادی وعظ کیا کرتے تھے۔ ان کی مجلس وعظ میں خواتین کی تعداد زیادہ ہوتی تھی
انہوں نے مستورات کو کھلی اجازت دے رکھی تھی وہ دورانِ تقریر گھر کے لیے
وغیرہ بنا سکتی تھیں۔ سویٹر بن سکتی تھیں، گھر کے تمام کام سرانجام دے سکتی تھیں۔
بچوں کو دودھ پلانا، انہیں کھلانا اور ان کو لوریاں دینے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ مولوی
محمد ایمن آبادی ہرنی کا قصہ، جابر کے فرزندوں کی قربانی اور ان کا دوبارہ زندہ
حضرت بلال پر مظالم کی داستان، شہدائے کربلا کی داستانِ غم سناتے جاتے اور
میں توجہ سے وعظ سننے والی خواتین کو رلاتے جاتے۔

مولانا مودودی میدانِ خطابت میں:

لاہور کے اس خطاباتی زمانہ کے دوران عالمگیر کی بادشاہی مسجد میں مولانا غلام
مرشد، سنہری مسجد کے خطیب اور دیوبندی مساجد کے ائمہ بالکل لاتعلق رہتے تھے۔
البتہ جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے علمائے اہل سنت کی اس
مہم سے متاثر ہو کر اپنی خطاباتی تحریک کا آغاز کیا۔ وہ لاہور کے بڑے بڑے محلوں میں
''جماعت اسلامی'' کے اجتماع کرتے۔ لوگوں کو اپنے افکار سے آگاہ کرتے اور
نوجوان طبقہ کو متاثر کرتے۔ جب سنی علماء اپنے پروگرام میں سست پڑ گئے تو مولانا
ابوالاعلیٰ مودودی نے بھاٹی دروازہ کے باہر والے باغ میں ایک زبردست کانفرنس
کی۔ یہ نواب آف کالاباغ کی گورنری کا زمانہ تھا۔ جماعت اسلامی کی کانفرنس میں
گولی چلی۔ جماعت اسلامی کا ایک عالم دین اللہ بخش گولی کا نشانہ بنا۔ کانفرنس درہم
برہم ہو گئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مولوی اللہ بخش کا قاتل آج تک نہیں پکڑا گیا!

حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ:

اگرچہ لاہور کی گلیوں میں بڑے بڑے اہلِ علم کے ''آشیانے'' تھے مگر رام گلی
کے ایک درویش صفت طبیب حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کی مجالس نہیں بھولتیں۔ وہ علم

دوست انسان تھے۔ مریضوں کے علاوہ اہلِ علم بھی ان کے مطب میں موجود رہتے۔
مریضوں کو دوائی دیتے مگر اہلِ علم کی خاطر و مدارات کرتے۔ آگے چل کر اسی حکیم محمد
موسیٰ امرتسری نے ''مرکزی مجلسِ رضا'' کی بنیاد رکھی۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی
کتابیں شائع کر کے مفت تقسیم کرنے کا پروگرام بنایا۔ یومِ رضا کے جلسوں میں مقتدر
علماء اور خطباء کو دعوتِ خطاب دیتے اور لوگ جوق در جوق آتے۔ آپ نے اٹھارہ
کتابیں شائع کر کے تقسیم کیں اور فاضلِ بریلوی کے افکار کو سارے برصغیر میں
پھیلایا۔ یہ سلسلہ ابھی تک ''مرکزی مجلسِ رضا'' کے زیرِ اہتمام جاری ہے۔

تحریکِ ختمِ نبوت:

پاکستان کے قیام کے چند سال بعد ''تحریکِ ختمِ نبوت'' چلی تو علمائے اہلِ سنّت
نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دیوبندی علماء، وہابی مولوی، جماعت اسلامی کے
دانشور اور شیعہ ذاکر پہلی بار لاہور شہر میں سنی علماء کی قیادت میں سامنے آئے۔ چونکہ یہ
جماعتیں تحریک پاکستان کے خلاف تھیں۔ انہیں لوگ سننا تو کیا دیکھنا بھی پسند نہیں
کرتے تھے۔ مگر ''تحریکِ ختمِ نبوت'' کے دوران یہ لوگ سنیوں کے دامن میں لپٹ کر
پاکستان میں پہلی بار دینی میدان میں آ گئے۔ مولانا ابوالحسنات، مولانا عبدالحامد بدایونی،
صاحبزادہ سید فیض الحسن اور مولانا احمد سعید کاظمی جیسے سنی علماء اس تحریک میں پیش پیش
تھے۔ مارشل لا لگا تو سب کے سب گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا عبدالستار خان نیازی
صاحب ان دنوں پنجاب اسمبلی کے رکن تھے۔ انہوں نے پنجاب اسمبلی سے نکل کر مسجد
وزیر خان کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ مارشل لا کے باوجود تین دن تک حکومت کے خلاف تقریر
کرتے رہے اور کسی پولیس مین یا ملٹری کے جوان کو اپنے ہیڈ کوارٹر تک نہ آنے دیا۔ ان
دنوں وزیر خان کی مسجد میں سنیوں کا مجمع دیدنی اور مولانا عبدالستار خان نیازی کی تقاریر
شنیدنی ہوتیں۔ مولانا نیازی کو جب فوجی عدالت نے سزائے موت سنائی تو ان کی پیشانی
پر فتح و کامرانی کی جھلک نمایاں تھی۔ اس تحریک میں ہزاروں سنی علمائے کرام نے قید و بند

کی صعوبتوں کو لبیک کہا تھا اور اکثر مارشل لاء کے فوجیوں کی گولیوں کے نشانہ بنے۔

چوک دالگراں کی ''مسجد دالگراں'' میں مفتی محمد حسین نعیمی مرحوم دارالعلوم نعیمیہ کی بنیاد رکھ رہے تے۔ وہ دارالعلوم کے ابتدائی ایام میں دالگراں کے چوک میں رات کے وقت جلسے کراتے۔ ملک کے بڑے بڑے علمائے کرام کو بلاتے۔ اس طرح لاہور کے لوگ رات بھر چوک دالگراں کے جلسوں میں تقاریر سنتے۔ مَیں نے ان جلسوں میں حضرت محدث کچھوچھوی، مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا شاہ عارف اللہ قادری، مولانا عبدالستار خاں نیازی، مولانا غلام محمد ترنم، مولانا بشیر احمد کوٹلی لوہاراں، مولانا بخش مسلم، مولانا ابوالحسنات، مولانا غلام دین انجن شیڈ کو زوردار تقریریں کرتے مفتی محمد حسین نعیمی اپنے جلسوں میں اقتدار سے محروم سیاسی لیڈروں کو بھی بلا تے۔ مَیں نے اسی سٹیج پر خان عبدالقیوم خان، نواب مشتاق احمد گورمانی، مولانا نیازی جیسے لیڈروں کو اس وقت سنا، جب انہیں اقتدار سے محروم کر کے دلفگار کر دیا تھا۔ مولانا نعیمی نے جب اپنے دارالعلوم کی بنیاد رکھی تو بڑے بڑے قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کیں جس سے طلبہ کی قطاریں لگ گئیں۔ یہی دارالعلوم جامعہ نعیمیہ بن کر گڑھی شاہو آیا تو لاہور میں صف اول کی سنی درس گاہ بن گیا۔

جامعہ نعیمیہ کے جلسوں کی رونقیں:

مجھے زینت القراء قاری غلام رسول صاحب کی جلسوں میں خوش آوازی سے قرآن خوانی کرنا ابھی تک یاد ہے۔ مجھے مولانا الٰہی بخش صاحب کی تقریریں ابھی تک لطف دیتی ہیں۔ مجھے محمد اعظم چشتی مرحوم کی نعتیہ خوش آوازی ابھی تک کانوں میں گونجتی سنائی دیتی ہے۔ مجھے حضرت محدث اعظم کچھوچھوی کی گرجدار آواز کی گونج ابھی تک سنائی دیتی ہے۔ مجھے مولانا غلام محمد ترنم کی کڑکتی آواز ابھی تک خوش کرتی ہے۔ مجھے مولانا عبدالحامد بدایونی کی طرحدار تقریر ابھی تک مسرور کرتی ہے۔ مجھے مولانا یار فریدی کی سرائیکی میں تقریر کی شیرینی نہیں بھولتی۔ سید امانت علی شاہ چشتی کی مثنوی

کانوں کو سکون بخشتا ہے۔ مجھے مولانا محمد شریف نوری کا تقریر کے دوران خوش آوازی سے گایا ہوا شعر پڑھنا ابھی تک سرور میں لے آتا ہے۔ مجھے سید محمود شاہ گجراتی کی جوشیلی تقریریں ابھی تک نہیں بھولیں۔ مجھے مولوی عبدالغفور ہزاروی کی تقریر کا انداز ابھی تک یاد ہے۔ مجھے صاحبزادہ فیض الحسن کے الفاظ کے موتی برسانا ابھی تک نہیں بھولے۔

لاہور کے جلسے:

''جماعت اصلاح المسلمین'' بازار تیزابیاں کشمیری بازار کے جلسے انفرادی شان رکھتے تھے جہاں ہمارا گروپ خود ہی تلاوت قرآن کرتا، خود ہی نعت پڑھتا، خود ہی تقریریں کرتا، خود ہی صلوٰۃ و سلام پڑھتا اور دعا کے بعد ہر شخص اپنی اپنی سائیکلوں پر اپنے اپنے گھر جا کر کھانا کھاتا۔ نہ دعوت، نہ کھانا، نہ کرایہ، نہ نذرانہ، اللہ اللہ خیر صلاّ! لوگوں کو ہمارا یہ انداز اچھا لگا۔ اور ہمیں لاہور کے ہر علاقہ سے دعوتیں آنے لگیں۔ مجھے اس زمانے کی نعت خوانوں کی مجالس ابھی تک یاد ہیں جو اہلِ محبت کو عشقِ رسول کے جذبے سے مالا مال کرتے تھے۔ محمد اعظم چشتی مرحوم ان کے استاد فضل الٰہی کی پارٹی، جان محمد امرتسری، جان محمد جانی، سرفراز پپا، بعد میں آنے والے ثناء اللہ بٹ، محمد علی ظہوری، محمد حسین نظامی، صوفی اللہ دتا اور مرغوب ہمدانی اور دوسرے نعت خوان حضور کی بارگاہ میں ہدیہ عقیدت پیش کرتے۔ آج سے چالیس سال پہلے ''ویلوں'' کا رواج نہیں تھا۔ البتہ نعت خوانوں کو تبرکات کا دوگنا حصہ ملتا تھا۔ کہیں کہیں چھپ چھپا کر ''خدمت'' کی جاتی تا کہ نعت خوان کا ''وقار'' مجروح نہ ہو۔

پیر حیدر شاہ کے موکل:

لاہور میں وعظ و نعت کی مجالس سے ہٹ کر علمائے دین کا ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو شب بیداری میں اپنی مثال آپ تھے اور زہد و تقویٰ کو اختیار کیے ہوئے اپنے حجروں

میں ہی محدود رہتے تھے۔ اور لوگ ان کی دعاؤں کی تمنا میں ان کے حجروں کے دروازوں
کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ دارالعلوم حزب الاحناف کو جانے والی گلی کے ایک
کونے میں سید حیدر شاہ بخاری رہتے تھے۔ وہ تعویذات اور عملیات کے بڑے ماہر
تھے۔ ان کے اخراجات کو دیکھ کر بعض حضرات کہتے کہ شاہ صاحب کیمیا گر ہیں۔ مگر وہ
زیر زمیں ایسے ایسے عملیات کرتے جس کا بہت کم لوگوں کو علم تھا۔ اگر وہ کسی دکاندار
سے کوئی چیز خریدتے تو ان کے روپے رات کو ان کے پاس واپس آ جاتے۔ ان کا کہنا
تھا کہ ان کے پاس بعض ایسے موکل ہیں جو یہ کام کرتے ہیں۔ وہ اکثر ہندو ساہوکاروں
سے زیورات، ملبوسات اور دوسری ضروریات خریدتے۔ تحریکِ پاکستان چلی تو
مسلمانوں نے ہندو دکانداروں سے سودا سلف لینا بند کر دیا مگر حیدر شاہ بخاری ہندوؤں
سے ہی سودا سلف لیتے۔ مسلمانوں نے ان پر زور ڈالا اور اصرار کیا کہ آپ مسلمان
دکانداروں سے زیورات و ملبوسات لیا کریں۔ یہاں تک کہ وہ چند ایک مسلمان
دکانداروں کو ساتھ لے آئے۔ بخاری صاحب نے انہیں بتایا کہ ان کے موکل راتوں رات
روپیہ واپس لے آتے ہیں۔ مَیں کسی مسلمان کو نقصان پہنچانا پسند نہیں کرتا مگر لوگوں
نے اصرار کیا۔ شاہ صاحب نے نوٹوں پر دستخط کرائے۔ دوسرے روز گمٹی بازار اور دلی
بازار کے مسلمان دکانداروں سے خریداری کی۔ نوٹ دکانداروں کے حوالے کیے،
دستخط دکھائے مگر دوسرے روز وہ نوٹ شاہ صاحب کے گھر تھے۔ اس دکاندار نے اپنے
نوٹ سرہانے کے نیچے رکھے۔ رات کو اسے خواب آیا کہ کوئی شخص نوٹ اٹھائے لے جا
رہا ہے۔ صبح اٹھے تو واقعی نوٹ غائب تھے۔

عملیات کے ماہر علمائے کرام:

مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کو ہم نے کئی بار دیکھا کہ کوری ٹھیکریوں پر چند
حروف لکھتے۔ آگ میں دبانے کا کہتے اور گمشدہ افراد فوراً گھر آ جاتے۔ دلی
دروازے کے اندر مولوی نیاز علی کی مسجد میں ایک صوفی کے پاس ایسے لوگ آتے جن

کے تالوں کی چابیاں گم ہو جاتیں تو صوفی صاحب دم کرتے۔ گھر پہنچنے سے پہلے مقفل
دروازے کھل جاتے۔ تیز بخار، واری کا بخار اور میعادی بخار کو تو ہم نے پیر برہان کے
مزار سے کنکریاں اٹھا کر باندھنے سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ وزیر خان کی مسجد کے
ساتھ مولوی تاج الدین کی مسجد میں جنات کا بسیرا تھا۔ صوفی اسمٰعیل کے پاس آسیب
زدہ لوگ آتے اور شفا پاتے۔ مزنگ کے ایک عالم دین کے ہاں جب بھی جانا ہوا،
سایوں سے یوں کھیلتے دکھائی دیتے جیسے تسبیح چلا رہے ہوں۔ ہمیں دیکھ کر کہتے بھاگ
جاؤ اب مولوی آ گئے ہیں!

سابقہ پچاس سالہ لاہور کے شب و روز اس انداز سے آباد تھے۔ اس کے گلی
کوچے اہلِ ذکر کی محفلوں سے سرشار تھے۔ اس کی مسجدیں آباد تھیں، اسکی خانقاہیں
بارونق تھیں۔ اس کے مدرسے طالب علموں سے بھرے بھرے، اس کے جلسے پرہجوم مگر
پرامن تھے۔ اس کی محفلیں پرسکون تھیں۔ اس کے لوگ خوش خوش اور مطمئن تھے۔ لیکن
اب وہ زمانہ گزر گیا۔ وہ وقت گزر گیا، وہ شب و روز بیت گئے۔

؎ گزر گئی تیرے مستوں کی وہ بھی تیرہ شبی
نہ کہکشاں، نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی

(''جہانِ رضا'' جون ۲۰۰۰ء)

آسمانِ اہلِ سُنّت سے ڈھلتے ہوئے سورجوں پر ایک نظر

مقدور ہو تو موت سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے؟

مجاہد ملت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی رحمۃ اللہ علیہ:

کیم مئی ۲۰۰۱ء کو زندگی سے روٹھ گئے اور ہم سے جدا ہو گئے۔ چار روز قبل آزاد کشمیر میرپور میں تاجدار بریلی کانفرنس میں صدر تھے زبردست تقریر کی۔ امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اپنے گھر میانوالی آئے۔ تین دن کے بعد علی الصباح داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ و انا الیہ رٰجعون۔

مولانا نیازی بڑے باکمال انسان تھے۔ وہ تحریک پاکستان کے سپاہی تھے وہ قائداعظم کے فدائی تھے۔ وہ تحریک ختم نبوت کے لیڈر تھے۔ وہ پاکستان کے سیاسی اور دینی راہنماؤں میں صف اول کے راہنما تھے ان کی ساری زندگی ملکی حالات کی کشمکش میں گزری وہ ظالموں، جابروں اور بدعنوان حکمرانوں کو للکارتے رہے۔ وہ قید و بند ہی نہیں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے رہے۔ وہ سیاست کے خارزاروں سے گزر کر جب قصر وزارت میں قلمدانِ وزارت تک پہنچے تو دنیا زر پرستی کو زندگی کا اصول بنا بیٹھی تھی۔ جب اقتدار پسند طبقہ مال و دولت کو خدا جاننے لگا تھا۔ جب پاکستان کی دولت لوٹ کھسوٹ کے لیے مباح تھی اس وقت یہ مرد مجاہد ان حالات میں بھی فقر و استغنا کے بوریا پر بیٹھا رہا۔ جب وہ اس دنیا سے گیا نہ مکان، نہ پلاٹ، نہ کارخانہ، نہ بینک بیلنس، فقیر اور درویش بن کر گیا۔

مولانا نیازی سے ہماری نیاز مندی تحریک ختم نبوت سے شروع ہوئی جب وہ

وزیر خان لاہور میں پاکستان کے پہلے مارشل لاء کے سامنے سینہ سپر تھے۔ وہ قادیانیت کی جھوٹی نبوت کو پائے استحقار سے ٹھکرا رہے تھے۔ ہم نے انہیں موت کی کال کوٹھری میں اس وقت دیکھا۔ جب موت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اور تختۂ دار ان کو پکار رہا تھا۔ مگر:

وہ کہ سوزِ غم کو سانچے میں خوشی کے ڈھال کر
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

مولانا نیازی موت کی وادی سے اذان دیتے ہوئے گزرے۔ وہ تختۂ دار کو سلام کرتے ہوئے گزرے وہ نواب آف کالا باغ کو کالی سیاست کا کالا بھوت کہا کرتے تھے۔ وہ ایوبی دور میں بغاوت کے چودہ مقدمات کو ٹھکراتے ہوئے گزرے ہم اس مجاہد ملت کو سلام کرتے اور ملاقات کرتے وقت قدم چوم لیتے۔

ایک وقت آیا کہ وہ ''مرکزی مجلس رضا'' کے سرپرست بنے۔ سعودی حکومت نے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ قرآن ''کنز الایمان'' پر پابندی لگائی تو انہوں نے احتجاج کیا۔ کتاب لکھی۔ برطانیہ میں سعودی حکام سے اس پابندی پر تفصیلی گفتگو کی۔ اور اپنا موقف نہایت علمی انداز میں پیش کیا۔

ہم نے انہیں سیاسی میدان میں بھی دیکھا وہ جمیعۃ العلماء پاکستان کی اعلیٰ قیادت کے ستون تھے وہ قائد اہلسنت الشاہ احمد نورانی صدیقی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سارے پاکستان کا دورہ کرتے نظر آئے۔ انہوں نے کراچی سے لے کر پشاور تک سنیوں کو بیدار کیا متحد کیا۔ حجروں سے میدان سیاست میں لائے۔ پھر جب انتخابات آئے تو ان کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے امیدوار ہر صوبہ ہر ضلع ہر تحصیل میں منتخب ہوتے گئے۔

ان کی قیادت جب قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں پہنچی تو انہوں نے آئین سازی میں موثر کردار ادا کیا۔ مرزائیوں کو مرتد قرار دینے میں اہم کردار ادا کیا وہ ذوالفقار علی بھٹو کے سوشلزم کے طوفان کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے نظر آئے

وہ نظام مصطفیٰ کی تحریک میں صف اول میں نظام مصطفیٰ کا پرچم بلند کیے دکھائی دیے

ہم نے انہیں جنرل ضیاء الحق کی آمریت کو للکارتے ہوئے دیکھا جب ان کے ہزاروں ساتھی اسلام آباد کے ہوٹلوں میں حکومتی دعوتوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ زکوۃ و خیرات کی چمک دمک کی وجہ سے ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ تن تنہا اپنے قائد الشاہ احمد نورانی کے پہلو میں کھڑے نظر آئے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو پکارتے رہے واپس بلاتے رہے۔ سمجھاتے رہے مگر جب جلسہ ختم ہوجاتا ہے تو خطیب کی آواز کون سنتا ہے۔

ہم نے انہیں اقتدار کی کرسی پر بھی دیکھا۔ وہ فقیر بے نوا کی طرح ایوان وزارت میں بیٹھتے۔ ہم نے ان پر انعام واکرام کی بارشیں ہوتی دیکھیں مگر وہ اپنا دامن بچا کر ایک طرف ہوجاتے۔ ہم نے انہیں اس میلے میں تن تنہا دیکھا۔ جب ہر شخص لوٹ کھسوٹ کو اپنا حق سمجھتا تھا۔ ہم نے انہیں پلاٹوں۔ کوٹھیوں کی الاٹمنٹ، قرضوں کی بندربانٹ۔ کارخانوں کی مفت ملکیت کے میلے سے علیحدہ کھڑے دیکھا۔ وہ وزارت میں رہ کر فقر وفاقہ کی چادر سمیٹے ہوئے باہر نکلتے نظر آئے۔

ہم ان کے حالات زندگی نہیں لکھ سکتے۔ مگر ہم نے ایسے شخص کو سفر آخرت کرتے دیکھا تو برملا کہا۔ شادم از زندگی خویش کہ تنہار فتم!

اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر اپنی رحمتیں برسائے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مرقد کو اپنے نور سے بھر دے اللہ تعالیٰ ان کی روح کو پاکستان میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ کی عملی صورت میں دیکھنے کی توفیق دے۔ نور اللہ مرقدہ.......... طاب اللہ ثراہ.......... وجعل قبرہ روضۃ من الریاض الجنتہ۔

مولانا خدا بخش اظہر:

شجاع آباد میں ۲ مئی ۲۰۰۱ء کو موت کو لبیک کہتے ہوئے چلے گئے وہ ایک بلند پایہ سنی عالم دین تھے۔ وہ ایک خوش گفتار خطیب تھے وہ منجھے ہوئے مدرس تھے۔ وہ قابل معلم تھے۔ وہ اعلیٰ منتظم تھے۔ انہوں نے شجاع آباد میں اس وقت ایک دینی دارالعلوم کی

بنیاد رکھی۔ جب اس علاقہ میں دیوبندیوں کا غلبہ تھا۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی مجلس احرار کے قائد تھے اعلیٰ قسم کے خطیب تھے۔ عام دیوبندی ہی نہیں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی محمد علی جالندھری، شورش کاشمیری، شیخ حسام الدین امرتسری جیسے شعلہ بیان احراری پوری ملت دیوبند کے ساتھ شجاع آباد اور اس کے مضافات پر چھائے ہوئے تھے۔ مولانا خدا بخش اظہر نے ان حالات میں بے سروسامانی کے عالم میں شجاع آباد کے قصبہ میں اہل سنت کا علم بلند کیا۔ محنت کی۔ مشقت کی۔ تدریس کی۔ تعلیم کو پھیلایا۔ عشق رسول کا پیغام دینا شروع کیا۔ فقیرانہ انداز سے کام کیا۔ چند برسوں میں سارا علاقہ اپنے رسول کی محبت کی تلاش میں آپ کے اردگرد جمع ہونے لگا۔ دیوبندیوں کا زور ٹوٹ گیا اور مولانا اظہر کا دارالعلوم ایک چشمۂ علم وفضل بن کر علاقہ کو سیراب کرنے لگا۔

آج وہ ہم سے جدا ہوگئے ہیں مگر ان کی نیک اولاد (علامہ محمد اقبال صاحب اظہری جمعیۃ العلماء پاکستان ہمارے خصوصی دوست ہیں) ان کا دارالعلوم، ان کے شاگرد، ان کے عقیدت مند، ان کے ہمعصر علماء ان کی یادوں کے امین ہیں۔

ع آسماں تیری لحد پر نور افشانی کرے

مولانا غلام علی اشرفی اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا غلام علی اشرفی اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۲۰۰۰-۵-۱۶) کو ہم سے بچھڑے ایک سال ہوگیا۔ آپ کا سالانہ عرس بھی ہوگیا ہمارے برادر عزیز علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی کراچی سے اوکاڑا آئے اور حضرت مولانا غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات پر بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔ اس سال وہ ''یادگار غلام علی اوکاڑوی'' شائع نہیں کرسکے۔ ورنہ ان کی درخشاں تحریریں ''منم غلام علی وعلی امام من است!'' کے عنوان سے ہمارے سامنے آتیں۔

مولانا غلام علی اشرفی اوکاڑوی (جنہیں ہم ساری زندگی مدظلہ لکھتے آئے ہیں آج ''رحمۃ اللہ علیہ'' لکھنا پڑا) ایک زبردست عالم دین تھے۔ وہ بیک وقت خطیب، معلم، مدرس، سیاست دان اور منتظم تھے۔ ان تمام اوصاف علیہ کے ساتھ ساتھ ہمارے نہایت ہی

شفیق دوست تھے ہم نے ان کے سامنے زانوئے ادب تو تہ نہیں کیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے
کہ ہمارے ذہن و بیان میں جو کچھ ہے وہ حضرت مولانا غلام علی اوکاڑوی کے علم
وفضل کی خوشہ چینی ہے۔ ہمیں آپ کی نیاز مندی کا شرف تشکیل پاکستان سے بھی
پہلے سے حاصل ہے۔ ہارون آباد (ریاست بہاول پور) میں ایک عظیم الشان جلسہ تھا
ان کی تقریر نے مجمع کو لوٹ لیا۔ اور اس دن سے ہم ان کے ''غلام بے دام'' بن گئے۔
ساری عمر ان کی شفقتیں ابر محبت بن کر برستی رہیں۔ ہماری ذاتی لائبریری میں ایک ایسی
کتاب تھی جسے ہم علمائے کرام کی نظر شوق سے چھپائے رکھتے تھے۔ مولانا غلام علی اشرفی
کو ہماری نیاز مندی پر بڑا ناز تھا۔ اوکاڑا سے دوڑے دوڑے لاہور آئے کتاب طلب
کی ہم نے عرض کی۔ جان من! ''جان خواہی حاضر است۔ کتاب خواہی سخنے درمیان
است'' بڑے مایوس ہوئے، بڑے ناراض ہوئے، بڑے غضبناک ہوئے مگر ہم یہی
کہتے رہے۔ ''جان خواہی حاضر است!'' فرمانے لگے اچھا جان اپنے جسم ناتواں میں
رکھو۔ کتاب دو۔ تمہارے حجرے میں بیٹھ کر پڑھ لوں گا۔ میں سلام کرتا ہوں مولانا
غلام علی کی کتاب بینی کو۔ وہ ساری رات جاگتے رہے۔ کتاب پڑھتے رہے۔ نماز فجر
کے بعد فرمانے لگے۔ جو ''کستوری'' تم نے سنبھال کر رکھی تھی وہ میرے سینے میں آ گئی
ہے پھر وہ صفحے کے صفحے اور پیروں کے پیرے سناتے گئے۔ اور کتاب مجھے تھماتے
ہوئے اوکاڑا چلے گئے۔

مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخی کتاب ''تقدیس الوکیل عن توہین الرشید
والخلیل'' کو جب از سر نو مرتب کیا گیا تو ہم نے اس پر ایک مقدمہ لکھا۔ چھپی تو مولانا
غلام علی مرحوم مقدمہ اور کتاب پڑھ کر لاہور آئے۔ منہ چوما اور ایک سو روپیہ (آج کا
دس ہزار روپیہ) انعام دیا انگلی پکڑی۔ حجرے سے باہر نکالا اور حضرت سید علامہ ابو
البرکات کے پاس لے گئے اور مرکزی انجمن حزب الاحناف کے دامن میں ''مکتبہ
نبویہ'' کی بنیاد رکھ کر اوکاڑا چلے گئے اس مکتبہ سے متعدد ایسی کتابیں چھپ چکی ہیں جو

کسی کو دیکھنے کے لیے بھی نہیں ملتی تھیں۔
حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب ''تکمیل الایمان فارسی'' کا ہم نے
اردو ترجمہ کیا۔ بہت خوش ہوئے۔ فرمانے لگے دیباچہ میں لکھوں گا۔ دیباچہ کیا لکھا۔
خوش کر دیا۔ جب ہم نے پانچ سو روپیہ نذرانہ پیش کیا۔ تو یہ کہہ کر واپس کر دیا۔ کہ:
''دل و جان بر تو فدایت کنم''۔
زندگی کے آخری ایام میں وہ بیماریوں سے لڑتے رہے۔ ڈاکٹروں، طبیبوں کی
ناز برداریاں کرتے رہے۔ مگر اپنے عزم اور جذبہ سے جلسوں میں شرکت بھی کرتے۔
تقریر بھی کرتے، تنقید بھی کرتے، سفر بھی کرتے۔ عمرہ بھی کرتے، حج بھی کرتے مگر
وقت نکال کر مکتبہ نبویہ میں ضرور آتے۔ ''جہان رضا'' کی تحریروں پر اپنی پسندیدگی کا
اظہار کرتے حوصلہ افزائی فرماتے بعض موضوعات پر لکھنے کو کہتے۔ اور فرماتے ''جہان
رضا'' جب جاتا ہے الف سے ی تک پڑھتا ہوں۔ اور خوش ہوتا ہوں۔ تاثرات اس
لیے نہیں لکھتا کہ کہیں تم ''نفاست ناموں'' میں نہ چھاپ دو۔
جانے سے چند روز پہلے لاہور آئے۔ مکتبہ نبویہ میں تشریف لائے۔ عربی کے
چند اشعار سنائے ان کی تشریح کی۔ اور دل خوش کر دیا پھر حضرت علامہ سید ابوالبرکات
اور سید محمود احمد رضوی رحمۃ اللہ علیہما کے مزارات پر فاتحہ پڑھ کر دونوں کو مخاطب کر کے
کہنے لگے۔ ''میں آ رہا ہوں۔ میں آپ کے پاس آ رہا ہوں''۔ چار دن بعد واقعی مولانا
غلام علی اوکاڑوی ہم سے جدا ہو گئے۔ اور اپنے دوستوں سے جا ملے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

(''جہانِ رضا'' مئی، جون ۲۰۰۱ء)

مجاہد ملت مولانا محمد عبدالستار خاں نیازی نور اللہ مرقدہٗ

(م: ۲۰۰۱-۵-۲)

مجاہد ملت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی ایک مجاہد سیاست دان اور بلند پایہ
عالم دین تھے۔ ان کی رحلت پر ملک بھر کے اخبارات، رسائل اور ذرائع ابلاغ نے
بہت کچھ لکھا۔ خصوصی نمبر شائع کیے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی
اجلاس ہوئے۔ سیاسی اور مذہبی راہنماؤں نے ان کی خدمات کو خراج عقیدت پیش
کیا۔ علمائے اہلسنت نے ملک کے گوشے گوشے میں ان کے لیے تعزیتی اجلاس منعقد
کیئے۔ قرآن خوانی کی گئی، دعائے مغفرت کے لیے مجالس قائم کیں۔ اور حق یہ ہے
کہ ان کے عقیدت مندوں نے اشکبار آنکھوں سے جس انداز میں نذرانۂ عقیدت
پیش کیا وہ شائد ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔

آج کی اس مجلس میں ہم مجاہد ملت کی زندگی کے شب و روز، آپ کے سیاسی سفر
کے واقعات اور آپ کی دینی خدمات پر روشنی نہیں ڈالیں گے۔ کیونکہ ان موضوعات پر
اخبارات میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ ہم ان کی زندگی کے بعض مشاہداتی واقعات کی
یادوں کو تازہ کریں گے جو اگرچہ واقعات کے لحاظ سے غیر سیاسی ہیں۔ غیر اہم ہیں۔
چھوٹے ہیں مگر بڑے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا نیازی سے ہماری نیاز مندی کا آغاز پاکستان میں پہلی تحریک ختم
نبوت (۱۹۵۲ء-۱۹۵۳ء) کے ہنگاموں سے ہوتا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے
جب لاہور کے گلی کوچوں میں فوجی دندنا رہے تھے اور سارا لاہور فوجیوں کے بوٹوں
سے کچلا جارہا تھا بایں ہمہ کسی فوجی یا سپاہی کو اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ اندرون شہر

کسی دروازے کے اندر وردی پہن کر داخل ہو سکے۔ سارا قدیم لاہور مولانا عبدالستار
خان نیازی کی کمانڈ میں تھا۔ وہ مسجد وزیر خاں (لاہور کے عین وسط میں) مورچہ
سنبھالے بیٹھے تھے۔ اور ملک کے تقریباً تمام نامور علمائے کرام گرفتار ہو چکے تھے۔
تحریک ختم نبوت کی مجلس عمل کے سارے اراکین جیل میں پابند سلاسل تھے۔ مولانا
نیازی ان دنوں پنجاب اسمبلی کے ایم ایل اے (ممبر آف لیجسلیٹو اسمبلی) تھے
انہوں نے پنجاب اسمبلی میں قادیانیوں کے خلاف ایک بھرپور تقریر کی اور حکومت
وقت کو مرزائیوں کی اندھی حمایت کرنے پر للکارا۔ پھر دوسرے دن مسجد وزیر خان کو اپنا
ہیڈ کوارٹر بنا کر تحریک ختم نبوت کی کمان سنبھال لی۔

ہم جب پہلے دن مسجد وزیر خان میں داخل ہوئے تو مسجد عاشقان رسول سے
لبالب بھری ہوئی تھی۔ اور مولانا نیازی گرج رہے تھے۔ ہمیں آج تک وہ الفاظ یاد
ہیں۔ جن کا زور اور جوش ہمارے دل و دماغ کو روشن رکھتا ہے آپ نے فرمایا:

''یہ پاکستانی مجاہدین کی چھاونی ہے یہ غازیوں کی لشکر گاہ ہے یہ شیروں کی کچھار
ہے۔ یہ عقابوں کا نشیمن ہے۔ یہ بہادروں کی سرزمین ہے یہ عاشقان رسول کی تربیت
گاہ ہے۔ یہ محمد بن قاسم کے مجاہدوں کا کیمپ ہے۔ آج اس ملک پر محمد شاہ رنگیلے کی اولاد
قابض ہوگئی ہے آج اقتدار کی کرسیوں پر اینگلو محمڈن نوابوں کے بیٹے بیٹھے ہیں۔ آج
یزید کے جانشین لشکر حسین پر گولیاں برسا رہے ہیں''۔

ان دنوں لاہور کی فوجوں کی کمانڈ جنرل اعظم کے ہاتھ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ لاہور
کے علاوہ دوسرے شہروں سے علماء و مشائخ ان کے ہزاروں مرید، حافظانِ قرآن گلے
میں حمائلیں ڈالے لاہور ریلوے اسٹیشن سے نکل کر لنڈے بازار سے ہوتے ہوئے
مسجد وزیر خان کا رخ کرتے تھے۔ ہم نے ان شریف لوگوں پر کئی بار گولیوں کی بارش
ہوتے دیکھی۔ گلے میں لٹکتے ہوئے قرآن زمین پر گرتے دیکھے۔ ختم نبوت کے
پروانوں کے لاشے خاک و خون میں تڑپتے دیکھے، ہم نے کئی بار دہلی دروازے کے

باہر کوتوالی کے سامنے ہزاروں لوگوں کو زبردست مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ
شہیدوں کی لاشوں کی واپسی کا مطالبہ کرتے تھے۔ کئی بار ہم خود بھی ان مظاہروں میں
حصہ لے کر گولیوں کی زد سے بچتے رہے۔

ہم دل شکستہ لوگ۔ دلفگار لوگ یہ مناظر دیکھتے تو آنکھوں سے آنسو بہ جاتے
لاہور کی سرزمین میں یہ پہلا جبر اور تشدد تھا جو مسلمان فوجیوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر
روا رکھا گیا پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا موقع تھا۔ کہ ہم نے مسلمان فوج کے ہاتھوں
مسلمانوں کو قتل ہوتے دیکھا پھر وہ مسلمان جو اپنے آقا و مولا کی ختم نبوت کے تحفظ کے لیے
باہر آ گئے تھے۔ ہم شکستہ جان ہو کر مولانا نیازی کے پاس مسجد وزیر خان میں پہنچے۔ وہ
تمام حالات سے باخبر تھے کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ لیکن ہمیں غمزدہ دیکھ کر کہتے ''فکر نہ کرو
یہ جنرل اعظم نہیں یہ خر اعظم ہے جو دولتیاں جھاڑ رہا ہے۔ ایک وقت آنے والا ہے کہ
ختم نبوت پر قربان ہونے والوں کا خون رنگ لائے گا''۔

ہم نے مسجد وزیر خان کے دروازے کے سامنے وہ نظارہ بھی اپنی آنکھوں سے
دیکھا جب لاہور کا ڈی ایس پی فردوس شاہ بیس باوردی سپاہیوں کو لے کر مولانا نیازی
کو گرفتار کرنے آ گیا لوگوں نے اسے مسجد وزیر خان کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر للکارا
اور آن کی آن میں اس کو قتل کر کے زمین پر پھینک دیا۔ ہم نے اس کے ساتھ آئے
ہوئے سپاہیوں کو تنگ گلیوں میں بھاگتے ہوئے دیکھا لوگ ان کے پیچھے ان کی وردیوں
کو کھینچ کر گھسیٹ رہے تھے۔ اور وہ جان بچانے کے لیے تنگ و تاریک گھروں میں
پناہ لے رہے تھے۔

ہم ان دنوں سٹی کوتوالی کے متصل اپنے استاد مولانا نبی بخش حلوائی کی مسجد میں
رہتے تھے۔ ہم نے مسجد کی چھت پر کھڑے کھڑے فردوس شاہ کی بے گور و کفن لاش کو
دیکھا۔ وہ بہت بڑا پولیس آفیسر تھا گجرات کا رہنے والا تھا۔ مگر اس کی لاش کو کوئی
نہلانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ آخر تھانے کے ماشکی نے مشک سے اس کی لاش پر پانی

اور اسے گاڑی میں رکھ کر گجرات لے گئے خسر الدنیا و الاخرۃ۔

مارشل لاء حکام کی فوجی عدالت نے مولانا نیازی کو سزائے موت کا حکم سنایا یہ ایک
نہایت ہی سخت سزا تھی۔ سارے ملک میں صف ماتم بچھ گئی۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر
رونے لگے اور احتجاجی مظاہرے ہونے لگے ہمارا ان دنوں پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں
ممتاز محمد خاں دولتانہ کی کوٹھی میں آنا جانا تھا۔ جہاں ہمیں پنجاب کابینہ کے وزراء اور ایم
ایل اے حضرت سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ وہاں یہی باتیں ہوتیں ''نیازی پھانسی لگ
گیا۔ نیازی تختہ دار پر آ گیا، نیازی مارا گیا یا نیازی گیا! نیازی گیا!'' یہ لوگ حکومت
کے اساتین تھے اسمبلی کے ممبر تھے ہم ان کی باتوں کو درست مانتے تھے۔ دل بیٹھ بیٹھ
جاتا تھا۔ راتوں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں جہاں جاتے یہی باتیں سنتے۔ دولتانہ
وزارت میں سید علی حسین گردیزی ہمارے بڑے مہربان وزیر تھے۔ نیازی صاحب
کے دوست تھے۔ ہم نے انہیں کئی دفعہ اس خبر پر روتے دیکھا ان کا ایک عزیز لاہور
میں سپرنٹنڈنٹ جیل تھا، ہم چار دوست تھے جو نیازی صاحب کو موت سے پہلے انھیں
دیکھنا چاہتے تھے۔ گردیزی صاحب نے ہماری التجا پر فون اٹھایا اور سپرنٹنڈنٹ جیل کو
کہا کہ ان چار لڑکوں کی نیازی صاحب سے ملاقات کراؤ۔ ہم جیل پہنچے، ان دنوں
جیل شادماں کالونی میں تھی۔ نیازی صاحب کال کوٹھری میں قیام فرما تھے۔ ہم کئی بار
انہیں مسجد وزیر خان میں مل چکے تھے۔ ہمیں پریشان دیکھ کر قریب بلایا سر پر ہاتھ رکھا۔
اور فرمانے لگے۔ ''فکر نہ کرو۔ مجھے کوئی پھانسی نہیں لگا سکتا۔ یہ میرے کپڑے دیکھو۔
نیازی صاحب نے قیدیوں کا ایک دھاری دار کرتہ پہنا ہوا تھا۔ جو ان کے بدن پر پورا
نہیں آتا تھا آدھا پیٹ ننگا تھا آدھے بازو ننگے تھے۔ ان کا پاجامہ ٹخنوں تک تھا۔ ہمیں
کھڑے دیکھا تو کہنے لگے جن بزدلوں کے کپڑے میرے جسم پر پورے نہیں آتے ان
کی پھانسی کا پھندا میرے گلے میں پورا نہیں آئے گا۔ جاؤ! پروا نہ کرو! یہ مجھے تختہ دار پر
نہیں لے جا سکیں گے''۔

کئی سال گزرے ایک دعوت میں ہم نے دیکھا کہ ایک ہی میز پر مولانا نیازی، مولانا مودودی اور جنرل (ریٹائرڈ) اعظم کھانا کھا رہے ہیں ہم نے خوشی کا نعرہ لگا اور کہا: ''نیازی اور مودودی کی موت کا فرشتہ آج ان کے ساتھ کھانا کھا رہا ہے''۔

نواب آف کالا باغ میانوالی کے نواب تھے۔ سوءِ اتفاق سے وہ مغربی پاکستان کے گورنر بن کر گورنر ہاؤس میں آ بیٹھے ان کی ایمانداری اور مظالم کی داستانیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ نواب آف کالا باغ جبر و استبداد کا کوہ گران تھے۔ کسی کو معاف نہ کرتے ساری نوکر شاہی ان کے سامنے لرزاں لرزاں رہتی تھی۔ سارے سیاست دان ان کے نام سے ڈرتے تھے اس نے نورے جیسے کئی قاتل غنڈے پال رکھے تھے۔ ان غنڈوں سے قبرستانوں میں مردے بھی کانپ جاتے تھے۔ ان پالتو غنڈوں سے اس نے کئی بے گناہ لوگوں کو قتل کرایا کئی صحافی۔ سیاسی لیڈر۔ کئی زمیندار موت کی وادی میں جا چکے تھے۔ کوئی زبان، کوئی قلم کوئی سیاستدان اس کے ڈر سے دم نہیں مارتا تھا۔ ان دنوں جسٹس کیانی اپنی تقریر میں کہا کرتے تھے کہ پہلے لوگ ''سبز باغ'' دکھایا کرتے تھے۔ اب ''کالا باغ'' دکھاتے ہیں۔ مگر مولانا نیازی اس سفاک گورنر کی بادشاہی میں جلسہ عام میں تقریر کرتے تو اسے ''کالے باغ کا کالا بھوت'' کہہ کر للکارتے تھے۔

نواب آف کالا باغ نے لاہور کے کئی قاتل غنڈے مولانا نیازی کے پیچھے لگائے ہوئے تھے آپ لکشمی چوک میں ایک تانگے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ تو غنڈوں نے آپ پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اللہ نے اپنے خاص فضل سے مولانا کی جان بچالی۔ مگر اس واقعہ کے بعد بھی مولانا نیازی نے سر نہیں جھکایا کہ

کٹ سکتا ہے سر خوددار کا پر جھک نہیں سکتا!

ہم نے اس غنڈے کو جس نے مولانا نیازی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا آخری دنوں میں کینسر کی بیماری میں ایک عرصہ تک تڑپتے اور سسک سسک کر مرتے دیکھا۔ جب اس کا جنازہ اٹھا۔ تو ہر شخص اس کی نفرت آمیز زندگی پر گفتگو کرتا تھا۔

مولانا نیازی کی عظمت ہر اس شخص کے دل میں موجود رہی جو ظلم کے مقابلہ میں ان کے کردار کو بہ نظر تحسین دیکھتا تھا۔ ہم نے میر علی احمد خاں تالپور وزیر دفاع پاکستان اور میر رسول بخش خاں تالپور گورنر سندھ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جب وہ مولانا نیازی کو ملتے پہلے پاؤں کو ہاتھ لگاتے پھر گلے ملتے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب دونوں بھائی برسر اقتدار تھے ہم نے مولانا عبدالستار خان نیازی کو مولانا الشاہ احمد نورانی صدیقی صاحب کی رفاقت میں سارے پاکستان کا دورہ کرتے دیکھا۔ لوگ ان دونوں راہنماؤں پر قربان ہوئے جاتے تھے۔ علماء مشائخ۔ پیرزادوں اور نظام مصطفیٰ سے محبت رکھنے والوں کا ایک جم غفیر ان کے اردگرد ہوتا۔ یہ دونوں سنی راہنما جس شہر میں جاتے تھے۔ جس قصبہ اور قریہ میں قدم رکھتے، لوگ آنکھیں فرش راہ کرتے۔ سنی کانفرنس ملتان ہو یا میلاد کانفرنس رائے ونڈ مولانا نیازی اور مولانا نورانی کی قیادت پر سنیوں کا اعتماد دیدنی تھا آج ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ گواہ ہیں۔ کہ ان کانفرنسوں میں علماء اہلسنت۔ مشائخ عظام، خادمان جمعیۃ العلماء پاکستان اور جان نثاران نظام مصطفیٰ پروانہ وار ان شمعوں کے گرد اکٹھے تھے۔ حالانکہ یہ جنرل ضیاء کی آمریت کا زمانہ تھا۔ جہاں مخالفین پر کوڑے اور ہم نواؤں پر انعام و اکرام کی بارشیں برستی تھیں مگر نیازی اور نورانی آمریت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صدر ضیاء کو وقت کا ''ابن زیاد'' کہا کرتے تھے۔ جنرل ضیاء اپنے دور آمریت میں نہ نیازی کو دبا سکا۔ نہ نورانی کو جھکا سکا

ہم نے سابقہ سطور میں مولانا نیازی کی زندگی کے وہ واقعات بیان کیے ہیں جہاں وہ ''اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر'' نظر آتے ہیں۔ مگر اب ہم وہ یادیں تازہ کریں گے جس میں ''اگر ہو صلح مثال غزال تاتاری'' دکھائی دیتے ہیں۔

حضرت مولانا نیازی مجلسی زندگی میں بڑے خوش گفتار اور بڑے ہی شفیق و حلیم تھے۔ تلخ اعتراض کا جواب خوشگوار انداز میں دیتے تھے طعنہ زنی کو خاطر میں نہ لاتے اور ''بادوستاں تلطف با دشمناں مدارا'' کا رویہ اختیار کرتے تھے۔ علما اور طلبہ میں بیٹھتے

تو نہایت ادب اور شفقت فرماتے فقیروں غریبوں سے ملتے تو سراپا عجز و نیاز بن جاتے

یہ روایت مولانا عبدالستار خاں نیازی کے حلقوں میں بلا خوف تردید چلتی ہے کہ

لاہور کے ''چار نوجوانوں'' نے عہد کیا تھا۔ کہ جب تک پاکستان میں اسلامی قانون (نظام مصطفٰی) نافذ نہیں ہوگا۔ وہ شادی نہیں کریں گے۔ یہ چاروں نوجوان اس مقصد میں دن رات کوشاں رہے۔ یہ چار نوجوان مولانا عبدالستار خان نیازی، حکیم محمد انور بابری، م ش (میاں محمد شفیع کالم نگار نوائے وقت) اور مولانا ابراہیم علی چشتی (فرزند ارجمند مولانا محرم علی چشتی) تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ حکیم محمد انور بابری اور م ش نے تو شادیاں کرلیں۔ مگر مولانا ابراہیم علی چشتی اور مولانا نیازی اپنے عہد پر قائم بھی رہے اور تادم آخر پاک باز بھی رہے۔

پچھلے دنوں قاری زوار بہادر صاحب سیکرٹری جمعیۃ العلماء پاکستان نے مولانا نیازی کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ کرایا جس میں تمام سیاسی جماعتوں کے راہنماؤں کو دعوت خطاب دی گئی تھی۔ جماعت اسلامی کے لیاقت بلوچ صاحب نے اپنی تقریر میں حضرت نیازی صاحب کی سیاسی خدمات کو ہدیۂ تحسین پیش کیا مگر تقریر کے آخر میں نیازی صاحب کے متعلق ایک لطیفہ سنایا۔

آپ نے بتایا کہ پچھلے دنوں اسلام آباد میں مختلف سیاسی راہنماؤں کی ایک میٹنگ تھی مسلم لیگ کے شیخ رشید آگے بڑھے اور نیازی صاحب کو گلے ملے۔ مجمع میں ایک منچلے نے آوازہ کسا! دیکھو! دو بوڑھے کنوارے آپس میں گلے مل رہے ہیں! شیخ رشید تو کھسیانے ہوگئے مگر مولانا نیازی نے شیخ رشید کو کہا: ''بھیڑا نہ پواسیں انہاں رنواں (رن مریدوں) کولوں چنگے ہاں (رشید! شرماؤ نہیں ہم ان رن مریدوں سے اچھے ہیں)

آج سے تیس سال قبل موچی دروازے کے باغ میں ایک جلسہ تھا بڑے بڑے لیڈر تقاریر کرنے آئے۔ مولانا نیازی نے اتنی زبردست تقریر کی اور حکومت وقت کے خلاف اتنی تلخ بیانی کی کہ ہر ایک کو خدشہ تھا۔ کہ وہ کل ہی پکڑے جائیں گے۔ جانے

لگے تو ماہنامہ ''احوال و آثار'' لاہور کے مدیر عبداللہ بٹ کہنے لگے۔ نیازی صاحب! اتنی سخت تقریر! مارے جائیں گے۔ فرمانے لگے میں مارا گیا تو مجھے کوئی رونے والا نہیں۔ مجھے کیا ڈر۔ ڈرتے تو وہ ہیں جو بیوی بچوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔'' عبداللہ بٹ کہنے لگا۔ نہ شادی ہوئی۔ نہ بیوی آئی۔ نہ بچہ ہوا! بر چشم بد دور آپ کو کس کا ڈر ہے! اللہ اللہ خیر صلا۔

ہم نے مولانا نیازی کو فقیری میں دیکھا۔ جب وہ لکشمی چوک کے چوبارے میں رہتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو امیری میں دیکھا جب وہ اچکن اور طرہ دار پگڑی کے ساتھ لوگوں میں جاتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو غنڈوں کے گھیرے میں دیکھا جب وہ مردانہ وار بچ نکلتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو میانوالی کے پتھر دل لوگوں کے انتخابی معرکوں میں دیکھا جب وہ کالا باغی نوابوں اور روکھڑیوں کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو علمائے اہلسنت کے مجمعوں میں دیکھا جہاں وہ گل سرسبد دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو پنجاب اسمبلی میں اپوزیشن کی سیٹ پر دیکھا جب وہ اقتدار نشینوں کو للکارا کرتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو تحریک ختم نبوت کے دوران مسجد وزیر خان میں دیکھا جب وہ مارشل لا حکام کو اپنے جوتے کی ٹھوکر پر رکھا کرتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو، اقتدار کی کرسی پر دیکھا جہاں امیری میں فقیری کی شان نظر آتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو موت کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھا۔ جہاں اقبال کے شعر کی تصویر نظر آئے

نشانِ مرد مومن با تو گویم ۔۔۔ چو مرگ آید تبسم بر لب اوست!

(''جہانِ رضا'' جولائی ۲۰۰۱ء)

(''ضیائے حرم، لاہور'' جولائی ۲۰۰۱ء)

حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ (م ۹۹-۱۱-۱۷)

(اعتقادی اور فکری خدمات - افکار رضا کی روشنی میں)

مرکزی مجلس رضا پاکستان کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری (م ۱۹۹۹ء) نے امام اہلسنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی کے نظریات کی اشاعت میں جس مستعدی اور مسلسل حکمتِ عملی سے کام لیا اس کی مثال برصغیر پاک و ہند میں نہیں ملتی آپ کی اس بے مثال جدو جہد کو علمائے کرام اور مشائخ عظام نے بھرپور انداز میں سراہا اپنے تو اپنے فاضل بریلوی کے نظریات سے اختلاف رکھنے والے دانشوروں نے بھی ہدیہ تحسین پیش کیا۔ آپ کی ان خدمات کی تفصیلات پاک و ہند کے اخبارات، میگزین ماہناموں اور سابقہ دو عشروں میں چھپنے والی بے شمار کتابوں کے دیباچوں میں ملتی ہیں۔ ماہنامہ جہانِ رضا لاہور کے صفحات خصوصی طور پر حکیم اہلسنت کی علمی اور اعتقادی خدمات پر روشنی ڈالتے رہے ہیں۔

ہم چونکہ "مرکزی مجلس رضا پاکستان" کے قیام سے بہت پہلے حکیم صاحب کی مجالس میں آتے جاتے رہے ہیں اندریں حالات ہم ان مشاہداتی واقعات پر ہی روشنی ڈالیں گے جن سے بانی مرکزی مجلس رضا کی علمی اور اعتقادی خدمات کی ایک جھلک سامنے آجائے۔ ایک زمانہ تھا، جب حکیم محمد موسیٰ امرتسری رام گلی لاہور میں ایک مختصر سا مطب کرتے تھے۔ آپ کو دینی کتابوں کے مطالعہ سے بڑی دلچسپی تھی اور بعض ملکی رسائل میں آپ کے مضامین بھی چھپتے رہتے تھے ان علمی مشاغل کی وجہ سے آپ کے مطب پر بیماروں کے علاوہ اہل علم بھی آتے اور آپ سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے آپ کے اس علمی حلقہ میں بلا امتیاز مذہب و مسلک ہر قسم کے لوگ آتے آپ ہر موضوع

پر نہایت تحمل سے اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ایک وقت آیا کہ آپ کا یہ علمی حلقہ بڑھتا گیا پھیلتا گیا اور آپ کی دانشورانہ گفتگو کا اہل علم میں چرچا ہونے لگا۔

ان دنوں حکیم مرحوم کا یہ معمول تھا۔ کہ نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے حضرت گنج بخش لاہوری کی جامع مسجد جاتے نماز پڑھنے کے بعد سید ابو الحسن ہجویری رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری دیتے فاتحہ پڑھتے داتا صاحب کے مزار کے باہر بازار میں آتے تو نوری کتب خانہ میں آبیٹھتے۔ ان دنوں نوری کتب خانہ حضرت سید محمد معصوم شاہ نوری الگیلانی کی نگرانی میں کام کر رہا تھا۔ اس کتب خانے کی خصوصیت یہ تھی کہ اعلیٰ حضرت کے رسائل چھپتے اور نہایت ارزاں ہدیہ پر لوگوں کو دیے جاتے۔ حکیم صاحب ہر جمعہ کی نماز کے بعد نوری کتب خانہ سے چند کتابیں خریدتے اور سید محمد معصوم شاہ نوری رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس سے فیضیاب ہوتے۔ ان دنوں گنج بخش روڈ پر مکتبہ نبویہ اور المعارف کھلے تو حکیم صاحب ان کتب خانوں پر ضرور آتے اپنی دلچسپی کی کتابیں خریدتے آپ کا یہ بھی معمول تھا کہ مسلم مسجد کے زیر سایہ مولوی شمس الدین تاجر کتب نادرہ کی دکان پر ضرور آتے۔ یہ دکان ایک طرف نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ تھی دوسری طرف کتاب دوست اہل علم و فضل کا مرجع تھی۔ حکیم صاحب نے اس دکان پر نایاب کتابوں سے شناسائی حاصل کی پھر یہاں پر آنے والے اہل علم و فضل سے تعارف ہونے لگا۔ اور آپ کا علمی حلقہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔

ہمیں یاد ہے کہ حکیم صاحب نے اہل علم احباب کا ایک اجلاس طلب کیا۔ یہ اجلاس مولانا محمد سعید نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (جو ان دنوں جامعہ مسجد شاہ محمد غوث بیرون اکبری دروازہ لاہور کے خطیب تھے) کے حجرے میں ہوا تھا۔ جس میں حکیم صاحب نے ایک منصوبہ پیش کیا کہ اہلسنت کی اعتقادی کتابوں کی اشاعت کی جائے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ پاکستان میں سنیوں کی اکثریت کے باوجود کتابی دنیا اور اشاعتی میدان میں بہت کم کام ہو رہا ہے۔ آپ نے مولانا محمد سعید احمد نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ عبد النبی

کوکب کو تصانیفی اور تالیفی کام کا سربراہ منتخب کیا اور بعض مفید کتابوں کی اشاعت کے لیے
آمادہ کیا اور ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ لاہور میں ''یوم رضا'' کا انعقاد ہونا چاہیے۔ اجلاس
میں ان تین بزرگوں کے علاوہ مولانا باغ علی نسیم، مولانا محمد شفیع رضوی۔ مولانا قیوم الٰہی
عرفانی۔ اور راقم کے ساتھ چند اور مقامی علماء تھے۔ اسی مجلس میں ہی تمام حضرات نے
فنڈ جمع کیا اور کام کا آغاز ہوا۔ مولانا محمد سعید احمد نقشبندی اور مولانا عبدالنبی کوکب کے
ذمہ چند اعتقادی کتابوں کے تراجم لگائے گئے۔ اور حکیم صاحب خود یوم کی تیاری کے لیے
شب و روز کام کرنے لگے۔ اس وقت تک مرکزی ''مجلس رضا'' کا نام یا قیام عمل میں
نہیں آیا تھا۔ حکیم صاحب اور مولانا کوکب مرحوم کی خواہش تھی کہ ''یوم رضا'' کے موقع
پر اپنے روایتی علماء کرام کے علاوہ دوسرے دانشوروں اور ادیبوں کو بھی سامنے لایا
جائے۔ اور وہ بھی امام احمد رضا کی علمی خدمات پر بات کریں۔ اس سلسلہ میں حکیم
صاحب بذات خود کئی دانشوروں کے پاس گئے اور انہیں یوم رضا پر تقریر کرنے پر آمادہ
کیا۔ دوسری طرف علامہ عبدالنبی کوکب نے بعض ادیبوں، دانشوروں اور غیر سنی
مشاہیر سے رابطہ کر کے ان کے پیغامات اکٹھے کیے۔ ''یوم رضا'' کا پہلا اجلاس برکت
علی محمڈن ہال موچی دروازہ لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں روایتی علماء کرام سے ہٹ کر
نئے چہرے سامنے آئے، نئے بیانات آئے، نئے انداز آئے اور جو لوگ امام اہلسنت
مولانا احمد رضا کے افکار اور ان کی کتابوں سے نا آشنا تھے۔ وہ بھی فاضل بریلوی کی
تعریف میں رطب اللسان بن گئے اس اجلاس میں اپنے علماء میں سے مولانا عبدالستار
خاں نیازی، مولانا محمد شفیع اوکاڑوی۔ مولانا غلام علی اوکاڑوی کے علاوہ نئے نئے
مقررین لائے گئے۔ یہ پہلا تجربہ تھا جس نے سنی علماء میں اعلیٰ حضرت کی کتابوں کے
مطالعہ کی اہمیت کو بیدار کیا۔ ''یوم رضا'' کی روئیداد چھپی۔ تو اس میں مقررین کے علاوہ
مولانا مودودی۔ (جو ان دنوں جماعت اسلامی کے بانی ہونے کی وجہ سے شہرت کی
بلندیوں پر تھے) پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ر. فسر علامہ علاء الدین صدیقی،

مولانا عبدالستار خاں نیازی، مولانا ابراہیم علی چشتی، میاں محمد شفیع (م ش) نوائے وقت
اور کئی دوسرے دانشوروں کے پیغامات چھپے اور حکیم صاحب نے اسے روئیداد کی شکل
میں ملک کے گوشے گوشے تک پھیلا دیا۔ سنی حلقہ علمی رابطے کے اس انداز سے آشنا نہ
تھا۔ مگر جہاں جہاں یوم رضا کی روئیداد پہنچی لوگ حکیم صاحب سے رابطہ کرنے لگے۔
علامہ عبدالنبی کوکب مرحوم نے ہر سال پر یوم رضا کی رپورٹیں مرتب کیں۔ اور
حکیم صاحب نے انھیں چھپوا کر ''دائرۃ المصنفین لاہور'' کی طرف سے شائع کیا۔ ان
رپورٹوں میں پہلی بار ارباب علم و فضل نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی شخصیت اور
ان کے علمی کارناموں پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا اپنے تو اپنے اعلیٰ حضرت کے
مخالفین نے بھی فاضل بریلوی کی فقہی اور علمی بصیرت کو خراج تحسین پیش کیا یہ ایک نیا
انداز تھا جسے اہل علم سنیوں نے بے حد پسند کیا اور اس طرح لوگوں میں اعلیٰ حضرت کی
کتابوں کی جستجو کا ذوق پیدا ہوا۔ مولانا کوکب مرحوم ان دنوں جماعت اسلامی کے بانی
مولانا مودودی سے بہت متاثر تھے۔ ان کی جماعت کے قریبی حلقوں میں رسائی تھی۔
اور ان کے تبلیغی انداز کے سائنٹیفک انداز کو جانتے ہوئے پسند فرماتے تھے انہوں نے ان
سہ سالہ رپورٹوں میں اہلسنت کے علاوہ ایسے دانشوروں کے تاثرات بھی شائع کر دیے۔
جو ''ہجو ملیح'' کی ایک جھلک تھی۔ علماء اہلسنت نے اس بات کا نوٹس لیا۔ خصوصاً
ہندوستان کے بعض جید علمائے اہلسنت نے حکیم صاحب کو متنبہ کیا کہ آپ کے سٹیج سے
ایسی عامیانہ تحریروں کو پسندیدگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ حکیم صاحب ایک کھلے دل و دماغ
کے مالک تھے آپ نے غور کیا تو اس سلسلہ کو آئندہ کے لیے روک دیا گیا۔

''یوم رضا'' اور ان کی روئیدادوں کی اشاعت کے بعد حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی
شخصیت علمائے اہلسنت میں ابھرتی ہوئی نظر آئی۔ حکیم صاحب نے یوم رضا کا اہتمام
اور لٹریچر کی اشاعت کی ذمہ داری خود سنبھال کر ''مرکزی مجلس رضا'' کی بنیاد رکھی اور اپنے
مخلص احباب کے ساتھ مل کر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار کی اشاعت پر بھرپور

کام کا آغاز کیا ایک وقت آیا کہ ''یوم رضا'' برکت علی محمدن ہال کی بجائے نوری مسجد ریلوے اسٹیشن لاہور میں منایا جانے لگا۔ ملک کے مقتدر علمائے کرام اور دانشور اس کے پر اظہار خیال کرنے لگے حکیم صاحب مرحوم کی عادت تھی کہ قابل ترین علماء کرام اور بڑے سنجیدہ دانشوروں کا انتخاب کرتے اور انہیں خود موضوعات دیتے اور لوگ دور دراز سے چل کر آتے جلسہ میں عمدہ خیالات کا اظہار ہوتا سامعین کا زیادہ حصہ علمی بصیرت کا مالک ہوتا اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے اعتقادی نظریات سے دلچسپی رکھتا۔ یوم رضا کی تقریب بڑی باوقار اور شاندار ہوتی۔ حکیم صاحب خود سارا دن دروازے پر کھڑے ہوتے۔ آنے والوں کا استقبال کرتے۔ سٹیج پر علماء کا کنٹرول ہوتا اور حکیم صاحب ایک کارکن کی حیثیت سے شام تک کام کرتے۔ یوم رضا کی تقریبات سے فارغ ہو کر مرکزی مجلس رضا نے اشاعتی کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ ''یوم رضا'' پر بڑا شاندار اشتہار چھپتا جو کتابت اور طباعت کا ایک عمدہ نمونہ ہوتا تھا اسے سارے پاکستان میں ڈاک کے ذریعہ پھیلا دیا جاتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار حکیم صاحب نے ''یوم رضا'' کے دس ہزار اشتہار چھپوا کر ملک کے گوشے گوشے تک پہنچائے اور اشتہاری زبان میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کا تعارف کرایا دوسری طرف آپ نے اعلیٰ حضرت کی کئی کتابیں اور ان کے علوم پر کئی رسالے چھپوا کر مفت تقسیم کرانا شروع کر دیئے۔ ''مرکزی مجلس رضا'' کے سٹیج سے حکیم صاحب کی نگرانی میں ہزاروں نہیں لاکھوں کتابیں چھپتیں اور تقسیم ہوتیں۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے شب و روز ایک کر دیا۔ اعلیٰ حضرت کے تعارف کے لیے صبح و شام وقف کر دیئے۔ آپ کے احباب رات گئے تک کتابوں کے پارسل تیار کرتے اور علی الصبح ڈاک کے حوالے کرتے جاتے۔ حکیم صاحب رات گئے تک اپنے چند رضا کاروں کو لے کر لاہور کے گلی کوچوں میں پہنچتے۔ اشتہار لگواتے اور لاہور کے لوگ صبح اٹھتے تو دیواروں پر اشتہار دیکھ کر کہتے:

؎ گونج گونج اٹھے ہیں نغماتِ رضا سے بوستان

ہم ان کتابوں کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے جو مرکزی مجلس رضا نے شائع کی تھیں مگر اعلیٰحضرت کی سب سے پہلی کتاب ''تجلی المشکوٰۃ'' چھپی اور بڑی خوبصورت چھپی۔ پانچ ہزار چھپی۔ وہی کتاب مکتبہ نبویہ نے ایک ہزار چھپوا کر کتابی مارکیٹ میں پھیلا دی۔ حکیم صاحب کا طریق کار یہ تھا۔ جو شخص دینی مسائل سے دلچسپی رکھتا اسے کتاب ضرور دیتے۔ کئی علماء، کئی طلبہ کئی دفتری کلرک، کالجوں کے کئی نوجوان، حکیم صاحب کے پاس جاتے مفت کتابیں حاصل کرتے پھر کئی کتابیں ڈاک کے ذریعہ ملک کے دانشوروں، پروفیسروں، وکیلوں، ججوں، خطیبوں، ادیبوں اور صحافی دنیا کے افراد کے گھر پہنچا دیتے۔ کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے ''مرکزی مجلس رضا'' کی چھپی ہوئی ہر کتاب اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے نظریات لے کر لوگوں کے گھر پہنچ جاتی مولانا محمد سعید شبلی کی ایک کتاب فضائل درود شریف پر چھپی۔ ہزار نہیں دو ہزار نہیں دس ہزار چھپ کر تقسیم ہوئی جو لوگ اعلیٰ حضرت کے نام سے چڑتے تھے وہ جب ''مرکزی مجلس رضا'' کی طرف سے ایسی کتابیں پاتے تو ان کے دلوں کے گوشے نرم ہو جاتے۔ اور آہستہ آہستہ حضور کی محبت کی نسیم جان فزاء ان کے دلوں کو تازہ جھونکا دیتی اعلیٰ حضرت سے بے رخی کے باوجود ان کی زبانوں پر ہوتا

ع مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام

ریڈیو پر میلاد کی محفلیں منعقد ہونے لگیں اس میں اعلیٰ حضرت کی نعتیں اور سلام رضا پڑھا جانے لگا۔ حکیم صاحب نے عام رسالوں کی اشاعت سے ابھر کر ''فتاویٰ رضویہ'' چھپوانے کا پروگرام بنایا۔ سب سے پہلے آپ نے فتاویٰ رضویہ کی ''کتاب النکاح'' تیار کی۔ بڑی خوبصورت تیار کرائی نفیس کتابت کرائی۔ جسٹس شجاعت علی قادری مرحوم نے بڑا پر مغز دیباچہ لکھا کتاب تیار ہوئی تو راقم کی استدعا پر ''مکتبہ نبویہ'' کو اشاعت کے لیے دے دی گئی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت کے عقائد و نظریات

ہر سمت سے عوام تک پہنچیں۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ جب دیو بندی مکتب فکر اور جماعت اسلامی کے دانشوروں کی تحریروں سے لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کر رہے تھے یہ لوگ، یونیورسٹیوں، کالجوں، سکولوں اور مدرسوں میں اسلام کے نام پر کتابیں شائع کرتے تھے۔ حالانکہ یہ لوگ تشکیل پاکستان کے مخالف تھے۔ قیام پاکستان کے وقت ہندوؤں کی سیاسی جماعتوں کے کیمپوں سے نکل نکل کر پاکستان کے خلاف تقریریں کیا کرتے تھے۔ جب پاکستان بن گیا تو پاکستان میں چلے آئے یہ لوگ عوام کے سامنے آنے کی بجائے ''پناہ گیر'' بن گئے اور اپنے عقائد اور نظریات کو کتابوں کے ذریعہ پھیلانے لگے۔ مرکزی مجلس رضا کو اس بات کا سخت دکھ تھا کہ پاکستان کے مخالف، نظریہ پاکستان کے مخالف، عقائد اہلسنت کے مخالف، اعلیٰ حضرت کے نظریات کے مخالف، تو دینی قیادت کے کرتا دھرتا بن گئے اگر پاکستان پر جان دینے والے صحیح العقیدہ اور سنی علماء و مشائخ گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔

ع منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

حکیم صاحب نے ان حالات کا مطالعہ کیا آگے بڑھے اور گلی گلی کوچہ کوچہ پھر کر دیکھا بد عقیدہ لوگ دندناتے پھر رہے ہیں اور جو لوگ حضور کے شیدائی ہیں وہ گوشہ نشین ہیں۔ انہیں اس بات کا بڑا دکھ تھا وہ اٹھے اور تہیہ کر کے اٹھے کہ وہ مظلوم سنیوں کو بیدار کریں گے اور برصغیر کے ایک مظلوم راہنما کی تعلیمات کو عام کریں گے۔ مرکزی مجلس رضا کی طرف سے پہلی دفعہ جب ملک شیر محمد اعوان آف کالا باغ کی کتاب ''محاسن کنز الایمان'' چھپ کر ملک میں پھیلی تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں کہ دیو بندی علماء نے قرآن کے تراجم میں کتنی گستاخیاں کی ہیں اور عامیانہ ترجمے کیے ہیں جب لوگوں نے کنز الایمان اور دیو بندی حضرات کے قرآنی ترجموں کا موازنہ کیا۔ تو حیران رہ گئے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ لوگ دین کے نام پر لوگوں کو کن راہوں پر لے جا رہے ہیں حکیم صاحب نے محاسن کنز الایمان کی بیس ہزار کاپیاں چھپوا کر ملک میں تقسیم کیں تو

لوگ ششدر رہ گئے۔ اس کے بعد مولانا غلام رسول صاحب سعیدی کی ''ضیائے کنز الایمان'' نے اس موضوع کو آگے بڑھایا تو ہزاروں لوگ دیو بندیوں کے اردو تراجم سے دستکش ہو گئے۔

ہمارے ایک دانشور افسر پنجاب کے ایک محکمہ کے ڈائریکٹر تھے وہ دیو بندی مکتب فکر کی علمی خدمات کے بڑے معترف تھے ان کے تراجم قرآن کے بڑے مداح تھے، حکیم صاحب کی ڈاک نے انہیں ''محاسن کنز الایمان'' پہنچایا۔ انھوں نے مطالعہ کیا تراجم کا موازنہ کیا پھر کیا تھا جب بھی اپنی مجالس میں قرآنی ترجموں کی بات کرتے کہتے جو کتاب جس کی چاہو پڑھو مگر قرآن کا ترجمہ پڑھنا ہو تو صرف ''کنز الایمان'' ہی پڑھو۔ یہ تھا وہ فکری انقلاب جو حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کی اشاعتی کوششوں سے پیدا ہوا۔ حکیم صاحب مرحوم ''مرکزی مجلس رضا'' کی چھپی ہوئی کتابیں ہندوستان بھر کے علمائے اہلسنت کی طرف روانہ کرتے اور مسلسل روانہ کرتے رہتے جس سے ہندوستان میں بھی فاضل بریلوی کا چرچا نئے انداز سے ہونے لگا ''مرکزی مجلس رضا'' نے ایک سو سے زیادہ کتابیں شائع کیں ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن چھپے اور تقسیم ہوئے اعلیٰ حضرت کی کئی کتابیں پشتو، سندھی میں بھی چھپیں اور علاقائی طور پر لوگوں کو متاثر کرتی رہیں ان کتابوں نے ایک جہان کو خوش کام کیا۔ حکیم صاحب کی ایک عادت تھی کہ وہ اپنی مجلس میں بیٹھنے والے اہل علم کو افکار رضا پر لکھنے پر آمادہ کرتے ان سے کتابیں لکھواتے چھپواتے اور تقسیم کرتے آج ہمارے ملک میں کتنے ہی ایسے ارباب علم و قلم موجود ہیں جو ''مرکزی مجلس رضا'' سے متاثر ہوئے اور آگے چل کر فاضل بریلوی کے ترجمان بن گئے ایک علمی قافلہ تیار ہوا جو فکر رضا کو لے کر دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچا ایک مرکز بنا جس کی روشنیاں چار دانگ عالم میں پھیلتی گئیں ایک چشمہ جاری ہوا۔ جو دماغوں کی خوابیدہ وادیوں کو سیراب کرتا گیا۔ ہم یہ واقعات اس لیے نہیں لکھ رہے کہ ایک شخص کی مدح سرائی کی جائے۔ ہم تو اپنے نوجوان علماء دین کو بتانا چاہتے ہیں کہ دین

کے کام کے لیے اگر ایک طبیب، ایک حکیم، ایک موسیٰ عزم لے کر اٹھ کھڑا ہوتو سارا گلستان مہک اٹھتا ہے۔ سارا دبستان جاگ اٹھتا ہے سارا جہان جگمگا اٹھتا ہے!

آج ہمارے پاس علمائے کرام کی کمی نہیں لکھنے والوں کی کمی نہیں، اچھا لکھنے والوں کی کمی نہیں، خوبصورت لکھنے والوں کی کمی نہیں، اگر کمی ہے تو اس عزم کی ہے جو انسان کو ستاروں پر کمندیں ڈالنے پر آمادہ کر دیتا ہے ہم اپنی اس تحریر میں ''مرکزی مجلس رضا'' کی اشاعتی سرگرمیوں اور اس کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کی رپورٹ پیش نہیں کر سکے مگر ہم نے ایک طائرانہ انداز سے اپنے قارئین کے سامنے وہ باتیں لانے کی کوشش کی ہے جو حکیم اہلسنت کی شبانہ روز زندگی کا عکس تھیں۔ یہ باتیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ روزمرہ کی باتیں ہیں دارا و سکندر کی داستان حیات نہیں قیصر و کسریٰ کا تذکرہ نہیں یہ تو ایک درویش بے نوا کی شبانہ روز جد و جہد کی باتیں ہیں!

الحمد للہ ''مرکزی مجلس رضا'' آج بھی حکیم اہلسنت کی متعین راہ پر رواں دواں ہے بے سروسامانی کے باوجود ہزاروں کتابیں شائع کر کے مفت تقسیم کر رہی ہے مرکزی مجلس رضا کا ترجمان ''ماہنامہ جہان رضا'' افکار رضا کی اشاعت میں سرگرم عمل ہے اس میں رضویت کے بلند پایہ اہل قلم کے مقالات و افکار چھپتے ہیں اس میں فکر رضا کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اسے اہل علم اور اہل ذوق دل جمعی سے پڑھتے ہیں اور پورے اعتماد سے ''جہان رضا'' کی تحریروں کو پسند کرتے ہیں اور بقول سعدی شیرازی ''ہمچو نیشکر میخورند''۔ انھیں امام احمد رضا بریلوی کی تعلیمات کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ بلا جھجک مرکزی مجلس رضا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ آج دنیا کے مختلف ممالک میں افکار رضا کے جھنڈے لہراتے نظر آتے ہیں اور ہر زبان میں کتابیں چھپ رہی ہیں امریکہ یورپ افریقی علاقے اور عالم اسلام کے تمام ممالک میں فکر رضا کی روشنیاں پھیل رہی ہیں۔ آج صرف ایک شہر لاہور سے ہی کنز الایمان کی سات لاکھ جلدیں ہر ماہ چھپ کر دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ رہی ہیں ''کنز الایمان''

کے تراجم در تراجم چھپ رہے ہیں۔ مختلف اشاعتی ادارے اس کار خیر میں سرگرم عمل ہیں آج پاکستان میں دیو بندیوں، غیر مقلدوں کے کئی اشاعتی ادارے ''کنز الایمان'' شائع کر کے عوام تک پہنچا رہے ہیں۔ ہندوستان میں بعض سکھ اور ہندو ناشرین بھی کنز الایمان شائع کر رہے ہیں ہمارا دعویٰ ہے کہ کنز الایمان کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ کسی دوسرے ترجمہ قرآن کو نصیب نہیں ہوئی۔

ع چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

اس کے باوجود مسلک رضا اور افکار رضا کی اشاعت کی ابھی بھی بہت ضرورت ہے پاکستان کی اکثریت (سواد اعظم) سنی العقیدہ لوگوں پر مشتمل ہے انھیں بعض فرقے اپنے لٹریچر سے گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ اور بعض سیاسی تنظیمیں بددل بھی کرتی رہتی ہیں۔ عوام تشنہ لب ہیں انھیں اعتقادی راہنمائی کی ضرورت ہے ان کی خواہش اور ضرورت کے مطابق انھیں دینی راہنمائی نہیں مل رہی علماء کرام کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ قوم کی راہنمائی کریں اور انہیں بدعقیدہ تنظیموں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیں۔ مسلک رضا پر صرف جلسے اور وعظ کے مجمع نہ سجائیں حقیقی طور پر مسلک رضا پر لوگوں کو دعوت دیں۔ جو حضرات زبان کی شیرینی سے مسلک رضا لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں وہ اللہ کی خوشنودی کیلئے آگے بڑھیں۔ جو قلم کار اپنی روشن تحریروں سے راہنمائی کر سکتے ہیں وہ آگے بڑھیں اور اچھے انداز میں لٹریچر مہیا کریں تا کہ نوجوان طبقہ ان سے استفادہ کر سکے روزی کمانا، اپنے بچوں کو پالنا، اپنے جاہ و جلال کو برقرار رکھنے کے لیے روپیہ پیسہ حاصل کرنا انسانی زندگی کا خاصہ ہے اس کے لیے ہمارے مسلک کے بعض علماء کرام دیار مغرب کے سفر کرتے رہتے ہیں یہ بری بات نہیں مگر اپنے مسلک کی خاطر تھوڑا سا وقت نکال لیں لوگوں کو توجہ دلائیں دنیاداروں کو ترغیب دیں تو مسلک کا کام بھی ہوتا رہنا چاہئے پیران عظام بھی مسلک رضا کی طرف توجہ دیں اپنے حلقۂ عقیدت میں پڑھے لکھے حضرات سے کام لیں تو ایک انقلاب بر پا ہو سکتا ہے۔

آخر میں مقتدر سنی علماء کرام اور صاحبزادگان ذوالاحترام کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ مسلک رضا کے لیے ''مرکزی مجلس رضا'' کی خدمات حاصل کریں۔ اس کے فورم کو استعمال میں لائیں اس کی راہنمائی فرمائیں اس کی مشکلات کا اندازہ کریں اور اس انداز سے کام کریں کہ دنیا بھر کے سنی حضرات کی پیاس بجھ جائے۔

(''جہانِ رضا'' نومبر، دسمبر ۲۰۰۱ء)

الفت ومحبت کا ایک اور چراغ بجھ گیا

الحاج محمد اسحاق نوری رحمۃ اللہ علیہ......داروغہ والا لاہور

قلب وجگر کے شبستانوں میں جگمگاتے ہوئے کتنے چراغ بجھتے جا رہے ہیں۔ اور غم وملال کے اندھیرے بڑھتے جاتے ہیں۔ الحاج محمد اسحاق نوری بھی الفت ومحبت کا ایک ایسا روشن چراغ تھے جو اجل کی سرسر کے سامنے گل ہو گیا۔ آپ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ (نومبر، ۲۰۰۱ء) کے پہلے ہفتہ میں دل کے ہاتھوں تنگ آ کر وادی بقا میں چلے گئے۔ انا للہ انا الیہ راجعون۔

مرحوم مشرقی لاہور کے آرائیں خاندان کے ایک معروف فرد تھے چوک داروغہ والا جی ٹی روڈ لاہور پر ان کی کوٹھی اہل علم وفضل کا مرکز رہی ہے وہ اپنی محبت سے عالم اسلام کے دینی اہل علم اور مشائخ کرام کو اپنی محبت میں مجبور کر کے اپنے گھر لے آتے تھے۔ اور انہیں اپنی مخلصانہ خدمت سے خوش کر کے رخصت کرتے۔ وہ ایک خوشحال زندگی کے مالک تھے۔ مگر ان کی یہ خوشحالی ہمیشہ علما ومشائخ، طالب علموں اور درویشوں کے کام آئی۔ ان کا گھر سارے علاقہ میں اہل محبت کا مرکز تھا۔ وہ کویت کے وزیر اوقاف فضیلت الشیخ حضرت علامہ محمد یوسف رفاعی مدظلہ العالی کو ان کی سرکاری رہائش ''ہوٹل آواری'' لاہور سے اٹھا کر اپنے گھر لے آتے اور اپنے اخلاص اور خدمات سے خوش کر دیتے۔ مکہ مکرمہ سے حضرت فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر محمد علوی مالکی دامت برکاتہم العالیہ کو ''پرل انٹر کانٹینیٹل لاہور'' سے اٹھاتے اور اپنی رہائش پر ٹھہراتے۔ جہاں اہل محبت کا جھمگھٹا ہوتا علماء وطلبہ بلا روک ٹوک چلے آتے اور ہر آنے والے کو سہولت ہوتی۔ ایک عرصہ تک 'ورلڈ اسلامک مشن'' کے چیئرمین قائد اہلسنت الشاہ احمد نورانی صدیقی لاہور

تشریف لاتے تو انہیں ایئر پورٹ سے اپنی کار پر بٹھاتے اور اپنے گھر قیام کرنے پر آمادہ کر لیتے۔ قائد اہلسنت جس جلسے میں جاتے مرحوم آدھی رات تک آپ کے ساتھ ہوتے۔ آپ حضرت مولانا نوراللہ صاحب نعیمی بصیر پوری سے قادری سلسلہ میں بیعت تھے۔ ان کے ساتھ ان کی رفاقت مثالی تھی۔ ان کے دارالعلوم کے خصوصی معاون تھے۔ ہم جیسے نیاز مندان بھی ان کے دولت کدے پر حاضر ہوتے تو وہ سراپا محبت بن کر پیش آتے خوشبودار قہوے کا دور چلتا ان کے بیٹے محمد عبدالرزاق مدنی کا مدینہ سے فون آجاتا۔ تو مسجدِ نبوی میں اذان کی آواز کمرے میں نصب لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے ہمارے دل و جان کا وظیفہ بناتے "مرکزی مجلس رضا" کے دفتر مکتبہ نبویہ لاہور آتے بیٹھتے تو بڑی شیریں زبانی سے گفتگو کرتے۔ نبی کریم ﷺ صاحب کوثر و تسنیم پر درود شریف پر چھپی ہوئی کتابیں خریدتے اور اپنے احباب میں تقسیم کرتے جاتے اگر چہ ہم کتب فروش تھے۔ مگر ہم سے ہی کتاب خرید کر ہمیں ہی تحفہ دیتے۔ ان کی یہ ادا ان کی محبت رسول کی علامت تھی۔

وہ ہر سال شہر محبت (مدینہ منور) میں حاضری دیتے۔ اور بعض اوقات شعبان میں چلے جاتے اور حج کر کے لوٹتے۔ ان کے دونوں بیٹے محمد عبدالرزاق مدنی اور محمد حامد مدنی مدینہ پاک میں حرم شریف کی روشنیوں کی تابانیوں کو برقرار رکھنے کے لیے خدمت کرتے۔ ہمیں جب پہلی بار حضور کی بارگاہ میں ۱۹۹۲ء میں حاضری کا موقع ملا تو مدینہ منورہ میں ہمارا ایک ہوٹل میں قیام تھا۔ حرم شریف میں ملے تو اپنے بیٹے عبدالرزاق کو کہا ہوٹل سے فاروقی صاحب کا سامان اٹھا کر اپنے گھر لے آؤ۔ سارا رمضان اپنا مہمان بنائے رکھا اپنے گھر کی مجالسِ نعت میں حصہ دیا۔ مدینہ پاک میں دوسرے احباب کے ہاں محافلِ نعت ہوتیں تو ساتھ لے جاتے الشیخ عادل کے محلات میں عربی نعت خوانوں کی مجالس نعت ہوتیں تو ساتھ رکھتے۔ اس طرح ان کی رفاقت سے کئی نعمتوں سے ہمیں حصہ ملتا۔

۱۹۹۲ء کے بعد ہمیں ہر سال بارگاہِ رسول کی حاضری کا موقع ملتا تو الحاج محمد اسحاق نوری رفیق مدینہ بن کر ساتھ رکھتے محافل نعت میں لے جاتے ساری ساری رات شہر محبت کی رونقوں سے نوازتے۔

حضرت مولانا ضیاء الدین قادری رضوی خلیفۂ مجاز اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کے صاحبزادہ فضیلت الشیخ حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں انہی کی وساطت سے حاضری ہوتی۔ آپ کے دونوں مدنی صاحبزادے حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدنی کے غلاموں میں تھے۔ وہ ساتھ جاتے تو ہمیں حضرت کی خصوصی صحبت میسر آتی۔ جب تک حاجی محمد اسحٰق نوری مرحوم، ان کے بیٹے اور راقم شریک محفل رہتے کسی دوسرے کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی یہ خصوصیت صرف اور صرف حاجی صاحب مرحوم کی بدولت ہوتی۔

پچھلے سال آپ کو دل کا عارضہ تھا۔ حضور کی بارگاہ میں اعتکاف بیٹھے تو ان کا بیٹا حامد مدنی گھر سے سحری کے وقت جو کی روٹی پکوا کر لاتا۔ حاجی صاحب مرحوم راقم کو سحری کے دستر خوان پر "دعوت نانِ شعیر" دیتے اور ہر روز نئے نئے جو کی نئی قسم کی روٹی کھلاتے یہ ان کی محبت تھی یا مجھے نان شعیر کھلا کر "قوت حیدری" سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔

ان کی وضع داری اور علم نوازی کا یہ عالم تھا کہ لاہور میں کوئی عالم دین بیمار ہوتا تو خود چل کر اس کے گھر جاتے۔ بیمار پرسی کرتے۔ اور علاج معالجہ کے لیے مالی امداد کرتے کسی عالمِ دین یا طالبِ علم کی مالی پریشانی کا سنتے تو خفیہ طور پر اس کی امداد کرتے مجالس نعت اور تقریبات میلاد میں ان کی حاضری یقینی ہوتی حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر کثرت سے حاضر ہوتے اور کافی وقت بیٹھے رہتے۔

آج کا زمانہ ان شفقتوں، ایسی خدمات اور ایسے رویوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ خال خال کہیں کہیں دور دراز بعض افراد نظر آتے ہیں۔ حاجی محمد اسحٰق نوری مرحوم ایسے روشن ضمیر لوگوں میں سے ایک تھے۔ ان کی زبان سے کبھی کسی کی دلآزاری نہیں ہوئی

تھی ان کے عمل سے کسی کو کبھی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے علاقہ میں ایک محترم شخصیت مانے جاتے تھے۔ وہ اپنی برادری میں ایک نیک سیرت فرد تسلیم کیے جاتے تھے۔ وہ علماء کرام کے محبوب نظر تھے وہ نعت خوانانِ مصطفیٰ کے محبّ تھے۔ وہ سادات کا بے حد احترام کرتے تھے موت سے پہلے اپنے بیٹوں کو کہا جنازہ کوئی سیدزادہ پڑھائے چنانچہ ان کی یہ خواہش پوری ہوئی۔

اللہ تعالیٰ الحاج نوری صاحب کی قبر کو اپنی رحمتوں کی بارش سے ٹھنڈا رکھے۔

مرزا استاد غلام قادر بھی چلے گئے:

ہمارے جلیس مجالس، علم و دانش کی شمع فروزاں، وضع داری اور مردم شناسی کی مثالی شخصیت استاد مرزا غلام قادر بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے ان سے ہمیں چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک نیاز مندی تھی۔ مولوی شمس الدین مرحوم تاجر کتب نادرہ، زیرِ سایہ مسلم مسجد لوہاری دروازہ لاہور کی علمی اور کتابی مجالس کے مخلص احباب میں سے تھے جن کی زبان و قلم نے ہمیشہ دل و دماغ کی توانائیاں بخشیں۔ مولوی شمس الدین مرحوم کی محفل اجڑی تو انہوں نے ہماری محفلوں کو رونق بخشنا شروع کر دی اور دم آخر جلیس محفل اور رفیقِ علم و فضل رہے جب رمضان المبارک کو ہم دیارِ حبیب کو روانہ ہونے لگے تو ''بسلامت روی و باز آئی'' کہہ کر الوداع کہہ رہے تھے۔ ہم واپس آئے تو ہمیں دیدار بخشے بغیر ہی رخصت ہو گئے...... رفتید و لے نہ از دلِ ما!

ان کے جانے کا بے حد ملال ہوا۔ دل کو صدمہ ہوا۔ ہم نے انہیں یاد کیا۔ پکارا اور ایک جھلک دیکھنے کی تمنا کی مگر موت کی وادی میں جانے والے کب واپس دیکھتے ہیں۔

ع رو پس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گزشت

علامہ مرحوم ابن میاں احمد دین بن حسن محمد گوجرانوالہ (مرالی والا) میں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے لاہور آئے تو اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مولانا نور الحق علوی، مولانا محمد یٰسین فلسفی جیسے اساتذہ سے ادب اردو اور فارسی کا مطالعہ کیا۔ آپ نے

مولانا محمد یٰسین سے فلسفہ اور منطق کی ابتدائی اور منتہی کتابیں پڑھیں اور افغانستان کے ایک عالم دین سے فلسفہ، علم الکلام، منطق اور معانی کے مختلف مدارج کو سمجھا اور حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی ساری کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں۔ ''فصوص الحکم'' اور ''فتوحات مکیہ'' اور ان کی شروحات کی روشنی میں مکتوبات مجدد الف ثانی کا موازنہ کیا وہ فلسفۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر بڑی پر مغز گفتگو کرتے تھے۔

وہ جب اساتذہ کے عربی اور فارسی اشعار سناتے تو دل خوش ہو جاتا جب ان کی تشریح کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ ہم قدیم فارسی شعراء کی مجلس میں بیٹھے ہیں۔

''اللہ انہیں اپنی رحمتوں کے دامن میں ہمیشہ ہمیشہ رکھے''۔

(''جہانِ رضا'' فروری ۲۰۰۲ء)

”مرکزی مجلسِ رضا“ کے ننھے منّے مجلسی

پیر محمد حسن شاہ نوری الگیلانی:

”جہانِ رضا“ کے سابقہ دو شماروں میں ”مرکزی مجلس رضا کے ننھے منّے مجلسی“ کے عنوان سے ایک کالم آ رہا ہے۔ جسے بہت سے اہل علم، خصوصاً حلقۂ رضویہ کے قارئین نے بے حد پسند کیا۔ بعض حضرات نے خطوط کے ذریعہ سراہا بعض نے فون پر اظہار مسرت فرمایا۔ بعض بذات خود بقدم خود، بجمال خود تشریف لائے اور اس کالم کو ایک لطیف تحریر قرار دیا۔ ان حضرات میں بعض بزرگ علماء اور دانشور بھی تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا ذکر بھی اس کالم میں آئے۔ ہم نے ایسے بزرگوں سے معذرت کی کہ آپ ”ننھے منھے مجلسی“ نہیں ہو سکتے وہ ہماری بات پر خاموش ہو گئے مگر ایک دن ایک سنی عالم دین تشریف لائے۔ فرمایا: اگرچہ میں زندگی کے ستر سال گزار چکا ہوں مگر آپ لوگ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سو پچاسواں یوم ولادت منا رہے ہیں اس لیے ہم ان کے حضور تو ننھے منھے ہی ہیں! ان کی بات سے ہمارا دل لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ہم اٹھے ان کے ہاتھ چومے پھر انتہائے شوق سے عمامے کو بوسہ دیا بٹھایا۔ اور پھر تمام عمر کے اہل محبت کو مجلس رضا کے ننھے منھے جلیس تسلیم کر لیا ہے۔

ع ہزار سال سے غنچے کھلے ابھی تر ہیں!

ابھی ہم نے یہ فیصلہ کیا ہی تھا کہ ہمارے دفتر کے سامنے ایک گاڑی آ کر رکی تو دیار حبیب کے قیام کے ساتھی ایک ”شیخ“ گاڑی سے اترتے نظر آئے ہم آگے بڑھے۔ آنکھیں فرش راہ کیں زبان نے پکارا:

ے آمد سنی کسی کی تو واللہ رے اشتیاق — آنکھیں بچھائیں ہم نے جہاں تک نظر گئی

انہیں لا کر اپنے پاس بٹھایا۔ یہ تھے صاحبزادہ پیر سید محمد حسن شاہ صاحب گیلانی النوری مدظلہ العالیہ۔ آپ کئی ماہ کے بعد لاہور آئے تھے اور گھر جانے سے پہلے ہمیں اپنے دیدار سے نوازتے ہوئے تشریف لے آئے حضرت پیر صاحب ہمارے مدینہ منورہ کے قیام کے دوران دربار مصطفیٰ میں ہم سے فقیروں کو اپنی رفاقت سے نوازتے ہیں دوسرے لفظوں میں ہم حرم نبوی کے باب مجیدی کے اندران کے احباب کی مجالس کے خواجہ تاش بن جاتے ہیں۔

پیر سید محمد حسن شاہ نوری الگیلانی گجرات کے سادات خانوادہ کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ ”قادریہ نوشاہیہ سلسلہ تصوف“ کی خانقاہ عالیہ، چک سادہ کے سجادہ نشین ہیں۔ آپ کے والد مکرم حضرت پیر سید محمد معصوم شاہ نوری گیلانی رحمۃ اللہ علیہ پاکستان بننے سے بہت پہلے گجرات سے لاہور آئے تو حضرت داتا گنج بخش کے مزار پرانوار کے نزدیک ایک حجرے کو اپنی قیام گاہ بنایا اور اسی حجرے میں عبادت و ریاضت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار و نظریات کی اشاعت کا ایک اہم مرکز قائم کیا۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک یہ مرکز اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی تالیفات کو عوام تک پہنچانے میں سرگرم عمل ہے۔

حضرت سید محمد معصوم شاہ نوری کے دونوں نامور فرزندوں سید محمد حسین شاہ صاحب گیلانی اور صاحبزادہ سید محمد حسن شاہ صاحب نوری نے فاضل بریلوی کی تصانیف کو عام کرنے میں اپنے والد مکرم کا بھرپور ساتھ دیا۔ اور اعلیٰ حضرت کی دو سو سے زائد کتابوں کو شائع کر کے برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔ ۱۹۵۶ء میں مفتی احمد یار خان نعیمی نے گجرات سے اپنی مشہور کتابوں جاء الحق، تفسیر نعیمی اور مرآۃ المناجیح شرح مشکوٰۃ المصابیح کی تصانیف کا آغاز کیا تو پیر سید محمد معصوم شاہ نوری نے ان کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ جس سے مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑا حوصلہ ملا۔ ”جاء الحق“ نے اعتقادی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ ”تفسیر نعیمی“ کی پہلی جلدیں آئیں تو علمائے اہلسنت نے اسے بڑا پسند کیا۔ جاء الحق اور تفسیر نعیمی کی ابتدائی جلدیں تو مفتی احمد یار

خان نعیمی نے گجرات سے شائع کیں مگر شرح مشکوٰۃ المصابیح کا پہلا ایڈیشن پیر محمد معصوم شاہ نوری کے ایک مرید روف احمد نوشاہی مرحوم کے اہتمام میں شائع ہوا۔ قیام پاکستان سے پہلے سید محمد معصوم شاہ نوری نے اعلیٰ حضرت کے رسالوں کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ اور چند برسوں میں فاضل بریلوی کے دوسو سے زائد رسالے نوری کتب خانہ کے اہتمام میں چھپ کر سامنے آئے سید محمد معصوم شاہ نوری اور پیر سید محمد حسن شاہ صاحب گیلانی کا یہ اشاعتی کام تمام ناشرین کتب دینیہ سے منفرد بھی تھا اور ممتاز بھی۔ سارے پنجاب میں اعلیٰ حضرت کے خلیفۂ مجاز حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ کوئی شخص اعلیٰ حضرت بریلوی کی کتابوں کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔ نوری کتب خانہ لاہور کا یہ کارنامہ اعتقادی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا کہ جن دنوں سارے پنجاب میں کوئی ناشر اس طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا تھا۔ سید محمد معصوم شاہ نوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فرزندار جمند صاجزادہ محمد حسن شاہ نوری الگیلانی کو ساتھ لے کر فاضل بریلوی کی کئی کتابوں کو زندہ کر دیا نوری کتب خانہ نے ۱۹۵۹ء میں پہلی بار اپنے اہتمام میں اعلیٰ حضرت کا ''کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن'' شائع کیا۔ اسی عرصہ میں ہمارے فاضل دوست مولانا محمد اطہر نعیمی صاحب کے والد مکرم مولانا محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کنزالایمان مع تفسیر خزائن العرفان کا مرادآبادی کا عکس کراچی سے شائع کر کے اولیت حاصل کر چکے تھے انہی دنوں مقبول عام پریس لاہور اور مکتبہ نبویہ جامع مسجد نبویہ متصل سٹی کوتوالی، دہلی دروازہ، لاہور نے جلی حروف میں کنزالایمان کے ایڈیشن شائع کیے تھے۔ پھر تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی کے مالک شیخ عنایت اللہ مرحوم نے کنزالایمان کا ایک خوبصورت ایڈیشن شائع کیا۔ یہ ابتدائی دور تھا۔ آج علمی آسمان پر آفتاب رضویت درخشاں ہے اور کنزالایمان کی لاکھوں جلدیں چھپ چھپ کر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ رہی ہیں۔ فاضل بریلوی کی بے شمار کتابیں پاک و ہند کے اشاعتی ادارے چھپوا کر پھیلا رہے ہیں۔

ع گونج گونج اٹھے ہیں نغمات رضا سے بوستاں!

سید محمد حسن صاحب گیلانی نوری نے نوری کتب خانہ کے سٹیج سے اعلیٰ حضرت کے رسالے چھپوائے تو خریدار بہت کم تھے۔ لوگ آتے ایک دو رسالے لیتے اور چلے جاتے۔ مجھے سید محمد حسن شاہ نوری صاحب نے بتایا کہ علمائے اہلسنّت میں واحد شخصیت شیخ الحدیث مولانا سردار احمد فیصل آباد ایسی تھی۔ جس نے اعلیٰ حضرت کے رسالوں کے سلسلہ میں ہمارے ساتھ مخلصانہ تعاون کیا وہ حضرت داتا گنج بخش کے مزار پرانوار پر حاضری دینے آتے تو نوری کتب خانہ میں ضرور آتے اور میرے والد مکرم کے پاس بیٹھتے اور فرماتے شاہ صاحب جو رسالے کوئی نہیں خریدتا وہ مجھے دے دیں وہ رقم ادا کرتے اور فیصل آباد لے جاتے وہاں جا کر اپنے حلقہ احباب میں تقسیم کرتے اور انہیں پڑھنے پر آمادہ فرماتے۔

سید محمد حسن شاہ گیلانی نوری صاحب نے پہلی بار اپنے والد مکرم کے ساتھ ۱۹۵۵ء میں حج کیا۔ دوسری بار ۱۹۶۲ء میں حج کیا۔ پھر ۱۹۸۲ء سے مسلسل آج تک (پورے بیس سال) ہر سال رمضان کا پورا مہینہ عمرہ کرنے کے بعد دربار نبوی میں گزارتے ہیں۔ اور شوال کے وسط میں واپس آتے ہیں۔ دیار حبیب میں ان کا ایک اپنا حلقہ ہے، احباب ہیں، رفقاء ہیں، علماء کرام ہیں، نعت کی مجالس ہیں۔ ان کے احباب میں پاکستانی ہیں، ہندوستانی ہیں، مکی ہیں، مدنی ہیں، یمنی ہیں، ترکی ہیں، سوڈانی ہیں، عربی ہیں، عجمی ہیں۔

صاجزادہ سید محمد حسن شاہ گیلانی کی حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بڑی مخلصانہ رفاقت رہی ہے۔ حکیم مرحوم برکت علی محمڈن ہال میں ''یوم رضا'' منایا کرتے تھے پھر سید محمد حسن شاہ گیلانی کی فرمائش پر ریلوے اسٹیشن کے سامنے نوری مسجد میں ہر سال یوم رضا منایا جانے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اجلاس ہوتے۔ ملک کے چند علمائے کرام اور سکالرز اعلیٰ حضرت پر مقالات پیش کرتے اور لوگ دور دور سے چل کر نوری مسجد لاہور میں یوم رضا کے سلسلہ میں آتے۔ یہ اجلاس ۱۹۸۴ء تک ہر سال ہوتے رہے تھے۔ ''یوم رضا'' کا مرکزی مقام نوری مسجد ریلوے اسٹیشن لاہور ہی تھا۔

اس مسجد کی بنیاد سید محمد معصوم شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک دوست اور مرید ڈاکٹر [illegible]
حسین مالک پنجاب ہوٹل سے مل کر رکھی تھی۔ یہاں ایک چبوترا تھا سامنے [illegible]
مسجد کی بلند و بالا عمارت تھی مگر وہاں کے متذبذب عقیدہ کے امام کے پیچھے سید محمد معصوم
شاہ گیلانی نماز ادا کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ اس چھوٹے سے چبوترے پر اپنے چند
مخلص احباب سمیت نماز پڑھ لیتے اور پڑھا لیتے۔ آہستہ آہستہ چبوترا پھیلنے لگا۔ نمازی
بڑھنے لگے نوری مسجد کے لیے پھیلتے پھیلتے دو کنال سے زیادہ (تینتالیس مرلے) زمین
حاصل کر لی گئی قیمت ادا کر دی گئی اور لوگوں کے تعاون سے ۱۹۶۵ء تک مسجد مکمل ہو کر
گنبد خضریٰ کی جھلکیوں سے نمازیوں کو دعوت سجدہ دینے لگی۔

سید محمد حسن شاہ نوری گیلانی نے اپنے والد گرامی کے ساتھ مل کر بلال گنج میں ایک
اور نوری مسجد تعمیر کی۔ بلال گنج کے محلہ معصومیہ میں معصومیہ مسجد بنائی۔ بند روڈ کے
ساتھ معصومیہ قبرستان بنایا۔ بند روڈ کے اس پار نوری مسجد بنوائی۔ پھر ساتھ ہی ایک
غوثیہ مسجد تعمیر کرائی ہمارے مخدوم محترم حضرت گیلانی نے اپنے والد کی راہنمائی میں
اللہ کے گھروں کو تعمیر کر کے اپنے لیے آخرت کے سامان بنا لیے ہمارے مخدوم سید محمد
حسن نوری صاحب اس وقت بہتر سال (۱۹۳۰-۲۰۰۲ء) کے ہو چکے ہیں۔ اور ابھی
تک بعض دینی مدارس اور مساجد کی تعمیرات میں شب و روز مصروف ہیں۔

حضرت پیر محمد حسن شاہ گیلانی کی ''مرکزی مجلس رضا'' سے سالہا سال سے وابستگی
ان کی علمی اور اعتقادی پختگی کی علامت ہے۔ ابھی ہمارے یہ محترم مجلس میں بیٹھے
''یک فنجان چائے''۔ ختم نہ کرنے پائے تھے۔ کہ ڈاکیا آ گیا۔ خط آ گئے۔ لفافے
آ گئے۔ رسالے آ گئے۔ پیغام آ گئے۔ سلام آ گئے۔

ع زاہد وفا کو بھول گیا اضطراب میں!

(''جہانِ رضا'' اپریل ۲۰۰۲ء)

مرکزی مجلس رضا کے ننھے مُنّے مجلسی

مولانا مفتی محمد خاں صاحب قادری:

مرکزی مجلس رضا کے حجرے کا دروازہ کھلا ہی تھا۔ کہ چند نوجوان آ پہنچے۔ یہ
نوجوان مختلف شہروں سے آئے تھے۔ وہ مجلس کے ''ماہنامہ جہان رضا'' کے قارئین
سے تھے۔ وہ مرکزی مجلس رضا کی علمی اور اشاعتی خدمات پر اظہار خیال کر رہے تھے۔
سلسلہ جاری تھا کہ حضرت مولانا مفتی محمد خاں صاحب قادری تشریف لے آئے۔ ان
کا استقبال کیا اہل مجلس نے ان سے مصافحہ کیا ان کے ہاتھ میں ان کی تصنیف ''شرح
سلام رضا'' کا تازہ ایڈیشن تھا۔ جسے دیکھ کر فاضل بریلوی کے دربار میں ان کی
خدمات کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ مفتی محمد خان صاحب قادری نے سلام رضا کی شرح
۱۹۹۳ء میں لکھی تھی۔ اس وقت تک اعلیٰ حضرت کے سلام رضا کی گونج چار دانگ عالم
تک پھیل چکی تھی ہر مجلس نعت، ہر مجلس وعظ بڑے بڑے دینی جلسوں اور جلوسوں میں
''مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' کی دلنواز آوازیں ایمان کو تازہ کرنے میں بڑا
اہم کردار ادا کر چکی تھیں مگر کسی نے اس کی شرح پر قلم نہیں اٹھایا تھا۔ مفتی محمد خان
صاحب قادری ایک کتاب ''شاہکار ربوبیت'' لکھ رہے تھے۔ اس پر جب وہ اعلیٰ
حضرت فاضل بریلوی کے دیوان سے اشعار لاتے تو خود جھوم جھوم جاتے۔ خصوصاً
اس کتاب میں انھوں نے جابجا ''سلام رضا'' سے کئی اشعار مستعار لے کر اپنی کتاب
کو شاہکار بنا دیا۔ انھوں نے اسی وقت عزم کر لیا کہ وہ ''شرح سلام رضا'' لکھیں گے۔
آپ کے اس ارادے کو جناب شمس بریلوی مرحوم، مولانا عبدالحکیم صاحب شرف، سید
وجاہت رسول صاحب قادری اور مرکزی مجلس رضا کے نگران (راقم پیرزادہ اقبال احمد

فاروقی) نے تقویت دی اور آپ نے اس کتاب کو چھ سو صفحات پر مکمل کر کے دنیائے رضویت میں ایک مثال قائم کر دی۔

مفتی محمد خان قادری صاحب کا یہ کارنامہ مجلس میں بیٹھے ہوئے تمام حضرات نے پسند کیا ان میں سے بہت سے حضرات تو "شرح سلام رضا" پڑھ چکے تھے انھوں نے کھل کر دادِ تحسین دی۔ "شرح سلام رضا" کا پہلا ایڈیشن جون ۱۹۹۳ء میں چھپا۔ تو دنیائے رضویت میں تہلکہ مچ گیا ہر ایک عالم دین نے داد و تحسین سے نوازا۔ ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری اور جناب شمس بریلوی جیسے ماہران رضویت نے بے حد تعریف کی۔ "جہان رضا" نے بھی اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کیا۔ پھر ہندوستان کے اکثر سنی علماء کرام نے بھی اسے پسند کیا اور مفتی محمد خان صاحب کو تعریفی خطوط لکھے۔ ہندوستان کے کئی ناشرین نے "شرح سلام رضا" کے انڈین ایڈیشن شائع کیے۔

مفتی محمد خان قادری نے بیٹھے بیٹھے فاضل بریلوی کی علمی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی اور اعلیٰ حضرت کی دینی بلندیوں کو اس انداز میں بیان کیا کہ مجلس میں بیٹھا ہر ایک مجلسی خوش ہو گیا۔ مفتی محمد خان صاحب قادری اگرچہ لاہور کے ایک دار العلوم کے مہتمم ہیں۔ جامع مسجد رحمانیہ شادمان کے خطیب اعظم ہیں "کاروان اسلام" کے سپہ سالار ہیں مگر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی علمی خدمات کے ترجمان ہونے کی بنا پر ہم انہیں مرکزی مجلس رضا کے ننھے منّے مجلسی شمار کر لیں تو یہ بات روایت کے خلاف نہیں ہو گی۔

مفتی صاحب نے بتایا کہ "سلام رضا" میں بچاس ایسے اشعار ہیں جو سید عالم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سراپا نگاری پر مشتمل ہیں مجھے "شاہکار ربوبیت" لکھتے وقت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے ان اشعار نے اتنا متاثر کیا کہ میری کتاب مکمل ہو گئی۔

مفتی صاحب ایک عرصہ تک "فتاویٰ رضویہ" کی ترتیب نو اور تدوین کے اس بورڈ کے چیئر مین رہے ہیں جسے "رضا فاؤنڈیشن لاہور" شائع کر رہی ہے چنانچہ آپ نے جلد پنجم سے آگے تیرہ جلدوں تک فتاویٰ رضویہ کو مرتب کیا۔ مرکزی مجلس رضا کے بانی

حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کی فرمائش پر مفتی صاحب نے "فتاویٰ خیریہ" پر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے حواشی کا ترجمہ کیا تھا۔ "اعلیٰ حضرت بحیثیت قاطع بدعات" پر ایک مبسوط مقالہ لکھا جسے ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی نے اپنے مجلّہ میں شائع کیا۔

مفتی صاحب نے دوران گفتگو بتایا کہ وہ ان دنوں اعلیٰ حضرت کے ایک اور منظوم قصیدہ "کروڑوں درود و سلام" کی شرح لکھنے میں مصروف ہیں۔ ابھی مفتی صاحب کا سلسلۂ کلام جاری ہی تھا...... کہ ڈاک آ گئی۔ مختلف شہروں سے قارئین جہان رضا اور جہان امام احمد رضا کے خطوط آ گئے۔ نوازش نامے، یاد نامے، کرم نامے، محبت نامے اور نفاست نامے کھلنے لگے۔ ڈاک کیا آئی در معنیٰ کھل گیا بعض نفاست نامے نسیم جان بن کر آئے۔ بعض تنقید و تشریح لے کر آئے۔ "داغ دہلوی" نے کیا خوب کہا تھا۔

خط میں لکھے ہوئے رنجش کے پیام آتے ہیں
کس قیامت کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں

پروفیسر منیر الحق کعبی:

ہم نفاست ناموں پر نظر ڈال رہے تھے کہ مفتی محمد خاں قادری موقع غنیمت جان کر کھسک گئے۔ ابھی ان کے کھسکنے کی کسک ہمارے دل میں تازہ تھی کہ گجرات سے پروفیسر منیر الحق کعبی آ پہنچے۔ پروفیسر کعبی صاحب نے آتے ہی اپنی مسکراہٹوں سے مجلس کو باغ و بہار بنا دیا وہ اگرچہ شدید گرمی میں گجرات سے طویل سفر کر کے آئے تھے مگر ان کا چہرہ گل صحرا کی طرح ترو تازہ تھا۔ پانی کا گلاس نوش جاں کرتے ہی اپنے ممدوح اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی پر گفتگو کرنے لگے۔ حاضرین محفل نے اس جوان رعنا کو جس انداز سے امام احمد رضا کا ذکر کرتے سنا تو دل ہی دل میں محسوس کرنے لگے یہ بھی مجلس رضا کے ننھے منّے جلسی ہوں گے۔

پروفیسر منیر الحق کعبی ان دنوں زمیندار کالج گجرات میں پروفیسر ہیں اپنی تدریسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ علمی اور روحانی نظریات سے لگاؤ کے سبب انہیں اپنے کالج

کے اساتذہ میں منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے وہ فاضل بریلوی کی شعری اور ادبی تحریروں کو بہت خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے رہتے ہیں۔ چند سال قبل انہوں نے اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری پر ایک ایسی کتاب...... لکھی جس نے پاک و ہند کی دنیائے رضویت میں تہلکہ مچادیا۔ انھوں نے اعلیٰ حضرت کے کلام کے محاسن کو بڑے علمی اور تحقیقی انداز میں بیان کیا ساتھ ہی اعلیٰ حضرت کی شاعری پر کام کرنے والوں کو نشانۂ تنقید بنا کر پہلی بار گلستان رضویت کے باغبانوں اور خیابان رضا کی بلبلوں کو للکارا۔ ان کے قلم کی نوک سے بڑے بڑے اہل سخن اور اہل قلم کی تحریریں مجروح ہوئیں۔

؎ نگاہ کے تیر سے گر بچ گیا شکار کوئی
تو بڑھ کر زلف نے اس کو اسیر دام کیا

کعبی صاحب کو یہ کتاب لکھنے کی تحریک دراصل ہمارے دوست۔ نعت گو شاعر نعت نویس، دانشور اور حسن کارکردگی کے قومی ایوارڈ یافتہ جناب بشیر حسین صاحب ناظم ایم اے، ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل وزارت امور مذہبیہ پاکستان کی ایک تضمین پر ہوئی جو سلامِ رضا پر لکھی گئی تھی۔ اور ماہنامہ ''جہان رضا'' میں چھپی۔ کعبی صاحب کو بشیر حسین ناظم کے بعض اشعار پر اعتراض تھا۔ انہیں یہ بھی اعتراض تھا کہ ناظم صاحب نے اعلیٰ حضرت کے کلام میں بعض الفاظ کو بدل دیا ہے۔ وہ جہان رضا میں ان مقامات پر تنقید کرنے کی بجائے پوری کتاب ''تنقید نامہ'' تیار کرتے گئے پھر تضمین سلام رضا ہی نہیں حدائق بخشش پر جتنے کام کرنے والے اہل قلم ہیں۔ ان کی مسامحات کے دفتر کھولتے گئے۔

ان کا خیال ہے کہ اعلیٰ حضرت کی شاعری پر لکھنے والے اکثر قلمکار خصوصاً اعلیٰ حضرت کی نعتوں پر تضمینیں لکھنے والے اہل علم بڑی بے اعتنائی سے قلم اٹھاتے ہیں اور جو دل میں آیا لکھتے جاتے ہیں انھوں نے ایسے حضرات کے اس رویے کو ''شاملات دیہہ'' کی ایک دیہاتی اصطلاح سے تعبیر کیا۔ کعبی صاحب کی اس کتاب نے دنیائے

رضویت میں طوفان نہ سہی مگر ہر طرف ہلچل مچا دی۔ بہت سے اہل سخن نے کعبی صاحب اور ان کے تنقیدی تیر وسنان کا نوٹس لیا۔ ہندوستان سے مفتی مطیع الرحمان بہاری نے ''درجواب آں غزل'' ایک پوری کتاب...... لکھی جس میں پروفیسر کعبی کی تنقیدی تحریروں پر گرفت کی اور شائع کردی۔

وہ اس ادبی اور تنقیدی نوک جھونک کے بعد ایک عرصہ خاموش رہے۔ اور ہماری بار بار خواہش کے باوجود اس موضوع پر دوبارہ قلم نہیں اٹھایا طویل خاموشی کے باوجود وہ مجلس رضا کے مجلسی بن کر تشریف لاتے رہتے ہیں۔ وہ آج کی محفل میں بھی دنیائے رضویت پر خوبصورت گفتگو کر رہے تھے۔ جس سے اہل مجلس خوش ہو رہے تھے۔ ان کی خواہش ہے کہ اعلیٰ حضرت کے کلام کو بھرپور انداز سے لوگوں تک پہنچایا جائے۔

(''جہانِ رضا'' جون، جولائی ۲۰۰۲ء)

تحریکِ پاکستان کا ایک جان نثار سپاہی مولانا محمد بخش مسلم

پاکستان کی تشکیل سے دو سال قبل لوہاری دروازہ لاہور کے باہر ایک باغیچہ تھا
جس کے ایک جانب پھول بیچنے والے پھول بیچتے اور ایک طرف چھوٹے
چبوترے پر نمازِ جمعہ سے پہلے ایک خوش گفتار عالمِ دین خطاب فرمایا کرتے تھے۔
تھے مولانا محمد بخش مسلم بی اے۔ مولانا مسلم ایک بے مثال مقرر تھے۔ جو اردو انگریزی
میں یکساں خطاب کیا کرتے تھے۔ تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی پاکستان کے حامی
لوگ جوق در جوق ان کی تقریر سننے آتے اور باغ کے گھنے درختوں کے نیچے ایک دینی
اور سیاسی مجمع لگ جاتا۔ جن میں نوجوانوں کی اکثریت ہوتی۔ خصوصاً کالجوں کے طلبہ
اور عدالتوں کے نوجوان وکلا مولانا مسلم کی تقریر سننے دور دور سے آتے۔

ہم ان دنوں کالج کے طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ اس باغیچے میں پہنچے جہاں
آج مسلم مسجد کا فلک بوس مینار تحریک پاکستان کی یادوں کو تازہ کر رہا ہے۔ ہم مسجد کی
طرف آ رہے تھے ہم نے دیکھا کہ ایک خوبصورت عالمِ دین سر پر ترکی ٹوپی پہنے
پاکستان کے قیام پر نہایت مدلل طریقے سے خطاب کر رہا ہے وہ لوگوں کو پاکستان کی
حمایت کے لیے پکار رہا تھا اور لوگوں کو غلامی کی مایوسیوں کے اندھیروں سے نکلنے کی
جدوجہد میں شریک ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔ ہم نے اس کی مترنم آواز میں یہ
اشعار سنے:

شبِ ہجراں کے جاگنے والو! کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی؟
رہ گئی بات، کٹ گئی شبِ ہجر تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی؟

وہ فرما رہے تھے۔ آزادی کی شبِ ہجراں گزارنے والو! اور پاکستان کے لیے

قربانیں دینے والو! اگر ملک آزاد نہ ہوا اور پاکستان نہ بنا تو تم کیا کرو گے؟ پھر زور دے
کر فرماتے۔ غلامی کی سیاہ رات ختم ہونے والی ہے۔ شبِ ہجراں صبحِ آزادی میں
تبدیل ہونے والی ہے۔ یہ شبِ ہجر کٹ جائے گی اور صبحِ آزادی کی روشنیاں ضرور
آئیں گی اور پاکستان بن کر رہے گا۔

ہم نو عمر طالب علم تھے۔ مولانا مسلم کی تقریر میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کی تقاریر
کے انگریزی جملے سنتے۔ تحریکِ پاکستان پر دلائل سنتے تو دل میں جذبات کے سمندر
امنڈتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کے ہندو رہنما پوری قوت
سے پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے۔ اور قائدِ اعظم کے خلاف اپنی تمام توانائیاں
صرف کر رہے تھے۔ مگر لاہور کی اس چھوٹی سی مسجد کا یہ خطیب قائد اعظم کے اقوال سنا
سنا کر علامہ اقبال کے اشعار پڑھ پڑھ کر اپنے سامعین کو تحریکِ پاکستان کا ہمنوا بنا رہا
تھا۔ آج بہت سے لوگ پاکستان کے موجودہ حالات میں ایسے کھو گئے ہیں کہ انہیں یہ
احساس ہی نہیں رہا کہ تشکیلِ پاکستان کی جنگ لڑنے والے سپاہیوں میں مولانا محمد بخش
مسلم کی خدمات کا کیا مقام ہے۔

مولانا محمد بخش مسلم ۱۸ فروری ۱۸۸۸ء کو قدیم لاہور کے ایک گنجان محلّہ چھتہ
بازار میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسمِ گرامی پیر بخش تھا۔ آپ کا سارا خاندان شرقپور شریف
کے میاں شیر محمد شیر ربانی رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدت مند تھا۔ مولانا مسلم نے سات سال کی عمر
میں قرآن پاک حفظ کیا۔ مشن ہائی سکول رنگ محل لاہور سے میٹرک کیا۔ ممتاز عالمِ
دین مولانا غلام مرشد صدر مدرس دار العلوم نعمانیہ اور مولانا اصغر علی روحی پروفیسر اسلامیہ
کالج لاہور سے دینی علوم کا مطالعہ کیا۔ ۱۹۱۱ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا ۱۹۱۳ء میں
فاضل عربی میں کامیابی حاصل کی۔ مولانا مسلم کو انگریزی ادب میں علامہ احسان اللہ
ملک اور پروفیسر احسان اللہ شاہجہانپوری سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ ان دنوں لاہور
کے دینی مدارس میں دار العلوم نعمانیہ درس وڈا میاں (مغلپورہ) مدرسہ حمیدیہ (نیلا گنبد)

دارالعلوم فتحیہ (اچھرہ) کے اساتذہ سے بھی رہنمائی حاصل کی۔ ۱۹۱۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا اور بی اے ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ وہ تقریر و تحریر میں باکمال مقرر اور ادیب بن کر ابھرے۔ انہیں حضرت علامہ اقبال کی مجالس میسر آ گئیں اور مولانا ظفر علی خان کے روزنامہ زمیندار میں مکالمہ نویسی کا موقع ملا۔

تحریکِ پاکستان چلی تو ملک کے دینی اور سیاسی رہنما دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ علمائے دین کا ایک طبقہ نیشنلسٹ علماء بن کر گاندھی اور نہرو کا ہمنوا بن گیا اور تحریکِ پاکستان کے خلاف کام کرنے لگا۔ سیاسی رہنماؤں میں تحریک خلافت، مجلس احرار اسلام، خاکسار تحریک، جمعیت علمائے ہند کے رہنما پاکستان کے خلاف میدان میں نکلے مگر ان کے برعکس مولانا محمد بخش مسلم ان علماء کی صف میں کھڑے تھے جنہوں نے پاکستان کی حمایت میں علامہ اقبال کی فکر اور حضرت قائداعظم کے عزم کی ہمنوائی کی تھی۔ ان علماء کرام میں مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالحامد بدایونی، نواب بہادر یار جنگ، علامہ علاء الدین صدیقی پیر آف مانکی شریف، پیر جماعت علی شاہ علی پوری، پیر آف زکوڑی شریف، سندھ کے پیر آف بھر چونڈی شریف اور خانوادہ امام احمد رضا کے تمام سنی علماء کرام تحریکِ پاکستان کے ہمنوا تھے۔ مولانا مسلم انہی علماء کے کاروان میں شریکِ سفر تھے۔

پاکستان میں آج اکثر ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے مولانا مسلم کی تحریک پاکستان کی جدوجہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ بمبئی سے لے کر صوبہ سرحد تک تمام شہروں، قصبوں، دیہاتوں اور قریوں میں گئے اور اپنے خطابات سے لوگوں کو تحریک پاکستان سے آشنا کیا۔ بمبئی اور جنوبی ہند کے اکثر علاقوں میں آپ نے انگریزی میں تقریریں کیں۔ یوپی اور پنجاب کے علاقوں میں اردو اور انگریزی میں تقریریں کیں پھر پنجاب کے دیہات میں پہنچے تو پنجابی میں ''بابا قائداعظم'' سے لوگوں کو متعارف کرایا۔ وہ مسلم لیگ کے جلسوں میں صفِ اوّل کے مقررین میں شمار ہوتے تھے۔

آج زمانہ مولانا محمد بخش مسلم جیسے عالمِ دین کو بھول گیا ہے دولت کی لوٹ کھسوٹ میں آزادیٔ وطن کے لیے کام کرنے والوں کے نام تک بھلائے جا رہے ہیں۔ ورنہ مولانا مسلم نے جو کام کیا ہے وہ پاکستان کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جانے والا ہے۔ آزادی کے بعد لوگ کوٹھیوں اور زمینوں کی الاٹمنٹ میں لگ گئے کارخانوں اور ملوں کے حصول میں مصروف ہو گئے دولت کی ریل پیل میں ان لوگوں کو بھلاتے گئے جن کے خون سے پاکستان کا پودا پروان چڑھا تھا۔ ان تمام تماشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مولانا محمد بخش مسلم اپنے چھوٹے باغیچے میں خطاب کرتے رہے۔ ایک وقت آیا کہ ان کی کوششوں سے لوہاری دروازہ لاہور کے باہر اس باغیچہ میں مسلم مسجد جیسی عظیم الشان مسجد بنی اور آج اس کے محراب و منبر مولانا مسلم کی قومی اور ملی خدمات کی شہادت دے رہے ہیں۔ مولانا مسلم نے تشکیلِ پاکستان سے لے کر تا دمِ رحلت دین کی خدمات سرانجام دینے میں زندگی وقف کر دی۔ کاش مولانا مسلم کی دینی اور سیاسی خدمات کا اعتراف کیا جاتا۔ تحریکِ پاکستان میں ان کی جدوجہد کا ذکر آتا۔ پاکستان بنانے والوں میں ان کی خدمات کو سراہا جاتا۔ پاکستان کے اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھنے والے ایسے پرعزم رہنماؤں کو یاد رکھتے مگر ہائے زمانہ کی بے مہری!

نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھیے منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے!

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور ۲۹ مئی ۲۰۰۲ء)

مرکزی مجلس رضا کے ننھے مُنّے مجلسی

پچھلے ہفتے ہماری محفل جمی ہوئی تھی کہ ایک شخص جہانیاں منڈی ضلع خانیوال سے
چل کر لاہور آیا اور ہماری مجلس میں آ پہنچا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے اپنے
روداد سنانا شروع کی۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے نظریات سے وابستگی پر گفتگو کرنے
لگا پھر مرکزی مجلس رضا کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری سے اپنے تعلقات پر روشنی
ڈالنے لگا۔ اس کی باتیں دلچسپ بھی تھیں اور دلنشین بھی۔ مگر اس نے جب والہانہ انداز
میں مرکزی مجلس رضا کی خدمات پر اظہار خیال کرنا شروع کر دیا تو ہمیں اچھا لگا
اس نے بتایا کہ میں سابقہ گیارہ سال سے جہان رضا کا مسلسل مطالعہ کر رہا ہوں
اس کی تحریریں پسند آتی ہیں مضامین دلنشین ہوتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی
اہل قلم وعلم کے مقالات پڑھتا ہوں تو دل خوش ہو جاتا ہے۔

خلیل احمد رانا:

ہمارے یہ مجلسی خلیل احمد رانا تھے جو جہانیاں منڈی سے چل کر افتاں خیزاں
صرف اس لیے لاہور پہنچے تھے کہ وہ مرکزی مجلس رضا کے مجلسی بن کر ہمارے ساتھ علمی
اور عملی تعاون کریں گے۔ انھوں نے کہا اب وہ یہاں ہی رہیں گے ''جہان رضا'' کے
مضامین کو ترتیب دیں گے۔ اس کی طباعت اور اشاعت کے مراحل میں ہاتھ بٹائیں
گے پروف ریڈنگ کر کے جہان رضا کو پریس میں بھیجیں گے چھپوائیں گے رسالہ تیار
ہونے پر قارئین جہان رضا کو ترسیل کریں گے۔ تمام قارئین کے پتے اپنے ہاتھ سے
لکھیں گے اور نام و پیام لکھتے وقت ''جہان رضا'' کے ایک ایک قاری کو سلام کہیں گے۔
دفتر میں آ کر بدست خود جہان رضا حاصل کرنے والوں کے ساتھ واقفیت حاصل کریں

گے۔ اس طرح ایک ایک معاون سے تعارف حاصل کریں گے۔ جہان رضا کے ایڈیٹر
کے بوجھ کو اپنے سر لے کر چھوڑیں گے۔

اس ننھے منھے مجلسی خلیل رانا آف جہانیاں منڈی کے جذبہ کو تمام حاضرین مجلس
نے سراہا۔ خود ایڈیٹر جہان رضا نے ان کی اس پیشکش پر خوشی کا اظہار کیا خلیل احمد رانا
حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے عاشقوں میں سے ہیں۔ تیس سال سے زیادہ عرصہ
گزرا انہیں مرکزی مجلس رضا سے تعلق خاص رہا ہے بانی مجلس حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے
رفیق علم وقلم رہے ہیں اور ان کی تالیفات اور تصانیف کو حکیم صاحب نے ہمیشہ قدر کی نگاہ
سے دیکھا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے خلیفہ قطب مدینہ مولانا ضیاء الدین احمد قادری مدنی کا
مدینہ منورہ میں انتقال ہوا تو حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے مولانا ضیاء الدین احمد پر ایک مبسوط
کتاب مرتب کرنے کا اعلان کیا۔ تو آپ کی نگاہ نے خلیل احمد رانا کو منتخب کر کے اس
عظیم کام کے لیے آمادہ کیا رانا صاحب نے نہایت محنت اور جانفشانی سے ''انوار قطب
مدینہ'' مرتب کی جو چھ سو صفحات پر مشتمل تھی جسے ''مرکزی مجلس رضا'' نے نہایت خوبصورت
انداز میں زیور طباعت سے آراستہ و پیراستہ کر کے پاکستان اور بیرون پاکستان کے اہل
محبت کے ہاں اعزازی طور پر پیش کیا۔ خلیل احمد رانا صاحب کا یہ کارنامہ دنیائے
رضویت میں ہمیشہ تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا اور علمائے کرام نے بہت تعریف کی
خلیل احمد رانا ایک مخلص صاحب قلم و تحقیق دانشور ہیں جنہوں نے کئی موضوعات پر قلم
اٹھایا۔ ''جہان رضا'' کے صفحات پر اپنے تحقیقی مقالات شائع کرا کر اہل محبت کو دعوت
مطالعہ دی ان کے پاس بے شمار مشاہیر اہل سنت کے خطوط موجود ہیں جن میں بانی مجلس
حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے لکھے ہوئے ایسے تین سو خطوط موجود ہیں جو حکیم
صاحب کی ''مرکزی مجلس رضا'' کی تنظیمی جدوجہد پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ہمارے آج کے مجلسی رانا خلیل صاحب جہانیاں منڈی کے ایک متوسط زمیندار
ہیں۔ زراعت پر روزی کا دارومدار ہے مگر علمی کھیتوں کی آبیاری میں زندگی کے طویل

شب و روز گزارتے ہیں۔ ان کا علمی حلقہ بڑا وسیع ہے۔ ''مرکزی مجلس رضا'' کے ترجمان ''جہان رضا'' کے صفحات پر ان کے عمدہ مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ اور وہ سارے برصغیر پاک و ہند کے حلقۂ رضویت کے جانے پہچانے دانشور ہیں۔ انھوں نے اپنے علمی ذوق کی تشنگی کو سہارا دینے کے لیے جہانیاں منڈی میں ''نعمان اکیڈمی'' کی بنیاد رکھی جس کے فورم سے بڑا علمی کام کیا۔

اب وہ جہانیاں سے چل کر لاہور آئے ہیں۔ ہمارے ننھے منے مجلسیوں نے اجلاس میں شرکت کی ہے ہمارے ساتھ علمی و عملی تعاون کرنے پر بضد ہیں۔ اور اصرار کرتے ہیں کہ جب تک آپ اپنے کندھوں پر تھکا دینے والا بوجھ میرے سر پر نہیں رکھیں گے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ ''جہان رضا'' کی جیم سے الف تک کی ساری خدمات میں سرانجام دوں گا۔ میں پڑھوں گا۔ میں لکھوں گا میں پریسوں میں جاؤں گا۔ ایڈریس لکھوں گا۔ ڈاک خانے میں جاؤں گا۔ ایسے ننھے منے مجلسی کو کس طرح ٹالا جائے۔ کس طرح بہلایا جائے۔ کن الفاظ میں شکریہ ادا کیا جائے۔ کن الفاظ میں ان کے جذبے کی تعریف کی جائے۔ کس انداز میں اپنے سینے میں محفوظ کیا جائے۔

وہ کمسن ہیں! ضدی ہیں نرالی ان کی!
اس پہ مچلے ہیں کہ وہ ''جہان رضا'' چھاپیں گے

خلیل رانا نے ہمیں خوش کر دیا۔ ہماری دعاؤں کے سیلابوں کا رخ اپنی طرف موڑ لیا۔ اب آپ فیصلہ کریں جب مرکزی مجلس رضا کے ایسے ننھے منے مجلسی موجود ہوں تو ہمیں کیا فکر ہو سکتی ہے۔ یہ مرکزی مجلس رضا کی خدمات کا صلہ ہے۔ ''جہانِ رضا'' کی تحریروں کے ثمرات ہیں کہ ایسے ایسے اہل قلم، اہل محبت پھولوں کو چن چن کر اپنی جھولیاں بھرتے رہتے ہیں۔ جو ہم ''جہان رضا'' کے صفحات پر بکھیرتے رہتے ہیں۔

اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

جناب خلیل احمد رانا ابھی میر محفل بنے ہوئے تھے کہ ڈاک آ گئی۔ یہ ڈاک سپیشل ڈاکیا لایا تھا جس نے ایک بہت بڑا لفافہ دیا کھولا تو ہمارے دوست علامہ کوکب نورانی صاحب کا ایک جگمگاتا ہوا مضمون جلوہ گر ہوا۔ علامہ کوکب نورانی جب کرم فرماتے ہیں تو سپیشل ڈاک سے پیغام رسانی کرتے ہیں رات کراچی کی فوری ڈاک میں خط دیا ''علی الصباح چو مردم بہ کاروبار روند'' لاہور پہنچ گیا ابھی ہم چند سطریں پڑھنے پائے ہی تھے۔ کہ ایک اور فوری ڈاک آ گئی یہ جناب سید وجاہت رسول صاحب قادری ''صدر ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی'' کا نفاست نامہ تھا اور ساتھ ہی ایک خوبصورت ''مجلہ امام احمد رضا سالانہ کانفرنس کراچی'' جلوہ فرما ہوا۔ اس مجلہ میں ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی کی علمی امور کی تفصیلات تھیں جسے دنیائے رضویت نہایت عقیدت سے پڑھتی ہے۔ یہ دونوں لفافے اہل مجلس کے لیے ''مٹھائی کے ڈبے'' بن کر سامنے آئے جسے ہر مجلسی بلا اجازت اٹھا کر پڑھتا رہا۔

ابھی ہماری نگاہیں ان آنے والے ''شیریں اوراق'' کو ذوق نظر سے دیکھ ہی رہی تھیں کہ کسٹم کے محکمہ کا ایک رضوی انسپکٹر آ پہنچا۔ ایک بنڈل پیش کیا۔ اس میں ممبئی (انڈیا) سے چھپنے والے ''افکار رضا'' کے پرچے تھے۔ کسٹم کے محکمہ کا یہ رضوی انسپکٹر بھی مرکزی مجلس رضا کا دیرینہ مجلسی ہے۔ انڈیا سے جب ایسی ڈاک آتی ہے جس میں اعلیٰ حضرت کی خوشبو ہو تو ڈاکیے کی بجائے خود آتا ہے اور ''رضویت کا نامہ بر'' بن کر ہمیں خوش کر دیتا ہے۔

افکارِ رضا (ممبئی) کیا آیا دفتر معنی کھل گیا۔ محمد زبیر قادری سے کون رضوی عالم دین واقف نہیں ان کی تحریروں کا کون منتظر نہیں رہتا؟ بنڈل کھلا تو سب حاضرین کے ہاتھ بڑھے ہم بھی مشتاقان دید کے مجمعے میں بیٹھے تھے۔ افکار رضا کھولا۔ محمد زبیر قادری

صفحہ صفحہ پر جلوہ گر دکھائی دیئے اداریہ پڑھا عالم اسلام کے مسائل حاضرہ کا تجزیہ تھا۔ جن
دعوت اسلامی ممبئی کے سالانہ اجتماع کی روداد سامنے آئی ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب، ایم
ایچ پی جی کالج، مراد آباد کا ''ترجمہ کنز الایمان کا لسانی جائزہ'' پڑھا۔ پھر شیخ الاسلام
حضرت سید محمد مدنی میاں اشرفی الجیلانی کے قلم سے اعلیٰ حضرت کے ایک شعر کی ترجمانی
نے دعوت مطالعہ دی۔ علامہ کوکب نورانی (کراچی) کے قلم سے نجدی وہابیوں کی ایک
کتاب ''امام العصر'' پر زبردست تبصرہ سامنے آیا۔ علامہ محمد عبدالحکیم خاں شاہجہان
پوری مرحوم کی قلمی خدمات پر ایک تحقیقی مضمون نے خوش کام کیا۔ نوری مشن، مالیگاؤں
کے معروف اہل قلم مولانا غلام مصطفیٰ رضوی صاحب نے اپنے شہر مالیگاؤں میں
رضویت کی فضا کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی بریلی صاحب کا مضمون ''امام
احمد رضا اور ڈاکٹر علامہ اقبال'' ایک خوبصورت تحریر سامنے آئی علامہ محمد سراج الدین
شریفی سہشرامی (بہار) نے ہمارے علمائے کرام کی تبلیغی کوتاہیوں پر زبردست مقالہ لکھا۔

جناب محمد زبیر قادری ۱۹۹۹ء میں پاکستان آئے تو اپنی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے
قلم برداشتہ سفرنامہ لکھا جسے بڑی دلچسپی سے پڑھا گیا اور حقیقت ہے کہ

ع دل وجاں وجد کناں جھک گئے بہر تعظیم!

محمد زبیر قادری صاحب اگرچہ ممبئی انڈیا میں قیام پذیر، میں مگر وہ ''مرکزی مجلس
رضا پاکستان کے ننھے مُنّے مجلسی ہیں''۔ اگر آپ انہیں دیکھ لیں تو کہیں گے کہ واقعی وہ
''ننھے مُنّے مجلسی'' ہیں۔ آج سے دس سال قبل ہم جہان رضا کے چند شمارے اجمیری
بک ڈپو ممبئی کو ہر ماہ بھیجا کرتے تھے۔ محمد زبیر قادری صاحب ہر ماہ ان سے جہان رضا
لیتے مطالعہ کرتے ایک دن انھوں نے اپنی خوشی کا برملا اظہار کرتے ہوئے ہمیں خط
لکھا۔ گویا کہہ رہے ہیں: ''I Love You'' خط پڑھا۔ دل خوش ہوگیا کہ ایسے لوگ
بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں موجود ہیں۔ جواب لکھا تو سلسلۂ خط کتابت جاری ہوگیا۔
انہیں ''جہان رضا'' اتنا پسند آیا۔ کہ وہ چشم براہ رہتے انھوں نے ''تحریک فکر رضا'' کی

ادا رکھی۔ اور فروغ افکار رضا پر کام کرنے لگے۔ انہیں ''جہان رضا'' کا انداز بے حد پسند
تھا اسی انداز میں ''سہ ماہی افکار رضا'' نکالا۔ پہلا شمارہ چھپا۔ ہندوستان بھر کے علمائے
کرام کو اعزازی پہنچایا گیا بعض علمائے کرام نے حیرت کا اظہار کیا بعض نے حوصلہ افزائی
کی۔ ''افکار رضا'' پاکستان پہنچنے لگا تو ہم نے یہ جانا کہ یہ ''جہان رضا'' کا عکس جمیل
ہے پاکستانی علماء نے پسند کیا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے خط آنے لگے۔ ادھر
''افکار رضا ممبئی'' کی ترتیب پر جناب محمد زبیر قادری نے بڑی محنت کی اور رسالہ تیار
کرنا شروع کیا۔ عام رسالوں کی روش سے ہٹ کر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا پر علمی
تحقیقی اور معلوماتی مضامین آنے لگے ''افکار رضا'' کے صفحات نے جس تخصص سے
پیغام رضا پہنچایا اس سے

ع گونج گونج اٹھے ہیں ''افکار رضا'' سے بوستان!

کا سماں بندھ گیا۔ اداریہ، مضامین، رضانامہ، اہل علم کے خطوط چھپنے لگے۔ سارا ہندوستان
رضا کے نغمات سے گونجنے لگا۔ وہ چند رسالے پاکستان بھیجتے تو اہل محبت ہاتھوں ہاتھ
لیتے اور محبت سے مطالعہ کرتے۔

''افکار رضا'' نے داہنے دامن میں لپیٹ کر سارے
پیغام رضا کو خصوصیت سے
ہندوستان میں پھیلانا شروع کردیا۔ اہل علم نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اعلیٰ حضرت
فاضل بریلوی کے عاشقوں نے رسالے کی تلاش شروع کردی۔ کیرالہ سے لے کر
سری نگر کی وادیوں تک ''افکار رضا'' پہنچنے لگا۔

''افکار رضا'' کے ایڈیٹر محمد زبیر خان قادری نے ''مرکزی مجلس رضا'' کی خدمات
کو بے حد پسند کیا۔ اس کی خدمات کو سراہا۔ ''جہان رضا'' سے بے حد متاثر ہوئے۔
بذات خود صرف اور صرف ''مرکزی مجلس رضا'' کو دیکھنے کے لیے دو تین بار ممبئی سے
لاہور آئے۔ مرکزی مجلس رضا کے ''ننھے مُنّے مجلسی'' بنے مجلس کی خدمات کو ہمیشہ خراج
تحسین پیش کیا۔ ''جہان رضا'' کے ایڈیٹر کی خدمات کو خوش کن الفاظ میں سراہا۔ اس

سے بڑھ کر ہر ماہ ''جہان رضا'' کے کم وبیش ساٹھ رسالے منگوا کر ہندوستان کے اہل علم میں تقسیم کرنا شروع کر دیئے۔ان کی اس مسلسل کوشش سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں جہان رضا پھیلنے لگا۔وہ ایسے مقامات تک جہان رضا پہنچاتے ہیں جہاں تک ہماری رسائی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ مرکزی رضا کے اس ''ننھے مُنّے مجلسی'' کو عمر خضر عطاء فرمائے اور زندگی بھر پیغام رضا سے دلوں کو منور کرتے رہیں۔!

(''جہانِ رضا'' اگست ۲۰۰۲ء)

علماء کرام کی یادیں......مجلسی لطائف کی روشنی میں

علماء کرام نے اپنی علمی اور فقیہانہ کوششوں سے اپنے اردگرد کے ماحول کو اسلامی افکار سے روشناس کرانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ان کی زندگیاں دین اسلام کی خدمت میں وقف رہی ہیں۔اور وہ شب وروز عوام کو دعوتِ فکر دیتے رہے ہیں۔دینی امور کی رہنمائی کے ساتھ وہ اپنی مجلسی زندگی میں بڑی لطیف گفتگو کرتے تھے۔اس میں شگفتگی بھی ہوتی اور نکتہ آفرینی بھی یہ نکتہ آفرینی بعض اوقات سٹیج پر بھی سامنے آیا کرتی تھی۔ہمیں یہ سعادت حاصل رہی ہے کہ جہاں ہم نے عام جلسوں میں علماء اہلِ سُنّت کے خطبات سے اپنا حصہ پایا اور ان کے تدریسی حلقوں سے خوشہ چینی کی وہاں ان کی نجی اور خصوصی مجالس سے بھی گلہائے رنگارنگ سمیٹے۔

موچی دروازے کے باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہو رہا ہے۔یہ جلسہ ''اتحاد بین المسلمین'' کے نام سے منعقد ہوا تھا۔یہ ۱۹۶۲ء کا واقعہ ہے۔جب بعض ''اتحادی علماء'' نے سنی، شیعہ، دیوبندی، احراری، خاکساری اور جماعت اسلامی کے مقررین کو ایک اسٹیج پر بٹھادیا۔ایسی ''بے معنی'' کوششیں ہر دور میں ہوتی رہتی ہیں۔مگر نہ ''اتحاد بین المسلمین'' ہوتا ہے اور نہ ''اتحاد بین العلماء'' ہوتا ہے۔اس جلسہ میں ہر فرقے کے شعلہ بار مقرر آئے ہوئے تھے۔ایک شیعہ راہنما علامہ مظفر علی شمسی (م:۷-۶-۱۹) دھواں دار تقریر کر رہے تھے۔وہ تقریر کے دوران قیامت کے واقعات بیان کر رہے تھے۔اور جہنم کی خوفناکیوں کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔معاً انہیں میدانِ کربلا یاد آ گیا۔تو انہوں نے اپنے خطاب کا رخ موڑ کر دریائے فرات کے کنارے معصومانِ کربلا پر مظالم کا ذکر شروع کر دیا۔دس منٹ میں انہوں نے اس دردناک انداز میں مصائب

اہلِ بیت کا تذکرہ کیا کہ مجمعے میں بیٹھے ہوئے بہت سے شیعہ حضرات یا حسین یا حسین! یا حسین! کہہ کر رونے لگے۔ اور جلسے میں ایک کہرام مچ گیا۔ اب فاضل مقرر اپنے سابق موضوع پر لوٹنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر انہیں یاد نہ رہا کہ وہ سلسلہ بیان کہاں چھوڑ کر آئے ہیں۔ انہوں نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میں کہاں تھا؟'' کسی نے جواب نہ دیا۔ تو شمسی صاحب نے پرزور الفاظ میں دوبارہ للکارا ''میں کہاں تھا؟'' جب کوئی جواب نہ آیا تو مولانا محمد بخش مسلم مرحوم اسٹیج پر بیٹھے تھے۔ اٹھ کر فرمانے لگے۔ ''آپ جہنم کے کنارے پر تھے''۔ شمسی صاحب نے کہا ہاں ہاں میں جہنم کے کنارے پر کھڑا تھا۔ مسلم صاحب نے میرا بازو پکڑ کر کھینچ لیا سارے مجمعے میں ایک خوشگوار قہقہہ بلند ہوا پھر شمسی صاحب دوبارہ گرجے اگر ہم شیعہ سنی ایک ہو جائیں ''اتحاد بین المسلمین'' ہو جائے تو ہم جہنم میں گرنے سے بچ جائیں گے۔

مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۷۰-۱۰-۹):

بڑے عالم، منطقی اور قادر الکلام خطیب تھے وہ مجمعے میں کھڑے ہوتے تو اپنی خوش بیانی اور شیریں زبانی سے مجمع پر چھا جاتے۔ ''دار العلوم نظامیہ'' لوہاری دروازہ لاہور کی دعوت پر ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کرنے آئے۔ لاہور کے علماء اور اہلِ علم و فضل بڑی تعداد میں موجود تھے۔ مولانا ہزاروی کا خطاب موسلا دھار بارش کی طرح چھایا ہوا تھا۔ آپ نے اپنے خطاب میں لفظ ''تجلّی'' بولا۔ مجمع میں سے ایک بابا اٹھا بلند آواز سے بولا مولانا لفظ ''تجلی'' ہے ''تجلّی'' نہیں۔ مولانا رک گئے کہنے لگے ''بابا تیری تجلی اور میرا تجلّی''۔ اور فرمایا ''فلمّا تجلّی'' تیری تجلی اور میرا تجلّی۔ پھر بولے:

تجلّی تیری ذات کا سوبسو ہے!

لیکن بابا تیری تجلی اور میرا تجلّی۔ پھر فرمایا:

بدو گفت سالار بیت الحرام — کہ اے حاملِ وحی برتر خرام
چو در دوستی مخلصم یافتی — عنانم ز صحبت چرا تافتی؟

بگفتا فراتر مجالم نہ ماند — بماندم! کہ نیروے بالم نہ ماند
اگر یک سرے موئے برتر پرم — ''فروغ تجلّی'' بسوزد پرم

آپ نے سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ شعر ترنم سے پڑھے سارا مجمع جھوم گیا پھر بابے کو کہا: بابا تیری تجلی اور میرا تجلّی''۔ وہ دیکھو علامہ اقبال کی روح مکان کی چھت پر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے۔

بے تجلّی مرد دانا رہ نبرد — از لکد کوب خیال خویش مرد
بے تجلّی زندگی رنجوری است — عقل مہجوری و دین مجبوری است

لیکن تیری تجلی اور میرا تجلّی۔ پھر سنو: علامہ اقبال کی روح جاتے جاتے رک گئی اور آواز آئی:

یہ بزم تجلّی ہاست بنگر؟

بابا تیری تجلی اور میرا تجلّی۔ مولانا عبدالغفور ہزاروی نے بیس بار تجلّی کا لفظ استعمال کیا اور ہر موقع پر آیات، احادیث اور اشعار سے دلیلیں لاتے رہے۔ مجمع سرور میں ڈوب رہا اور ''تجلی والا بابا'' خدا معلوم کدھر چلا گیا۔

مولانا محمد شریف نوری قصوری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۷۲-۵-۱۳):

ہمارے مخلص احباب میں سے تھے۔ حضرت مولانا نور اللہ نعیمی بصیر پوری رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ اپنے وقت کے شیریں بیان مقرر تھے۔ ان کی خوش آوازی دلوں کو سکون بخشتی تھی۔ ان کی دل سوز آواز دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھی۔ وہ پاکستان کے دور دراز شہروں اور قصبوں میں بلائے جاتے تھے اور اپنے بیان و کلام سے دلوں کو روشن کرتے جاتے تھے۔ نواب آف کالا باغ ابھی گورنر نہیں بنے تھے۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ مولانا محمد شریف نوری محرم الحرام کے جلسہ میں کالا باغ آئیں اور تقریر کریں۔ نواب آف کالا باغ کے بھائی نواب خاں اور ان کے کزن شیر محمد خان اعوان (مولف ''محاسنِ کنز الایمان'') لاہور آئے مولانا محمد شریف نوری اور

مولانا محمد بخش مسلم مرحوم کو کالا باغ لے گئے۔ دونوں نامور خطیب تھے۔ جلسہ گاہ میں دور دور سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ مولانا مسلم مرحوم بتاتے ہیں کہ مولانا نوری نے کربلا کے واقعات کو بڑے پرسوز انداز میں بیان کیا اور مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے فرمایا: ''حضرت عباس علمدار میدانِ کربلا میں نکلے۔ سامنے یزیدی فوج دریائے فرات پر پرے باندھے کھڑی تھی حضرت عباس کے ہاتھ میں ''ذوالفقارِ علی'' تھی۔ ہزاروں یزیدی حضرت عباس پر ٹوٹ پڑے اور آپ کو گھیرے میں لے لیا۔ حضرت عباس نے تلوار کا دایاں ہاتھ مارا دس ہزار یزیدی کٹ گئے۔ بایاں ہاتھ مارا تو دس ہزار یزیدی واصلِ جہنم کر دیے۔ ایک شقی القلب یزیدی نے دور سے ایک ایسا تیر مارا کہ حضرت عباس کی پیشانی سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ پھر نوری صاحب نے زور دے کر کہا: لوگو یہ وہ پیشانی تھی جسے شہیدِ کربلا حضرت امام حسین نے چوما تھا۔ یہ وہ پیشانی تھی جسے حضرت زینب نے چوم کر اجازت دی تھی۔ مولانا نوری نے اس یزیدی کے تیر اور پیشانی سے خون کے فوارے کی بات اس دردناک انداز میں کی کہ مجمعے میں کہرام مچ گیا اور کئی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ مولانا مسلم کہتے ہیں کہ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے میرے کان میں کہا اُن کا بیس ہزار آدمی مار دیا۔ کوئی نہ رویا ایک تیر لگا تو سارا مجمع رونے لگا۔ میں نے کہا چپ رہو! یہ بات باہر جا کر کہنا ورنہ مارے جاؤ گے۔

مولوی نور محمد ایمن آبادی:

پیپلز پارٹی کے عروج کا زمانہ تھا۔ ملیں قومیائی جا رہی تھیں۔ کارخانوں میں مزدور قابض ہو رہے تھے۔ کارخانوں کے مالکوں کے منہ کالے کر کے ذلیل و خوار کیا جا رہا تھا۔ پیپلز پارٹی کے جیالے جگہ جگہ قبضے کر رہے تھے۔ لوگ بڑے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ہر طرف ''ہے جمالو'' کے نعرے تھے۔ ''دما دم مست قلندر'' کے بھنگڑے تھے۔ کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ جیالوں کے طوفان کو کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ ایمن آباد

کے ایک مولوی نور محمد تھے۔ سنار تھے۔ مگر ان کی آواز میں بڑا درد تھا۔ بڑا سوز تھا۔ وہ لاہور کے بھاٹی دروازہ کے باغ میں مسندِ وعظ بچھاتے تھے۔ نہایت سریلی آواز میں وعظ کرتے اور شعر سناتے۔ آپ کے مجمع میں عام طور پر لاہور کے گنجان محلوں میں بسنے والی خواتین آتیں۔ اور آپ کا وعظ سُنتیں۔ ان مستورات کو اجازت تھی کہ وہ مجلس وعظ میں بیٹھی بیٹھی گھر کے لیے سبزی تیار کرتی جائیں۔ سوئیٹر بنتی جائیں۔ جرابیں بناتی جائیں۔ کپڑے سیتی جاتیں۔ حتیٰ کہ اپنے بچوں کو بیٹھے بیٹھے دودھ بھی پلاتی جائیں مگر فاضل مقرر بلاتردد حضرت جابر کے فرزندوں کا واقعہ، ہرنی کا قصہ، حضرت بلال کی کہانی سناتے جاتے۔ وہ پیپلز پارٹی کے جیالوں کی لوٹ کھسوٹ سے بڑے تنگ تھے۔ ایک دن راہ چلتے چلتے تین جیالے آئے۔ اور کہنے لگے: ''لیا او مولوی! جو کما کر لا رہا ہے ہمارے حوالے کر۔ تو سرمایہ داروں سے پیسے بٹور لاتا ہے یہ تو ہمارا مال ہے''۔ وہ لٹ گئے مولوی نور محمد دکھی تھے۔ مگر زبان پر کچھ نہ لا سکتے تھے۔ ڈرتے تھے۔ زباں بندی تھی۔ جیالوں کا ڈر تھا۔ ایک دن وہ مجمع میں پنجابی کے یہ اشعار بڑی میٹھی آواز سے لاؤڈ سپیکر پر سنا رہے تھے۔

گھگی بیٹھی وِچ وظیفے لٹ کھادا گھر کانواں
باز عقاب اڑن جس ویلے پُت نہ سانبھن مانواں

وہ اس کی تشریح یوں کرتے۔ گھگی (فاختہ) سے میری مراد یہ ہے کہ پاکستان کے پرامن لاکھوں عوام جو دنیا داری کے وظیفے (کاروبار) میں مصروف ہیں۔ آج وہ آواز نہیں اُٹھاتے۔ دوسری طرف ''پیپلز پارٹی کے جیالوں'' کے کانواں (کوؤں) نے سارا گھر (ملک) اجاڑ دیا ہے۔ اور لوگ کچھ نہیں کہتے۔ کاں (کوا) کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے۔ سارے کاں (کوے) کافر اور مردار ہیں۔ قرآن نے انہیں کافر قرار دیا ہے۔ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ۔ ''سارے کوے کافر ہیں''۔ سارے جیالے لٹیرے ہیں۔ یاد رکھو! ایک وقت آنے والا ہے کہ باز اور عقاب پاکستان کی فضاؤں میں اڑائیں

بھریں گے۔ تو ان کووں کو مار مکائیں گے۔ تو وہ ایسا وقت ہوگا کہ مائیں اپنے بچوں کو
نہ سنبھال سکیں گی۔ اس فریادی تقریر کو ابھی چند ماہ گزرے تھے کہ ملک میں مارشل لاء
لگ گیا۔ جنرل ضیاء الحق عقاب بن کر بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ ٹی وی پر نظر آنے
لگے۔ اب پیپلز پارٹی کے لیڈر اور جیالے چھپنے لگے۔ بعض ملک چھوڑ کر بھاگنے لگے۔
جیسے قیامت برپا ہو۔ اور میدانِ حشر میں مائیں اپنے بچوں کو نہ سنبھال سکیں۔

ہمیں معلوم نہیں کہ آیا مولوی نور محمد ایمن آبادی کو جنرل ضیاء نے کوئی انعام و اکرام دیا ہے یا نہیں یا جنرل پرویز مشرف کی طرح ہمارے علامہ فہامہ ''طاہر القادری'' کی ساری مخلصانہ خدمات'' کو ڈکار گیا۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی کی پرسوز تقریریں اپنی جگہ جو بھاٹی دروازے کے باہر ''زنانہ باغ'' میں ہوتی تھیں۔ مگر ایک وقت تھا۔ جب لوہاری دروازے سے لے کر بھاٹی دروازے تک ایک کھلا خوبصوت سایہ دار درختوں کے نیچے باغ تھا۔ اس باغ میں علمائے اہلسنّت ہفت روزہ تقریریں کرتے تھے۔ لاہور بھر سے اہلِ ذوق نہایت شوق سے علماء کرام کی تقریریں سننے کیلئے جمع ہوتے تھے۔ دفتروں کے ملازمین اہتمام سے آ کر تقریریں سنتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ ان جلسوں میں صاحبزادہ فیض الحسن آلومہاروی کی مترنم تقاریر، مولانا محمد عمر اچھروی کی پنجابی تقاریر، مولانا محمد بخش مسلم کی خوش آواز تقاریر، مولانا غلام الدین انجن شیڈ کی دلچسپ تقاریر، مولانا عبدالغفور ہزاروی کی دلنواز تقاریر، مولانا عبدالستار خان نیازی کی گرجدار تقاریر، پیر امانت علی شاہ کی مثنوی مولانا روم کے اشعار سے معمور تقاریر، مولانا محمد شریف نوری کی لچھے دار تقاریر، بلاتردد سننے کو ملتی تھیں۔ علماء اہلِ سنت کی تقاریر سے بڑے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔ ان اثرات کو محسوس کرتے ہوئے۔ مولانا مودودی نے اپنے تقاریر کی مراکز کو چھوڑ کر بھاٹی دروازے کے باہر ''جماعت اسلامی'' کا ایک بڑا زبردست اجتماع کیا۔ یہ اجتماع نہایت ہی کامیاب اجتماع تھا۔ ملک کے گوشے گوشے سے ''جماعت اسلامی'' کے کارکن آئے ہوئے تھے۔ مگر حکومت وقت کے کارپردازوں نے اس جلسے کو

الٹنے کے لیے بھرپور انداز میں ہلہ گلا کیا۔ جس سے جلسہ درہم برہم ہوگیا۔ اور جماعت اسلامی کے ایک عالمِ دین اللہ بخش کو جلسہ عام میں قتل کر دیا گیا۔ یہ جلسہ دہشت گردی کی نذر ہوگیا۔ اس کے بعد ان جلسوں کی بساط الٹ گئی۔

ع آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کر رہ گیا

ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر آج بھی ہمارے علماء اہلِ سنت، خطیب اور مقرر مل جل کر اجتماعی طور پر لوگوں کو اپنے خیالات سے آگاہ کرنا چاہیں اور لاہور میں ایک ایسا مرکز بنائیں۔ جہاں لوگ بلا روک ٹوک جمع ہو کر ہمارے سنی علماء کرام کی تقریریں سن سکیں۔ تو رونق گزشتہ آسکتی ہے مگر اب زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے۔ خوش بیاں علماء ''وعظ فروش'' بن گئے ہیں۔ سیلانی علماء کرام، یورپی ممالک اور امریکہ جا کر ''تبلیغ'' کر رہے ہیں۔ کچھ علماء ''سیاسی پارٹیوں'' میں بٹ گئے ہیں۔ کچھ جماعتوں کے ''لیڈر'' بن گئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی بات سننے کو تیار نہیں۔ ایک دوسرے کے مرنے جینے کی خبر نہیں۔ ہائے!

ع اہلِ دل کے کارواں کن وادیوں میں کھوگئے!

حضرت مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ (م:۹۸-۳-۱۲):

حضرت مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم نعیمیہ بڑے زبردست عالم دین اور محنتی دینی راہنما تھے۔ ہم ان کے نیازمند تھے۔ وہ تحریکِ ختم نبوت کے دوران قید و بند میں رہے۔ قلعہ لاہور کے عذاب خانوں میں رہے۔ رہا ہو کر آئے تو انہوں نے چوک دالگراں کی مسجد میں ''جامعہ نعیمیہ'' کی بنیاد رکھی۔ مسند تدریس بچھائی۔ طلبہ کو دعوت عام دی۔ ساتھ ہی آپ ہر ماہ چوک دالگراں میں ایک جلسہ عام کا اہتمام کرتے تھے۔ اور ملک کے نامور علماء کرام اور مقررین کو بلا کر لوگوں کو تقاریر سناتے تھے۔ ان دنوں چوک دالگراں کھلا تھا ہزاروں لوگ بیٹھ کر تقاریر سن سکتے تھے۔ نہ ٹریفک کا شور نہ تجاوزات کا زور۔ مفتی محمد حسین نعیمی کی خوش انتظامی کا یہ عالم تھا کہ لاہور کے گوشے

گوشے سے اہلِ ذوق علماء کرام کو سننے آتے۔ دارالعلوم نعیمیہ کے ایک معاون حاجی نورالدین مرحوم تھے۔ بڑے مخیر، طلبہ اور علماء سے محبت کرنے والے تھے۔ ان کا مسجد دالگراں کے پاس ہی برف خانہ تھا۔ ان کی محبت اور خلوص کے پیش نظر مفتی صاحب ہر جلسہ کی کرسی صدارت پر انہی کو بٹھاتے وہ بھی اس منصب پر جچتے۔ ایک رات وہ کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ چیف مقرر تھے۔ رات کا وقت تھا۔ حدِ نگاہ تک مجمع تھا۔ جب تقریر شباب پر آئی۔ تو مولانا ہزاروی نے دیکھا کہ صدر محترم سو رہے ہیں۔ آپ نے کچھ نہ کہا۔ مگر تقریر کے دوران ایک واقعہ سنانے لگے۔ فرمایا میں ہزارے کے پہاڑی علاقوں کا رہنے والا ہوں۔ میرے گاؤں میں ایک چرواہا تھا۔ وادیوں میں اپنی بکریاں چرانے لے جاتا۔ مگر کئی بار بھیڑیے نکلتے اور اس کی کوئی نہ کوئی بکری اٹھا کر لے جاتے۔ اسے بڑی نظر رکھنی پڑتی تھی۔ اس کا ایک بارہ سالہ بیٹا تھا۔ اس کا نام نورالدین تھا۔ مگر لوگ اسے ''نورا نورا'' کہتے تھے۔ اس نے بیٹے کو کہا آج تم بکریاں لے جاؤ مگر خیال رکھنا بھیڑیے نہ آ جائیں۔ بچہ بکریاں لے گیا وہ چرنے لگیں۔ مگر بچے کو نیند آ گئی وہ سو گیا۔ اس کے باپ نے اسے پہاڑی سے دیکھا کہ چرواہا تو سو رہا ہے زور سے آواز دی۔ ''او نوریا!'' جب یہ آواز لاؤڈ سپیکر پر گونجی تو صدر محترم حاجی نورالدین جاگ اٹھے۔ مولانا عبدالغفور ہزاروی نے فرمایا حاجی صاحب آپ آرام فرمائیں میں نے تو اپنے گاؤں کے ''نورے'' کو کہا تھا اور مجمع لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

مولانا غلام محمد ترنم رحمۃ اللہ علیہ (م: ۵۹-۷-۲۴):

مولانا غلام محمد ترنم رحمۃ اللہ علیہ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آئے۔ بڑے قادر الکلام مقرر تھے۔ بڑی کڑا کے دار آواز تھی۔ بڑے خوش بیان مگر درویش صفت عالم دین تھے۔ وہ امرتسر میں ''امام ابوحنیفہ کانفرنس'' بڑی شان و شوکت سے مناتے تھے۔ سارا امرتسر اس کانفرنس میں امڈ آتا۔ لاہور آئے تو مسجد مائی لاڈو میں خطاب جمعہ شروع کیا

اور گوال منڈی کے چوک میں سالانہ ''امام اعظم کانفرنس'' کا اہتمام کرتے تھے۔ گوالمنڈی میں سارے لوگ امرتسر سے آ کر بسے تھے۔ مولانا سے مقدور بھر تعاون کرتے اور بڑا شاندار جلسہ ہوتا۔ مسجد مائی لاڈو سے اٹھ کر سیکرٹریٹ کے اندر جامع مسجد میں جمعہ پڑھانے لگے۔ آپ کی توجہ سے مسجد از سر نو مرمت ہوئی اور کشادہ ہوئی۔

آپ کو کئی شہروں سے دعوتِ خطاب آتی۔ شاہدرہ ٹاؤن والوں نے آپ کو دعوتِ خطاب دی۔ آپ نے رات کو بھرپور جلسے سے خطاب کیا۔ رات کے ایک بجے آپ فارغ ہوئے مگر کسی نے آپ کو سواری مہیا کی نہ کوئی نذرانہ۔ سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ آپ اندھیری رات میں اکیلے رہ گئے۔ جیب میں روپیہ تھا نہ پائی۔ ان دنوں شاہدرہ اور لاہور کے درمیان تانگے چلتے تھے۔ وہ بھی آدھی رات کے بعد بند ہو جاتے تھے۔ آپ تنہا اندھیرے میں پیدل چلتے چلتے لاہور روانہ ہوئے۔ آپ جوتے کی بجائے ''ہوائی چپل'' پہنا کرتے تھے۔ دریائے راوی کے پل پر پہنچے تو چپل کا ایک تسمہ ٹوٹ گیا۔ ایک چپل ہاتھ میں پکڑ لی اور سفر جاری رکھا۔ چلتے چلتے شاہی مسجد کے قریب پہنچے، تو ایک تانگہ رکا۔ اس میں ایک عیسائی پادری بیٹھا تھا وہ مولانا کو جانتا تھا۔ آپ کو پہچان کر تانگے میں بٹھایا اور حیرت سے پوچھا مولانا آپ اس وقت کہاں؟ آپ نے بتایا کہ شاہدرہ ٹاؤن میں ایک جلسہ تھا وہاں سے آ رہا ہوں۔ اس نے کہا: پیدل؟ فرمانے لگے: ''اسلام کے مبلغ پیدل ہی تبلیغ کرتے ہیں۔ ہاں عیسائی پادری چوتھے آسمان کی بلندیوں پر اڑتے رہتے ہیں''۔ پادری نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا ''ویل مسٹر ترنم'' مولانا نے اس پادری کے سامنے شاہدرہ کے مسلمانوں کی ''بے نیازی'' کی کوئی شکایت نہ کی۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (م: ۱۳۷۸ھ):

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایک احراری مقرر تھے۔ گرج دار آواز، شعلہ بیانی اور ملکی سیاست پر بات کرنے کا ملکہ تھا۔ وہ ہندوؤں کے وظیفہ خوار تھے۔ اور نظریہ

پاکستان کی مخالفت کرتے تھے۔ اس وجہ سے انہیں ''بوکا'' کہا جاتا تھا۔ دہلی دروازہ
لاہور کے باغ میں مجلس احرارِ اسلام کا ایک جلسہ تھا۔ یہ بات پاکستان بننے سے پہلے کی
ہے۔ تقریر عروج پر تھی مولانا حبیب الرحمٰن گرج رہے تھے۔ ایک شخص مجمع میں اٹھا اور
چلا کر کہنے لگا۔ پہلے مجلس احرار تین لاکھ چندے کا حساب دے۔ مولانا لدھیانوی رک
گئے۔ فرمایا ''ہم احرار ہیں''...... آزاد لوگ ہیں۔ چندہ لیں گے۔ حساب نہیں دیں گے؟''
آپ نے میز پر زوردار مکا مارا۔ سٹیج سے نعرہ تکبیر بلند ہوا۔ پھر بولے ہم مسلمان ہیں
حضرت علی کے ماننے والے فقیر ہیں ہم ہندو بنیئے نہیں کہ کوڑی کوڑی کا حساب رکھے
پھریں۔ اسٹیج سے پھر نعرہ تکبیر بلند ہوا۔ مولانا پھر گرج کر بولے: ہاں! ہاں! ''اگر تم
لوگوں نے مجلس احرار سے چندے کا حساب لینا ہے تو پہلے انگریز حکومت سے عالمی جنگ
کے اخراجات کا حساب لو۔ پھر مجلسِ احرار سے بات کرنا''۔ اس بات پر نعرہ ہائے تکبیر
بلند ہوئے۔ اور سوال کرنے والا غائب تھا۔

مولانا محمد یٰسین:

مولانا محمد یٰسین راسخ العقیدہ سنی عالمِ دین تھے۔ عمر ستر سال سے زیادہ تھی۔ بڑے
جذباتی بڑے کھرے، ان کے ہاتھ میں ہر وقت ایک چھڑی رہتی تھی وہ مسلم مسجد لاہور
کے نیچے مولوی شمس الدین مرحوم کی کتابوں کی دکان میں تشریف لاتے۔ جہاں بہت
سے علماء اور کتاب دوست حضرات بھی آ بیٹھتے تھے۔ مولانا طبیعت کے بہت سخت تھے
اور بے پناہ جذباتی ان کے سامنے کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کوئی بات خلاف طبیعت
کرنے کی جرأت کرتا تو وہ خشمناک نظروں سے اسے ایسے دیکھتے کہ وہ ڈر کر بیٹھ
جاتا۔ ہم نے ان کا نام ''**مولوی کچیچی**'' رکھا ہوا تھا انہیں اپنا نام معلوم ہو گیا تھا مگر
وہ ہماری اجتماعی قوت کے سامنے ہمیں کچھ نہ کہتے۔

آج کی طرح ان دنوں بھی لاہور میں دیوبندیوں اور وہابیوں کا زور بڑھتا جا رہا
تھا۔ ایک شخص نے ڈرتے ڈرتے ''**مولوی کچیچی**'' کو کہا۔ مولوی صاحب آج کل

وہابیوں کا زور ہو رہا ہے۔ فرمایا کہاں؟ مجھے بتاؤ! کہا چینیاں والی مسجد میں آج کل سارے
وہابی جمع ہوتے ہیں۔ پوچھا کہاں ہے چینیاں والی مسجد؟ اس نے مولوی کی چھڑی کا رخ
چینیاں والی مسجد کی طرف کر دیا۔ مولوی **کچیچی** نے غصے میں آگ بگولہ ہو کر کہا دھڑ ام!
دھڑ ام! لو لاہور کے سارے وہابی ختم ہو گئے!

ہم خوش ہو گئے۔ چلو مولوی **کچیچی** نے لاہور کے وہابی ختم کر دیئے۔ آج ہم
ان فرقوں کو لاہور میں دوڑ دھوپ کرتے دیکھتے ہیں۔ اور اپنے مقرروں کی رات کو گرجدار
تقریروں کی آوازیں سنتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے۔ سارے وہابی، دیوبندی تبلیغی جماعت
والے ''دھڑ ام'' ہو گئے ہیں۔ مگر دوسرے دن یہ سارے حشرات الارض کی طرح دوڑتے
نظر آتے ہیں۔ ہمارے مدرسے ویراں ہو رہے ہیں۔ ہماری مسجدوں پر دیوبندی قبضہ کر
رہے ہیں۔ ہماری خانقاہوں پر شیعوں کے کالے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔

ع گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا؟

شورش کاشمیری (م: ۲۵-۱۰-۷۵):

شورش کاشمیری زبردست مقرر، قلم کار اور ملکی مسائل کو زوردار انداز میں بیان
کرتے تھے۔ ان کی زبان اور قلم یکساں چلتی تھی۔ اور خوب چلتی تھی۔ ہم لوگ ان کی
لچھے دار تقریریں سنتے اور ان کے ہفت روزہ چٹان'' کے ''قلم قتلے'' کے کالم چٹخارے
لے کر پڑھتے تھے۔ اگرچہ وہ احراری تھے۔ احراریوں کے ترجمان تھے۔ اور ہمارے
مسلک کے سخت خلاف تھے۔ مگر ان سے جب ملاقات ہوتی تو خندہ پیشانی سے ملتے۔
لطیف گفتگو کرتے اور بعض اوقات عمدہ شعر سنا کر ہمیں خوش کر دیتے۔ وہ اکثر مسلم مسجد
لاہور میں نمازِ جمعہ پڑھتے تھے۔ ایک دن نماز پڑھ کر نکلے۔ مجھے اور بشیر حسین ناظم کو دیکھ
کر اپنے پاس بلایا۔ اور فرمانے لگے اگر تم نے ''اسلاف کی نشانی'' دیکھنی ہو تو مولانا عبداللہ
درخواستی آئے ہوئے ہیں۔ ان کی زیارت کرو۔ ہم نے شورش کو ساتھ لیا اور مسلم مسجد
کے نیچے ادویات کی ایک دکان کے تہ خانے میں چلے گئے۔ وہاں مولانا عبداللہ درخواستی

ایک قالین پر چند عقید تمندوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ میں اور شورش تو کھڑے رہے مگر بشیر حسین ناظم آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً مولانا عبداللہ درخواستی کے قدموں میں سر رکھ کر ''سجدہ کناں'' بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ مولانا درخواستی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے جیسے پالتو بلی کے سر پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے۔ میں اور شورش کاشمیری کھڑے کھڑے بشیر حسین ناظم کی ''حالتِ زار'' کو دیکھتے رہے۔ نہ مولانا درخواستی نے اسے اٹھایا نہ کسی مولوی نے اسے سمجھایا کہ ''سجدہ نہ کرو'' ناظم خود ہی اٹھا۔ ٹسوے بہاتا رہا۔ اور اہلِ مجلس پر اپنا رنگ جماتا رہا۔ مولانا درخواستی نے ہم سب کو دو دو مالٹے دیے اور کہا کہ یہ ''تبرک'' ہے۔ لے لو پھر ایک ایک تعویذ دیا۔ اور فرمایا یہ تعویذ حضرت امام شافعی کا مجرب تعویذ ہے۔ ہم چند لمحے مجلس میں رہے۔ اجازت لے کر باہر آ گئے۔ باہر سڑک پر آ کر بشیر حسین ناظم نے کہا شورش! آپ کے ''اسلاف'' ایسے تھے۔ نہ سجدہ کرنے سے روکتے تھے۔ تبرک دیتے تھے۔ تعویذ بانٹتے تھے شورش کاشمیری نے ناظم کو کہا دفعہ ہو جاؤ۔ ہمارے بزرگوں کے خلاف بکواس نہ کرو۔

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں ہے

(''جہانِ رضا'' جون، جولائی ۲۰۰۳ء)

علماء کرام کی لطیف یادیں

مولانا کوثر نیازی (م:۹۴-۳-۱۹):

مولانا کوثر نیازی کی یاد آئی۔ وہ عالمِ دین، معلم علوم دینیہ اور فاضلِ درس نظامی تو نہیں تھے۔ مگر دانشور تھے، صحافی تھے، صاحب قلم تھے، خطیب تھے، ادیب تھے پھر سیاسی میدانوں کے شاہسوار تھے۔ وہ وزیر بنے مشیر بنے۔ زندگی کے آخری سالوں میں امام احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فضل کے ترجمان بن کر برِ صغیر پاک و ہند میں ''نغماتِ رضا'' کی ''صدائے دلستان'' بن گئے۔

ہم ان کے حلقۂ احباب میں اس وقت داخل ہوئے جب ان کا نام ''حیات محمد خاں'' تھا۔ اور میانوالی کی خشک وادی سے نکل کر لاہور آئے تو ''کوثر نیازی'' بن گئے۔ لاہور کی علمی زندگی میں داخل ہوئے۔ ہم ان دنوں کی بات کر رہے ہیں جب وہ شام نگر چوبرجی کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ اور شاہ عالمی بازار کی لال مسجد میں نمازِ جمعہ سے پہلے ''ماڈرن خطاب'' کیا کرتے تھے۔ بشیر حسین ناظم، مولانا محمد بخش مسلم مرحوم اور قاری محمد عطاء اللہ کے ساتھ ہم کبھی کبھی ان کے حجرے میں چلے جاتے۔ ہم نے ان کو ''مقطوع اللحیہ'' تو نہیں دیکھا البتہ وہ ''مقصور اللحیہ'' تھے۔ ان دنوں ہم خود بھی ''مقصور اللحیہ'' تھے۔ بشیر حسین ناظم ''مفقود اللحیہ'' تھے۔ ہم سب سرکاری ملازم تھے۔ مولانا مسلم محکمہ امداد باہمی، بشیر حسین ناظم آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ اور ہم محکمہ صنعت میں انسپکٹر تھے۔ ہم سب مل کر مولانا کوثر نیازی کے پاس جاتے اور ان کے حجرے میں چائے کا دور چلتا۔

مولانا کوثر نیازی ان دنوں جماعت اسلامی کی ''بلبل ہزار داستان'' تھے۔ مولانا

مودودی کی مجالس کے ''امیر خسرو'' تھے۔ اور بقول شورش کاشمیری میخانہ جماعت اسلامی کے ''مغبچہ'' تھے۔ جماعت اسلامی سے دوری کے باوجود ہم لوگ مولانا کوثر نیازی کو پسند کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب امریکہ کی ایک یہودی خاتون ''مریم'' دامنِ اسلام میں آ کر مولانا مودودی کے گھر ذیلدار پارک اچھرہ میں قیام پذیر تھی۔ اور دینی تربیت پا رہی تھی۔ مولانا کوثر نیازی اس جواں سال خاتون سے بڑے متاثر تھے۔ وہ ہر روز دیسی مرغی کے پانچ انڈے ابالتے اور سائیکل پر سوار ہو کر شام نگر سے اچھرے جاتے۔ اور نو مسلم خاتون کو پیش کرتے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ مولانا ہمیں تو خالی چائے کی پیالی پلاتے ہیں اور مریم کو دیسی مرغی کے ابلے ہوئے انڈے کھلاتے ہیں۔ اگرچہ ان کا یہ فعل برا نہیں تھا۔ مگر ہمیں ''احساس محرومی'' اندر سے کاٹتا تھا۔ بشیر حسین ناظم نے ایک دن مولانا مسلم کو مولانا کوثر نیازی کی اس ''حرکت'' سے آگاہ کیا۔ ہم نے بھی ''اپنے احساس محرومی'' کا رونا رویا۔ دوسرے دن محفل جمی تو مولانا مسلم فرمانے لگے۔ ''او کوثریا''؟ تیری یہ حرکت کہ مریم کے لیے پانچ پانچ انڈے اور ہمیں خالی چائے''؟ مولانا کوثر نیازی فرمانے لگے حضرت وہ نو مسلم ہے میں تو یہ خدمت ''تالیف القلوب'' کے لیے کرتا ہوں۔ مسلم صاحب فرمانے لگے وہ تو کل کی مسلمان ہے اور ہم تو صدیوں سے مسلمان چلے آ رہے ہیں؟ مجلسِ کشت زعفران بن گئی۔ ہم سب نے مسلم صاحب کے ''جواب کو باصواب'' قرار دیا۔ اس کے بعد مولانا کوثر نیازی نے زندگی بھر ہمیں کبھی خالی چائے نہیں پلائی۔

غالباً ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ ہم ابھی دس بارہ سال کے طالب علم تھے۔ مسجد وزیر خاں میں انجمن حزب الاحناف کا سالانہ جلسہ ہوتا تھا۔ جلسہ تین دن رہتا۔ اس جلسے کا انتظام واہتمام علامہ سید ابوالبرکات، سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ کیا کرتے تھے۔ بریلی شریف، مراد آباد، پیلی بھیت، بمبئی، اور آگرہ سے علماء اہلِ سنت کے قافلے آتے اور علامہ ابوالبرکات ان کے استقبال کے لیے علماء لاہور کا ایک وفد سجا کر ریلوے اسٹیشن پر حاضر

ہوتے۔ علماء کرام کے یہ قافلے جب ریلوے اسٹیشن سے چلتے تو نولکھا بازار، لنڈا بازار، اور دہلی دروازے کے دکاندار دکانوں سے باہر نکل کر نعرۂ تکبیر اور نعرۂ رسالت بلند کرتے۔

وزیر خاں کی مسجد میں جلسہ گاہ بڑی شان سے سجائی جاتی۔ سامعین وحاضرین کے لیے آرام دہ فرش بچھائے جاتے۔ سٹیج پر ساٹھ ستر علماء کرام کی نشستیں لگتیں۔ یہ محدث کچھوچھوی تشریف فرما ہیں، یہ صدر الافاضل جلوہ فرما ہیں، یہ صدر الشریعہ جلوہ آرا ہیں، یہ شہزادۂ اعلیٰ حضرت مولانا حامد رضا خاں ہیں، یہ شیر بیشہ اہلسنّت مولانا حشمت علی ہیں۔ یہ وصی احمد سورتی کے بیٹے بیٹھے ہیں۔ یہ محدث لائلپوری مولانا سردار احمد بریلی سے آئے ہیں۔ یہ اشرفی میاں ہیں، یہ کچھوچھے سے تشریف لائے ہیں، یہ گڑھی اختیار خاں سے محمد یار فریدی ہیں۔ یہ جھنگ سے مولانا قطب الدین جھنگوی ہیں، یہ گجرات سے پیر ولایت شاہ ہیں۔ کس کس کا نام لیں اور کن کن کا ذکر کریں۔

ع اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر!

یہ آسمان سنیت کے آفتاب و ماہتاب تھے جو وزیر خاں کی مسجد میں عقائد اہلسنّت کے مختلف موضوعات پر تقاریر کرتے تھے۔ ادھر سامعین تھے۔ جو پنجاب کے مختلف شہروں سے کھچے چلے آتے۔ مسجد وزیر خاں کا صحن کھچا کھچ بھرا ہوتا۔ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے مختلف علاقوں سے لوگ جوق در جوق آتے۔

اگرچہ ہم طالب علم تھے۔ لیکن ہماری دلی خواہش ہوتی کی علماء کرام کی قربت ہمیں نصیب ہو۔ ان کے پہلو میں بیٹھیں۔ ایک تو سٹیج پر کھڑے ہو کر جلسہ گاہ کا نظارہ کریں گے دوسرے ان بلند پایہ علماء کے دامن کے سائے میں جگہ مل جائے گی۔ مگر ہمیں کون سٹیج پر جانے دیتا...... کون پوچھے ہے تیری بات رضا!...... نئے کپڑے پہن کر پانی کا جگ اٹھائے اسٹیج پر جا پہنچتے۔ جہاں ساٹھ علماء کرام جلوہ فرما ہیں۔ کسی کے سامنے پانی کا گلاس پیش کیا۔ کسی کے سامنے پاندان رکھا۔ کسی کے سامنے اگال دان رکھا۔ کسی کا رومال گر پڑتا تو اٹھا کر پکڑاتے۔ کسی کے پاؤں پر پھولوں کی پتیاں گری ہوئی نظر آتیں تو

انہیں اٹھائے۔ سی کا رقعہ سٹیج سیکرٹری تک پہنچاتے ہماری یہ غلامانہ ادائیں دیکھ کر ہمیں ا[illegible] سے کوئی نہ ہٹاتا حتی کہ جب غیر حاضر ہوتے تو علامہ ابوالبرکات آواز دے کر بلا لیتے!

ؔ تیرے کوچے اس بہانے میرا دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا!

ہم کس کس کی تقریر کا ذکر کریں، کس کس کے بیان کا تذکرہ کریں، کس کس کی شعلہ نوائی کا ذکر کریں۔ کن کن نکات کو سامنے لائیں۔ ہر ایک مقرر آفتاب و ماہتاب کی کرنیں بکھیرتا دکھائی دیتا تھا۔ جب سید پیر ولایت شاہ گجراتی تقریر کیلئے آتے۔ تو میز سے گلدستے ہٹا دیئے جاتے۔ دوسری چیزوں کو اٹھا دیا جاتا۔ ان کی تقریر بڑی پرجوش ہوتی وہ گرجتے اور چمکتے ہوئے مجمعے پر چھا جاتے۔

ایک دن وہ سامعین کے سامنے اسلام کی عظمت پر تقریر کر رہے تھے۔ اور ایک ہندو عورت کے اسلام لانے کا واقعہ سنا رہے تھے۔ جو حضور پر نور پر ہزاروں بار درود شریف پڑھ کر پہلے زیارت سے مشرف ہوئی۔ پھر اسلام کے دامن میں آ گئی۔ اس مقام پر آ کر شاہ صاحب حضور نبی کریم کی شان پر اظہار خیال فرماتے ہوئے۔ درود شریف کے منکرین پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ اور منکرین شان رسالت کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ ''او...... !تہاڈے کولوں تے کھترانی چنگی نکلی'' شاہ صاحب کے اس جملے پر سارا مجمع لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ہندوستان سے آئے ہوئے علماء کرام پنجابی سے ناآشنا تھے خود علامہ ابوالبرکات پنجابی زبان کی ٹکسالی اصطلاح سے ناواقف تھے۔ ان حضرات میں سے کسی کو سمجھ نہ آئی۔ علامہ ابوالبرکات نے ایک شخص سے پوچھا شاہ صاحب نے کیا فرمایا کہ سارا مجمع لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔ اس شخص نے عرض کی کہ حضور شاہ صاحب نے تصوف کا ایک ''باریک نکتہ'' بیان فرمایا ہے۔ علامہ ابوالبرکات خوش ہو کر فرمانے لگے۔ ''کیوں نہ ہوں آخر سادات کے گھرانے کے عالم دین ہیں!''

ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں (سیالکوٹ):

ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں (سیالکوٹ) بڑے نامور خطیب، صاحب قلم

اور شعر و سخن کے مالک ہیں۔ ان کی عمر غالباً نوے سال سے کچھ زیادہ ہے۔ حضرت شیخ الحدیث محمد شریف کوٹلی لوہاراں کے فرزند ارجمند ہیں۔ دار العلوم حزب الاحناف کے فارغ التحصیل ہیں۔ وہ صاحب علم و قلم ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مولانا بشیر کا میدان خطابت میں طوطی بولتا تھا۔ ہر شہر اور ہر قریہ کے لوگ انہیں بلاتے وہ جہاں جاتے مجمع پر چھا جاتے۔ خوش آواز تھے قادر الکلام خطیب تھے ان کا طرز بیان مخصوص تھا۔ دوران تقریر لطائف بیان کرتے۔ اور مجمع کو کشت زعفران بنا دیتے۔ اشعار کا برمحل استعمال کرتے تو اہل ذوق جھوم جھوم جاتے۔ وہ خود شاعر ہیں ''حاجی لق لق'' کے مقابلے میں ''حاجی حق حق'' کا تخلص رکھتے ہیں۔ شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ انھوں نے جوانی میں ماہنامہ ''ماہ طیبہ'' نکالا۔ جو سُنّی صحافت کا بہترین ترجمان تھا۔ ان دنوں بڑھاپے نے انہیں گوشہ نشین بنا دیا ہے ورنہ وہ اپنے وقت میں زبان و قلم کے ماہر تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن سے علماء اہلسنت کو بڑی راہنمائی ملتی ہے۔

ان کے ضلع سیالکوٹ کے بہت سے لوگ ریاست بہاولپور میں زمینیں آباد کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔ انہوں نے مختلف علاقوں میں مربعے آباد کیے۔ یہ پاکستان سے پہلے کا واقعہ ہے ان سیالکوٹی عقیدتمندوں نے آپ کو ایک جلسے میں بلایا ہارون آباد کے مضافات میں ایک گاؤں میں جلسہ ہوا۔ دور دور سے صحرا نورد اونٹوں پر سوار ہو کر آئے۔ مولانا محمد بشیر صاحب تقریر کر رہے ہیں۔ مجمع پر سناٹا طاری ہے۔ حد نگاہ تک لوگوں کا اجتماع ہے ہر ایک کی نگاہ آپ کے چہرے پر لگی ہوئی ہے۔ اور کان آپ کی آواز پر لگے ہیں۔ تقریر جوبن پر آئی تو مولانا بشیر فوراً رک گئے۔ فرمانے لگے میں اپنے سامعین کو رات کا ایک ''حادثہ'' سنانا چاہتا ہوں۔ لوگ گوش برآواز تھے کہ رات کو کیا حادثہ ہو گیا۔ میزبان دم بخود ہے خدا جانے مولانا بشیر صاحب کو کیا حادثہ درپیش آیا۔ مولانا بشیر صاحب بولے۔ میں رات کو سویا ہوا تھا۔ کمرے میں اکیلا ہی تھا۔ آدھی رات کے وقت مجھے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ آہیں، سسکیاں اور چیخیں سنائی دیں۔ میر

اٹھا ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، کوئی بھی نہیں تھا۔ لالٹین جلائی۔ کوئی چیز نظر نہ آئی۔ میں نے خیال کیا۔ اس گھر میں جنات کا بسیرا ہے۔ میں نے ''اصحاب کہف کا وظیفہ'' پڑھا۔ مگر رونا دھونا اور چیخ و پکار بند نہ ہوئی۔ آخر میں نے حضور پر درود پڑھنا شروع کیا مگر آوازیں مسلسل آتی رہیں۔ میں نے غور کیا تو جس بستر پہ سویا ہوا تھا۔ اس کی رضائی، تلائی، اور چادر بھی رو رہی ہیں۔ تکیہ رو رہا ہے۔ کمبل رو رہا ہے۔ کپڑے آہ وزاری کر رہے ہیں۔ یہ ساری چیزیں ریشمی کمخاب اور اعلیٰ سوتی کپڑے کی بنی ہوئی تھیں۔ اور بالکل نئی نکور تھیں۔ میں نے پوچھا تم کیوں رو رہی ہو؟ وہ کہنے لگیں ''مولوی صاحب! ان لوگوں نے پہلی بار ہمیں آپ کے استعمال میں دیا ہے۔ آپ عالم دین ہیں۔ اللہ والے ہیں رسول اللہ کے عاشق ہیں۔ آپ سوئے ہمیں بڑا سکون ملا آپ کے جانے کے بعد یہ لوگ خدا معلوم کن جاہلوں اجڈوں اور جانگلیوں کے حوالے کریں گے۔ جو اپنے ناپاک گھٹنوں سے ہمیں کھدیڑ دیں گے۔ ہم تو اس خوف سے رو رہے ہیں کہ کل کیا ہوگا''؟

واقعہ بڑا پر لطف تھا لوگ بڑے محظوظ ہو رہے تھے میزبان مجمعے سے اٹھا۔ اور کہنے لگا ''مولوی بشیر صاحب یہ سارا بستر آپ کا ہوا!''

(''جہانِ رضا'' دسمبر ۲۰۰۳ء)

علامہ شاہ احمد نورانی کے غیر سیاسی شب و روز

مولانا شاہ احمد نورانی جمعیت العلماء پاکستان کے صدر، ورلڈ اسلامک مشن کے چیئرمین اور ملی یکجہتی کونسل کے صدر نشین ہیں۔ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ سیاسی خارزاروں میں سفر کرتے گزرا ہے۔ وہ پاکستان کی مختلف سیاسی تحریکوں میں ایک مقتدر راہنما کی حیثیت سے نمایاں رہے ہیں۔ قید و بند کی صعوبتوں کو لبیک کہتے رہے۔ نیشنل اسمبلیوں اور سینٹ میں ان کے سیاسی کردار کو بڑی پذیرائی ملی۔ وہ اقتداری قوتوں کو للکارتے بھی رہے اور ان قوتوں کے مظالم کے سامنے سینہ سپر بھی رہے۔ انہیں اپنے سیاسی حریفوں اور حلیفوں سے واسطہ بھی رہا مگر ان کے قدم استقلال کو کبھی لغزش نہیں آئی۔

سیاسی زندگی کے برعکس مولانا شاہ احمد نورانی کی ایک غیر سیاسی زندگی ہے جس پر ہم جیسے غیر سیاسی لوگ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ مولانا ۱۹۲۸ء میں میرٹھ (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی مبلغ اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم میرٹھی اپنے وقت کے بڑے بلند پایہ عالم دین تھے۔ وہ فاضل بریلوی کے فاضل تلامذہ میں شامل ہوتے ہیں۔ مولانا عبدالعلیم مرحوم کو اردو، انگریزی، فارسی اور عربی زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فاضل بریلوی نے آپ کو ہندوستان کے علاوہ دنیا کے مختلف ملکوں میں اسلامی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دینے کے لیے منتخب کیا۔ چنانچہ آپ نے ساری زندگی یورپ، امریکہ، افریقی ممالک اور انڈونیشیا، فلپائن اور مشرق بعید کے کئی ممالک میں تبلیغ کی۔ انہوں نے امریکہ میں کئی اسلامی سنٹر قائم کیے۔ افریقی ممالک میں اسلام کی حقانیت کو پھیلایا، جنوبی افریقہ میں اسلامی مراکز قائم کیے۔ امریکہ، برطانیہ، ہالینڈ، فلپائن اور تھائی لینڈ میں اسلامی تبلیغ کے لیے کئی سفر کیے۔ آپ نے دنیا

کے ان خطوں کی زبانوں پر بھی عبور حاصل کیا اور وہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کو اسلام کی حقانیت سے روشناس کیا۔

مولانا شاہ احمد نورانی اپنے والد مکرم کے ساتھ دنیا بھر کے مختلف ممالک میں جاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مولانا نورانی کو عربی، انگریزی، ڈچ، جرمنی، فرانسیسی اور افریقہ کی علاقائی زبانوں پر بڑا عبور ہے۔

وہ عراق، لیبیا، برطانیہ، ہالینڈ، فرانس، امریکہ جنوبی افریقہ اور فلپائنی زبانوں میں یکساں طور پر بڑی روانی سے خطاب کرتے ہیں۔ وہ امریکہ کی یونیورسٹیوں میں انگریزی میں لیکچرز دیتے ہیں۔ وہ عراق اور لیبیا کے اعلیٰ اجلاس میں عربی زبان میں خطاب کرتے ہیں۔ وہ ہالینڈ میں اور فرانس کے علمی مراکز میں کھل کر بات کرتے ہیں۔ آج پاکستان کا شاید ہی کوئی ایسا لیڈر ہو جو ترجمان کے بغیر ان ممالک میں براہ راست لوگوں کو مخاطب کر سکتا ہو۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے میرٹھ کی عظیم الشان دینی درسگاہوں سے مختلف علوم کی تربیت حاصل کی۔ تفاسیر و احادیث میں سند فضیلت لے کر پاکستان آئے۔ آپ نے پاکستان میں علماء دین اور مشائخ وقت کے ساتھ علمی اور روحانی رابطے پیدا کیے اور اپنے والد کے زیر تربیت رہ کر جن علمی مقامات اور روحانی احوال کا مطالعہ کیا تھا، اس میں اہل علم وفضل اور مشائخ کرام کی مجالس میں پہنچ کر اضافہ کیا۔ آپ کی ابتدائی زندگی ایک ابھرتے ہوئے عالم دین اور مبلغ اسلام کی حیثیت سے سامنے آئی۔ آپ کے والد عمر کے آخری حصے میں اپنے ذاتی مکان مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہوئے۔ مولانا شاہ احمد نورانی بھی اپنے والد گرامی کے زیر سایہ ایک عرصہ تک مدینہ پاک میں رہے۔

آپ کی شادی قطب مدینہ حضرت مولانا ضیاء الدین مدنی کے بیٹے فضیلت الشیخ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدنی مدظلہ کی بیٹی (جو مدینہ یونیورسٹی کی فاضلہ اور جدہ یونیورسٹی کی ڈاکٹر ہیں) سے ہوئی۔ آپ کے والد مولانا شاہ عبدالعلیم میرٹھی مدینہ

منورہ میں ہی واصل بحق ہوئے اور ''جنت البقیع'' میں راحت وسکون پایا۔

مولانا شاہ احمد نورانی مدینہ منورہ سے پاکستان آئے تو کراچی صدر میں ایک کرائے کا فلیٹ لیا۔ الحمدللہ پاکستان نے ہزاروں رنگ بدلے مگر شاہ احمد نورانی چالیس سال سے اسی فلیٹ میں کرایہ دار کی حیثیت سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ آج بھی رہ رہے ہیں۔ صبر وقناعت کی یہ مثال شاید ہی پاکستان کے کسی دینی یا سیاسی راہنما میں ملے۔

سابقہ تیس سال سے آپ کا معمول رہا ہے کہ صدر میں ایک مسجد میں ہر سال تراویح میں پورا قرآن سناتے ہیں۔ شبینہ کی طاق راتوں میں اضافی قرآن پڑھتے ہیں۔ آپ نے اپنے معمول میں کبھی نہ ناغہ کیا ہے نہ کوتاہی کی ہے۔ آپ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ سرکار مدینہ کی زبان عربی میں بات کرتے ہیں مگر پاکستانی ملاقاتیوں کے ساتھ دہلوی اردو میں گفتگو کرتے ہیں۔ سیاست میں آنے سے پہلے آپ مختلف وظائف کی ادائیگی میں ساری ساری رات گزار دیتے تھے۔ دعائے ''حزب البحر'' اور ''قصیدہ بُردہ'' سیاسی مصروفیتوں کے باوجود آج بھی آپ کے معمولات میں شامل ہے۔

حضرت خواجہ قمرالدین سیالوی صدر جمعیت علماء پاکستان کی رحلت کے بعد آپ کو جمعیت کا صدر چنا گیا۔ اس وقت تک جمعیت علماء پاکستان سنیوں کی ایک دینی اور تبلیغی جماعت تھی نہ الیکشن میں حصہ لیتی نہ انتخابی مہموں میں۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے علماء اہل سنت کا ایک قافلہ تیار کیا اور کراچی سے چترال تک اور کھوکھراپار سے خیبر تک علماء ومشائخ میں دینی بیداری اور اعتقادی یکجہتی کے لیے کام کیا اور شہر بہ شہر قریہ بہ قریہ پہنچ کر علماء کرام کو حجروں، مدرسوں، خانقاہوں اور مسجدوں کو دینی اور روحانی مراکز بنانے کے لیے تیار کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانا نورانی کی اس مہم میں ملک بھر کے سنی علماء ومشائخ نے آپ کی آواز پر لبیک کہا اور جو علماء صرف نماز، نکاح، جنازہ اور ختم درود تک محدود تھے، وہ علمی جرأت لے کر متحد ہو گئے۔ جو صاحبزادگان اور سجادہ نشین تعویذات، نذرانے اور روحانی مجالس تک محدود تھے، وہ تبلیغ دین پر آمادہ ہو گئے۔

مولانا نورانی ایک شب بیدار عالم دین ہیں۔ وہ سیاست کے طویل سفر میں رات
کے آخری لمحوں تک ملک کے مختلف علاقوں میں سیاسی اور دینی جلسوں میں خطاب
کرتے ہیں مگر مجال ہے کہ وہ نماز تہجد تک قضا کریں۔ ان کے معمولات روحانیہ میں
"دعائے حزب البحر" اور قصیدہ بردہ" آج بھی اسی طرح تازہ ہے جس طرح آج سے
چالیس سال پہلے اپنے والد کے زیر سایہ تازہ تھے۔ وہ زمین کے فرش پر سوتے،
مساکین کے ساتھ بیٹھنے اور غرباء کی محفل میں وقت گزارنے سے نہیں اکتاتے۔

جنرل ضیاء الحق کے زمانہ اقتدار میں میر علی احمد خان تالپور مرحوم وزیر دفاع تھے۔
وہ میر بھی تھے، امیر بھی تھے اور وزیر بھی تھے، مگر ایک دانشور ہونے کی وجہ سے شاہ احمد
نورانی کے علم و فضل کی قدر کرتے تھے۔ ایک وقت آیا کہ جنرل ضیاء الحق کی مخالفت کی
وجہ سے شاہ احمد نورانی سے کبیدہ خاطر تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے ایک دن
اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ جنرل ضیاء الحق نے اکثر مولویوں کو دانہ ڈال
ڈال کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے مگر یہ مولوی نورانی قابو نہیں آیا۔ جنرل ضیاء نے مولانا کو
رام کرنے کے لیے مجھے اشارہ کیا مگر مولانا نورانی نہ میرے قابو آئے نہ ضیاء کی انٹیلی
جنس انہیں رام کر سکی۔ آخر کار جنرل ضیاء نے فیصلہ کیا کہ ایئر مارشل اصغر خان کی طرح
مولانا نورانی کو ان کے گھر میں نظر بند کر دیا جائے۔ میں نے جنرل ضیاء الحق کو بتایا اس
مولوی کو چھوڑ دیں یہ عام لوگوں میں قرآن پڑھتا ہے تو لوگوں کے دل ڈھل جاتے ہیں۔
جب "قصیدہ بردہ" پڑھتا ہے تو میں دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہوں مگر سنا ہے کہ وہ رات کو
"حزب البحر" پڑھتا ہے۔ اس وظیفے کی مار سات سمندروں کی تہوں میں بھی اپنے مخالف
کو نشانہ بناتی ہے۔ یہ سن کر جنرل مرحوم نے مولانا کی نظر بندی کا خیال چھوڑ دیا۔

مولانا کا لباس اسلامی لباس کا نمونہ ہے۔ فقیرانہ لباس ہے، سر پر خس کی بنی ٹوپی
پر گہرا عنابی عمامہ، گلے میں رنگین پٹکا اور ہاتھ میں عصائے عالمانہ۔ وہ جب نورانی
لباس میں نورانی آن بان سے نکلتے ہیں تو ایک درویش مسلمان کی شبیہ سامنے آجاتی

ہے۔ انہوں نے کبھی دولت کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں نہیں مارے۔ وہ زرانہ زی
کے دور میں بھی فقیری کی مثال رہے۔ وہ اسمبلیوں میں رہ کر بھی تہی دست ہیں۔
سیاسی لیڈروں کی دولت مندی کو تو چھوڑیئے، آج اس کے بینک میں زکواتی مولویوں
اور سرکاری سجادہ نشینوں سے بھی کم بینک بیلنس نکلے گا۔ آج جو علماء اپنے آقایان ولی
نعمت کو خوش کرنے کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کی تجوریاں
دیکھ کر سر ندامت سے جھک جاتے ہیں۔

سیاسی ہماہمی کے باوجود مولانا نورانی ملک اور بیرون ملک کی دینی درسگاہوں کی
سرپرستی سے غافل نہیں رہتے اور ان کی ترقی اور استحکام پر نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ ملت
اسلامیہ کے ان فرزندان دین کی بے پناہ قدر کرتے ہیں جو مساجد اور مدارس میں دین
کی تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں۔ وہ دینی مدارس کی تقسیم اسناد کی تقاریب پر پہنچ کر
اساتذہ اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہ ایسے غریب اساتذہ اور طلبہ کی مالی مدد
کرتے اور کراتے ہیں جو دین کی خدمت کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔ میں ایسے
درجنوں علماء کرام کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جو مولانا نورانی کی توجہ سے مدرسے چلا
رہے ہیں۔ مجھے ایسے مفلوک الحال علماء کا علم ہے جو مولانا نورانی کی مالی خدمت کے
مرہون منت ہیں۔

سیاست میں مخالفین حملے کرتے ہیں اور کراتے ہیں۔ پھر آج تو تشدد کا اتنا
زبردست زمانہ ہے کہ اندھیرے قتل ہماری زندگی کا لازمہ بن چکے ہیں۔ مولانا شاہ
احمد نورانی پر ایسے کئی حملے بھی ہوئے قتل کے منصوبے بھی بنے اور قاتلانہ گولیاں بھی
سرسرائیں۔ مگر مجال ہے کہ اس شخص نے کبھی مقدمہ، کبھی استغاثہ، کبھی فریاد اور شکایت
کی ہو، سارے معاملات اللہ کے سپرد ہوتے ہیں اور اللہ حفاظت بھی کرتا ہے اور
حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف انہیں اللہ اپنی پناہ میں رکھتا ہے بلکہ ایسے حملہ آوروں کو ذلیل و
خوار کر دیتا ہے۔

مولانا شاہ احمد نورانی اسلامی تبلیغ و تربیت کے ساتھ ساتھ اپنے مریدوں کی روحانی تربیت سے غافل نہیں ہیں۔ آج بلا مبالغہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر پچیس ہزار سے زائد لوگ آپ سے بیعت ہیں۔ آپ سلسلہ قادریہ اور نورانیہ میں بیعت کرتے ہیں اور اپنے مریدوں کی اصلاح احوال پر مسلسل نظر رکھتے ہیں۔ انہیں سیاسیات کی مصروفیت سے جب بھی وقت ملتا ہے، وہ اپنے مریدوں کو خصوصی توجہ دیتے ہیں اور ان کی اپنی محافل میں قلب و ذکر کی تربیت کرتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان کے بہت سے مریدوں کو جانتا ہوں جن کے اندر بڑی اصلاحی تبدیلیاں آئیں اور وہ تزکیہ نفس سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

(''جہانِ رضا'' جنوری ۲۰۰۴ء)

لاہور کی چھوٹی مسجدوں کے بڑے بڑے علماء

لاہور شہر جہاں باغوں، کالجوں، سکولوں اور استادوں کا شہر رہا ہے وہاں اس کے گلی کوچے چھوٹی چھوٹی مسجدوں سے آباد تھے۔ ان مسجدوں میں ایسے علماء کرام امامت کروایا کرتے تھے۔ جو آج ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ ہم پاکستان بننے سے دس سال پہلے کی بات کرتے ہیں۔ ہمارے استاد محترم مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ، دہلی دروازے کے باہر ایک چھوٹی سی مسجد میں قیام فرماتے تھے۔ وہ مفسر قرآن تھے۔ انہوں نے پندرہ جلدوں میں ''تفسیر نبوی'' تالیف کی تھی۔ یہ تفسیر پنجابی اشعار میں تھی اس تفسیر نے پنجاب کے دیہات میں تہلکہ مچا دیا۔ پنجاب کے ہر گاؤں کا امام مسجد ''تفسیر نبوی'' کا مطالعہ کرتا اور اپنے نمازیوں کی اعتقادی تربیت کرتا تھا۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی، مولانا غلام قادر بھیروی کے شاگرد تھے۔ حضرت پیر عبد الغفار کاشمیری کے مدرسہ سے پڑھے تھے۔ اور مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ اور مرید تھے۔ آپ نے اپنی مسجد اپنی نیک کمائی سے تعمیر کی۔ کسی سے کوئی چندہ یا فنڈ نہیں لیا تھا۔ دہلی دروازے کے باہر سٹی کوتوالی کی دیوار کے ساتھ یہ مسجد بنی تو اسے ''مسجد گھاس منڈی'' کہتے تھے ان دنوں مسجد کے ساتھ مویشیوں کے چارے کی بڑی وسیع گھاس منڈی تھی مولانا نے آہستہ آہستہ دو منزلہ مسجد بنالی۔ اور یہ ''دو منزلی مسجد'' کہلانے لگی۔ اب یہی مسجد بلند و بالا بن کر دہلی دروازے کے باہر پوری شان سے کھڑی ہے۔ اب اس کا نام ''مسجد نبویہ'' رکھ دیا گیا ہے۔ اس مسجد میں طلبہ علماء، اور سالکان طریقت کی تربیت ہوتی تھی۔ یہ مسجد اہل علم و فضل کا مرکز بھی تھی اور تربیت گاہ بھی تھی۔

دہلی دروازے کے باہر جہاں آج ''مسجد میلاد'' ہے۔ یہاں باغ کے کنارے

پر ایک چھوٹی سی مسجد تھی جسے ہم ''باغ والی مسجد'' کہتے تھے۔ اس کے امام ایک اعلیٰ عالم دین تھے۔ نہ تنخواہ لیتے تھے نہ بچوں سے کوئی چندہ وصول کرتے تھے وہ حلال کی روزی کے لیے گھڑیوں کی مرمت کر کے روزی کماتے اور زندگی بسر کرتے تھے مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑا وسیع باغ تھا۔ جہاں ''مجلس احرار، نیلی پوش'' اور خاکسار لیڈر زاینٹی پاکستان جلسے کیا کرتے تھے۔ اور کانگریس کے وظیفہ خور نیشنلسٹ مولوی پاکستان کی تشکیل کے خلاف دھواں دھار تقریریں کرتے تھے۔ وہ قسمیں اٹھا اٹھا کر لوگوں کو یقین دلاتے تھے کہ پاکستان تو کیا کوئی مائی کالال پاکستان کی ''پ'' بھی نہیں بنا سکتا۔

اس باغ کے ساتھ ہی حضرت شاہ محمد غوث قادری رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ اور ساتھ ہی ایک بہت بڑی جامع مسجد ہے۔ کسی زمانے میں مولانا سلطان محمود جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ یہ مولانا گورنمنٹ پرنٹنگ پریس میں پریس مین تھے۔ مگر انہیں انگریزی عہد میں نوٹ بنانے کا ایسا فن آتا تھا کہ ان کے بنائے ہوئے نوٹوں کے سامنے اصل نوٹ بے حیثیت اور کھوٹے نظر آتے تھے۔ وہ نوٹ بناتے مگر خود اپنے تصرف میں نہ لاتے تھے۔ بلکہ غریبوں میں بڑے حیرت انگیز اور خفیہ طریقوں سے تقسیم کیا کرتے تھے۔ وزیر خاں کی مسجد کی صفوں کے نیچے نوٹ پھنسا دیتے دن کو صفیں جھاڑنے والے مزدور ان نوٹوں کو اٹھا کر ''غیبی امداد'' خیال کرتے صبح نماز فجر کے لیے مسجد کو جاتے تو کسی بیوہ عورت کے صحن میں میلے کچیلے کپڑے میں نوٹ رکھ کر پھینک جاتے وہ صبح اٹھتی تو اسے ''غیبی امداد'' جان کر اپنی غربت کو دور کرتی۔ سحری کے وقت کسی مزدور کو ٹوکرا اٹھائے منڈی کی طرف جاتے دیکھتے تو اس کے آگے دور جا کر کپڑے جھاڑتے اور نوٹ زمین پر پھینک دیتے، خود آگے چلے جاتے مزدور اس جگہ آتا۔ گرے ہوئے نوٹ اٹھاتا اور آگے جانے کی بجائے گھر آ کر سکون کا سانس لیتا۔ اسی طرح دور مختلف قصبوں اور دیہاتوں میں نکل جاتے اور طرح طرح کے لوگوں کی خفیہ طریقوں سے خدمت کرتے اور کسی کو بتائے بغیر غریبوں کی امداد کرتے جب ان مولوی صاحب پر مقدمہ چلا تو چودہ سال سزا ہوئی۔

مگر جس دن پاکستان بنا تو تمام قیدی رہا ہو کر اپنے گھروں میں آگئے۔ مولانا اپنے گھر آ کر گوشہ نشین ہو گئے اور بلا تنخواہ شاہ محمد غوث کی مسجد میں جمعہ پڑھانے لگے۔

حافظ محمد عالم (شیخ القرآن والحدیث خطیب دو دروازہ مسجد سیالکوٹ) جن دنوں دارالعلوم حزب الاحناف میں پڑھا کرتے تھے اکبری منڈی میں اعلیٰ والی مسجد میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ مولوی سلطان محمود کی وفات کے بعد آپ شاہ محمد غوث کی جامع مسجد میں خطبہ دینے لگے۔ ان کے سیالکوٹ چلے جانے کے بعد مولانا محمد سعید نقشبندی جو بعد میں داتا گنج بخش کی جامع مسجد میں خطیب بنے۔ مسجد شاہ محمد غوث میں جمعہ پڑھانے لگے۔ مولانا محمد سعید نقشبندی بڑے محنتی مدرس، معلم اور عالم دین تھے۔ انہی کے حجرے میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری، مولانا محمد عبدالنبی کوکب، مولانا اقبال احمد فاروقی، مولانا قیوم الٰہی عرفانی (جو بعد میں شاہی مسجد کے خطیب بنے) اور کئی دوسرے علماء کرام نے ''مرکزی مجلس رضا'' کا خاکہ تیار کیا، اور بنیاد رکھی۔ مولانا محمد سعید نقشبندی داتا گنج بخش کی مسجد میں خطیب بنے تو انہوں نے اس مسجد کو علم وعرفان کا گہوارہ بنا دیا۔ ''کشف المحجوب'' کا درس دیتے ''مکتوبات امام ربانی'' کی تشریح کرتے۔ پھر بہت سی کتابوں کی تصنیف وتالیف کر کے ایک علمی مقام حاصل کیا۔

دہلی دروازے کے اندر ایک ''چنگڑ محلہ'' ہے۔ جس کے اندر حزب الاحناف نے علم و فن کے دریا بہا دیئے! اس محلے کے آغاز میں سید حیدر شاہ صاحب کا گھر تھا۔ سید صاحب بڑے دولت مند تھے۔ ان کے گھر کے اندر ریشم اور کمخاب کے بستر اور پردے ان کے گھر کی رونق کو دوبالا کرتے تھے۔ وہ بڑے شاہ خرچ تھے جس بازار میں چلے جاتے ہزاروں روپے کا سامان لاتے۔ یہ تحریک پاکستان کا زمانہ تھا۔ لیکن سید حیدر شاہ ہمیشہ ہندو سیٹھوں سے چیزیں خریدتے تھے۔ ان کے اس رویہ پر مسلمانوں کو بڑا دکھ تھا۔ مسلمانوں کا ایک وفد سید صاحب کے گھر آیا اور انہوں نے ترغیب دی کہ آپ ہندو سیٹھوں کی بجائے اپنے مسلمان دکان داروں سے سودا سلف خریدا کریں۔ اس وفد

میں ایک گمٹی بازار میں کپڑے کا مسلمان تاجر بھی تھا۔ جس نے یقین دلایا کہ اگر وہ ہمارے بازار میں آئیں تو ان کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ سید صاحب نے وفد کے اراکین کو بتایا کہ ان کے پاس ایک ''عمل'' ہے۔ وہ دن کو جو کچھ خریدتے ہیں رات کے وقت سارے روپے ان کے گھر آجاتے ہیں۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ کسی مسلمان کا نقصان ہو ان حضرات نے آپ کی یہ بات مذاق میں ٹال دی اور اصرار کیا کہ آپ ہم سے سودا خریدیں دکاندار نے کہا کہ آپ میری دکان پر آئیں ایسی کوئی بات نہیں ہو گی سودا اچھا ملے گا۔ روپیہ محفوظ رہے گا۔ سید حیدر شاہ گئے تین ہزار کا کپڑا خریدا روپے دیئے گھر آگئے دکاندار یہ روپے احتیاط کے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔ بیوی کو دیئے تاکید کی کہ انہیں سنبھال کر رکھیں مگر دوسرے دن روپے مانگے تو روپے غائب تھے اس زمانے میں تین ہزار کی بڑی حیثیت تھی۔ مسلمان دکاندار روتا پیٹتا دوستوں کے پاس گیا قصہ سنایا مگر سب حیران تھے اب وہ شاہ صاحب کو کیا کہہ سکتے تھے۔

دہلی دروازے کے بازار میں ''مولوی نیاز علی کی مسجد'' تھی۔ مولوی نیاز علی ''عملیات'' کے بڑے ماہر تھے۔ لوگ تعویذ لے جاتے۔ شفاء پاتے۔ نہ روپیہ لیتے، نہ کسی سے کچھ مانگتے۔ ہم بھی بخار، سر درد اور کئی بیماریوں کے وقت مولوی نیاز علی کے پاس جاتے، تعویذ لاتے، شفاء پاتے، بس کسی مسجد میں ایک جھاڑو رکھنا ہوتا تھا۔

دہلی دروازہ کے بازار کی شمالی گلی میں ایک مسجد میں مولانا عبدالغفور نقشبندی ہزاروی امامت کرتے تھے۔ قرآن پڑھتے تو لطف آجاتا۔ جہاں ہم جمعہ کی نماز سے پہلے خطاب کرتے تھے وہ نماز جمعہ پڑھاتے تھے۔ ان کی آواز اور قرآن سن کر نمازی جھوم جھوم جاتے تھے۔

ان کی مسجد سے تھوڑی دور آگے بڑھیں تو قاری عطاء اللہ صاحب قادری (ان دنوں دبئی ریڈیو پر ''صوت القرآن'' کے انچارج ہیں) کے والد حافظ غلام محمد امامت کرایا کرتے تھے۔ حافظ قرآن تھے اور ان گلی کوچوں میں درجنوں حافظ ان کے شاگرد

تھے۔ حجرے میں رہتے تھے، زمین پر سوتے تھے، قرآن پڑھاتے اور بچوں کو حافظ بناتے، نہ طمع نہ لالچ، مگر جدھر جاتے لوگ جھک کر سلام کرتے۔ حافظ غلام محمد کی مسجد سے تھوڑا سا آگے بڑھیں تو مسجد وزیر خاں کی طرف نکلنے والی گلی کے ایک کونے میں ''مولوی تاج الدین کی مسجد'' تھی لوگوں میں مشہور تھا کہ اس مسجد میں جنات کا پہرا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں حافظ صدرالدین (نابینا) امامت کرایا کرتے تھے۔ ہمارا ان حافظ صاحب سے بڑا رابطہ تھا۔ حافظ صدرالدین پٹیالہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ مگر بلاء کے ذہین تھے وہ نابینا ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ سے ریڈیو ٹرانسسٹر بنا لیتے تھے ہم لوگ ان کے ہاتھ سے بنے ہوئے ٹرانسسٹروں سے ہیڈ فون لگا کر ریڈیو پروگرام سنتے رہتے تھے۔ نہ بجلی، نہ بیٹری کے سیل بس ''سورج مکھی'' کا ایک دانہ ایک کوائل اور ایک ہیڈ فون لگا کر ایریل سے ریڈیو کے پروگرام سن لیتے تھے۔ ان کے بنے ہوئے ٹرانسسٹر ہم دور دراز دیہات میں لیجا کر ریڈیو سنتے رہتے تھے۔ حافظ صدرالدین رات کے وقت اپنی مسجد کے پنکھے اتار کر اندھیرے میں انہیں گریس دیتے، انہیں صاف کرتے اور پھر چھت سے لٹکا کر رواں دواں کر لیتے ان چیزوں کے ساتھ ساتھ دن کے وقت وہ قرآن پاک کے حفظ کی کلاس لیتے اور بچوں کو قرآن پڑھاتے۔ آپ کے بہت سے شاگرد آج بھی مختلف اداروں میں کام کر رہے ہیں۔ تقسیم ملک کے وقت ہمارا زیادہ وقت حافظ صدرالدین کے پاس گزرتا تھا وہ خوش الحان قاری تھے، تجوید پر عبور حاصل تھا قاری فضل کریم نے امرتسر سے آکر جب ''موتی مسجد'' میں مدرسہ ''تحفیظ القرآن'' جاری کیا تو حافظ صدرالدین ان کے نگران تھے۔

مولوی تاج دین کی مسجد سے نکل کر سڑک عبور کریں تو مسجد وزیر خاں اپنے پرشکوہ انداز میں کھڑی نظر آتی ہے۔ اس کے بلند و بالا مینار، محراب و منبر، در و دیوار مغل دور کی نقاشی کا بے مثال نمونہ ہیں۔ یہ اندرون شہر کی عظیم الشان مسجد ہے۔ اس کے خطیب اعظم مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ تھے مگر مسجد وزیر خاں بلند پایہ علمائے کرام کی بدولت لاہور کے مسلمانوں کا دینی مرکز تھی۔ یہاں قاری محمد طفیل نے امرتسر

سے آکر جب بساط تدریس بچھائی تو طلبہ کے جمگھٹے لگ گئے وہ نہایت خوش آواز قاری تھے۔ وہ قرآن پڑھتے تو مسجد کے در و دیوار گونج اٹھتے۔ ہم تراویح پڑھ کر قاری محمد طفیل کے پیچھے کھڑے ہو کر ان کی دلکش آواز میں قرآن سن کر محظوظ ہوتے ان کے زمانے میں مسجد وزیر خاں نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی تھی جب حزب الاحناف کے سالانہ جلسے ہوتے تو سارے پنجاب سے لوگ کھنچے چلے آتے۔

یکی دروازے کے اندر ایک ''حویلی میاں خاں'' تھی اس کی مسجد میں حافظ عبدالعزیز امامت کرواتے تھے۔ حافظ عبدالعزیز کے زیر کمانڈ ایک ٹیم تھی جس میں حافظان قرآن، درویش، اور طلبہ تھے۔ شہر میں جہاں قرآن خوانی ہوتی، ایصال ثواب کی محفل ہوتی یا کوئی اور تقریب ہوتی تو حافظ عبدالعزیز کی ٹیم پوری ذمہ داری سے اہتمام کرتی، حافظ صاحب ختم پڑھتے اور ایصال ثواب کے لیے لمبی دعا کرتے، اور جب کھانے کا وقت آتا تو وہ پلاؤ اور قورمہ کی کئی کئی پلیٹیں کھا جاتے۔ ہمیں خوف آتا کہ یہ کھانا کس طرح ہضم کریں گے۔ حافظ صاحب کا معمول تھا کہ رات کو مصلے پر کھڑے ہو جاتے دو سو نفل ادا کرتے۔ نصف قرآن پاک پڑھتے پھر تہجد کا وقت آجاتا اس کے بارہ نوافل پوری سورتوں کے ساتھ ادا کرتے۔ صبح کی جماعت کرانے کے بعد لاہور کے مختلف مزارات کی زیارت کو نکل جاتے اور کم از کم دس میل پیدل سفر کرتے ہم نے ان کی بسیار خوری کو معاف کر دیا اور شب بیداری کو دیکھ کر ان کے خلاف اپنے جذبات کو ٹھنڈا کر دیا کرتے۔

ہم نے آج کی محفل میں ان علمائے کرام کا ذکر کیا ہے جنہیں ہم نے دیکھا تھا، ملاقاتیں کی تھیں اور ان کے شب و روز کے مشاغل کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا اب قارئین کی مرضی ہے کہ وہ لاہور کی چھوٹی چھوٹی مسجدوں کے ان بڑے بڑے علماء کرام کو جس انداز سے چاہیں دیکھیں۔

(''جہانِ رضا'' فروری، مارچ ۲۰۰۴ء)

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی علماء کے جھرمٹ میں

نماز صبح کے بعد مراقبے میں گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ دروازے کی گھنٹی کی آواز آئی۔ دروازہ کھولا تو افق پر دور سورج ابھرتا ہوا نظر آیا۔ دوسری نظر دیکھا تو سامنے ایک بہت خوبصورت کار کھڑی تھی اس میں سے ایک نورانی شخص نکلا جو سر پر ''تاجِ سمنان'' سجائے تھا۔ یہ حضرت پیر طریقت ڈاکٹر محمد مظاہر اشرف الاشرفی الجیلانی کھڑے ہیں۔ دوڑ کر ہاتھ چومے اور اندر لا کر بٹھایا ہم کبھی حضرت پیر اشرفی کو دیکھتے کبھی اپنے گھر کو!

ڈاکٹر محمد مظاہر الاشرفی الجیلانی ''حلقہ اشرفیہ پاکستان'' کے صدر نشین ہیں۔ وہ سلسلۂ اشرفیہ سے وابستہ پاکستان، ہندوستان اور یورپ کے ہزاروں مریدوں کی تربیت کرتے ہیں۔ کچھوچھا شریف کے وابستگان آپ سے نہ صرف عقیدت رکھتے ہیں بلکہ آپ سے روحانی رہنمائی بھی حاصل کرتے ہیں۔ آپ کو یہ نسبت خانوادہ اشرفیہ سمنان سے ملی ہے۔ ڈاکٹر محمد مظاہر اشرف روحانی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ امراضِ قلب کے ماہر ڈاکٹر بھی ہیں۔ وہ لاہور (شادمان) کراچی اور لندن میں روحانی مجالس قائم کرتے ہیں۔ ماہنامہ ''آستانہ'' کراچی کے چیف ایڈیٹر ہیں اور اس میں روحانی بیماریوں کے علاج پر آپ کا ایک مستقل کالم چھپتا ہے۔ آپ نے اپنے روحانی خانوادے کی کئی کتابیں شائع کر کے تقسیم کی ہیں۔ ہم جب بھی درِ دولت پر دستک دیتے ہیں تو آپ کے مریدوں کا ایک حلقہ آپ کی روحانی مجلس میں موجود ہوتا ہے۔ وہ ہمیں بھی خصوصی توجہ سے نوازتے ہیں اور مختلف موضوعات پر گفتگو کر کے ہماری رہنمائی فرماتے ہیں۔ آج جب وہ ہمارے غریب خانہ پر تشریف لائے تو ہمیں

امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا شعر یاد آیا!

خرم رسیدہ ام شب کہ نگار خواہی آمد
سرِ من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد

مولانا کوکب نورانی کو خدا خوش رکھے۔ وہ لاہور آئے تو ایک جلسے میں خطاب کیا۔ اور ہمیں بھی اپنے ساتھ رکھا۔ وہ مغلپورہ لاہور کے رات کے جلسے میں واقعی کوکب نورانی بن کر چمکے۔ حاضرین نے انہیں تحریروں اور ٹی وی کے مختلف چینلز پر تو سنا تھا مگر آج پہلی بار انہیں اپنے سامنے سن کر جھوم جھوم گئے۔ وہ رات گئے تک اپنے مخصوص انداز میں تقریر کرتے رہے۔ اگر چہ ان کی آواز میں روایتی مقرروں کی طرح گرج اور چمک تو نہ تھی، مگر سامعین کے دلوں پر ''کوکب الدری'' بن کر نور بکھیرتے گئے۔ ہم نے دیکھا کہ تقریر کے دوران مولانا کوکب نورانی کے چہرے پر بیک وقت دس ہزار آنکھیں جمی ہوئی تھیں۔ مگر ان کی زبان سے پھول بکھرتے جا رہے تھے۔

پھولوں کی ہیں ہزار زبانیں مگر خموش
بلبل کا ایک نغمہ مگر گونجتا ہوا!

یہ لاہور کے ایک جلسے کی جھلک تھی۔ ویسے مولانا کوکب نورانی موجودہ دور میں علمائے اہل سنت کی ایک منفرد شخصیت ہیں۔ جو ہر محاذ پر صبح و شام مصروف عمل رہتے ہیں۔ ان کی تقریر کے علاوہ ان کی تحریر نے بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ وہ بدعقیدہ علماء پر ''رضا کے نیزے کی مار'' بن کر حملہ کرتے ہیں مگر جب افکار رضا کا اظہار کرتے ہیں تو ''جوئے نغمہ خواں'' بن جاتے ہیں۔ وہ دنیا کے گوشے گوشے تک پروازیں کرتے رہتے ہیں اور واپسی پر ہمارے قارئین ''جہان رضا'' کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔ وہ شب و روز کام کرتے ہیں اور کام کرتے تھکتے نہیں۔ ہم جب کبھی علمائے اہل سنت کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہماری مجالس میں ان کی یادیں، نسیم بہاری بن کر چلی آتی ہیں۔

مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کے احباب نے ان کی یاد میں الحمراء ہال

لاہور میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ جس میں ملک کے مقتدر اور مایۂ ناز علمائے کرام تشریف لائے اور ان کی علمی خدمات کو ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ ان کے ہمعصر علمائے کرام اور شاگردوں کی کثیر تعداد ہال میں موجود تھی۔ ہمیں ان کی یاد نے آلیا۔ اور ہم نے چشمِ تصور میں دیکھا کہ وہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ''فتاوٰی رضویہ'' کے دفتر کھولے بیٹھے ہیں اور ہماری انگلی پکڑ کر فتاوٰی رضویہ کے ان اوراق پر پھیر رہے ہیں جو ان کی کوششوں سے تخریجات و توضیحات کے ساتھ ۲۸ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ آج دنیائے رضویت کے کئی اہل علم و قلم اعلیٰ حضرت کے علمی اور فقہی کمالات کو سامنے لانے میں مصروف ہیں۔ مگر مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی کی نگرانی میں ''فتاوٰی رضویہ'' جس شان سے مرتب ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔ آج ''فتاوٰی رضویہ'' کی ۲۸ جلدیں فقہی دنیا کی رہنما ہیں۔ جب ہم علمائے کرام کے علاوہ وکلاء اور ججز کی الماریوں میں ''فتاوٰی رضویہ'' کو جگمگاتا دیکھتے ہیں، تو دل خوش ہو جاتا ہے۔ مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ ہماری یادوں میں اپنی تدریسی، علمی اور مسلکی خدمات کی وجہ سے تو دمِ آخر رہیں گے مگر دنیائے علم و فضل میں ''فتاوٰی رضویہ'' کی تدوین ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جو انہیں صدیوں زندہ و تابندہ رکھے گا۔ نور اللہ مرقدہ!

مولانا محمد رفیق مجاہد نقشبندی، آزاد کشمیر کے ایک پہاڑی گاؤں ''کڈھالہ'' میں ''بوستانِ نقشبندیہ'' کی آبیاری کر رہے ہیں۔ وہ ہمارے دوست ہیں لاہور آتے ہیں تو ملاقات سے نوازتے ہیں۔ اپنی کارکردگی سے آگاہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری کی علمی خدمات کو بڑی محبت سے بیان کرتے ہیں۔ ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا (کراچی) کی تالیفات کو عام کرنے میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ''حیاتِ اعلیٰ حضرت'' مولفہ مولانا ظفر الدین قادری چھپی تو مکتبہ نبویہ سے ایک سو سیٹ لے گئے اور آزاد کشمیر کی دور دراز وادیوں میں پہنچاتے رہے۔ وہ نقشبندی ہیں، مگر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب سے محبت، ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا سے رفاقت اور اعلیٰ حضرت

فاضلِ بریلوی کی کتابوں کی تقسیم میں شبانہ روز کام کرنا ان کی مجاہدانہ زندگی کا حصہ ہے۔ پھر ہم جیسے نیازمندوں کو نوازنا ان کی اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کی ذات کے ساتھ محبت کی علامت ہے۔ جب وہ ہماری مجالس میں تشریف لاتے ہیں تو ہم انہیں ''مجاہدِ رضویت'' جان کر علمائے کرام کا مقام دیتے ہیں۔ جب ان کے خوبصورت خط آتے ہیں تو ہم انہیں پڑھ کر باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ انہیں جب ''جہانِ رضا'' ملتا ہے جب تک اسے پڑھ نہ لیں، سونے کا نام نہیں لیتے۔ ادام اللہ تعالیٰ عمرہٗ۔

عزیزم ضیاء الحسن اشرفی، لالہ موسیٰ سے چل کر ایک عرصہ کے بعد ''جہانِ رضا'' کے دفتر میں آ گئے۔ ضیاء الحسن اشرفی، معروف عالمِ دین حضرت علامہ غلام قادر اشرفی کے نواسے ہیں۔ علامہ غلام قادر نے پاکستان بننے کے بعد ساری زندگی لالہ موسیٰ (گجرات) میں گزاری۔ وہ ان بزرگوں میں سے تھے، جن کی گفتگو عالمانہ تھی اور باتیں دلآویز۔ وہ ہندوستان کی ریاست فرید کوٹ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان میں زبردست کام کیا۔ وہ سنی کانفرنس (بنارس) میں ایک متحرک کارکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ پاکستان بنا تو ہجرت کر کے چلے آئے اور ''لالہ موسیٰ'' (گجرات) میں قیام پذیر ہوئے۔ جن دنوں ہم علمائے اہلسنّت کی مجالس میں ایک خدمت گزار کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ تو مولانا غلام قادر اشرفی میر محفل ہوتے تھے۔ انہوں نے سیاسی اور دینی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا۔ پھر بڑے بڑے جلسوں کو خطاب کیا۔ وہ زندگی کے آخری ایام میں ''دیارِ حرم'' کی حاضری میں زیادہ وقت گزارتے۔ مدینہ منورہ جاتے تو حضرت مولانا ضیاء الدین قادری خلیفہ اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کی مجالس میں اپنا وقت گزارتے۔ وہ ان کے نہایت ہی قریبی احباب میں شمار ہوتے تھے ہم ان کی مجالس میں بیٹھتے تو وہ ملکی اور سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ دیارِ حبیب کی یادوں سے ہمارے دل کو باغِ جناں بنا دیتے۔ وہ ہمیں خصوصی نگاہوں میں رکھتے تھے۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری بانی ''مرکزی مجلسِ رضا'' کے

خاص احباب میں سے تھے۔ حکیم اہلسنّت، جب حج کو گئے تو کئی ماہ دیارِ حبیب میں ٹھہرے رہے۔ مولانا غلام قادر اشرفی ان کے رفیق مدینہ تھے۔ اعلیٰ حضرت کے افکار ونظریات پر انہیں بڑی دسترس تھی۔ بات کرتے تو بریلی کی بہاریں سامنے آ جاتیں۔ آج ان کے نواسے ضیاء الحسن اشرفی نے آ کر ان کی یادوں کو تازہ کر دیا۔ ہمیں یوں محسوس ہوا کہ مولانا غلام قادر اشرفی اپنے نواسے کو گود میں اٹھائے۔ ہمارے پاس لے آئے ہیں یا یوں لگا جیسے ضیاء الحسن اشرفی اپنے نانا جان کا دامن پکڑ کر ہمیں سرفراز کرنے کے لیے ''جہانِ رضا'' کے دفتر میں آ گئے ہیں۔

آج ہم علمائے کرام کی یادوں کی محفل سجائے بیٹھے تھے، تو ڈاک آ گئی۔ ہم بیٹھے بیٹھے سیکڑوں علمائے کرام کی یادوں میں گھر گئے اور ''جہانِ رضا'' کے قارئین کے حلقہ خلوص میں شاد کام ہونے لگے۔ بمبئی (انڈیا) سے عزیزِ گرامی زبیر خان قادری اپنے ''افکارِ رضا'' کے دو بنڈل اٹھائے دفتر میں آ پہنچے۔ علامہ ارشد القادری کے پوتے علامہ خوشتر نورانی ''جامِ نور'' کے پچاس جام انڈیل کر چلے گئے۔ حضرت علامہ یٰسین اختر مصباحی دہلی سے چلے اور اپنے ''کنز الایمان'' کی پچاس جلدیں عنایت کر کے غیب ہو گئے۔ مبارک پور انڈیا سے، علامہ مبارک حسین مصباحی اپنے ماہنامہ ''الاشرفیہ'' کے ''سیدین نمبر'' کی چالیس جلدیں لے کر آئے اور دیکھتے دیکھتے غیب ہو گئے۔ ہم نے پکارا تو جاتے جاتے اپنی خوبصورت کتاب ''افتراق بین المسلمین کے اسباب'' عنایت فرماتے ہوئے کہنے لگے اب اس کی پانچ ہزار جلدیں چھپوا کر پاکستان میں تقسیم کریں۔ لوگ مجھے بار بار تقاضوں سے نوازتے رہتے ہیں۔ حضرت علامہ حبیب البشر خیری رنگون سے پرواز کرتے ہوئے تشریف لائے۔ ''تحفہ درود شریف'' کی نہایت ہی خوبصورت ایک جلد عنایت فرمائی اور فرمانے لگے کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کا تحفہ ہے اسے اہلِ محبت تک پہنچاؤ۔

ان سارے علمائے کرام کی کرم فرمائیاں اور ''جہانِ رضا'' کے قارئین کے خطوط

ہم پر بارانِ رحمت بن کر برستے رہے اور ہم ان کی یادوں کی خوشبو سے دل و دماغ کو معطر کرتے رہے۔ ابھی ہم ان خطوط کے مطالعہ سے سرشار ہی تھے کہ گھنٹی بجی اور ہماری جیب کا ''ہدہدِ رنگیں نوا'' یادِ مدینہ لایا۔ مدینہ پاک میں ہمارے ایک دوست حکیم محمد عارف ضیائی مدنی شہرِ محبت میں تیس سال سے قیام پذیر ہیں۔ وہ تین سال تک شہرِ محبت کی جیل میں رہنے کے بعد کراچی پہنچے تھے اور ہم سے بات کر رہے تھے۔ حکیم محمد عارف ضیائی ''مرکزی مجلسِ رضا'' کے بانی حضرات میں سے ہیں۔ وہ ''مجلسِ رضا'' کے پہلے صدر تھے۔ انہوں نے حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے ساتھ کئی سال کام کیا اور اعلیٰ حضرت کے پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔ آج تیس سال ہو گئے ہیں مدینہ منورہ میں پہنچے۔ مولانا ضیاء الدین قادری خلیفہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی تربیت میں ایک عرصہ گزارا۔ ان کے وصال کے بعد ان کے بیٹے حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے پھر مدینہ پاک میں ''کوچۂ جاناں'' میں ایک آشیانہ بنا کر بسر اوقات کرتے رہے ہر ماہِ رمضان میں وہ بارگاہِ رسول میں اپنا دستر خوان بچھاتے اور اہلِ محبت کو افطاری کرواتے۔ ہم ان کے دستر خوان پر حاضر ہوتے تو اپنے پہلو میں بٹھا کر افطاری کرواتے۔ جب ہم جدا ہوتے تو ''خصوصی انعامات'' سے نوازتے۔ اگرچہ وہ ایک طویل عرصہ تک دیارِ حبیب میں رہے۔ مگر آخرکار نجدیوں نے ان کی محبت رسول کو ''شرک و بدعت'' کا نام دے کر پس ''دیوارِ زنداں'' رکھا۔ آج آزاد ہوئے تو کراچی سے ان کی آواز آئی۔ ان کی یادیں تازہ ہو گئیں اور ہم ان کی یادوں کی خوشبوئیں اپنے قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔

آنے والو! یہ تو بتاؤ شہرِ مدینہ کیسا ہے؟

سر اُن کے قدموں میں رکھ کر جھک کر جینا کیسا ہے؟

میاں جمیل احمد شرقپوری پیرِ طریقت ہیں۔ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کی عظیم خانقاہ شیر ربانیؒ [illegible]ر شریف کے سجادہ نشین ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی علمی اور

روحانی خدمات سرانجام دینے میں گزاری۔ خصوصاً حضرت مجدد الف ثانی کے افکار و نظریات کی اشاعت میں مؤثر انداز میں کام کرتے رہے۔ وہ خانقاہ سے نکل کر میدانِ سیاست میں آئے تو ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ مولانا الشاہ احمد نورانی مرحوم کی قیادت میں ''جمعیت العلماء پاکستان'' کے جھنڈے تلے ''نظامِ مصطفیٰ'' کے لیے بڑا کام کیا۔ ''تحریکِ نظامِ مصطفیٰ'' میں صفِ اول میں کھڑے تھے۔ انتخابی میدان میں نکلے تو انہیں قوم نے ووٹ بھی دیئے اور ''عقیدت کے نوٹ'' بھی نچھاور کیے۔ قید و بند میں رہے تو جیل خانے کو روحانیت کی خوشبوؤں سے معمور کر دیا۔ انہوں نے اپنے تین بیٹوں کی اچھے انداز میں تربیت کی۔ ایک پیر بنا تو ساحل سمندر سے لے کر کوہ قراقرم کی وادیوں تک مریدوں کا حلقہ قائم کرتا گیا۔ ایک میدان سیاست میں اترا۔ تو پنجاب اسمبلی کا جاندار رکن بنا۔ ایک تجارت میں نام پیدا کرنے کے بعد اٹھا تو بڑے بڑے سیاسی بتوں کو گرا کر قومی اسمبلی کا رکن بنا۔

میاں جمیل احمد شرقپوری نے ایک طویل عرصہ علالت میں گزارا۔ اب وہ بڑھاپے کی وادی سے گزر رہے ہیں مگر ان کی ہمت کا یہ عالم ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات کو مربوط کرنے کے لیے علماء کی محفلیں سجاتے ہیں اور حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات کو عام کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ آپ نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی تعلیمات پر اہلِ علم و قلم سے کئی کتابیں لکھوائیں اور سلسلہ مجددیہ کی کتابوں کے ترجمے کروا کر مفت تقسیم کیے۔ آپ نے اپنے روحانی حلقے میں سلسلۂ مجددیہ کی تربیت کرتے ہیں۔ آپ کا رسالہ ''نورِ اسلام'' پچاس سال ہوئے جاری و ساری ہے۔ ''شیرِ ربانی ڈائجسٹ'' انگریزی میں نکالتے ہیں۔ ''حوزۂ نقشبندیہ'' میں دورِ حاضر کے نقشبندی اور مجددی حضرات کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ میاں جمیل احمد شرقپوری ایک بے نیاز پیر ہیں۔ وہ بے اعتنائی پر آئیں تو کروڑ پتی مریدوں کو دروازے کے باہر کھڑے ہونے کا حکم دیں۔ نوازنے کو آئیں تو ہم جیسے فقیر ب...

ے گھروں پر علی الصبح ''چھاپے'' مار کر خوش کر دیں۔ ہم نے انہیں زندگی کا طویل سفر
کرتے دیکھا ہے۔ وہ روایتی سجادہ نشینوں کی طرح دنیا داروں کے پیچھے کبھی نہیں
بھاگتے اور نہ ہی وہ اہلِ علم سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کی شام
آتے دیکھی تو اپنی لاکھوں روپے کی نادر کتابیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو بخش
دیں۔ وہ اکثر علمائے کرام اور سکالرز کی مجالس میں بیٹھتے ہیں اور حضرت مجدد الف ثانی
کی تعلیمات پر لکھنے کے پروگرام دیتے جاتے ہیں۔ کیا آپ کو ایسا پیرِ طریقت پسند آیا؟

چلے تو راہِ طریقت کا شاہسوار لگے
رُکے تو ''شیرِ ربانی'' کا شاہکار لگے

(''جہانِ رضا'' اگست، ستمبر ۲۰۰۴ء)

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا محمد نبی بخش نقشبندی المتخلص بہ حلوائی لاہوری قدس سرہ العزیز (م ۱۹۴۴ء) انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے دوران قطب الارشاد شہر لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کی اور ایک سنی العقیدہ جید عالم دین کی حیثیت سے علمی دنیا میں متعارف ہوئے۔ ایک قادر الکلام پنجابی شاعر کی حیثیت سے شہرت سخن وری پائی۔ ایک مفسر قرآن حکیم کی حیثیت سے اہل علم وفضل سے داد وتحسین حاصل کی۔ اپنی نظریاتی اور ناقدانہ طرز نگارش میں ممتاز ہوئے۔ تبلیغی مساعی کی وجہ سے پنجاب بھر میں تبلیغی فرائض کو سرانجام دیتے رہے۔ سادہ بود و باش کی وجہ سے فقیر بے نوا بنے اور ریاضت ومجاہدہ کی بنا پر سلسلہ نقشبندیہ کے مشائخ عصر سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ایک مدرس، معلم، مفسر اور سالک راہ طریقت ہونے کی وجہ سے ہزاروں شاگردوں، متعلموں، قارئین، مریدین اور عقیدت مندوں کے ممدوح ومحبوب رہے۔

۱۹۳۷ء میں حضرت مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی درسگاہ دور و دراز کے طلبہ کو دعوت علم دے رہی تھی۔ دہلی دروازے کے باہر کوتوالی کی شمالی دیوار کے ساتھ آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی جو دو منزلہ ہے۔ یہی مسجد آپ کی خانقاہ تصوف تھی، درسگاہ طلبہ تھی، ادارۂ تصنیف وتالیف تھی اور مرکز رشد وہدایت تھی۔ اس درسگاہ میں ان دنوں تقریباً تیس طلبہ علم دین حاصل کرتے تھے۔ سیکڑوں علماء کرام ملاقات کو آتے۔ دینی موضوعات پر گفتگو کرتے۔ آپ کے خیالات سے بہرہ اندوز ہوتے۔ ذکر وفکر کے رسیا اسی مسجد کی راتیں زندہ رکھتے اور صبح کی نماز کے بعد حضور پرنور پر درود کا حلقہ

ہوتا جس میں طلبہ وعلماء، مسافر و درویش، فقیر و امیر، مہمان و میزبان سب شریک ہوتے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت کی مجلس میں بیٹھنے والے لوگ فقیر بھی تھے اور بے نظیر بھی۔

ع تیری محفل میں بیٹھنے والے آدمی بے نظیر ہوتے ہیں!

حضرت مولانا کی خالی از تکلف اور سادہ زندگی ایک فقیر بے نظیر کی مثالی زندگی تھی۔ مجلس میں بیٹھتے تو امتیاز کہ و مہ نہ ہوتا۔ خود گفتگو کم کرتے مگر لوگوں کو بات کرنے کا زیادہ موقع دیتے۔ لباس عامی، قصوری لنگی، سفید ململ کا کھلا کرتا، سر پر سفید درویشانی ٹوپی، نرم اور سرخ کھال کی گامے شاہی جوتی، لوگ دور دور سے آتے، علوم و اسرار کی جھولیاں بھر کر اٹھتے۔ سالکان طریقت روحانی تربیت پاتے۔ علماء مسائل اعتقادیہ پر گفتگو کرتے۔ طالب علم "قال اللہ و قال الرسول" کی دولت سے مالا مال ہوتے۔

۱۹۳۹ء میں آپ "تفسیر نبوی پنجابی" کی پندرہ مبسوط جلدوں کی تالیف اور طباعت سے فارغ ہو چکے تھے اور بعض حصوں کے کئی کئی ایڈیشن زیور طبع سے آراستہ ہو کر پنجاب بھر میں پھیل چکے تھے۔ یہ تفسیر ایک طرف علم و فضل کا خزینہ تھی، پنجابی شاعری کا ایک ذخیرہ تھی، دوسری طرف اپنے دور کے دینی فتنوں اور اعتقادی ناہمواریوں کا جواب تھی۔ آپ نے نظریاتی اختلافات کو ہوا دینے والے مولفین کا بڑا زوردار جواب دیا۔ تفسیر محمدی پنجابی کے مباحث کو رد کیا۔ دل پذیر کے نظریات پر تنقید کی۔ تفسیر نعمانی پر گرفت کی۔ علماء دیوبند کے نظریات کی چھان پھٹک کی، فتنہ مرزائیت کے جواب میں کتابیں لکھیں اور نیچری تاویلات کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ تفسیری کارناموں سے ہٹ کر آپ نے بعض مسائل پر مستقل کتابیں لکھیں جو ہزاروں کی تعداد میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر اہل علم کے مطالعہ میں آئیں۔ صحابہ کرام کی ذات بابرکات کو ہدف تنقید بنانے والے رافضی خصوصاً حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے شیعوں کے جواب میں النار الحامیہ لمن ذم المعاویہ لکھی۔ اسمٰعیل دہلوی

کے عقائد کے رد میں "شموس الوہابیہ" لکھی۔ مساجد میں فتنہ برپا کرنے والے وہابین کے خلاف "اخراج الوہابین من المساجد المسلمین" لکھی۔ نبی مکرم کے درود پاک کے منکرین اور مانعین کے جواب میں "اظہار انکار المنکرین من الصلوٰۃ المحببین" لکھی۔ پھر اہل محبت اور خلوص کے دلوں کو حضور نبی مکرم ﷺ کے درود پاک کی اہمیت اور فضیلت سے روشن کرنے کے لیے کتاب "شفاء القلوب" پنجابی شعروں میں لکھی۔ نعتوں کے کئی مجموعے لکھے۔ پنجابی، فارسی، عربی اور اردو میں مولود شریف، مناقب اور حمد و ثناء پر بہت سے رسالے لکھے۔

۱۹۴۰ء کے اوائل میں آپ کے سامنے نظریاتی مباحث پر دو کتابیں آئیں۔ ایک "انوار آفتاب صداقت" جسے فضل احمد انسپکٹر لودھانوی نے لکھا اور طبع کرایا۔ اور دوسری کتاب "جاء الحق و زہق الباطل" جسے مفتی احمد یار خاں صاحب نعیمی قدس سرہ (مولف تفسیر نعیمی) نے گجرات سے شائع کیا۔ یہ دونوں کتابیں دیوبندی نظریات کا زبردست جواب تھیں اور اہل سنت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ایک کامیاب کوشش تھی۔ حضرت مولانا ان دونوں کتابوں سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ دونوں فاضل مولفین کے پاس خود سفر کر کے گئے، ہدیہ تبریک پیش کیا، داد و تحسین دی، حوصلہ افزائی کے لیے کئی کئی جلدیں خرید کر عوام میں تقسیم کیں پھر یہ محسوس کیا کہ تمام اختلافی امور پر ایک مبسوط اور بھرپور کتاب لکھنے کی ابھی ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ نے "الامتیاز بین الحقیقت والمجاز" کا مسودہ تیار کرنے میں کئی سال وقف کر دیے۔ ہزاروں حوالے کی کتابیں سامنے رہیں اور کم از کم دو سو اختلافی مسائل کو نظریات کا تقابلی جائزہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس مفید کتاب کا تقریباً تین ہزار صفحات پر پھیلا ہوا مسودہ ابھی تک اشاعت پذیر نہیں ہو سکا۔

تصنیف و تالیف کی دنیا سے ہٹ کر آپ نے ایک سالک طریقت کی حیثیت

سے وقت کے مشائخ کی خدمت میں تربیت حاصل کی۔ معمولات اولیاء کو اختیار کیا۔ مجاہدہ وریاضت کی منزلیں طے کیں۔ اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری ہاشمی، خلیفہ خاص حضرت دائم الحضوری رحمۃ اللہ علیہما سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ ان کے وصال کے بعد حضرت پیر سید جماعت علی شاہ ثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے زانوئے عقیدت تہ کیا، منازل سلوک طے کیے اور پھر خرقہ خلافت حاصل کیا۔ یہ دونوں مشائخ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کی معروف شخصیتیں تھیں۔ ان حضرات کا روحانی فیضان مولانا محمد نبی بخش حلوائی کی زبان قلم کی وساطت سے ہزاروں طالبان حق تک پہنچا۔ سیکڑوں مریدوں نے، آپ کے زیر نگاہ رہ کر تربیت حاصل کی، مقامات سلوک طے کیے۔ شب بیداری، قیام اللیل، کثرت درود اور معمولات اولیاء نقشبند کی نعمت حاصل کی۔ آپ کے شاگردوں نے نہ صرف اعتقادی اور نظریاتی پختگی حاصل کی بلکہ محبت رسول اور عشق مصطفیٰ کی نورانیت سے اپنے سینوں کو منور کرتے رہے۔

آپ لاہور کے ارائیں خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لاہور شہر کے اندر جہاں ان دنوں اکبری منڈی ہے، آپ کا اپنا مکان تھا۔ نولکھا کے مواضعات میں زمین تھی۔ دریا کے کنارے پر بہت سے کنویں تھے۔ آپ نے ابتدائی دور میں پیشہ ''حلوہ سازی'' اختیار کیا۔ علم دین حاصل کیا۔ آپ کے دوسرے بھائی (مہر قادر بخش) کھیتوں میں سبزیاں اگاتے، شہر لاتے اور بیچتے۔ آپ حلوہ بناتے، لوگوں کو کھلاتے۔ کھلاتے کھلاتے اللہ اور رسول کی باتیں سناتے۔ عام لوگوں میں بیٹھ کر مسائل دین ذہن نشین کرتے۔ مخلوق خدا مانوس ہوتی۔ حلوہ خورانی اور شیریں بیانی، دونوں شکم و قلب کو مطمئن کرنے والی چیزیں تھیں۔ پیٹ کی بھوک اور دل کی بے چینی کا علاج تھا۔

نگاہ کے تیر سے گر بچ گیا شکار کوئی تو بڑھ کے زلف نے اس کو اسیر دام کیا

آپ کی دکان سے حلوہ کھانے والے اور ساتھ ساتھ محبت رسول میں ڈوبی ہوئی

باتیں سننے والے آج تک حضرت حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے انداز گفتگو کو یاد کرتے ہیں۔

دکان سے جو بچتا، گھر کے مختصر اخراجات میں کام آتا یا کتابوں کی اشاعت میں صرف ہو جاتا۔ پھر آپ نے اپنے حصہ کی زمین اور باغات بیچ کر اللہ کا گھر بنا لیا۔ ایک وقت آیا کہ مکان بیچ کر تفسیر نبوی کی اشاعت میں روپیہ لگا دیا اور تفسیر پنجاب کے دیہات اور قصبوں میں بانٹ دی۔ زمین بیچی، اللہ کا گھر بنا لیا۔ مکان بیچا، اللہ کا کلام چھپوایا اور تقسیم کر دیا۔

ع یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کے لیے

آج کوئی ایسی مثال ڈھونڈیں لاہور کے زمینداروں میں، آرائیوں میں، عالموں میں، پیروں میں، حتیٰ کہ عصر حاضر کے فقیروں میں۔ میں اس زمانے میں بھی حضرت کی مجالس میں رہا، ان حالات کا عینی شاہد رہا۔ ان محافل کا خاموش مبصر رہا۔ میں نے علماء کرام کو آپ کے پاس آتے دیکھا اور حضرت کے سامنے علمی مباحث میں مصروف پایا۔ مشائخ کو دیکھا تو حضرت کو ان کی پابوسی پر مفتخر پایا۔ نعت خوانوں کو دیکھا تو آپ کی مجالس کو مجلس ذکر سے بھرپور پایا۔ وظیفہ دل کے متوالوں کو آپ کے حلقہ درود پاک میں محو پایا۔ شب بیدار مسجد کے در و دیوار کو زندہ رکھتے اور واعظانِ خوش بیان مسجد کے محراب و منبر کو آباد رکھتے۔

آپ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک کی کثرت سے، قلب و جگر میں جو کیفیتیں پائیں، آپ کے خامۂ محبت نے پنجابی شعروں کی زبان میں بیان کر دیں۔ قرآن و احادیث سے استدلال کیا کہ حضور کی بارگاہ میں درود پیش کرنا ہی ایمان کی جان ہے۔ درود کے متعلق احکام شرعیہ کی وضاحت کی۔ درود پاک کے فضائل بیان کیے۔ درود پاک کے آداب بیان کیے، پھر اہل ایمان کے دلوں پر درود پاک کے جو تاثرات مرتب ہوتے، جو کیفیتیں قلب و جگر کی زینت بنتیں، انہیں لطیف حکایات میں بیان

کیا۔ آپ نے اپنے آقا و مولا کی نعت و ثنا میں ڈوب کر اپنے قارئین کو دعوت مطالعہ دی ہے۔ بعض مقامات پر تو مولف علام، پنجابی ادب کے موتی رولتے جاتے ہیں اور پھولوں کی لڑیاں دربار مصطفیٰ میں نچھاور کرتے جاتے ہیں۔

نبی کریم کی کائنات ارضی پر آمد آمد ہے۔ میلاد مصطفیٰ کے انتظار میں آپ زمین کے گوشے گوشے اور ذرے ذرے کو چشم براہ پاتے ہیں اور پھر پنجابی زبان میں کیا منظر کشی کرتے ہیں:

کھل گئے در فلک دے خوشی ملائک کردے
ہشت بہشت سنگار کیتو نے بھاگوں خیر بشر دے

بدل چڑھے بہار فصل دے وسے مینھ کرم دے
گرد غبار زمین دی بیٹھی وقت گئے پھر غم دے

جھاڑو دے کے باد صبا نے دور کیتے ککھ کنڈے
فراش فضل دے فرش وچھائے مخمل سبز سوہندے

باغ بہار شگوفے ڈالیاں خوش رنگ نکلے سارے
سوہے، ساوے، سبز، سنہری، پھل دیون چمکارے

سن کے عید بہار درختاں سبز پوشاک لگائی
سرو اتے ہُو ہُو دی بنسری قمری آن وجائی

رکھے تاج درختاں سر تے وچھیا تخت پھلاں دا
کر کے صفاں کھلے رکھ تکدے سارے راہ جن دا

انگوراں سر سجدے تے ویلاں سیس نوائے
شاخاں میوہ دار درختاں سبھناں ادب کمائے

باد نسیم معطر ہو کے گلاں پھلاں وچ آئی
ہووے مبارک آ گھر گھر ہن گزریاں وقت جدائی

تارے جھک آئے ول دھرتی تے وسدے او گھنارے
چن سورج سائبان بنایا، موتی جڑ کے تارے

یہ جذبات، عشق و محبت کے بغیر بیان نہیں کیے جا سکتے۔ یہ مسرت دلی عقیدت کے بغیر سامنے نہیں آ سکتی۔ یہ انداز وجدان محبت کے بغیر اپنایا ہی نہیں جا سکتا۔

(''جہانِ رضا'' جنوری ۲۰۰۵ء)

علماء کرام کی لطیف یادیں

مولانا قیوم الٰہی عرفانی (م:۱۹۹۱-۱۲-۲۹):

اپنے دوست تھے، عالم تھے، فاضل تھے، ذہین تھے، فطین تھے۔ جب گفتگو کرتے تو دانشور معلوم ہوتے۔ بات بڑی پختہ کرتے۔ ایک زمانہ میں وہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کی شاہی مسجد لاہور کے خطیب تھے۔ ان کی وساطت سے ہمیں بھی شاہی مسجد میں آنے جانے کا موقع ملتا۔ بادشاہی مسجد کے درودیوار ہمیں اپنی گود میں لے لیتے اور اس کے محراب و منبر ہمیں اہلسنّت کے ان خطیبوں کی یاد دلاتے جو اورنگ زیب کی زندگی سے لے کر مولانا قیوم الٰہی عرفانی کی خطابت تک محراب و منبر کی زینت بنتے رہے تھے۔

مولانا قیوم الٰہی عرفانی اگرچہ تقریر اور خطاب میں اتنے معروف نہیں تھے مگر مولانا غلام مرشد جب اپنے شاگرد بھگوان مسعود کھدر پوش، ''چیف آف اوقاف'' کے ہاتھوں برخاست کیے گئے تو مولانا عبدالرحمٰن جامی کی چند روزہ خطابت کے بعد ہمارے دوست مولانا عرفانی صاحب خطیب شہر بن کر بادشاہی مسجد کی مسند ارشاد پر جلوہ فرما ہوئے۔

مولانا قیوم الٰہی عرفانی ہمارے بچپن کے دوست تھے ہم ان کے پاس اکثر آتے جاتے تھے اور پاکستان کی سب سے بڑی مسجد کی رونقیں دیکھتے۔ کبھی مینار پر کھڑے ہو کر سارے لاہور کو پاؤں تلے دیکھتے، کبھی عیدین کے خطبے کے دوران ان لاکھوں نمازیوں کا نظارہ کرتے جنہیں مولانا قیوم الٰہی عرفانی اپنے خطاب سے نوازتے تھے۔

مولانا قیوم الٰہی عرفانی اپنے پیش رو خطباء کی طرح اپنے اڑھائی سالہ دور خطابت میں کوئی دینی علمی یا اعتقادی کارنامہ سرانجام تو نہ دے سکے مگر اللہ کی شان وہ شاہی مسجد کے خطیب رہے۔ ہمیں ان کے پاس آنے جانے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ اگرچہ مولانا

عرفانی اڑھائی سال عالمگیری مسجد کے خطیب رہے۔ مگر اس دوران سنی علماء کرام نے شاہی مسجد کی خطابت کے لیے بڑی درخواستیں دیں۔ بعض حضرات نے تو ان کے خلاف شکایات بھی جمع کروائیں۔ وہ اس صورت حال کو دیکھ کر بڑے پریشان تھے وہ ہمارے پاس آتے تو علماء کا شکوہ کرتے اور اپنے برادران یوسف کا گلہ کرتے دوسری طرف اوقاف کے افسران بھی انہیں ڈراتے دھمکاتے رہتے وہ وظائف اور اوراد کو اپنے معمولات زندگی کا حصہ جانتے تھے وہ ان وظائف کو پڑھ کر وقت گزارتے، ہم نے بھی ان کی دفتری پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے ایک وظیفہ بتایا اور افسروں کو رام کرنے کا ایک ورد انہیں سکھا دیا اور ہدایت کی کہ جب وہ جابر افسروں کے پاس جائیں تو یہ ورد پڑھ لیا کریں، مگر تسبیح الٹی پھیرا کریں۔

ایک دن دوڑے دوڑے آئے اور کہنے لگے۔ فاروقی صاحب! آج مجھے ''چیف آف اوقاف مسعود بھگوان کھدر پوش'' نے بلایا تھا۔ میرے سامنے ایک فائل رکھ دی جس میں چالیس درخواستیں شاہی مسجد کی خطابت کے لیے آئی تھیں ان درخواستوں میں میرے کئی اپنے دوستوں کے نام بھی تھے۔ میں کانپ اٹھا مگر ورد پڑھتا گیا تسبیح الٹی پھیرتا گیا چند لمحوں بعد بھگوان گرجا ''عرفانی صاحب! پرواہ نہ کریں ان میں سے ایک مولوی بھی شاہی مسجد کی خطابت کے لائق نہیں تم ڈٹے رہو'' یہ واقعہ سنا کر عرفانی صاحب بے پناہ ہنسے اور کہنے لگے آپ کی الٹی تسبیح کا نتیجہ ہے ورنہ میں آج مارا گیا تھا ہم یہ واقعہ اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ محکمہ اوقاف کی مساجد خصوصاً شاہی مسجد اور داتا گنج بخش کی خطابت کرنا کتنا دشوار کام ہے۔ یہاں کے خطیبوں کو بچ بچ کر چلنا پڑتا ہے لوگ ہاتھ تو چومتے ہیں مگر خطیب تلوار کی دھار پر چلتے ہیں۔

مولانا قیوم الٰہی عرفانی ہر سال حج پر جایا کرتے تھے ایک سال جنرل ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ جس نے پہلے حج کر لیا ہے وہ حج پر نہیں جائے گا۔ مولانا عرفانی صاحب نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر اجازت نہ ملی۔ حتیٰ کہ وہ اسلام آباد جا پہنچے اور

جنرل ضیاء الحق سے ملے اور حج کے لیے گزارش کی مگران کی گزارش کو سختی سے مسترد کر دیا گیا۔عرفانی صاحب ہانپتے کانپتے ،افتاں وخیزاں گرتے پڑتے لاہور آئے ۔ہمارے پاس پہنچے ،دریدہ دل کے ٹکڑے دکھانے لگے ،رونے لگے اور جامی کا شعر سنانے لگے:

ز مہجوری بر آمد جانِ عالم ترحم یا نبی اللہ ترحم!

ہم نے تسلی دی اور دعا کی اور جواباً جامی کا ایک شعر سنایا:

نہ آخر رحمة للعالمینی ''زعرفانی'' چرا فارغ نشینی

چلے گئے ،گم ہو گئے ۔کراچی کے ایک تاجر نے انہیں بحری جہاز پر ملازم بنا کر جدہ پہنچا دیا۔مکہ پہنچے ،مناسک حج ادا کیے ۔میدانِ عرفات میں گئے تو اپنے خیمے میں بیٹھنے کی بجائے جنرل ضیاء الحق کو سلام کرنے چلے گئے ۔جنرل ضیاء الحق نے دیکھا تو خوش ہو کر مرحبا کہا اور کہا آپ کو بھلا کون روک سکتا ہے!واپس آئے مجھے واقعات سناتے گئے اور دل خوش کرتے گئے ۔

اشک سچے ہوں تو کبھی ضائع نہیں جاتے
میری پلکوں سے گرے ان کے قدم تک پہنچے

مولانا عرفانی صاحب بڑے خوش باش عالم دین تھے ۔علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ان کے ایک بھائی مولانا وجیہ السماء عرفانی سلسلہ چشتیہ قدوسیہ کے پیر طریقت تھے ۔ان کے ایک اور بھائی ملیک الرحمٰن داتا صاحب کی مسجد میں ''کشف المحجوب'' کا درس دیتے اور مسجد شمس عقب مال روڈ میں خطابت فرماتے تھے ۔ان کے ایک اور بھائی مولانا عزیز اللہ دینہ ضلع جہلم میں بے مثال خطیب تھے ۔آپ کے چچا انوار الٰہی دار العلوم نعمانیہ لاہور میں ایک عرصہ تک شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے ۔

شاہی مسجد کی خطابت سیاسی علماء اور ملک کے سیاسی لیڈروں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے ۔جو سیاستدان اقتدار کی اونچی کرسی پر بیٹھتا ہے اپنی مرضی کے عالم دین کو شاہی مسجد کی خطابت دیتا ہے ۔اگرچہ اس زمانے میں ''خطبہ بنام شہنشاہِ والا جاہ'' نہیں دیا

جاتا۔مگر وقت کا ہر حکمران یہ چاہتا ہے کہ اس کی بداعمالیوں کا تذکرہ شاہی مسجد کے محراب و منبر پر نہ ہو۔

شاہی مسجد لاہور کے اڑھائی سالہ دور خطابت کے بعد مولانا عرفانی جامع مسجد حضرت شاہ جمال لاہور کے خطیب بن گئے اور تاحیات وہاں خطیب رہے ۔ہم مولانا قیوم الٰہی عرفانی کی علمی و اعتقادی خدمات پر روشنی تو نہیں ڈال سکے مگر ہمیں اللہ کی فیاضی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ کس طرح گمنام گاؤں کے گمنام بچے کو اٹھا کر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی شاہی مسجد لاہور کا خطیب بنا دیتا ہے ۔وہ جب ذرے کو آفتاب بناتا ہے تو آفتاب و ماہتاب منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

مولانا احمد دین درگاہی رحمۃ اللہ علیہ:

پاکستان بن رہا تھا۔ہم ان دنوں ہارون آباد بہاولنگر (ریاست بہاولپور) کے ایک مدرسہ تعلیم الاسلام میں فارسی ادب کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے ۔نواب آف بہاولپور نے ہارون آباد میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی ۔اس مسجد کے خطیب لبیب حضرت مولانا احمد دین درگاہی تھے مولانا درگاہی دار العلوم حزب الاحناف لاہور کے فاضل تھے اور علامہ ابو البرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے ۔خطابت میں شہرۂ آفاق تھے اور تدریس میں مانے ہوئے مدرس تھے ۔آپ نے ہارون آباد کی اس مسجد کی خطابت کے دوران اسے تعلیم و تدریس کا مرکز بنا دیا۔ ایک دار العلوم قائم کیا۔حفظ و ناظرہ کے شعبے قائم کیے ۔درسِ نظامی میں طلبہ کی تعلیم کا نظام قائم کیا۔اعلیٰ مدرس مقرر کیے اور اس طرح ہارون آباد کو دینی علوم کا گہوارہ بنا دیا۔ مولانا درگاہی اعتقادی اور نظریاتی طور پر بڑے ہی حساس تھے ۔انہوں نے اس بڑی مسجد کو اعتقادیات کی تربیت گاہ بنا دیا۔ جلسے ہوتے تو ملک کے نامور خطیب آتے ۔ جلوس نکلتے تو سارا ہارون آباد صف بستہ ہو جاتا۔جشن عید میلاد النبی ،شب معراج اور دوسری دینی تقریبات کی رونقیں دوبالا ہو جاتیں ۔مولانا درگاہی علاقہ کے زمینداروں

اور شہر کے تاجروں کو دینی کاموں میں تعاون کرنے کی ترغیب دیتے۔ وہ مسجد کے محراب و منبر میں باجبہ و دستار بیٹھتے۔ تدریس کی مسند پر باوقار استاد کی حیثیت سے براجمان ہوتے۔ درس کے اساتذہ اور شاگردوں پر مشفقانہ نگاہ رکھتے تھے۔

ہم طالب علم کے حیثیت سے ''خوشہ ی چیدیم ہر جائے کہ خرمن یافتیم'' مولانا کی مجلس میں آتے جاتے تھے۔ مولانا درگاہی بھی شفقت فرماتے اور اپنی مجالس میں خصوصی جگہ دیتے۔ اپنے جلسوں میں مدعو کرتے اور اپنے جلوسوں میں جھنڈا اٹھا کر چلنے کا حکم دیتے۔ مولانا ریاست بہاولپور میں ہر تحریک کے علمبردار ہوتے تھے۔ عوامی جلوسوں کی قیادت کرتے جلسوں کا اہتمام کرتے اور اس وقت کے جید علماء کرام کو بلاتے بلند پایہ خطیبوں کو دعوت خطاب دیتے۔ اس طرح ہارون آباد مرکز دعوتِ ارشاد بن گیا۔ ہم نے اسی زمانے میں مولانا غلام علی اوکاڑوی، مولانا عبدالغفور ہزاروی، ابو النور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، مولانا غلام دین انجن شیڈ لاہور، مولانا غلام قادر اشرفی لالہ موسیٰ، صاحبزادہ پیر فیض الحسن آلومہاروی، مولانا محمد یار فریدی، استاذ العلماء مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری اور حضرت محدث اعظم کچھوچھوی کو ہارون آباد کے جلسوں میں تقریر کرتے سنا۔ ہمیں یاد ہے کہ پاکستان بن گیا۔ پاکستان میں پہلی بار تحریک ختم نبوت چلی تو ہارون آباد میں بھی احتجاجی جلوس نکالا گیا اس جلوس کی قیادت مولانا درگاہی فرما رہے تھے۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ آنسو گیس سے نوازا۔ لوگ بھاگنے لگے۔ مگر درگاہی صاحب بازار کے عین درمیان تن تنہا جھنڈا اٹھائے کھڑے رہے اور پولیس کو للکارتے رہے ہم نے یہ منظر دیکھا تو مولانا کی شجاعت کو ہدیہ تحسین پیش کیا۔

مولانا درگاہی کھاریاں (گجرات) کے قریب ایک گاؤں بیگا مروج پور کے رہنے والے تھے۔ شادی کا وقت آیا تو اپنے احباب علماء کرام کو بارات میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ ہمیں یاد ہے کہ آپ کی بارات کے جلوس میں مولانا غلام دین انجن شیڈ لاہور، مولانا غلام قادر اشرفی، خطیب لالہ موسیٰ، مولانا غلام علی اوکاڑوی، مولانا غلام

جہانیاں، ابو النور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، قاری احمد حسن فیروزپوری (خطیب گجرات) مفتی احمد یار خان نعیمی، محمد اعظم چشتی اور محمد یوسف نعت خوان جیسے بلند پایہ حضرات موجود تھے۔ ان علماء کرام کے علاوہ آپ کے مقامی احباب شاگردوں اور رشتے داروں کی خاصی تعداد بارات کی زینت تھی۔ یہ ایک انوکھی بارات تھی۔ دولہا کو گھوڑے پر سوار کرانے کی بجائے ایک سجی سجائی بیل گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ لاؤڈ سپیکر رکھا گیا۔ نعت خوان لاؤڈ سپیکر پر درود و سلام اور نعت کے دل نواز نغموں سے فضا کو معمور کر رہے تھے۔ جب دلہن کے گاؤں کی گلیوں میں یہ بارات درود و سلام اور حمد و نعت کے ترانوں سے سجی گونجتی پہنچی تو مستورات نے کوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ کر استقبال کیا۔ پھول برسائے اور حیرت سے کہتی رہیں کہ یہ بارات ہے یا عید میلاد النبی کا جلوس۔ گاؤں کے لوگ صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہوئے پھول نچھاور کرتے تھے۔ مولانا غلام قادر اشرفی دولہا (مولانا احمد دین درگاہی) کے بے تکلف دوست تھے دلہن کے دروازے پر بارات پہنچی تو مولانا غلام قادر اشرفی نے اعلان کیا، حضرات! اب دولہا میاں مولانا احمد دین درگاہی خصوصی خطاب فرمائیں گے۔ مولانا درگاہی اٹھے۔ لاؤڈ سپیکر کے سامنے آئے نہ جھجک نہ ندامت، نہ انکار نہ فرار، دلہن کے گھر کے سامنے آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ پھر مجلس نکاح میں بیٹھے آپ کا نکاح پڑھایا گیا، تو سارا مجمع مبارکباد کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

میری زندگی میں اس عالم دین کی یہ عجیب و غریب بارات تھی۔ جہاں دولہا خود دلہن کے دروازے کے سامنے لاؤڈ سپیکر پر تقریر کر رہا ہو اور نکاح کی مجلس میں درجنوں جید علماء کرام جلوہ فرما ہوں۔ دوسرے روز دعوتِ ولیمہ تھی۔ ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ علماء کرام نے پرزور تقریریں کیں۔ قاریوں اور نعت خوانوں نے اپنی خوش آوازی سے پنڈال کو گرما دیا۔ ہمیں یاد ہے کہ علماء کرام کی اس محفل میں ہم سب سے کم عمر مقرر تھے جو پانچ منٹ کے لیے تقریر کے لیے اٹھے۔ قصبوں اور دیہات سے بیشمار لوگ آئے تھے دیر تک جلسہ رہا سب کو کھانا کھلایا گیا۔ مولانا احمد دین درگاہی مرحوم کی

شادی ہمیں آج تک یاد ہے۔ یہ علمی بات نہ سہی مگر شادی کی بات ضرور ہے! ہے کوئی آج مردِ علم و فضل جو اپنی شادی پر تقریر کر کے دلہن کی سہیلیوں سے داد وصول کرے!!

پیر عبدالخالق فاروقی رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ (مؤلف تفسیر نبوی پنجابی) کے خاص مرید اور خلیفہ تھے انہوں نے ساری زندگی ایک سالک کی حیثیت سے اپنے پیر و مرشد کے زیر سایہ گزاری تیس سال تک سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں زیر تربیت رہے عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے۔ شب بیداری میں اپنی مثال آپ تھے۔ اپنے پیر و مرشد کے درویشوں کی خدمت کرتے۔ کسی کو بیٹا بنا لیتے۔ کسی کو چھوٹا بھائی کسی کو درویش، کسی کو فقیر، اسی بہانے سے وہ طالب علموں کی خدمت کرتے رہتے۔ حضرت مولانا نبی بخش حلوائی نے اپنی کئی تصانیف انہیں کے زیر اہتمام شائع کی تھیں۔ پھر ان کا ذکر جا بجا اپنی کتابوں میں کیا ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

پیر عبدالخالق فاروقی زندگی بھر اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہے، مگر اپنی زبان پر ان کا نام کبھی نہیں لائے۔ صرف ''حضرت صاحب'' ہی کہتے تھے۔ ایک دن ان کے پیر و مرشد نے ایک امیر آدمی کے پاس کچھ چیزیں لینے کے لیے بھیجا، تو جا کر کہنے لگے کہ ''حضرت صاحب'' نے بھیجا ہے تو پوچھا کہ کون حضرت صاحب تو کہنے لگے، نام تو مجھے یاد نہیں وہ میرے ''حضرت صاحب'' ہیں۔ امیر آدمی بگڑ گیا۔ کہنے لگا جاؤ یہاں کئی حضرت صاحب پھرتے ہیں واپس ہوتے ہوئے کہنے لگے تو میرے حضرت صاحب کو نہیں جانتا تو پھر کس کو جانتا ہے؟ واپس آئے امیر آدمی کے نوکر نے کہا یہ بابا عبدالخالق ہے مولانا محمد نبی بخش حلوائی کا درویش ہے وہ اٹھا۔ پیچھے دوڑا۔ معافی مانگی، گلے لگایا اور حکم بجا لایا۔

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی، پیر عبدالخالق کی روحانی تربیت پر خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ ایک دن پیر عبدالخالق فاروقی کی نماز تہجد قضا ہو گئی۔ مولانا نے فرمایا عبدالخالق تم نے نماز تہجد قضا کی ہے، تم ''ایک ہفتہ تک ہمارے ساتھ چائے نہیں پی

سکتے''۔ پیر عبدالخالق فاروقی اگرچہ ایک درویش، سالک طریقت اور عابد شب زندہ دار تھے۔ مگر اعتقادی طور پر اتنے بیدار دل تھے کہ مسجد نبویہ میں عبادات، دینی تقریبات اور سنی روایات پر عمل درآمد کرتے اور لوگوں سے کرواتے۔ ان کے پیر و مرشد حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ مولانا غلام قادر بھیروی کے شاگرد تھے۔ وہ بڑے راسخ العقیدہ تھے۔ وہ عقیدے کو عبادت و ریاضت پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کی مسجد میں اگر کوئی بدعقیدہ یا گستاخ رسول آ جاتا تو مسجد کو دھلواتے۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی ایک طرف نقشبندی سلسلہ کے پیر طریقت تھے دوسری طرف وہ ایک شاعر، مصنف اور مفسر قرآن تھے مگر پیر عبدالخالق فاروقی نے سلوک نقشبندیہ کی نہ صرف تربیت حاصل کی بلکہ سلسلہ نقشبندیہ کی ان روایات کی نگرانی کی جو ان کے پیر و مرشد کی مسجد میں ہوتی تھیں۔ وہ علی الصبح پانچ ہزار بار درود شریف پڑھانے کا اہتمام کرتے۔ تلاوت قرآن میں مصروف افراد کو سہولتیں بہم پہنچاتے۔ عصر کی نماز کے بعد ختم خواجگان میں شرکت کرنے والوں کی نگرانی کرتے۔ کوئی حقہ نوش، سگریٹ نوش یا نامانوس لباس کے ساتھ ختم خواجگان میں شرکت نہ کر سکتا تھا۔ ''گیارہویں شریف'' کے ماہانہ ختم کے انتظامات کی نگرانی کرتے طالب علموں کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ یہ سارے انتظامات کرتے وقت وہ غیر متعلق دکھائی دیتے۔ بعض اوقات نمازیوں کے آنے جانے کا خیال رکھتے۔ بدعقیدہ لوگوں کو مسجد میں آنے سے روکتے۔ تاکہ ان کی وجہ سے مسجد کا امن اور روحانی فضاء متاثر نہ ہو۔

ہم پیر عبدالخالق فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کر رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ عالم نہ تھے، خطیب نہ تھے، واعظ نہ تھے، مدرس نہ تھے، استاد نہ تھے مگر آج ہم اپنی مساجد، مدارس کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ایسے خاموش خدمت گزار یاد آتے ہیں۔ آج ہماری مسجدوں میں ہر شخص کی نگاہیں دوسروں کی جیبوں پر اٹکی ہوئی نظر آتی ہیں۔

(''جہانِ رضا''، مئی، جون ۲۰۰۶ء)

یاد یارِ مہربان آید ہمی!

پروفیسر علامہ محمد حسین آسی نور اللہ مرقدہٗ:

پروفیسر علامہ محمد حسین آسی نور اللہ مرقدہٗ اپنے یار مہربان تھے، قدر دان تھے، کبھی کبھی وہ ہمارے دل کے قریب ہو کر ہماری پہچان بن جاتے تھے۔ وہ صاحب علم تھے، صاحب قلم تھے، صاحب دل تھے، وہ ایک عرصہ سے جسمانی عوارض میں مبتلا رہے۔ مگر ان عوارض کے باوجود اُن کا قلم رواں تھا۔ ان کی زبان گوہر فشاں تھی اور ان کی زیارت ہمارے لیے تسکینِ جان تھی۔

وہ ایک روحانی سفر پر نکلے تو ۱۸ اگست ۲۰۰۶ء کو داعی اجل نے دورانِ سفر ہی پیغام وصال دیا اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ہم نے انا للہ و انا الیہ رٰجعون پڑھ کر دل پر ہاتھ رکھا۔ مگر ان کا چہرہ نقشِ لاثانی بن کر بار بار ہمارے سامنے آتا رہا، اور ہمیں تڑپاتا رہا۔

ع اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!

علامہ پروفیسر محمد حسین آسی ایک استاد تھے، معلم تھے، مدرس تھے، مقرر تھے، اور دینی مجلسوں کی جان تھے، آج سے بیس سال قبل پہلی بار وہ ہمارے پاس آئے پروفیسر مگر درویش سیرت، درویشانہ لباس اور شیریں زبان، مولانا محمد بخش صاحب نقشبندی اور مولانا بشیر احمد نقشبندی آپ کے ساتھ تھے۔ ان دنوں آپ اپنے پیرومرشد کے روحانی احوال پر کتاب ''انوار لاثانی'' ترتیب دے رہے تھے۔ اگرچہ ہم نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کا مطالعہ کیا ہوا تھا مگر پروفیسر محمد حسین آسی اسے نئے انداز میں ترتیب دے رہے تھے، اور خانوادۂ عالیہ نقشبندیہ لاثانیہ کی روحانی خدمات کو سامنے لانا چاہتے

تھے، انہیں ''انوارِ لاثانی'' کا نام بڑا پسند تھا۔ یہ حضرت پیر طریقت سید جماعت شاہ لاثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پر لکھی گئی تھی۔ حضرت آسی صاحب کے قلم نے اسے نیا رنگ دیا۔ اپنے پیرومرشد نقشِ لاثانی سید علی حسین شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ صاحبزادہ پیر سید عابد حسین شاہ علی پوری اور صاحبزادہ پیر سید محمد اسمٰعیل شاہ المعروف کاکاجی علی پوری کی نگرانی میں ترتیب دے رہے تھے۔ پروفیسر محمد حسین آسی نے ہماری تحریروں کو پڑھا تھا۔ پسند کیا تھا۔ محبت کی نظر سے دیکھا تھا، لاہور تشریف لائے اور فرمانے لگے ''انوارِ لاثانی کے نئے ایڈیشن کا ''مقدمہ'' آپ لکھیں گے''۔ ہمارے لیے اتنے اعلیٰ روحانی خانوادہ کی علمی اور روحانی خدمات پر قلم اٹھانا بڑا مشکل تھا۔ مگر انہوں نے اصرار کیا کہ مقدمہ تو آپ ہی لکھیں گے: انہوں نے ہماری مدد فرمائی، حوصلہ دیا، قلم پکڑا، راہنمائی فرمائی اور آمادہ کر لیا کہ یہ سعادت آپ ہی کا حصہ بنے گا۔ ہم نے مقدمہ لکھا تحریر کی نوک پلک خود پروفیسر صاحب نے سنواری اور اس طرح انوار لاثانی کے نئے ایڈیشن کے ابتدائی صفحات پر ہمارا نام آ گیا۔

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

اس ابتدائی ملاقات کے بعد پروفیسر محمد حسین آسی نے ہمیں اپنے دامنِ محبت سے کبھی جدا نہ ہونے دیا جب لاہور آتے ملاقات سے نوازتے، وہ آتے تو ہم دامن دل بچھا دیتے۔ ہم ان کی تحریروں کو پڑھتے تو داد دیتے۔ ان کے اندازِ بیاں کی تعریف کرتے اور ان کی علمی اور روحانی خدمات پر اظہارِ مسرت کرتے۔ اگرچہ ان کا روحانی سلسلہ اپنے پیرومرشد سے اتنا مربوط تھا۔ اور اپنے پیرومرشد کی نگرانی میں روحانی تربیت پانے میں بے پناہ مصروف رہتے تھے۔ مگر ہمارے ساتھ ان کا علمی، تحریری اور پھر محبت کا رشتہ قائم رہا۔ دائم رہا، اور دمِ آخر تک رہا۔

جب ان کی کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر آتیں تو ہم ایک سرسری نظر سے دیکھتے تو انہیں ہدیۂ تحسین پیش کرتے۔ ہمیں یاد ہے کہ انہوں نے جب اپنے کالج

کی طرف سے ''قرآن نمبر'' ترتیب دیا اور اسے خوبصورت انداز میں شائع کیا پھر اسے علمی حلقوں میں تقسیم کیا تو سارے ملک میں تہلکہ مچ گیا کہ شکر گڑھ کے ایک کالج کا میگزین قرآن کا پیغام لے کر آیا ہے۔ آپ نے اس نمبر کو ترتیب دینے میں بڑی محنت کی۔ عمدہ مضامین شریک اشاعت کیے۔ قرآنی مفہومات، قرآنی نکات اور قرآنی مطالب اس انداز سے پیش کیے کہ جو شخص پڑھتا قرآن فہمی میں سے اپنا حصہ لیتا۔ ہم اس نمبر پر تبصرہ تو نہ لکھ سکے مگر فاضل مرتب کو ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ دل کھول کر گفتگو کی جس سے آپ بڑے خوش ہوئے یہی قرآن نمبر بعد میں ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں چھپا۔

آگے چل کر آپ کا شاہوار قلم رواں دواں ہوا۔ کئی کتابیں سامنے آئیں۔ اور نہایت عمدہ کتابیں آئیں، لوگوں نے پسند کیں، بعض کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور اہلِ محبت کے دلوں کی کھیتیوں کو سیراب کرتے گئے۔

ہم اس تحریر میں آپ کے علمی اور روحانی کمالات کا ذکر نہیں کر رہے صرف ان کا ذکر...... یاد یار مہربان آید ہمی...... کے عنوان سے کر رہے ہیں ورنہ ان کی علمی خدمات، ان کی روحانی منازل، ان کا روحانی خانوادہ سے تعلق، فنافی الشیخ کی منازل اور اپنے شیخ پر سب کچھ قربان کر دینے کے اعزازات پر روشنی ڈالتے۔ ہمیں تو ان کی مجالس...... ان کی تحریریں...... ان کی لاہور میں آمد اور صرف ملاقاتوں تک کا تذکرہ کرنا ہے۔

علامہ پروفیسر محمد حسین آسی نے جب ماہنامہ ''الحقیقہ'' جاری کیا۔ اگرچہ یہ ماہنامہ پاکستان کے ایک غیر معروف قصبہ شکر گڑھ سے جاری ہوا تھا۔ مگر فاضل مدیر اعلیٰ کی تحریروں کی وجہ سے سارے پاکستان کے علمی حلقوں میں دھوم مچ گئی۔ ماہنامہ الحقیقہ کے کالم بڑے فکر آموز، ان میں آسی صاحب کے قلم کی جولانیاں دیدنی ہوتیں۔ آپ کے اندازِ بیاں پر داد دینے کو جی چاہتا۔ وہ خوب لکھتے تھے وہ دشمنانِ اسلام پر رضا کے تیر کا وار بے بن کر جھپٹتے وہ بے دین اور علمی دانشوروں کے خیالات کی دھجیاں اڑاتے نظر آتے۔ وہ بدعقیدہ بتوں پر کاری ضربیں لگاتے تو وہ اپنے ہم مسلک علماء کی

بے اعتدالیوں پر بھی زبردست محاکمہ کرتے۔ تعاقب کرتے بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا کہ ان کے قلم کی مار اعداء کے سینے سے پار ہو رہی ہے۔ آپ کا قلم جس موضوع پر اٹھتا بڑا شگفتہ ہوتا بڑا ادیبانہ جملوں سے آراستہ ہوتا اور جا بجا جب اساتذہ کے اشعار کے نگینے اپنی تحریروں میں جڑتے تو دل جھوم اٹھتا۔ ان کی تحریر روایتی ملا کی خشکی سے آلودہ نہیں تھی۔ ان کے دلائل فلسفیوں کی یبوست سے دور تھے۔ وہ لکھتے تو کلیاں شگفتہ ہو جاتیں۔ ان کے اداریے پڑھنے کے قابل ہوتے، پڑھتے پڑھتے لطف آ جاتا۔ ہم نے کئی بار دیکھا کہ ان کے اداریے اقتدار کے قلعوں پر برق و باران بن کر ٹوٹتے۔ وہ قوم و ملک کے غاصب حکمرانوں کو للکارتے۔ ان کے مظالم پر زبردست تنقید کرتے۔ ان کے مظالم پر برملا آواز اٹھاتے، انہیں عبرتناک انجام سے آگاہ کرتے۔ ان کی آخرت کی عبرتناک تصویر کا نقشہ کھینچ دیتے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی حفاظت میں رکھا۔ کوئی جابر ان کی طرف نہ بڑھ سکا۔ کوئی ظالمانہ نگاہ ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ دے سکی۔ ہمیں پوری طرح اندازہ نہیں مگر جب ہم ان کے تربیت یافتہ نوجوانوں کو آپ کے ساتھ دیکھتے تو دل خوش ہو جاتا۔ جب وہ اپنے ''شیرانِ اسلام'' کا ذکر کرتے تو بہت خوشی ہوتی۔ وہ ہمیں اپنی مساجد، مدارس اور تربیت گاہوں کی تفصیلات بتاتے تو ہماری خوشیوں میں اضافہ کرتے۔ وہ اپنے مستقبل کے منصوبوں پر گفتگو کرتے تو ہمیں حوصلہ ہوتا۔ ہم کبھی کبھی ان کی ان کوششوں پر لکھنے پر آمادہ ہوتے مگر رک جاتے۔ مگر جب ہم ان کی خدمات کو ہدیۂ تحسین پیش کرتے تو وہ خوش ہو جاتے۔

ہمیں یاد ہے کہ آج سے چند سال پہلے انہیں کئی بیماریوں نے بیک وقت گھیر لیا۔ وہ ڈاکٹروں کے مشوروں پر ہسپتال میں ''پابند آرام'' ہو گئے کئی ہفتے زیر علاج رہے۔ ڈاکٹروں کی زیر نگرانی رہے۔ مگر اس دوران رات کی تنہائیوں میں اٹھ بیٹھتے۔ پہلے نوافل ادا کرتے پھر ڈاکٹروں کے نگرانوں سے آنکھ بچا کر اتنی زبردست تحریریں صفحہ قرطاس پر لے آتے جس سے ''الحقیقہ'' کا ایک ضخیم نمبر تیار ہو گیا، جب چھپا تو دھوم مچ گئی۔ ہم نے پڑھا تو ان کی بیماری کے دوران ان کے ''بیمار قلم'' کی روانی کی داد دی۔

ایک خط لکھا اور تجویز کی حضور اب آپ بیمار بن کر ہسپتال میں ہی رہا کریں اور ایسی
تحریریں لایا کریں۔ تاکہ ہم تندرست قارئین آپ کے لیے دعائیں کرتے رہیں۔

حضرت علامہ پروفیسر محمد حسین آسی ہمارے دوست تھے۔ خانوادہ علی پور سیداں
شریف سے روحانی نسبت رکھتے تھے اور عقیدہ کے لحاظ سے راسخ العقیدہ سنی عالمِ
دین۔ مولانا امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اعتقادی مسلک پر ثابت قدمی سے
زندگی گزارتے رہے۔ انہوں نے امام احمد رضا کے افکار و تعلیمات کے پھیلانے میں
بڑا اہم کردار ادا کیا۔ مرکزی مجلسِ رضا کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ سے انہیں
بے پناہ عقیدت تھی۔ اسی مجلس کے زیرِ اہتمام جب ہم نے ماہنامہ ''جہانِ رضا'' جاری
کیا اور افکارِ رضا کے مختلف انداز پر تحریریں پڑھیں۔ تو بے حد خوش ہوئے خود چل کر
لاہور تشریف لائے۔ حوصلہ دیا۔ داد و تحسین دی۔ اور ہماری مسلکی کوششوں اور اداریاتی
تحریروں کو ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ وہ دم آخر تک ''جہانِ رضا'' کے کالموں کا مطالعہ کرتے
اور ہمیشہ داد دیتے رہے ورنہ علمائے کرام کے خانوادے کے بزرگ کسی کی حوصلہ
افزائی میں اپنے ''روایتی بخل'' کا سہارا لے کر اپنی بلند علمی پر فخر کرتے رہتے ہیں۔
پیرانِ عظام کا ایک طبقہ اعلیٰ حضرت سے دور رہتا ہے اور اپنی ''روحانی بدعات'' کو
چھپانے کے لیے اعلیٰ حضرت کی تعلیمات سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے مگر پروفیسر
محمد حسین آسی رحمۃ اللہ علیہ روحانی سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے زبردست سالک ہونے کے
باوجود امام احمد رضا کو اپنا مسلکی رہنما مانتے تھے پھر سنی عالمِ دین ہونے کے باوجود اعلیٰ
حضرت کے مسلک کو اجاگر کرنے والوں کا احترام کرتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے
تھے۔ انہوں نے ہزاروں بار ''جہانِ رضا'' کی خدمت کو سراہا اور بتایا کہ افکارِ رضا کی
ترجمانی کرنے والا واحد رسالہ ہے جسے ہر سنی کے گھر پہنچنا چاہیے۔

(الحقیقہ، حضور مفکر اسلام نمبر شکر گڑھ، ستمبر ۲۰۰۶ء)

خطیبِ پاکستان مولانا محمد شفیع اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۸۴ء)

''مرکزی مجلسِ رضا'' کی بنیاد رکھی گئی تو اس کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم
نے ۱۹۶۹ء سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہر سال عرس منانا
شروع کیا اور اس سالانہ عرس کا نام ''یومِ رضا'' رکھا۔ حکیم صاحب مساجد، مدارس اور
خانقاہوں سے نکل کر ''یومِ رضا'' کا جلسہ برکت علی اسلامیہ ہال، موچی دروازہ،
لاہور میں کیا کرتے تھے۔ یہ پہلا یومِ رضا تھا جب مولانا محمد شفیع اوکاڑوی کے خطاب
کا اعلان ہوا۔ مولانا اوکاڑوی ایک خوش نوا نعت خوان تھے مگر کراچی میں جا کر انہوں
نے ایک شیریں بیان خطیب کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ آستانہ عالیہ شرق پور شریف
سے روحانی تعلق کی بنا پر حضرت شیر ربانی کے عرس پر حاضر ہوتے تو سارے پنجاب
کے اہلِ محبت کو اپنی خوش بیانی سے مسحور کر دیتے۔ مرکزی مجلسِ رضا کی خدمات کو دیکھا
تو بانی مرکزی مجلسِ رضا کی دعوت پر یومِ رضا پر تشریف لا کر اعلیٰ حضرت پر ایسی شاندار
تقریر کی کہ ہر شخص جھوم جھوم اٹھا۔ اور برکت علی ہال اہلِ شوق سے لبالب ہو گیا۔

ع بلبل باغِ مدینہ تیرا کہنا کیا ہے!

ہمیں اسی ''یومِ رضا'' پر خطیبِ پاکستان سے نیاز مندی کا شرف حاصل ہوا۔ پھر
جب وہ لاہور تشریف لاتے تو شرفِ زیارت بخشتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ نے عام
جلسوں میں اپنی خطابت کے جوہر لٹانے کے ساتھ ساتھ اپنی قلم کے آبدار موتی
بکھیرنے شروع کیے۔ غالباً انہیں احساس تھا کہ زبان و کلام کی خوش بیانی اپنی جگہ مگر
تحریر اور قلم کی روانی کے اثرات دُور دُور تک جاتے ہیں۔ انہوں نے نماز پر کتاب لکھی،
نعتیہ انتخاب ''نغمۂ محبوب'' مرتب کیا، ثواب العبادات لکھی، راہِ توحید لکھی، ''انگوٹھے

چومنے کا ثبوت''، لکھی، ''راہِ عقیدت''، لکھی۔ یہ ساری کتابیں مدینہ پبلشنگ کراچی سے چھپنے لگیں۔ مجھے یاد ہے کہ حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے ''یومِ رضا'' پر ''نغمۂ محبوب'' کے پانچ سو نسخے منگوا کر اپنے احباب میں تقسیم کیے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد شفیع اوکاڑوی کی تحریر آسان مگر مدلل ہوتی ہے، تھوڑے الفاظ میں اہلِ سُنّت و جماعت کے اعتقادی مسائل کو بڑی خوبصورتی سے حل کر جاتے ہیں۔ اور جو مسائل بڑی بڑی کتابوں میں تلاش کرنے سے حل ہوتے ہیں وہ ثواب العبادات، راہِ توحید جیسی کتابوں میں مستند دلائل کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ پھر آپ نے ''نماز مترجم'' لکھی تو مجھے اس کے ناشر نے بتایا کہ اس کتاب کے بیس لاکھ نسخے ملک اور ملک سے باہر تقسیم ہو چکے ہیں اب تو اس کا انگریزی ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔

مولانا محمد شفیع اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم و فکر نے اپنا سفر جاری رکھا اور ذکر الحبیب، ذکر الحسین، شامِ کربلا، امام پاک اور یزید پلید جیسی بلند پایہ کتابیں سامنے آئیں۔ مولانا محمد شفیع اوکاڑوی کی روح کو خدا خوش رکھے وہ جب لاہور آتے، شرقپور شریف جاتے یا قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں براستہ لاہور جاتے تو مرکزی مجلسِ رضا کے دفتر سے ہو کر جاتے اور زیارت سے مشرف فرماتے تھے۔ ہم نے ان کی کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر وہ خطابت کے بادشاہ تھے۔ وہ ''خطیبِ پاکستان'' تھے۔ جہاں جاتے اہلِ محبت کے دل و دماغ میں اپنی تقریروں کی خوشبوؤں کو پھیلاتے جاتے۔ وہ تقریر کے دوران نعت پڑھتے۔ خصوصاً اعلیٰ حضرت کی نعت پڑھتے تو لوگ پکار اُٹھتے:

ع بلبلِ باغِ مدینہ تیرا کہنا کیا ہے!

۲۰/ اپریل ۱۹۸۴ھ کو آخری خطاب اپنی بنائی ہوئی جامع مسجد گلزارِ حبیب، کراچی میں کیا۔ اسی شب دل کا دورہ پڑا اور ۲۴ اپریل کو صبح ۵۵ برس کی عمر میں اذانِ فجر کے بعد درود و سلام پڑھتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اور اگلے روز اپنی جامع مسجد گلزارِ حبیب کے ایک گوشہ میں آسودہ خاک ہوئے۔

''رحمة الله تعالیٰ علیه دائماً ابداً''

سے آپ کا سنہ وصال ۱۴۰۴ھ مستخرج ہوتا ہے۔

ان کی وفات کے بعد خطابت کا ایک باب ختم ہو گیا مگر ان کے جواں سال بیٹے علامہ کوکب نورانی نے اپنے والد مکرم کی روایت کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ فروغ بخشا۔ انہوں نے اپنے والد کے نام کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ نام کو روشن کر دیا۔ تحریر و تقریر میں اپنا لوہا منوایا۔ اور جہاں گئے اہلِ علم و فضل سے داد وصول کرتے گئے۔ دُنیا کے مختلف ممالک میں گئے اور اپنی خطابت کے جوہر دکھائے اور اپنے والد خطیبِ پاکستان مولانا محمد شفیع اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے صدقۂ جاریہ بنتے رہے۔ اُنہوں نے اپنے والدِ گرامی کی طرح ''مرکزی مجلسِ رضا'' سے نہ صرف رابطہ رکھا بلکہ اُس کی سرپرستی کی اور ''جہانِ رضا'' کو اپنی نوازشات اور رشحاتِ قلم سے نوازا۔

ع کوکب نورانی را احمد شفیع

(غیر مطبوعہ)

مرکزی مجلس رضا کے ننھے منے مجلسی

چنیوٹ کے مضافات میں جانگلیوں کا ایک گاؤں ہے جس کا نام ''مونیانوالہ'' ہے۔اس گاؤں کا ایک نوجوان پیر سید میر احمد شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مرید ہے۔وہ عیدالاضحیٰ کے بعد مرکزی مجلس رضا کی محفل میں ''ننھا منا مجلسی'' بن کر آ پہنچا۔اور فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسائل اور تصانیف پر گفتگو کرنے لگا۔ہم اس کی باتوں کو سنتے گئے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔اس نوجوان نے اپنے مرشد سید میر احمد شاہ بخاری کی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ سے مسلکی وابستگی اور عقیدت کی باتیں سنائیں تو حضرت سید میر احمد شاہ کی یاد نسیم جان بن کر غم خانۂ دل میں آ پہنچی۔

نسیم خُلد می وزد، مگرز جوئے بارہا
کہ بوئے مشک می دہد ہوائے لالہ زارہا

سید میر احمد شاہ بخاری جلال پور جٹاں (گجرات) کے خانوادہ سادات کے گل سرسبد تھے۔وہ واعظ باکمال پیر سید ظہور شاہ بخاری کے چچا زاد بھائی تھے۔بڑے فاضل بڑے عالم اور بڑے درد دل کے مالک تھے۔جوانی متحدہ ہندوستان بمبئی میں گزاری۔اور پاکستان بننے کے بعد گجرات چلے آئے جہاں سے چنیوٹ کے گاؤں میں بسنے والے مریدوں نے آپ کو ''مونیانوالہ'' میں لا بسایا۔پھر آپ نے ساری زندگی وہاں گزار دی۔

سید میر احمد شاہ بخاری مرکزی مجلس رضا لاہور سے وابستہ تھے۔آج سے تیس سال قبل بانی مرکزی مجلس رضا حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کی مجالس میں آنے لگے۔اور ہر سال یومِ رضا کے موقع پر حاضری دیتے ایک دن اعلیٰ حضرت کا ایک رسالہ

الاستمداد علی اجیال الارتداد (۱۳۳۷ھ) لے آئے۔اس رسالے کے حاشیہ پر اعلیٰ حضرت کے دستخط تھے۔غالباً وہ اعلیٰ حضرت نے کسی شاگرد کو عطا فرمایا تھا۔پیر سید میر احمد شاہ فرمانے لگے آپ اس پر حواشی لکھیں۔

اللہ اللہ کس قدر خوش فہمیاں!

یہ رسالہ وہابیہ دیوبندیہ کے دو سو تیس اقوال کے رد میں تھا۔جو اردو زبان میں تین سو ساٹھ اشعار پر مشتمل تھا۔ہماری علمی اور اعتقادی استعداد سے بہت بلند موضوع تھا۔اس پر حواشی لکھنا ہمارے بس کی بات نہ تھی معذرت کر دی۔پھر اصرار ہوا۔مزید اصرار ہوا تو ''ذکر احباب و دعاء احباب'' پر مفصل حواشی لکھے اور ایک مکمل کتاب بن گئی۔حضرت میر احمد شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے زیور طباعت سے آراستہ کیا اور پاک و ہند کے اہلِ علم وفضل میں تقسیم کیا۔یہی ایڈیشن چند سال ہوئے بریلی شریف (انڈیا) سے چھپا۔

مولانا محمد منشاء تابش صاحب آج سے تیس سال پہلے دیارِ حبیب میں گئے۔تو وہاں مولانا ارشد القادری مدظلہ العالی سے ملاقات ہوئی جن کے پاس ''زلزلہ'' کا ایک مطبوعہ نسخہ تھا۔تابش صاحب کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی۔مدینہ پاک میں بیٹھے بیٹھے ساری کتاب نقل کر لی۔جب واپس آئے تو چھپنے کے لیے سارا مسودہ عنایت فرمایا۔ہم نے کتابت کرا لی تھی کہ پیر سید میر احمد شاہ مرحوم کی نگاہ اشتیاق نے دیکھ کر اصرار کیا کہ ''زلزلہ'' میرے اہتمام میں چھپے گا۔چنانچہ پاکستان میں ''زلزلہ'' کا پہلا ایڈیشن پیر صاحب کے زیر اہتمام ''مکتبہ مظہر فیض رضا برج منڈی فیصل آباد'' سے چھپا۔

پیر صاحب اعلیٰ حضرت کی کتابوں کے عاشق تھے۔کوئی رسالہ آتا تو ساری رات پڑھنے میں گزار دیتے۔اعلیٰ حضرت کے ایک مخلص مرید کے بیٹے فیاض کاوش وارثی مرحوم سندھ میں گورنمنٹ شاہ عبداللطیف بھٹائی کالج میرپورخاص میں پروفیسر آ لگے تو انہوں نے ایک کتاب ''پیرانِ پیر'' تالیف کی۔حضرت پیر صاحب بذات خود

پیر چورا س جا پہنچے مسودہ حاصل کیا اور ۱۹۷۷ء میں اپنے اہتمام میں "مکتبۂ مظہر فیضِ رضا برج منڈی فیصل آباد" سے چھپوا دیا۔ حضرت پیر صاحب کتابی ذوق کے میدان میں امام اہلِ سنت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کے گرویدہ تھے۔ وہ خود نقشبندی مجددی تھے خانوادۂ چورہ شریف سے نسبت روحانی رکھتے تھے مگر محدث قادری بریلوی کے فدائی تھے۔ سید میر احمد شاہ بخاری کا یہ مرید صادق پیر صاحب کے مزار کے فیضان کی باتیں کر رہا تھا۔ ان کی کرامات کا ذکر کر رہا تھا۔ ان کے بیٹے اور سجادہ نشین سید مظہر حسین شاہ ولی کی شفقتوں اور محبتوں کا تذکرہ کر رہا تھا۔ ہم اس کے چہرہ کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ "مرکزی مجلس رضا" کے یہ ننھے منے مجلسی کہاں کہاں سے چل کر ہمارے پاس چلے آتے ہیں۔ اور ان یادوں کو تازہ کرتے رہتے ہیں جو ہماری خوشیوں کا اثاثہ ہیں۔

گونج گونج اٹھے ہیں نغماتِ رضا سے بوستان!

حاجیوں کے قافلے واپس آنے شروع ہوتے ہی ہمارا ایک عزیز ----- دیارِ حبیب سے واپس آیا تو سیدھا مرکزی مجلسِ رضا کی مجلس میں آ بیٹھا۔ ہم ابھی استقبال کے لیے اٹھے ہی تھے اپنے بازو پھیلائے ہی تھے اور لبوں پر اھلاً وسھلاً آیا ہی تھا کہ اس عزیز محترم نے اپنا "خریطہ حج" کھولا۔ اور ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے۔ یہ ہے آپ کا آبِ زم زم یہ ہیں آپ کی کھجوریں یہ ہیں برنی اور یہ ہیں عجوہ یہ ہیں آپ کے لیے عطر کی رنگا رنگ شیشیاں۔ یہ ہے تسبیح یہ ہے مصلی، یہ ہیں گھڑیاں، یہ ہیں سنہری لڑیاں، یہ ہے ٹوپی یہ ہے رومال اس کو رکھنا بڑا سنبھال! اب اس عزیز نے ان مدنی احباب کے نام لینے شروع کر دیئے جنہوں نے یہ تحفے بھیجے تھے ہمارا دل جھوم جھوم رہا تھا۔

مدینے کی خوشبو مدینے کے تحفے — لیے جا رہا ہوں جیے جا رہا ہوں
سلامٌ علیکَ، علیکَ السلاما — کہے جا رہا ہوں جیے جا رہا ہوں

بتانے لگا۔ آپ کے دوست مرکزی مجلس رضا کے پہلے صدر فضیلت الشیخ حکیم محمد عارف صاحب ضیائی مدنی ان دنوں نجدیوں کی جیل میں ہیں۔ ان کا جرم یہ بتایا گیا ہے کہ وہ تعویذات لکھتے تھے۔ دم درود کرتے تھے۔ ان کے گھر سے پانچ ہزار دانوں کی تسبیح اور "شمع شبستانِ رضا" برآمد ہوئی تو نجدیوں نے آپ کو "ساحر" کہہ کر پانچ سال کے لیے پسِ دیوارِ زنداں کر دیا۔ حکیم محمد عارف صاحب ضیائی ہمارے بڑے پیارے دوست ہیں وہ گزشتہ تیس سال سے دیارِ حبیب میں مقیم ہیں۔ رمضان المبارک میں بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ میں ایک سو زائرینِ حرم کی افطاری کراتے ہیں اپنے گھر میں پاکستان اور ہندوستان کے علمائے اہلِ سُنّت کی دعوت کرتے ہیں۔ آج سے تیس سال پہلے وہ مرکزی مجلسِ رضا کے صدر تھے۔ بانیوں میں سے تھے۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے رفیق کار تھے۔ مرکزی مجلسِ رضا کی بنیادوں کو مضبوط بنانے والے لوگوں میں سے تھے۔ مدینہ پاک گئے تو انہیں فاضل بریلوی کے خلیفہ خاص مولانا ضیاء الدین مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت ملی کئی سال زیرِ تربیت رہے۔ بیعت ہوئے اپنے پیر و مرشد کے فرزند مولانا فضل الرحمٰن مدنی کی مجالس میں رہے۔ وہ حکیم ہیں، طبیب ہیں اور اعلیٰ حضرت کی کئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرا کے عرب ممالک میں تقسیم کر چکے ہیں۔ وہ قادری سلسلہ طریقت کے پیروکار ہونے کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے عاشق ہیں سید؛ غوث اعظم پر کئی عربی کتابیں چھپوا کر تقسیم کر چکے ہیں۔ "دلائل الخیرات" کے کئی ایڈیشن عرب کے اہلِ محبت اور افریقی ممالک کے زاہدوں، عابدوں کو ہدیہ کر چکے ہیں۔ ہمیں ان کی اس ابتلاء پر بڑا ملال ہے۔ ان کی رہائی کیلئے لبوں پر بار بار دعائیہ جملے آئے۔ مگر

کسی کو دشت نوردی کسی کو دار و رسن
یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کے لیے!

عزیزم نعیم عزیز صاحب ایم اے سیاسیات کے طالب ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی

میں زیرِ تعلیم ہیں وہ فاضل بریلوی کی کتابوں اور ان کی علمی خدمات سے ناآشنا ہیں مگر مان نہ مان میں تیرا مہمان بن کر مرکزی مجلسِ رضا کی مجالس میں چلے آتے ہیں۔ ایک دن آئے تو علماء کرام تشریف فرما تھے اساتذہ گفتگو کر رہے ہیں۔ رضوی حضرات علمی نکتے بیان کر رہے ہیں۔ مگر نعیم عزیز صاحب بلا جھجک چلے آئے۔ چند لمحات خاموشی سے سنتے رہے پھر حسبِ عادت گویا ہوئے:

؎ نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں!

سوادِ اعظم لٹ گیا اہلِ سُنّت بکھر گئے! سنی لٹ گئے! حنفی مر گئے! بریلوی ختم ہو گئے! مگر آپ لوگ ابھی تک بریلی کے ''محلہ سوداگران'' میں بیٹھے ''الوظیفۃ الکریمۃ'' کا ورد کر رہے ہیں ہمارا دل آیا کہ نعیم عزیز کو بیک بنی و دو گوش پکڑ کر باہر نکال دیں مگر وہ کہے جا رہے تھے۔ سنیوں کی دینی اور سیاسی قوت پارہ پارہ ہو گئی۔ جمعیت العلماء پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ جمعیت العلماء پاکستان (نورانی) جمعیت العلماء پاکستان (نیازی) جمعیت العلماء پاکستان (نفاذِ شریعت گروپ) جمعیت العلماء پاکستان (سوادِ اعظم گروپ) جمعیت العلماء پاکستان (مرکزی) جمعیت العلماء پاکستان (سوادِ اعظم)

؎ اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

ہم نے اسے سمجھایا کہ ہم سنی ہیں سوادِ اعظم ہیں عزیزِ محترم جنہیں تم ٹکڑے ٹکڑے کہتے ہو وہ تو ''گلہائے رنگارنگ'' ہیں جو رونقِ چمن ہوتے ہیں۔

وہ بولے یہ رونقِ چمن ہیں یا آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کے رہ گیا!

ہم نے انہیں دوبارہ سمجھایا کہ ہم لوگ اندر سے ایک ہیں۔ ایک ہی منزل ہے۔ ایک ہی قبلہ ہے ایک ہی مسلک ہے ایک ہی عقیدہ ہے۔ کہنے لگے فاروقی صاحب! یہ ایک نہیں ہیں۔ ''جماعت اہلِ سُنّت'' کے کئی ٹکڑے ہیں۔ پہلے صرف ایک ''جماعت اہلِ سُنّت'' تھی اب ''مرکزی جماعت اہلِ سُنّت'' بھی آ گئی جماعت اہلِ سُنّت (کراچی) جماعت اہلِ سُنّت (ملتانی) جماعت اہلِ سُنّت (لاہوری) کیا یہ بھی

گلہائے رنگارنگ ہیں؟ کیا یہ بھی رونقِ چمن ہیں؟ کیا یہ بھی بہارِ وطن ہیں؟ مجلس میں بیٹھے ایک عالمِ دین نے نعیم عزیز کو بتایا کہ ہمارے سنیوں کے سارے گروپ ایک سٹیج پر متفق ہیں۔ مسلک اعلیٰ حضرت پر مسلکِ رضا پر، مسلک اہلِ سُنّت پر، اس میں کسی گروپ کسی جماعت کا کوئی اختلاف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مسلکِ رضا کو نقطۂ اتحاد اہلِ سُنّت جانتے ہیں۔ نعیم عزیز چونکہ سیاسیات کا طالب علم ہے وہ مسلک رضا کی برکات کی گہرائیوں تک نہیں جا سکتا۔ کہنے لگا: ہاں ہاں! یہ لوگ ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' کی دلنواز آواز پر متفق ہیں اور اسی آواز پر روٹیاں توڑتے ہیں اگر ان کے پاس یہ شعر بھی نہ ہوتا تو ان انتشار زدہ لوگوں کو روٹی بھی کوئی نہ پوچھتا! مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک اور عالمِ دین نے نعیم کو سمجھایا کہ برخوردار۔ تم اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کا نعتیہ دیوان ''حدائقِ بخشش'' پڑھا کرو۔ تمہاری سیاسی سوچ بدل جائے گی۔ اس موقع پر ایک خوش آواز مجلسی نے اعلیٰ حضرت کی کہی ہوئی نعت:

؎ وہ کمال حسن حضور ہے کہ گمان نقص جہاں نہیں

سنا کر محفل کا رنگ بدل دیا۔ اب نعیم عزیز کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اور ہم جھوم رہے تھے۔

(''جہانِ رضا'' مارچ ۲۰۰۲ء)

مرکزی مجلس رضا کے ننھے منے مجلسی

ہمارے ایک ملاقاتی ہیں۔ جو پنجاب یونیورسٹی کے طالب علم ہیں۔ وہ اکثر ہمارے پاس آجاتے ہیں۔ ''جہانِ رضا'' خریدتے نہیں مگر پڑھتے ضرور ہیں۔ سطر سطر پڑھتے ہیں اور ایک ایک حرف کو نگاہ تنقید سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک سال سے ہمارے پیچھے پڑے ہیں کہ ''جہانِ رضا'' کے صفحات پر اعلیٰ حضرت عظیم البرکت رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر خیر تو ہوتا ہے۔ اور آپ بڑے بڑے علماءِ اہلِ سُنّت کے تذکرے اور مشائخ کرام کے حالات لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن کبھی ہم جیسے لوگوں کا ذکر تک نہیں کیا۔ وہ ''ہم جیسے لوگوں'' کے ذکر پر اتنا اصرار کرتے رہتے ہیں۔ جیسے وہ ''رومی و جامی'' کے ہم عصر ہوں۔ ایک دن وہ روزنامہ جنگ، روزنامہ نوائے وقت اور پھر کراچی کا خوبصورت ''اخبار جہاں'' اٹھائے لائے۔ اور کہنے لگے کہ آپ کا ''جہانِ رضا'' ان سے بڑا نہیں۔ ان میں دیکھیں عالمی اذکار و افکار کے ساتھ ساتھ چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ دیکھیے اتنے بڑے بڑے اخبارات کے صفحات بھنڈی توری، آلو کچالو، کدو کریلوں، کے تذکروں کے علاوہ موٹے موٹے عطائی حکیموں کے اشتہارات اور ان کے فوٹو پھر فلمی پریوں کی تصاویر سے پر ہوتے ہیں۔

ہم نے اس طالب علم کی باتوں کو درخور اعتناء نہیں جانا تھا مگر ''لو آج ہم نے توڑ دیا کاسۂ غرور!'' کہہ کر اپنے ننھے منے ملاقاتی کی بات مان لی اور مرکزی مجلسِ رضا میں آنے والوں کے اذکار سے اپنی محفل سجانے کا فیصلہ کر لیا۔

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان اپنی ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ اپنا ہے رات ان کی

ہمارا سارا دن ''مرکزی مجلسِ رضا'' کے اشاعتی کاموں میں گزر جاتا ہے۔ گھر آتے ہیں تو ٹیلیفون کی گھنٹیاں تنگ کرتی ہیں۔ نصف شب لکھتے لکھاتے گزر جاتی ہے اور باقی رات شب ہجراں بن کر کٹتی ہے۔

کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے ۔۔۔ کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے
ہماری بھی شب کیسی شب ہے الٰہی ۔۔۔ نہ روتے کٹے ہے نہ سوتے کٹے ہے!

دن باتوں میں گزر جاتے ہیں راتیں سونے میں گزر جاتی ہیں۔ مگر نہ ہمیں وصال کی لذتیں اور نہ ہجر کی عظمتیں میسر آتی ہیں۔

لو ابھی کالم لکھنے بیٹھے ہی تھے کہ ہمارے ایک ننھے منے ملاقاتی آپہنچے یہ ہارون آباد سے آئے ہیں ''جہانِ رضا'' کو پڑھتے ہی نہیں یاد کرتے جاتے ہیں۔ یہ کالج کے طالب علم ہیں۔ نام طارق ہے۔ ''جہانِ رضا'' نہ ملے تو بے تابی سے انتظار کرتے ہیں اور شکایت کے خط لکھتے ہیں۔ ابھی ان کی خیریت نہیں پوچھی تھی کہ عزیزم حافظ محمد شاہد اقبال آپہنچے۔ ہمارے سامنے ایک عرصہ تک یہ طالب علم رہے ہیں۔ ہم انہیں ''برخوردار'' کہا کرتے تھے ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنتے تھے تو انہیں ''شیریں گفتار'' بھی کہنے لگے۔ انہوں نے بھاٹی دروازے کے اندر ایک قدیم مسجد کی تعمیر نو کروائی اور اسے درخشاں کر دیا۔ مسجد کا نام ''مسجدِ صدیق اکبر'' رکھا۔ اس میں ایک خوبصورت لائبریری قائم کی۔ ایک حلقہ تدریس قائم کیا۔ اذان، نماز، صلوٰۃ وسلام کا اہتمام کیا۔ سالانہ مجالس منعقد کر کے ملک کے نامور خطیبوں کو دعوت خطاب دینے لگے۔ جلسے کا اشتہار چھاپتے تو اعلیٰ قسم کے خطاطوں سے قلم مستعار لیتے۔ ''مرکزی مجلس رضا'' کی اشاعتی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر اپنے طور پر کئی کتابیں شائع کر کے مفت تقسیم کیں۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد ملک العلماء مولانا الشاہ محمد ظفر الدین رضوی بہاری کی معراجیہ موضوع پر تقاریر بعنوان ''بیان المعراج'' کئی جزوں میں تیار کر کے مفت تقسیم کی۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد پروفیسر مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ (انڈیا) نے اپنے نایاب مسودات موصوف کو دیئے جنہوں نے زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے ان سے داد و تحسین حاصل کی۔ مگر اب وہ ''برخوردار شیریں گفتار'' نہیں رہے بلکہ لاہور کی ایک مشہور دینی درسگاہ میں استاد ہیں۔ درجنوں طالب علم ان کی مسند کے سامنے صف بستہ بیٹھتے ہیں اور انہیں ''حضرت جی! حضرت جی'' کہتے ہیں اب ہم انہیں کس طرح ''برخوردار'' کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہمارے پاس بیٹھے ہوئے بھی دارالعلوم نعمانیہ اور دارالعلوم نظامیہ کی دستار فضیلت سجائے بیٹھتے ہیں۔ ابھی ہم نے حافظ محمد شاہد اقبال صاحب کو چائے کی پیشکش نہیں کی تھی۔ کہ ڈاکیا آ گیا تازہ ڈاک لے آیا۔ دیکھتے دیکھتے در خیابان کھل گیا۔

سب سے پہلے خوبصورت لفافہ کھلا تو اس میں سید صابر حسین شاہ بخاری، برہان شریف، اٹک کا خط مسکراتا مسکراتا سامنے آ گیا۔ بخاری صاحب قبلہ تذکارِ رضا پر خوب لکھتے ہیں کبھی کبھی ان کے ''نفاست نامے'' ماہنامہ جہانِ رضا کے صفحات پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ قارئینِ جہانِ رضا پڑھتے ہیں تو خوش کام ہو جاتے ہیں۔ وہ عالم ہیں، معلم ہیں، محقق ہیں اور تذکرہ نویس ہیں۔ خوب لکھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ اس برقیاتی چکا چوند دور میں اپنے دور افتادہ گاؤں (برہان) میں ''چراغِ شب'' کی روشنی میں ''جہانِ رضا'' اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ سنا ہے انہوں نے دو بکریاں پال رکھی ہیں۔ جن کا دودھ پی کر دل و دماغ کو کھانے پینے کی ملاوٹ کے اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ بوعلی سینا اپنے دماغ کی نفاست کی ایک وجہ ''بکری کا دودھ'' بیان کیا کرتے ہیں۔ سید صابر حسین شاہ بخاری نے اپنے گاؤں (برہان شریف) میں ''ادارہ فروغِ افکارِ رضا'' قائم کیا ہوا ہے۔ جہاں آفتاب بریلی کی کرنیں ضیاء باریاں کرتی رہتی ہیں۔

ڈاک کھولی تو ایک اور خوبصورت لفافہ سامنے آیا اتنا خوبصورت کہ کھولنے کو ہاتھ بڑھایا تو ''دستہ گل چین کی جھنک'' کا احساس بیدار ہو گیا۔ اس میں ہمارے عزیز

محترم علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی کا جگمگاتا ہوا ''محبت نامہ'' برآمد ہوا۔ اگر ہم اسے ''عنبر شمامہ'' کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ''اگر نوازش نامہ'' لکھیں تو مبالغہ نہ ہوگا اگر اسے ''کوکب نامہ'' کہہ کر ''نفاست نامہ'' بنا کر ''جہانِ رضا'' کے نفاست ناموں میں شائع کر دیں تو قارئین جہانِ رضا خوش ہو جائیں گے۔ علامہ کوکب نورانی حضرت مولانا محمد شفیع اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ ادیب ہیں، خطیب ہیں اور پھر ہمارے حبیب لبیب ہیں...... ''اے تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم'' ہم ان کا خط پڑھ کر ایسے خوش ہو جاتے ہیں جیسے دنیا و جہاں کے لوگ ان کی ورلڈ ٹی وی پر گفتگو سن کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے انبوہ میں ''جہانِ رضا'' پڑھنے میں کوتاہی نہیں کرتے اور ہماری حوصلہ افزائی کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔

ابھی یہ خوشبودار خط پڑھ کر رکھا ہی تھا کہ ایک اور لفافہ سامنے آ گیا۔ یہ ہمارے ایک دوست جو آزاد کشمیر کی ٹھنڈی فضاؤں میں رہتے ہیں۔ کی طرف سے تھا۔ یہ علامہ محمد رفیق مجاہد نقشبندی ناظم اعلیٰ ''بستان نقشبندیہ'' اور نگرانِ اعلیٰ ''گلستانِ رضا'' کڈھالا بھمبر ہیں۔ ان کا کرم نامہ کھلا۔ خط کیا تھا۔ ''در معنیٰ کھلا''۔ اپنی مجاہدانہ تحریر کے ساتھ ساتھ ہماری بہت سی علمی راہنمائی فرما جاتے ہیں۔ مشورے۔ حوصلہ افزا جملے، تنقیدی زاویے۔ اپنی علمی جدوجہد کی داستانیں گرد و پیش کی باتیں۔ اپنے بیگانوں پر اظہارِ خیال۔ وہ خط لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں ہم ان کی بعض نصیحتوں کو پلے باندھ لیتے ہیں۔ بعض باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ اور بہت سی باتوں کو ''گول'' کر جاتے ہیں۔ ابھی ہم مجاہد آف آزاد کشمیر کا خط پڑھنے نہیں پائے تھے کہ ہمارے ایک ننھے منے دوست عزیزم ''محبوب الرسول صاحب قادری'' تشریف لے آئے یہ صاحب ''سوئے حجاز'' لاہور اور سہ ماہی ''انوارِ رضا'' جوہر آباد کے ایڈیٹر ہیں وہ جب تشریف لاتے ہیں ''نسیم جاں فزا کا جھونکا'' تو نہیں ''جھکڑ'' بن کر آتے ہیں ہماری کیا مجال کہ ان کے سامنے ڈاک کو ہاتھ لگا سکیں۔ ڈاک ایک طرف رکھی اور جناب محبوب الرسول

قادری کا ''دفتر معنیٰ کھلا'' آدھی لاہوری اور آدھی جوہر آبادی زبان (جسے ہم جانگلی زبان کہتے ہیں) میں گفتگو کرتے ہیں۔ بقول ''سودا'' ...... ''وہ جہاں بیٹھتے ہیں باغ لگا دیتے ہیں!'' باتوں پہ باتیں، خبروں پہ خبریں، دن رات کام کرتے ہیں۔ لاہور کی لمبی سڑکوں اور گلیوں کو پیدل طے کرتے جاتے ہیں ان کے ہاں رات دن میں کوئی تمیز نہیں۔ دورونزدیک میں کوئی فرق نہیں اندھیرے اجالے میں کوئی ڈر نہیں۔ ''جہانِ رضا'' پڑھتے ہیں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ چھپنے سے پہلے پڑھنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ''ماہنامہ جہانِ رضا'' کی بعض تحریروں پر تنقید کرتے ہیں بعض اوقات تنقید کرتے کرتے چائے کی پیالی بھی ٹھنڈی کر دیتے ہیں۔ ہمیں ان کی یہ ''کج ادائیاں'' یہ ''راہنمائیاں'' اور یہ ''مہربانیاں'' خوشگوار لگتی ہیں وہ اپنے رسالوں کے صفحات پر بہت کچھ لکھ جاتے ہیں مرنے والوں کا ''ذکر خیر'' کر جاتے ہیں۔ جینے والوں کے ''نام نکو'' بتاتے جاتے ہیں۔ لوگ پڑھے لکھے ہوتے ہیں وہ لکھے پڑھے دانشور ہیں۔ ان کا سلسلہ گفتگو ابھی جاری ہی تھا کہ دور دراز سے ایک اور دوست آ پہنچے۔

اگرچہ یہ دوست مولوی نہیں مگر کتابیں محبت سے پڑھتے ہیں مطالعہ کے شوقین ہیں سرحد کے قبائلی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کا نام غیر علمی ہے۔ ''سرخاب خاں مقہوری'' میں نے کئی بار ان کے نام پر تنقیدی گفتگو کی۔ مگر وہ بے پناہ دلائل کی روشنی میں مجھے مطمئن کر دیتے ہیں۔ اگرچہ سرخاب کو اپنے پروں کے لحاظ سے دنیا بھر کے پرندوں پر بڑی شہرت ہے۔ مگر میرے موصوف تو ''جہانِ رضا'' کے قاری، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے عاشق، حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کی خدمات کے معترف، عقائد کے لحاظ سے پکے سنی، سچے رضوی۔ بتا رہے تھے کہ میں افغانستان پر امریکہ کی بمباری کے دوران قندھار چلا گیا تھا۔ کئی طالبان میرے شناسا تھے ان کی خیریت مطلوب تھی ملا عمر (امیر المؤمنین) میرے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ میں جب لاہور آتا وہ مجھے ''دلائل الخیرات'' اور ''اورادِ فتحیہ'' لانے کی فرمائش ضرور کرتے تھے۔ جناب

سرخاب خاں نے بتایا مجھے ''اسامہ بن لادن'' سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر میں جب عرب مجاہدین سے ملتا تو اُن سے عربی میں گفتگو کرتا تو مزہ آ جاتا۔ مجھے ان کی جانبازی، جذبۂ جہاد اور جان نثاری بڑی پسند تھی۔ جن دنوں میں قندھار گیا تھا سارے دوست مختلف کیمپوں اور غاروں میں چلے گئے تھے۔ امریکہ کے بمبار آتے بم گراتے پھر بھاگ جاتے مجھے ان کے بھاگنے کی ادا بڑی پسند تھی۔ سرخاب خاں لوٹے ہوئے افغانستان کی باتیں سناتے گئے تباہ حال افغانیوں کی داستانیں سناتے گئے اور نظامی گنجوی کے ''سکندر نامہ'' کے وہ اشعار سناتے گئے جن میں تاریخی بہادروں کی داستانیں درج ہیں اس طرح وہ مجھے طالب علمی کا زمانہ یاد دلاتے جن دنوں ہم اپنے استادوں سے ''سکندر نامہ'' پڑھا کرتے تھے ابھی ان کے لیے چائے منگوائی ہی تھی کہ ہمارے علمائے کرام کا ایک ریلہ آ پہنچا۔ اب کہاں سرخاب خاں اور کہاں سرخاب کے پر، چائے کی پیالی اٹھائی دو گھونٹ بھرے اور ''رجال الغیب'' کی طرح گم ہو گئے۔

(''جہانِ رضا'' فروری ۲۰۰۲ء)

بانی مرکزی مجلس رضا حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ میرے استاد مکرم حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد بھی تھے اور پیر و مرشد بھی۔ ان کی مشہور زمانہ کتاب ''تقدیس الوکیل عن توہین الرشید والخلیل'' حضرت علامہ حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھی۔ میرے استاد مکرم مولانا باغ علی صاحب نسیم کی خواہش تھی کہ یہ کتاب از سرِ نو زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر لوگوں کے سامنے آئے۔ میں ان دنوں اورینٹل کالج لاہور میں ایم اے فارسی کے لیے یونیورسٹی کے جلیل القدر اساتذہ کے زیرِ تربیت خوشہ چینی کر رہا تھا، کتابیں پڑھنے کا شوق، کتابیں تلاش کرنے کا جنون، کتابیں خریدنے کا عشق، کتاب دوست حضرات کو ملنے کی تگ و دو، یہ میری زندگی کے مشاغل کا ایک حصہ تھا۔ ''تقدیس الوکیل'' مرتب کرنے کے لیے آگے بڑھا، اس کی تاریخی اور اعتقادی اہمیت کو سامنے رکھا اور مسودہ کتابت کے لیے دے دیا۔ یہ ایڈیشن صرف اردو تھا، چھپنے سے پہلے ایک بھرپور ابتدائیہ سپردِ قلم کیا جس میں علمائے اہلِ سُنّت کی مجالس سے سنی سنائی باتوں کو تحریر بنا کر شریکِ طباعت کر دیا۔ جب کتاب نوری کتب خانہ لاہور سے چھپ کر سامنے آئی تو علمائے اہلِ سُنّت نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کتاب کی حیثیت و اہمیت تو پہلے ہی مسلم تھی مگر میرے ابتدائیہ پر جب علماءِ کرام نے خراجِ تحسین پیش کیا تو دل میں آیا کہ

''ہم بھی چمن میں ہیں''

ان دنوں ہمارا ''علمی زاویہ'' دہلی دروازہ لاہور کے باہر مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کے اس حجرے میں تھا جہاں مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی اور

روحانی مجالس کی خوشبو ابھی تک اہلِ علم و فضل کے دل و دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ ایک دن ایک جواں سال صحت مند ہی نہیں بلکہ تنومند شخص ہمارے حجرے میں آیا اور بیٹھنے کے بعد کتاب ''تقدیس الوکیل'' کی بے پناہ تعریف کی، اس کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی، کتاب کے تاریخی مقامات پر اظہارِ خیال کیا اور سب سے بڑھ کر میرے ابتدائیہ پر ہدیۂ تحسین پیش کیا اور پوچھنے پر بتایا کہ میرا نام محمد موسیٰ امرتسری ہے، رام گلی میں دکان ہے اور کتاب دیکھ کر آیا ہوں، آپ بھی کبھی آنا۔ چند دنوں بعد میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی دکان (مطب) پر جا پہنچا دکان تو مختصر سی تھی مگر وہاں کئی دانشورانِ عصر حکیم صاحب کے ''حلقۂ مریضانِ علم'' میں بیٹھے دکھائی دیئے، مجھے بھی جگہ عطا ہوئی، خصوصی توجہ فرمائی، شربت شیریں کا جام پلایا، خمیرہ گاؤ زبان کھلایا اور مجلس میں بیٹھے اہلِ علم حضرات سے تعارف کرایا۔ ان اہلِ علم میں ایک دیوبندی تھا، ایک وہابی حتیٰ کہ ایک مرزائی۔ انا للہ و انا الیہ رجعون۔ میں تو جل بھن کر رہ گیا۔ میرے کانوں میں سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی آواز آئی ''طوطی در پنجرہ زاغاں گرفتار شدہ'' حکیم صاحب کے ساتھ علمی باتیں کرتے، تاریخی باتیں کرتے، تحقیقی باتیں کرتے اور پھر دل ستانی کی باتیں کرتے۔ میں حساس طبیعت کا مالک تھا، نوجوان تھا، طالب علم تھا، پھر سب سے بڑھ کر نیا نیا ''مولوی'' تھا چکرا کے رہ گیا۔ اٹھا، افسردہ خاطر اور شکستہ دل اٹھا اور اجازت لے کر چل دیا۔

کل جو پیر مغاں کی محفل سے جو اٹھا مست اٹھا، خراب اٹھا!

ان دنوں مفتی محمد حسین صاحب نعیمی نے انجمن نعمانیہ لاہور سے علیحدہ ہو کر چوک دالگراں کی جامع مسجد میں ''جامعہ نعیمیہ'' کی بنیاد رکھی تھی۔ میں مفتی صاحب کو ملنے جاتا، وہاں علماء اہلِ سُنّت کا جمگھٹا ہوتا۔ وہاں سے اٹھتے تو چوک دالگراں میں ہی ''مقبول عام پریس'' میں ایک نشست ہوتی جہاں احراری اور دیوبندی مولویوں کے علاوہ صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری، مولانا محمد بخش مسلم، حاجی لق لق، جناب مرتضیٰ احمد میکش ایڈیٹر

نوائے پاکستان اور مالکان مقبول عام پریس کے علاوہ اہلِ دانش کی زیارت ہوتی۔ میرا راستہ رام گلی سے ہوتا ہوا ''جامعہ نعیمیہ'' کو جاتا تھا مگر میں دانستہ راستہ بدل کر نکل جاتا۔ ایک دن رام گلی سے ہو کر گزرا تو حکیم صاحب کو مطب میں اکیلے بیٹھے دیکھا، رک گیا اور بیٹھ گیا۔ خمیرہ کھایا، شربت پیا اور بلاشرکت غیرے اور بلا سایہ رقیبے حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب سے گفتگو ہوئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ حکیم تو اپنا ہے، ہم مسلک ہے، ہم عقیدہ ہے، ہم نفس ہے، ہمدم ہے اور ہم دل ہے۔ حکیموں کی محفل میں ہر قسم کے ''مریض آتے جاتے ہیں'' دل مان گیا، غصہ ختم ہوا، تعصب دور ہوا، اب حکیم صاحب کی مجالس میں آنا جانا شروع ہوا تو واقعی حکیم محمد موسیٰ صاحب کو ایک دانشور، ایک محقق، ایک درویش، ایک فقیر اور اہلِ علم و دانش سے محبت کرنے والا شخص پایا۔ ان کی محفل میں بوئے گل بھی تھی، نالہ دل بھی تھا اور دود چراغ محفل بھی تھا۔ بڑے بڑے اہلِ علم و فضل سے ملاقات ہوئی اور اس طرح یہ سلسلہ ایک عرصہ تک ہی نہیں بلکہ زندگی بھر چلتا رہا۔

''رام گلی'' میں میرے کئی رفقائے علم بھی رہتے تھے۔ اورینٹل کالج کے استاد مولانا علم الدین سالک صاحب میرے ایم اے فارسی کے ہم سبق، سید اصغر علی شاہ جعفری ایم اے، سید سعید علی شاہ زنجانی اور دوسرے کئی دانشور رہتے تھے۔ میری تلاش میں ان حضرات کا رخ آہستہ آہستہ حکیم صاحب کی مجالس کی طرف ہونے لگا۔ حکیم صاحب کی مجالس میں کئی احباب تو میری وساطت سے آگئے مگر کئی حضرات حکیم صاحب کی طرف سے میرے قریب ہوتے گئے۔ بشیر حسین ناظم (تمغہ حسن کارکردگی) پروفیسر مخدوم غلام جیلانی پروفیسر اورینٹل کالج، سید اصغر علی شاہ جعفری ایم اے، مولانا باغ علی نسیم، مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، میاں محمد دین کلیم مرحوم، سید ریاض حسین شاہ خراباتی، مفتی غلام سرور صاحب لاہوری کے نبیرہ مفتی محمود عالم اور دوسرے کئی حضرات علم و فضل میری وساطت سے حکیم صاحب کے قریب ہوئے، مگر کئی ایسے دانشور سامنے آئے جنہیں حکیم صاحب کی مجالس سے میں نے اپنے قریب کرلیا۔ سید

شرافت نوشاہی (مولف شریف التواریخ) محمد عالم مختار حق (دانشور) سید بشیر حسین طاہری مرحوم، مولانا غلام دستگیر نامی مرحوم، پروفیسر محمد اقبال مجددی، پروفیسر محمد اسلم (شعبہ تاریخ) پروفیسر محمد ایوب قادری کراچی، غرضیکہ ہزاروں اہلِ علم و دانش حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کی مجالس سے اپنے بنے۔

حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری ان دنوں ''تذکرہ علمائے امرتسر'' پر کام کر رہے تھے۔ ان کے اپنے مضامین اور تبصرے مختلف قلمی ناموں سے ''فیض الاسلام راولپنڈی'' میں چھپ رہے تھے۔ بعض اہم کتابوں پر ان کے ابتدائیے، مقدمے اور دیباچے اہلِ علم و فضل کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ مجھے حکیم صاحب نے ترغیب دی کہ میں علمائے امرتسر کی طرز پر ''تذکرہ علمائے اہلِ سُنّت لاہور'' مرتب کروں۔ میں کام کرنے لگا، حکیم صاحب نے اس سلسلہ میں نہ صرف میری راہنمائی فرمائی بلکہ بڑی مدد دی۔ علماء کے حالات کے لیے نشاندہی کی، اہلِ علم و فضل کی تحریروں کے تراشے مہیا کیے۔ مختلف علمائے اہلِ سُنّت کے احوال و مقامات پر گفتگو کی، حکیم صاحب کا ''تذکرہ علمائے امرتسر'' تو ان کی تحقیقاتی زنجیروں میں جکڑا رہا مگر ان کی راہنمائی سے ''تذکرہ علمائے اہلِ سُنّت لاہور'' تیار ہوگیا، چھپ گیا، تقسیم ہوگیا، بک گیا، بلکہ کئی ایڈیشن سامنے آگئے۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب جہاں ایک مجلسی آدمی ہیں وہاں ایک اچھے میزبان بھی ہیں۔ ان کے اردگرد اہلِ علم کا ایک حلقہ ہر وقت قائم رہتا ہے، یہ بات ان کے ہاں بڑی امتیازی انداز میں پائی جاتی ہے کہ وہ علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ میں ایسے سیکڑوں مشاہیر قلم کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جو بعض علمی مسائل کے حل کے لیے حکیم صاحب کے پاس آئے، مگر دوسری طرف وہ ان سکالرز، طالب علم اور محققین کی راہنمائی سے کبھی پہلو تہی نہ کرتے۔ راہنمائی کرتے، امداد کرتے، اطلاع دیتے، کتابوں کے حوالے دیتے، اگر کوئی سکالر کتابیں نہ خرید سکتا تو اپنی محدود آمدنی سے خود کتاب خریدتے اور رجسٹری کرا کے اس کے گھر تک پہنچاتے۔

آج ہمارے ملک میں سیکڑوں ایسے اہلِ قلم موجود ہیں جنہوں نے حکیم صاحب کی اس فیاضی سے حصہ لیا ہے۔

ایک طرف حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کا مطب اہلِ علم وقلم کا مرکز تھا، دوسری طرف خود حکیم صاحب بھی اہلِ علم و دانش کے ہاں چل کر جاتے۔ استفادہ کرتے، مشائخ کے حجروں میں حاضری دیتے۔ اگر کوئی باہر سے صاحب علم آتا تو اس کی قیام گاہ پر خود حاضر ہوتے، خوشہ چینی کرتے، استفادہ کرتے، روحانی شخصیتیں حکیم صاحب کی نیازمندانہ حاضریوں کی گواہ ہیں۔

ان دنوں حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کا معمول تھا کہ نماز جمعہ جامع مسجد حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ پڑھتے۔ مزار مبارک پر حاضر ہوتے، فاتحہ خوانی کرتے، وہاں آئے ہوئے علماء اور صلحاء سے ملاقات کرتے، وہاں آئے ہوئے مشائخ اور صوفیہ کی زیارت کرتے۔ واپسی پر ''نوری کتب خانہ'' سے ہوتے ہوئے مسلم مسجد کے نیچے مولوی شمس الدین مرحوم کی کتابوں کی دکان پر آبیٹھتے یہ دکان قدیم کتابوں کا بہت اعلیٰ مرکز تھا، پھر اس کے مالک مولوی شمس الدین حکیم صاحب کے مخلص اور خاص دوستوں میں سے تھے۔ حکیم صاحب مولوی شمس الدین کی دکان پر خاصا وقت دیتے، یہاں کتاب دوست دانشور آتے، کتابیں دیکھتے، خریدتے اور نادر و نایاب کتابوں پر گفتگو کرتے۔ حکیم صاحب ایسے کتاب شناس دانشوروں اور علماء سے مختلف کتابوں پر گفتگو کرتے۔ یہ دکان جہاں علماء وفضلاء کا مرکز تھی وہاں نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ بھی تھی اور مولوی شمس الدین کی وجہ سے اہلِ محبت کی جلوہ گاہ تھی۔ حکیم محمد موسیٰ صاحب نے اس مرکز پر اپنی آمد ورفت اور نشست و برخاست کو ایک عرصہ تک زندہ رکھا۔ یہاں بیٹھنے والے اہلِ علم آگے چل کر حکیم صاحب کی علمی مجالس کے کرسی نشین بنے۔

ایک وقت آیا کہ حکیم صاحب نے رام گلی میں بڑھتے ہوئے تجارتی اور معاشرتی دباؤ سے تنگ آ کر ''ریلوے روڈ'' پر مطب لے لیا اور ایک پرسکوں اور نئے انداز میں

اہلِ علم وفضل کی محفلیں جمنے لگیں۔ حکیم صاحب کی محفل میں اگرچہ ہر مکتب فکر کے دانشور آتے تھے مگر کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۹۶۸ء میں حکیم صاحب نے ''مرکزی مجلسِ رضا'' کی بنیاد رکھی اور امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کی اشاعت کا ایک زبردست منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ پر دن رات کام کرنے لگے اور خالصتاً عقائد اہلِ سُنّت پر کتابیں، رسالے، پمفلٹ، مقالے، اشتہارات چھپنے لگے۔ حکیم صاحب کے اس پروگرام پر بعض حضرات ناگواری کے اس احساس میں مبتلا ہوئے اور آہستہ آہستہ وہ ان سے کٹتے گئے، ہٹتے گئے حتیٰ کہ وادی گم گشتگان میں گم ہوتے گئے۔ دوسری طرف ایک ایسا طبقہ ابھر کر سامنے آیا جس نے حکیم صاحب کے مشن کو بڑا پسند کیا اور وہ ان کے دست و بازو بننے لگے۔ اب حکیم صاحب تھے اور خیابانِ رضویت کی آبیاری تھی، حکیم صاحب تھے اور بہارستان رضا کی گل کاری تھی، حکیم صاحب تھے اور دبستانِ رضا کی گل فشانی تھی۔ اس مردِ درویش نے چشتی نظامی ہوتے ہوئے بھی برِصغیر کے ایک قادری کی تعلیمات کو عام کرنا شروع کیا۔ وہ خود حکیم تھے مولوی نہیں تھے مگر امام اہلِ سُنّت ومجدد مائۃ حاضرہ فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کی اشاعت کا علم اٹھائے سرگرم ہو گئے۔ آپ ایک دکاندار اور ادویات فروش تھے مگر نظریات رضا کی شیرینی تقسیم کرنے لگے۔ مولانا سعید احمد نقشبندی نے ''مکتوبات امام ربانی'' پر کام شروع کیا تو آپ پوری طرح سے ان کے معاون رہے، جب مکتوبات کا ترجمہ مکمل ہوا تو آپ نے ایک بھرپور مقدمہ لکھا، مولانا ابوالحسنات کا ترجمہ ''کشف المحجوب'' چھپنے لگا تو آپ نے ایک زبردست مقدمہ لکھا، ایسے کئی مقدمات اور دیباچے حکیم صاحب کی علمی اور فکری عظمت کا پتا دیتے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد آپ مرکزی مجلسِ رضا کے سٹیج سے چند قدم اور آگے بڑھے۔ اب ''یومِ رضا'' منایا جانے لگا۔ یومِ رضا کے مقالات چھپ چھپ کر ملک بھر میں تقسیم ہونے لگے۔ ''برکت علی محمڈن ہال'' اور نوری مسجد ریلوے اسٹیشن یومِ رضا کی رونقوں سے گونج اٹھے۔ ملک کے نامور علماء کو دعوت خطاب دی جاتی، علمائے کرام سے ہٹ کر

کالجوں کے پروفیسر، یونیورسٹیوں کے دانشور اور عدالتوں کے جج ''یوم رضا'' پر خطاب کرنے لگے۔ یوم رضا کی روئیدادیں اور مقالات یوم رضا چھپ کر سارے ملک کے اہلِ علم کے ہاں پہنچتے تو لوگ جھوم جھوم جاتے اور انہیں پڑھنے کے لیے ایک نیا انداز ملتا۔

''مرکزی مجلسِ رضا'' کی آبیاری کے لیے حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری نے اپنا خون پسینہ ہی ایک نہیں کیا بلکہ خون جگر تک قربان کر دیا۔ غربت کی ساری عظمتوں کے ساتھ وہ دن رات کام کرتے، وہ بے سروسامانی کو سامان بنا کر کام کرتے، وہ رات کو دن بنا کر کام کرتے، وہ دن کو روشنی بنا کر کام کرتے، ان کے ساتھ نوجوانوں کی ایک مختصر سی ٹیم تھی جو ہر وقت چاق و چوبند آپ کے ساتھ کام کرتی، یہ لوگ رات کو اندھیروں میں ''یومِ رضا'' کے اشتہارات لگاتے اور گلی گلی، کوچے کوچے میں پہنچتے۔ شہر کے اردگرد کے دیہات اور قصبوں میں حکیم صاحب بذاتِ خود اور ان کے نوجوان پیغامِ رضا لے کر جاتے۔

''یومِ رضا'' کی رونقیں دیدنی اور ''یومِ رضا'' کے خطابات شنیدنی ہوتے تھے۔ اہلِ علم و فضل دور دور سے جمع ہوتے اور تقاریر سنتے۔ ادھر حکیم صاحب بذاتِ خود نہ مولوی تھے نہ خطیب، نہ نقیب تھے نہ رقیب، نہ مقرر تھے نہ لیکچرار، نہ صدر نہ سیکرٹری، دروازے پر ایک فقیر بے نوا کی طرح کھڑے ہوتے، علماء کرام کا استقبال کرتے، مہمانوں کو بٹھاتے، حاضرین کا خیال رکھتے، جلسہ گاہ کے انتظام و انصرام کے لیے دوڑے دوڑے پھرتے۔ نوری مسجد میں ''یوم رضا'' کی دھوم مچی ہوتی مگر ''ناظم یوم رضا'' دروازے پر کھڑا نظر آتا۔ علماء گرج رہے ہوتے مگر ''نگران یومِ رضا'' مہمانوں کی پذیرائی میں مصروف ہوتا۔ نعت خوان اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا کلام سناتے مگر حکیم صاحب مجلس رضا میں آنے والے نعت خوانوں کے لیے آنکھیں فرش راہ کیے کھڑے ہوتے۔

میں ان دنوں گورنمنٹ کے ایک محکمے میں آفیسر تھا۔ اپنے ساتھ آفیسروں کو لے کر ''یومِ رضا'' کی تقاریب میں پہنچتا، دوسرے دن دفتر میں نشست ہوتی، اپنے افسروں کو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف میں رطب اللسان پاتا تو دل

خوش ہو جاتا۔ رات کو علماء کرام کے حلقہ میں بیٹھتا تو علمائے کرام کو ''یوم رضا'' کی تعریف کرتے پاتا۔ دینی مدارس میں جاتا تو اساتذہ اور طلبہ اعلیٰ حضرت بریلوی پر گفتگو کرتے سنائی دیتے۔ نعت خوانی کی مجالس میں حاضری ہوتی تو اکثر نعت خوان اعلیٰ حضرت کی نعتیں سناتے۔ اور سامعین سے داد وصول کرتے۔ یہ ''مرکزی مجلسِ رضا'' کی علمی خدمات کے اثرات تھے کہ بچہ بچہ آشنا ہو رہا تھا یہ مرکزی مجلس رضا کے تاثرات تھے جس سے ہر شخص متاثر ہو رہا تھا۔ مرکزی مجلس رضا کے پیچھے حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کی شبانہ روز محنت تھی جو اپنے برگ و بار لا رہی تھی۔

''مرکزی مجلس رضا'' نے حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کی نگرانی میں ہزاروں نہیں بلکہ آج تک سولہ لاکھ کتابیں شائع کر کے ملک کے گوشے گوشے میں تقسیم کیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ایک ایک کتاب دس دس بار چھپتی اور ہر ایڈیشن دس دس ہزار کا چھپتا۔ حکیم محمد موسیٰ صاحب کی ان خدمت سے نظر انداز ایک نابغہ روزگار شخصیت کا نام جسے Neglected genious of the East کہا جاتا تھا ہر شہر، ہر قصبہ، ہر قریہ ہر علاقہ میں پہنچنے لگا۔

''جھوم جھوم اٹھے ہیں نغماتِ رضا سے بوستاں''

مجھے یاد ہے کہ ریڈیو پاکستان پر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نعت پڑھنے پر پابندی تھی۔ معاندین رضا کے پراپیگنڈے کا یہ اثر تھا کہ کسی سرکاری تقریب میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نعت پڑھنا دشوار تھا۔ علامہ اقبال، حفیظ جالندھری اور مولانا ظفر علی کا کلام پڑھا جاتا اگر کہیں کوئی پروگرام منتظم اجازت دے بھی دیتا تو ساتھ ہی کہتا کہ امام احمد رضا کے نام والا مقطع نہ پڑھنا تاکہ مخالف لوگ امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کا نام سن کر اعتراض نہ کریں مگر حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کی مسلسل کوششوں اور ''مرکزی مجلس رضا'' کے اشاعتی شعبہ نے اتنا کام کیا کہ ملک کے گوشے گوشے سے

ع ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام''

کی دلنواز صدائیں فضاؤں میں گونجنے لگیں۔ ریڈیو، ٹی وی پر بھی اعلیٰ حضرت کی نعتیں
پڑھی جانے لگیں۔ سرکاری تقریبات پر ''حدائقِ بخشش'' کے صفحات گونجنے لگے۔ کوچہ
و بازاراں دلنواز نغموں سے معمور ہو گئے جو ''حدائقِ بخشش'' کے صفحات میں چھپے ہوئے
تھے۔ حکیم صاحب کی محنت رنگ لائی، گویا دبستان کھل گیا۔

ایک وقت تھا کہ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کو کوئی نہیں جانتا تھا مگر جب حکیم
صاحب نے فاضل بریلوی جیسے Neglected genious of the East
کو متعارف کرانے میں زندگی کا بہترین حصہ وقف کر دیا تو جہاں اعلیٰ حضرت مجدد مائۃ
حاضرہ امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیا جائے حکیم صاحب ساتھ کھڑے نظر
آتے ہیں۔ پاکستان کے گوشے گوشے میں اعلیٰ حضرت کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ اپنے
بیگانے اعلیٰ حضرت کا ذکر کرتے تھے تو اس ذکر کے ساتھ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری
کی خدمات کا ذکر ہوتا۔ پاکستان سے نکل کر جب حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری نے
ہندوستان کے علمائے کرام کو لٹریچر مہیا کیا تو اعلیٰ حضرت کو ماننے والے علماء کرام حکیم
محمد موسیٰ صاحب امرتسری کو فاضل بریلوی کا دامن پکڑے ہوئے پاتے۔ حکیم صاحب
اگر میں غلط نہیں، تو مجھے کہنے دیجیے کہ حکیم صاحب نے فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ پر ایک بھی
کتاب نہیں لکھی، ایک مضمون بھی نہیں لکھا، ایک مقالہ بھی نہیں لکھا، ایک شعر بھی نہیں
لکھا مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ فاضل بریلوی کے افکار و نظریات کے ترجمان حکیم محمد
موسیٰ صاحب امرتسری ہی ہیں۔ فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی پہچان حکیم محمد موسیٰ صاحب
ہیں۔ امام اہلِ سُنّت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی اذاں حکیم محمد موسیٰ صاحب ہیں بلکہ میں یہ کہنے
کی اجازت چاہوں گا کہ مجدد اہلِ سُنّت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان اور اعلیٰ حضرت کی
جان حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری ہی ہیں۔ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کبھی بریلی
نہیں گئے، عرس رضا پر حاضری نہیں دی، مزار کی زیارت نہیں کی، اعلیٰ حضرت کی
لائبریری نہیں دیکھی، مدرسہ منظر اسلام میں داخلہ نہیں لیا، جماعت رضائے مصطفیٰ کی

رکنیت حاصل نہیں کی مگر یوں لگتا ہے جیسے حکیم محمد موسیٰ امرتسری اعلیٰ حضرت کی مسجد
بریلی کے مینار پر کھڑے اذان دے رہے ہوں۔

حکیم صاحب نے وقت کے بڑے بڑے دانشوروں کو اعلیٰ حضرت پر لکھنے پر
آمادہ کیا، وقت کے بلند پایہ شعرا سے مناقب لکھوائے۔ یونیورسٹیوں کے پروفیسروں
اور عدالتوں کے سربراہوں سے مقالے لکھوائے، پاکستان اور ہندوستان کے بڑے
بڑے اہلِ قلم سے مضامین لکھوائے اور یوں خیابانِ رضویت کو سیراب و شاداب کر دیا
جسے آج ہر شخص محسوس کرتا ہے۔

ایک وقت آیا حکیم صاحب نے ''مرکزی مجلس رضا'' کے کام کو پختہ بنیادوں پر کھڑا
کرنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ انہوں نے چند مستعد احباب کی ایک مجلس بنائی جس میں
دنیادار بھی تھے، اہلِ علم بھی تھے، دکاندار بھی تھے اور مولوی بھی تھے۔ اس مجلس نے اشاعتی
کاموں کے ساتھ ساتھ مستقل ادارے بنانا شروع کر دیئے۔ چاہ میراں میں ایک مسجد کی
بنیاد رکھی جسے ''مسجد رضا'' کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اس کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے
عاشقانِ رضا اور خانوادہ رضا کے چند علماء و مشائخ آئے اور مالی تعاون میں حصہ لیا۔
تھوڑے عرصہ میں ''مسجد رضا'' مکمل ہو گئی، مسجد کے ساتھ ایک لائبریری قائم کی اور اس
میں کثیر تعداد میں کتابیں سجادی گئیں اور ہر پڑھے لکھے کے لیے دعوت مطالعہ کا اعلان کیا
گیا۔ علاقہ کے غریب، مسکین لوگوں کے لیے ایک کلینک قائم کیا گیا جو مفت علاج کی
سہولتیں بہم پہنچاتا۔ ان اقدامات پر اپنے تو اپنے بیگانے بھی حیران رہ گئے۔ وہ دیکھتے کہ
تہی دست سینوں کی ایک جماعت، بے وسائل درویشوں کے چند ایک افراد آگے آئے
اور اتنا بڑا کام کر رہے ہیں۔ یہ مال یہ دولت، یہ اخراجات، یہ انعامات، یہ مراعات کہاں
سے آ رہی ہیں۔ بیگانوں اور بے خبر لوگوں نے اسے ''امریکہ کی امداد'' کہہ کر مطعون کیا،
اپنوں نے اسے دستِ غیب کہا مگر ان کا کاروان آگے بڑھتا گیا۔

حکیم صاحب ایک درویش صفت انسان ہیں۔ نہ جبہ و دستار، نہ مسند و وقار، نہ

مال کی خواہش، نہ زر کی تمنا مگر جب دکانداروں اور افلاس کے مارے ہوئے لوگوں نے آپ کے اس عظیم کام کو دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گئے۔ حکیم محمد موسیٰ صاحب ایسے عالم میں بیمار ہو گئے اور ایک سال تک صاحب فراش رہے۔ اس ایک سال کے اندر اندر دکانداروں، اراکین اور زر پرست مولویوں نے آپ کی مجلس کو اس بے دردی سے پامال کیا کہ دردمند لوگوں کو حیرت ہوئی۔ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری جب صحت یاب ہو کر آئے تو شکستہ دل تھے، شکستہ خاطر تھے، شکستہ منزل تھے۔

آج وہ عمر کے اس حصہ میں ہیں جب انسان کی رفتار مکمل سست پڑ جاتی ہے۔ آلام و مصائب کے طوفانوں میں ہیں، اپنوں اور بیگانوں کے زخموں سے شکستہ دل ہیں، مگر آج بھی ان کی مجلس میں علم و عرفان کی بات چلتی رہتی ہے۔ حکیم صاحب کی ان بیس سالہ خدمات کا یہ اثر ہے کہ آج پاکستان اور ہندوستان کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں ایسی مجالس قائم ہو چکی ہیں جو امام احمد رضا کے افکار کو پھیلا رہی ہیں اور مرکزی مجلس رضا کے کام کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ آج برِ صغیر میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر جو کتاب لکھی جاتی ہے اس میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی ان خدمات کا اعتراف ہوتا ہے جو انہوں نے اپنی زندگی کی توانائیاں صرف کر کے سرانجام دی تھیں۔ آج اعلیٰ حضرت پر ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، سیکڑوں سکالرز امام احمد رضا پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کر چکے۔ ہزاروں دانشور ادارے قائم کر چکے ہیں مگر ان سب ترقیوں کا کریڈٹ حکیم محمد موسیٰ امرتسری کو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ انہیں تا دمِ قیامت سلامت رکھے، زندگی بھر صحت مند رکھے، ان کے احباب، ان کے عقیدت مند، ان کے فیض یافتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے حلقہ بگوش رہیں اور ''مرکزی مجلس رضا'' کی اشاعتی سرگرمیاں زندہ و پائندہ رہیں۔

(''جہانِ رضا'' اگست ۱۹۹۷ء)

مولانا غلام رسول سعیدی
مفتی غلام سرور قادری
قاری محمد امانت رسول رضوی
مولانا محمد انور علی رضوی
مولانا شباب الدین رضوی
مولانا محمد نبی بخش حلوائی
مولانا محمد بخش مسلم بی اے
مولانا محمد شریف نوری
مولانا غلام مرشد
ابو البرکات سید احمد قادری
مفتی محمد حسین نعیمی
ابو الحسنات سید محمد احمد قادری
مولانا محمد عمر اچھروی
سید امانت علی چشتی نظامی
میاں جمیل احمد شرقپوری
مولانا علم الدین
مولانا عبد القیوم ہزاروی
قاری صدر الدین
قاری عبد الغفور ہزاروی
قاری محمد طفیل امرتسری
مولانا غلام محمد ترنم
مولانا غلام معین الدین نعیمی
علامہ غلام قادر اشرفی
حافظ محمد نواز نقشبندی
مفتی اعجاز ولی خان رضوی
مولانا افضل عثمان فاروقی
محمد صائم چشتی فیصل آبادی
سید عطاء اللہ شاہ بخاری
مولانا شبیر احمد عثمانی
سید محمد محدث کچھوچھوی
مولانا شمس الدین مرحوم
رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

رجال الغیب کون ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی مشکلات دُور کرنے کے لیے اپنے، خاص بندوں، کا ایک ایسا لشکر تیار کیا ہے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ لوگ نہ تو دنیا کے کاروبار میں مصروف ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی تجارت وزراعت میں حصہ لیتے ہیں۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اللہ کی مخلوق کی خدمت کیلئے مامور ہیں اور لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں۔ انہیں، رجال الغیب، اولیائے مستورین، عباداللہ، کہا جاتا ہے رجال الغیب کا ایک اپنا وسیع جہان ہے، ایک "خفیہ نظام" ہے یہ ایک نہ نظر آنے والی دنیا ہے، اس دنیا میں میں غوث ہیں، قطب ہیں، ابدال ہیں، اوتاد ہیں، افراد ہیں اور ابرار ہیں۔ پھر ان رجال الغیب کے مختلف مناصب، مقامات اور درجات ہیں جو اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے کام کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کی دعاؤں سے بادل برستے ہیں، کھتیاں سرسبز ہوتی ہیں، بحر و بر کی رونقیں ہوتی ہیں۔ پھر کائنات ارضی پر ہونے والے انقلابات انہی کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق خفیہ امور سرانجام دیتے ہیں اور مخلوق خدا کی خدمت کرتے ہیں۔ اگر وہ ذرہ بھر غافل ہو جائیں تو م کلفات درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے ان، رجال الغیب، سے حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقاتیں، اقطاب عالم کے شب و روز اور ابدال و اوتاد کی خفیہ خدمات کا تذکرہ بھی سامنے آئے گا، آپ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو آپ دنیائے تصوف کے عرفانی سمندروں کے اُن یواقیت و جواہر کی روشنیاں پائیں گے جو آپ کے دلوں کو روشن کر دیں گی اور ان مردان خدا کی ملاقات کے لیے آپ کے دل و دماغ بے تاب ہو جائیں گے۔

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی